سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

لالہ و گل

شخصیات و نامہائے گرامی

رشحاتِ قلم

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

سابق شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند

ترتیب دادہ

سید احمد خضر شاہ مسعودی

شیخ الحدیث دار العلوم وقف و معتمد جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

بیت الحکمت دیوبند

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

لالہ وگل

شخصیات ونامہائے گرامی

رشحاتِ قلم

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ
سابق شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند

ترتیب وادارہ

سید احمد خضر شاہ مسعودی
شیخ الحدیث دار العلوم وقف ومعتمد جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

ناشر

بیت الحکمت دیوبند

تفصیلات

نام کتاب : لالۂ وگل

رشحاتِ قلم : فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد انظر شاہ کشمیریؒ

مرتب : سیّد احمد خضر شاہ مسعودی

صفحات : ۵۲۶

بارِ اوّل : ۲۰۰۰ء

بارِ چہارم (جدید ایڈیشن) : ۲۰۲۰ء

کمپیوٹر کتابت : نور گرافکس، دیوبند

ناشر

بیت الحکمت

محلہ ابوالمعالی، دیوبند 247554

Mob. 8006075484

دیوبند کے معروف کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

فہرست

وفیات ماخوذ از ''محدث عصر''

ضمیمہ

عرضِ مرتب

تقریباً پچیس سال کا عرصہ ہوا کہ احقر نے حضرت والد محترم اطال اللہ بقاءہٗ کے مضامین کا مجموعہ بہ نام ''فروغِ سحر'' ترتیب دے کر شائع کیا، فروغِ سحر کے ٹائٹل کے لیے احقر کی فرمائش بلکہ اصرار تائے ابا مرحوم مولانا سیّد از ہر شاہ صاحب قیصر سے یہ ہوا کہ کوئی مناسب شعر تجویز فرمادیں، چوں کہ فروغِ سحر نام ان کا ہی تجویز کردہ تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ قلم پکڑنے، لکھنے اور پڑھنے کے لیے ان ہی کی ترغیب تھی، مضامین کے مقابلہ کرانے کے لیے مرحوم ہی سے مضمون لکھوایا جاتا، تو گا ہے ان کے کسی مضمون کو اپنے نام سے شائع کرانے کا شوق ہوتا، وہ بھی بچوں میں بچے اور بزرگوں میں باتمکنت، احباب میں بے تکلف شخصیت کے مالک تھے،

فرمائش کی تکمیل ہوئی اور یہ شعر تجویز فرمایا۔

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیر شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی

غرفۂ صبح بھی کھل گیا، زنجیر شب بھی ٹوٹ گئی، پو بھی پھٹ گئی، غنچے بھی کھل گئے وغیرہ مگر وہ جو ''اٹھنے'' کا عمل تھا، وہ نہ ہوسکا اور آج تک غفلت ہی میں شب و روز گذر رہے ہیں۔ عمرِ عزیز کے زیاں پر بجز افسوس کے اب اپنا کوئی مشغلہ نہیں، حالاں کہ قدرت کی فیاضیوں نے مواقع بے حد عنایت کیے اور کام کرنے کے لیے جولان گاہ بھی موجود، لیکن غفلتیں عناں گیر، اسی رمضان المبارک میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ والد محترم کے مضامین

کو ترتیب دیا جائے اور اس فرصت کو کارآمد بنایا جائے، چناں چہ مضامین کو مختلف رسائل، جرائد، مجلات اور اخبارات سے جمع کرنے کے لیے بنام خدا جد وجہد کی، کافی تگ ودو اور کوشش کے بعد مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہوگیا، موضوع کے اعتبار سے ترتیب دینے کی نوبت آئی تو دیکھا کہ صرف ''شخصیات'' پر اتنا کچھ مواد ہے کہ اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہوجائے، جبکہ دیگر عنوانات پر بھی اتنا کچھ ہے کہ وہ ایک مکمل تصنیف کی صورت اختیار کرسکتی ہے۔

چناں چہ ترتیب میں ترجیح ''شخصیات'' کو دے کر مضامین پر نظر ثانی کا کام شروع ہوا۔ اسی دوران جبکہ مضامین کی تلاش ہو رہی تھی، والد محترم کے قدیم ذخیرے میں حضرات اکابر علماء، صوفیاء واولیاء اللہ کے وہ نایاب خطوط سامنے آئے جن میں مکتوب الیہ والد محترم تھے، لیکن کچھ تو بے حد بوسیدہ، تو کچھ کی روشنائی پھیکی ہوچکی تھی، باقی بھی کچھ بہتر حالت میں نہ تھے، خیال یہ ہوا کہ ان کو محفوظ کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ان کی طباعت ہوجائے، جس سے نفع بھی ہو اور فی الجملہ یہ قیمتی سرمایہ محفوظ بھی ہوسکے۔

والد محترم حسب دستور رمضان المبارک میں بسلسلہ تفسیر قرآن مجید جنوبی ہند کے مشہور شہر ''بنگلور'' میں قیام پذیر تھے، کہ سالہا سال سے بفضلہ تعالیٰ رمضان المبارک میں تفسیر قرآن ان کا محبوب شغل ہے، وہاں پر ٹیلی فون سے رابطہ کر کے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت اور ان حضرات اکابر کے مختصر سوانحی خاکوں کو تحریر کرنے کی فرمائش کی، عرصۂ دراز سے والد محترم کا معمول ہے کہ مضمون یا کوئی تحریر، یہاں تک کہ ڈاک کے جوابی خطوط بھی املا کراتے ہیں۔

باوجودیکہ روزے کا تعب اور دن بھر میں کم از کم تین پروگرام، مستزاد کوئی ہمراہ باسلیقہ لکھنے والا بھی میسر نہیں، انہوں نے یہ سوانحی خاکے اپنے قلم سے لکھ دیے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

یہ بھی عرض ہے کہ احقر کا اس میں کوئی کارنامہ نہیں، اور نہ ہی زیادہ کدوکاوش کی

ضرورت پیش آئی، ہاں ایک جذبہ ضرور تھا کہ والد محترم کی کچھ خدمت ہو کہ حقیقتاً اب ان کے معاملات کو احسان ہی کہا جائے گا۔ جو ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ ہیں، والدہ مرحومہ کے وصال کے بعد ہم سب بہن بھائی اور دوسرے متعلقین کی اسی شفقت کے ساتھ پرورش کی جو مادرِ مہربان کی حیات میں متوقع تھی، بلکہ اس سے بھی ہزاروں مراحل آگے۔

احقر کو وقف دارالعلوم میں تدریس کا موقع اس ادارہ کے قیام کے پہلے سال ہی سے میسر آیا اور یہ والد صاحب ہی کی توجہات و دعاؤں اور کوششوں کا نتیجہ ہے، آج حالاں کہ بیضاوی شریف اور طحاوی شریف جیسی کتابوں کا درس احقر سے متعلق ہے اور یہ یقین ہے کہ احقر ہرگز اس کے لائق نہ تھا، یہ خدا تعالیٰ کا انعام اور انہی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ والد محترم کی متعدد تصانیف شائع ہو چکیں، تفسیر قرآن پر انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ تفسیر مدارک، ابن کثیر، الجواہر، حقانی، بیضاویؒ پر گراں قدر حواشی اور علمی تحقیقات سپردِ قلم کیں۔

عربی و فارسی کتب کے ترجمے، اور تسہیل بھی، خود اپنے نام وَر والد امام العصر حضرت علامہ کشمیریؒ کی بسیط سوانح بنام "نقش دوام" ان کے گوہر بار قلم سے نکلی، جو بجائے خود اردو ادب کا شاہکار ہے۔

ان کی انشاء شگفتہ، تحریر باوقار، تشبیہ واستعارے نادر و نایاب، اسلوب جاندار، طرز شاہانہ، دروبست ملوکانہ، یادداشت قابل رشک اور حافظہ قوی، مشاہدہ حیرت انگیز، مرقع نگاری بے مثل۔

بچپن کے واقعات بھی انہیں محفوظ، اکابر نوّر اللہ مرقدہم کے حالات وواقعات ان کے حافظہ کے خزانے میں بدستور، خصوصاً حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات کے تو گویا حافظ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے سایہ کو ہمارے اور امت کے سروں پر تادیر قائم رکھے،

اوران کے فیوض ہمیشہ کے لیے امانتِ کائناتِ علم ہوں، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

زیر نظر مجموعہ میں بعض شخصیات ایسی ہیں جن پر مستقل ایک مضمون ہے اور پھر خطوط کے پس منظر میں ان کا ایک مختصر سوانحی خاکہ بھی ہے، چوں کہ ہر دو معلومات اور اردو ادب کے شاہکار ہیں اس لیے مکرر ہونے کے باوجود انہیں حذف نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کہیں کوئی نقص، یا خامی نظر آئے تو بلاشبہ وہ احقر کی کوتاہی ہوگی۔

اس مجموعہ کی اشاعت میں برادرِ محترم تاج عثمانی مالک مکتبہ فیض القرآن کے مفید اور کارآمد مشورے شامل رہے، میں ان کا از حد ممنون ہوں، اور اپنی اس ہیچ پوچ کوشش کو اپنے عظیم و نامور دادا کے نام نامی واسم گرامی کے ساتھ منسوب کرتا ہوں کہ ان کی برکات علمی دنیا پر عموماً اور خانوادۂ انوری پر خصوصاً سحابِ مدرار و ابر رحمت کی طرح برستے ہیں۔

وانا الاحقر سیّد احمد خضر شاہ

خادم التدریس دار العلوم وقف دیوبند

۵/صفر المظفر ۱۴۲۱ھ

***

”خامہ فرسائی“

از: حضرت مولانا سیّد انظر شاہ کشمیری مدظلہ العالی

زندگی کے تین مرحلے یقینی ہیں: بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ رہی تندرستی، بیماری، غربت وامارت، پُرشوکت زندگی، یا دربدر کی ٹھوکریں، خوبصورتی، یا بدصورتی، ان میں سے کوئی بھی یقینی نہیں۔

ایسے ہی موت کا مرحلہ یقینی اور خدا تعالیٰ کی جانب سے طے شدہ۔ عجیب بات، عدم سے وجود پذیر ہونا ضروری نہیں، لیکن بود سے نابود ہونا قطعی، موت سے کس کو رستگاری ہے، نہ رسل کو، نہ انبیاء کو، نہ اہل علم کو اور نہ اولیاء کو، نہ کج کلاہوں کو نہ فقیر بے نوا کو، نہ طاقت ور کو، نہ کمزور کو، اور پھر ایسا طے کہ ایک لحظہ ادھر نہ ادھر اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ پھر بھی انسان اسی یقینی منزل سے غافل۔ وہ گھر گرہستی کا فکر کرتا ہے، اسے بیوی بچوں کی فکر دامن گیر ہے، وہ اپنے مستقبل کی تعمیر میں مصروف، وہ عہدوں کے لیے تڑپ رہا ہے، وہ منصب کے پیچھے دوڑ رہا ہے، اقتدار اس کی بھوک ہے، عزت طلبی اس کی خواہش، وہ زمین جائداد کا شائق ہے، کوٹھیوں اور بنگلوں کا مشتاق، اسے پس انداز بھی کرنا ہے، جس کے لئے اس نے حرام وحلال کی تمیز اٹھادی، اسے پوشاک بھی زرّیں چاہیے، بلکہ ملبوسات کے ڈھیر اس کا مطلوب، حرص وآز، طلب وخواہش، لالچ وطمع، اسے کہاں کہاں لے جاتی ہے۔

وطن سے دور، اعزہ واقارب سے مہجور، لیکن تلاشِ معاش میں امریکہ اس سے قریب، برطانیہ اس کے پاس، سب کچھ ہے، اور سب کی تیاریاں، لیکن موت جیسے یقینی مرحلے سے غافل، نہ عقیدہ درست، نہ حسن اعمال، حالاں کہ قبر کے گڑھے میں یہ ہی دو چیزیں کارآمد، نہ وہاں شوکت شاہی کام دے گی، نہ خسروی، کس قدر سچ کہا کہنے والے نے: اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝ اس کا منظوم اردو ترجمہ بھی سن لیجئے ؎

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں

سامان سو برس کا ہے، کل کی خبر نہیں

یہ مبتلائے غفلت انسان جاگے گا، یہ تغافل کیش یقیناً بیدار ہوگا، اسے ہوش آکر رہے گا، اس کی غفلتیں یقیناً رخصت ہوں گی، مگر کب؟ جب بیداری کوئی کام نہ دے گی! جب جاگنا سودمند نہ ہوگا۔

کائنات میں سب سے زیادہ سچی زبان کا ارشاد ہے:

الناس نیام اذاماتو افانتبھو او کماقال علیہ السلام.

یہ دنیائے دوں دھوکوں سے لبریز، لیکن بڑا فریب خود زندگی ہے: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کیا ہے؟ جس پر انسان جیسا ذی ہوش وذی گوش، جیتا جاگتا جانور، اور پھر مبتلائے فریب، حالاں کہ تنبیہ وانتباہ ہر جانب سے، اس جانب سے بھی جن کے بارے میں "القرآن" ناطق ہے: فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ یعنی شعراء، آواز تھی جسے کانوں پر پڑے پردوں کو چیرتے ہوئے دل کی گہرائیوں میں اترنا چاہئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا، غالب ہی نے تو کہا تھا ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

حقائق کی گہرائیوں تک پہنچ جانا کسی خاص فرقے وطبقے کی وراثت نہیں، ایمان کی

روشنی مسلّم، اور اہل ایمان کی یہ شان بھی تسلیم: یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ
پھر بھی ہندو شاعر کا شعر دیکھئے، حقیقتوں سے نقاب اٹھاتا ہوا ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

مگر ملحوظ رہے کہ شعر میں نہ کوئی تعلیم وتلقین، نہ سوتے ہوؤں کو جگانے کے لئے، یا جاگتے ہوئے غافل کے لئے کوئی زجر وتنبیہ، اب ایک روشن ضمیر، خودشناس وخود آگاہ کو بھی سنئے ؎

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو ۞ ہمہ خنداں بوند وتو گریاں
آں چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو ۞ ہمہ گریاں بوند وتو خنداں

یہ کامیاب زندگی کی مسکراہٹ، بے حس وحرکت لاشہ کے ہونٹوں پر کھیلتی ہے، اسی کو اقبال نے کہا ہے کہ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

بہرحال، بات وہی ہے کہ موت، چہار جانب سے یہ ہی آواز، ہر جہت سے یہ ہی صدا، چپ وراست یہی چیخ رہا ہے، ذرہ ذرہ کی یہ ہی پکار ؎

کہہ رہے طائرانِ خوش الحان ۞ ہر صبح، کل من علیھا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے ۞ آج وہ، کل ہماری باری ہے

کہاں گئے دوست واحباب؟ کس دنیا کے باسی ہیں شفیق ماں باپ؟ یہ عورت کا سہاگ کس نے لوٹا؟ یہ شوہر کی خانہ ویرانی کس نے کی؟ یہ بچے کیوں یتیم ہوگئے؟ یہ شاد وآباد گھرانہ آج کیوں ماتم کدہ ہے؟ کیا کہہ گیا اور کیسی سچی بات، وہی اردو کا مشہور شاعر، جس نے عروج کے بعد زوال دیکھا، جسے امارت کے بعد فلاکت نے گھیرا، یعنی انشاء اللہ خاں انشاء ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

آہ! غفلتوں کا پشتارہ، اس پر خدا تعالیٰ کی جانب سے انتباہ وایقاظ، حالاں کہ عبرت پذیر دل ودماغ نے ہر لمحے کی آمد ورفت کو بھی درسِ عبرت قرار دیا ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی

تیاری، تیاری، مختصر سفر کے لئے بھی تیاری، خواہ یہ پروگرام تشکیل کو پہنچے یا نہیں، لیکن کوئی تیاری نہیں اس سفر کے لئے جو یقینی ہے، حالاں کہ ع:

مسافر شب سے اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

وقت گذر رہا ہے۔ اسے تھامنے میں چابک دستیاں ناکام، دن بیت رہے ہیں، ان کا دامن تھامنے کے لئے پنجہ آزمائی بے سود، سونے والے اب بھی سو رہے ہیں، غفلتوں کو تازیانۂ عبرت ختم نہ کرسکا، وہی غفلت وہی تغافل، وہی راحت پسندی وہی تساہل، حالاں کہ کہا یہ بھی گیا تھا ؎

جاگ لے! ہاں جاگ لے! افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

یعنی ع

عوضِ یک دو نفس قبر کی شبہائے دراز

اوروں کو تو کیا کہئے، خود ایک ستر سالہ، جو زندگی سے دور، اجل مسمی سے قریب ہے، وہ بھی دنیا کے عمومی انداز سے نہ یکسو، نہ ممتاز، نہ منفرد، نہ محتاط، بس اس کی دو توقعات، قارئین سے طلب دعائے خیر، اور مقصود اوّل وآخر مغفرت ربّ غفار۔

اپنے بزرگوں، اپنے اکابر، جانی پہچانی شخصیتوں، اور متعارف افراد واشخاص پر یہ مضامین قلم بند ہوئے، خدا جانے کن کن مجلات وجرائد کے لئے اور کہاں کہاں کے

اخبارات ورسائل میں شاید قدرت انہیں محفوظ رکھنا چاہتی، کہ عزیز قلبی، خادم زادہ مولوی احمد خضر سلمہٗ کو خیال ہوا کہ جمع وترتیب کے بعد ان کی طباعت کا سروسامان ہو، کارساز حقیقی کی چارہ سازیاں کہ طویل وسنگلاخ مراحل سے گذر کر اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس یقین کے ساتھ ؎

تو صاحب نظری بگیر ایں دستۂ گل ازمن
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

قارئین دانا وبینا ہیں، خلجان یقینی ہوگا کہ مجموعہ ''وفیات'' کیلئے گلدستہ کی تعبیر مؤلف کی کم سوادی کی علامت ہے، اس میں تو شک نہیں سواد تو کیا معنی؟ بے سواد ہوں، مگر فیصلہ کرنے سے پہلے ٹھہریئے! نمناک تُودوں پر ڈالنے کے لئے ان کاغذی پھولوں میں کچھ تروتازہ؛ بلکہ شاداب پھول بھی ہیں۔ وہ ہیں اکابر کے خطوط، لکھنے والے سب آخری منزل پر پہنچ چکے، مکتوب الیہ اگرچہ زندہ ہے۔ خیال یہ ہوا کہ اکابرؒ کی ان یادگار پھولوں کو بھی زیبِ گلو کردیا جائے، ان خطوط کو پڑھنا بڑا دشوار تھا، کچھ کو زمانے کی الٹ پھیر کھا گئی، کچھ ایسے شکستہ رسم الخط میں کہ ان کو پڑھنا کارے دارد، لیکن داد دیجئے مولوی طیب ہردوئی اور ان کے رفیق کار جناب لقاء الرحمٰن کو کہ اپنی صلاحیتوں کو نچوڑ کر اس ہفت خواں کو طے کرلیا۔ فجزاھما اللہ احسن الجزاء

ہر مکتوب کے پس منظر کو سامنے لانے کے لئے قلم گھسنے کی ضرورت تھی، سو وہ اس کم سواد نے انجام دی، مہم سر تو نہ ہوسکی، لیکن کچا چٹھا آپ کے روبرو ہے، نگاہ خوردہ گیر سے بھی پناہ مانگتا ہوں اور مبالغہ آمیز مدح سے بھی، اگر یہ مجموعہ قابل قبول ہے تو رحمت رحمان کا ادنیٰ کرشمہ قرار دے کر داد کا رُخ بے تکلف احمد خضر سلمہٗ کی طرف کیجیے، ناپسندیدہ ہے تو گردن زدنی میں ہوں۔

یہ مجموعہ، ان سب کے نام نامی کے ساتھ منسوب ہے جو کسی بھی عنوان سے اس میں مذکور ہیں، میری صرف اتنی درخواست کہ ان میں سے جو مؤمنین ہیں، ان کے لئے

دعائے مغفرت، اور ظلوم وجہول کے لئے دعائے حسنِ خاتمہ ورضوان ربِّ عظیم، کہ رضوان من اللہ اکبر۔

غالب دہلوی تو کہہ گئے ؎

چند تصاویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

لیکن خاکسار نے انہیں زندگی میں طشت از بام کردیا، یہ اس لیے کہ ؎

روزِ قیامت ہر کسے در دست گیرد نامۂ
من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

گویا کہ ''بغل'' کے لیے سامان پہلے سے مہیا، تو لیجئے پڑھئے، اس گزارش کے ساتھ: ''ذرا سر کو دھن''۔

وانا الاحقر **محمد انظر شاہ**
۷؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ

* * *

امیر المومنین

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

"لم أر عبقریاً یفری فرِیَہ" اسلام کے ابتدائی دور کی ضعیف و ناتواں تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اس دور کے متعلق خود قرآن حکیم نے فرمایا کہ "اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ" بے بسی کے اوقات میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے قیام واشاعت کے لیے جن چند اشخاص ورجال میں غیر معمولی طاقت وقوت کو محسوس کر کے ان کے وجود سے اسلام کے مستفیض ہونے کی بے اختیار دعاء کی تھی، ان میں اسلام کی وہ پُر عظمت ہستی بھی داخل ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق خاص، خلافتِ راشدہ کے دوسرے رکن اور جن کے عظیم کارناموں سے نہ صرف اسلام کی عظمت قائم ہوئی اور اس کے کاروبار کو فروغ حاصل ہوا، بلکہ اسلام کا صحیح اور مکمل نمونہ پیش کرنے کے لیے غالباً چند اشخاص میں سے ایک حضرت عمرؓ ہیں۔ دینی حمیت وغیرت، پُر جوش جدوجہد، شجاعت وشہامت اور اس کے ساتھ عدل وانصاف، تقویٰ وتورع کی مختلف الانواع صفات، اس پیکر انسانی میں کچھ اس طرح جمع ہوگئی ہیں کہ اسلام بجا طور پر فاروق اعظمؓ کی عظیم شخصیت پر فخر کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف صفات وامتیازات سے آپ کی ذاتِ گرامی جس طرح آراستہ وپیراستہ ہے اسی کا تقاضا تھا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورۃ الصدر تأثر کا اظہار فرمایا جس کا مطلب یہی ہے کہ:

"عمر عبقری اور اپنی زندگی میں اس قدر منفرد کہ دوسرا شخص ان کے کردار کو نبھا نہیں سکتا"۔

صادق ومصدوق کی رائے وتأثر کی صداقت وسچائی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی پوری زندگی اور زندگی کے ہر موڑ پر شہادت دیتے رہے اور انسانی زندگی کا یہ ایک مثالی نمونہ تاریخ میں واقعی عبقری لکھے جانے کا مستحق ہے۔

''موتمر اسلامی'' نے گراں قیمت کتابوں کا جو ذخیرہ مصری علماء کی وساطت سے ''دارالعلوم دیوبند'' کو ہدیۃً دیا ہے اس میں ''عبقریت عمرؓ'' کے نام سے کتاب احقر کی نظر سے گزری، جی چاہا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی بے مثال زندگی اور بے غبار کردار کی جھلک قارئین ''دارالعلوم'' کے سامنے بھی پیش کی جائے۔

اس صدی میں مسلمان مشرق میں ہو یا مغرب میں، جنوب میں ہو یا شمال میں، زندگی کے جن نازک مرحلوں سے گزر رہا ہے، اس طرح کہ شوکت وطاقت سے بھی محروم ہے، اقتصادی ومعاشی الجھنوں میں بھی گرفتار اور سیاسی اقتدار سے بھی بہت دور۔ ان حالات میں اسلام کی انہیں چند شخصیتوں کے عبرت انگیز حالات اور کوائف ہی سننے اور سنانے کی چیز ہے۔ کیا عجب ہے کہ امت کی موجودہ نسل انہیں رجال واشخاص کی زندگی کو نمونہ بنا کر روشنی کے ان مناروں سے اپنے ٹمٹماتے ہوئے چراغ روشن کر سکے۔ اس لیے کہ یہ تو حقیقت ہے کہ فرزندانِ توحید جب تک اسی کردار وعمل کو اپنانے کی کوشش نہ کریں گے جو آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا مخصوص اور امتیازی کردار ہے، اس وقت تک مسلمان خدا کی اس زمین پر اپنا حقیقی فریضہ ادا نہ کر سکیں گے۔ امریکہ کی تقلید، یورپ کا فکر، کمیونزم کے تخیلات، امپریلزم کے افکار اور سوشل نظریات وغیرہ ذلتوں کے گڑھوں میں کھینچ کر لے جانے والے تو ہیں؛ لیکن قعر مذلت سے نکلنے اور نکالنے کا کام ان سے نہیں لیا جا سکتا۔ خاک نشینوں کو خاک سے کاخ تک پہنچانے کا ذریعہ وہ تعلیمات ہیں جن کا سرچشمہ قرآن وحدیث ہیں اور جس کی سوتیں عمل بالقرآن اور عمل بالسنۃ سے نکلی ہیں، آج بھی انہیں حقائق پر عمل کرنے والے یہ کہتے ہوئے منزل کی طرف بڑی تیز گامی سے چلے جا رہے ہیں کہ ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا''

لیکن اس کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ ابھی تک مسلمان کی عام آبادی دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے اور آخرت کی فوز و کامرانی حاصل کرنے کے اس سچے اور پکے ''گر'' سے اب تک اس طرح کام نہیں لے رہی ہے جیسا کہ چاہیے تھا۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ سے لے کر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کے زخمی جسم پر استبداد و تشدّد کے جو تازیانے برابر پڑے ہیں ان کی مسلسل ضربیں اب انہیں جگا رہی ہیں اور بھولے بھٹکے مسافر اپنی منزل کو پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید اس دور اہے پر ابنِ خطاب، فاروقِ اعظم، حضرت عمر فاروقؓ کے حالات و سیر دانا و بینا لوگوں کے لیے کچھ کارآمد ہو سکیں، لکھنے والا تو بہرحال اس نیت سے لکھ رہا ہے۔

إنما الأعمال بالنيات.

رعبِ فاروقی

پُر ہیبت شخصیت اور پُر عظمت ہستی کسی دعوت اور جماعتی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ رافت و لطف اور نرمی و لینت سے آراستہ داعی و رہنما۔ گویا کہ جماعت کی ہیئتِ ترکیبی جو افراد سے تیار ہوتی ہے ضروری ہے کہ اس کے مختلف افراد متنوع صفات کے پیکر ہوں۔

اگر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے لطیف المزاج اشخاص ہوں تو فاروق رضی اللہ عنہ جیسے حدید اور تیز طبیعت افراد بھی لابدی ہیں، اور نبی ان تمام مختلف اور متضادات صفات کا جامع ہوتا ہے۔ اسی لیے اگر ایک طرف قرآن کریم نے آپ کے نرم خو، نرم پسند رحمۃ للعالمین ہونے کی اطلاع دی، تو دوسری جانب خود ''نصرت بالرعب'' کے خصوصی امتیاز کی بھی خبر سنائی ہے اور عقلاً بھی نبی و پیغمبر کے لیے متضاد صفات سے متصف ہونے کی ضرورت سمجھ میں آتی ہے، اس لیے کہ دعوت کی مرکزی شخصیت ہونے کے لیے اپنے مدعوئین کی مختلف خصوصیات کی رعایت ارشاد و رشد و ہدایت و رہنمائی میں کامیابی کی اوّل شرط ہے۔ بہرحال حضرت عمرؓ بہت ہی بارعب شخصیت کے مالک تھے اور اسلام کے ابتدائی دور

سے لے کر اپنی خلافت کے زمانے تک ان کا یہ وصفِ مخصوص خود ان کے لیے اور اسلام کے لیے بہت مفید اور کار آمد ثابت ہوا۔ خارجی فتنوں کے علاوہ داخلی انتشار و فشار جو عمرؓ کے بعد اچانک پھوٹ پڑا، ان کے دور میں قلوب میں پرورش پا رہا ہو تو پا رہا ہو؛ لیکن بظاہر وہ حجاز سے لے کر دور دور تک شئی نایاب ہی تھا، دینی حمیّت و غیرت۔ کے مواقع پر حضرت عمرؓ کے لیے خاموش رہنا بہت مشکل ہوتا اور ان کے فطری جوش و خروش سے ان کے رعب و دبدبے کا امتزاج عجیب کیفیت پیدا کر دیتا۔

موجودہ اصطلاح میں حضرت عمرؓ کو "سخت گیر" کہا جا سکتا ہے اور خود آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کی حدّت و مزاجی صلابت سے بے خبر نہ تھے۔ زیر بحث کتاب کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایک روز آپ نے صدیقؓ و فاروقؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"خداوند تعالیٰ بعض قلوب کو دودھ سے بھی زیادہ نرم بناتا ہے اور کچھ لوگوں کے دل ارادہ اور عمل کی بڑی مضبوطی رکھتے ہیں۔ ابو بکر تمہاری مثال "ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام" کی سی ہے، انہوں نے فرمایا: فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۶﴾ یا پھر تم عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہو جنہوں نے کہا تھا کہ "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۶۷﴾" اور اے عمر! تم تو بنے بنائے نوح علیہ السلام ہو جنہوں نے قوم کی مسلسل سرکشی پر چیخ کر کہا تھا کہ "رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ﴿۶۶﴾" یا پھر موسیٰ علیہ السلام سے ملتے جلتے ہو، جن کا نعرہ تھا کہ "رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۶۸﴾"

عمرؓ اسلام کے سلسلے میں شدید تھے جس طرح صدیق اکبرؓ کی نرمی لینت دین ہی کے کاروبار میں ممتاز ہے، ورنہ جہاں تک حق کو قبول کرنے کا تعلق ہے تو فاروق اعظمؓ کا قلب بھی اسی قدر فراخ و وسیع ہے جس قدر کسی حق پژوہ کا ہو سکتا ہے۔ چناں چہ انعقادِ خلافت کے وقت میں جب حضرت عمرؓ سے بیعت پر بعض صحابہ میں ان کی شدت

وحدّت پر چہ می گویاں شروع ہوئیں تو حضرت عمر نے جو کچھ کہا اس کا حاصل یہ ہے کہ:

''لوگو! مجھ تک یہ خبر پہنچائی گئی ہے کہ تم میری شدتِ مزاجی سے ڈر رہے ہو اور کہتے ہو کہ عمر ہمارے معاملات میں بڑے شدید تھے؛ حالاں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیات تھے اور عمر کی یہ تیزی اس وقت بھی قائم تھی جب کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۃ المسلمین بنائے گئے، اب جب کہ وہ خود امیر بنائے جا رہے ہیں تو خدا جانے کیا اور کیا نہ ہو؟

خدا کی قسم! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تو آپ کا غلام و خادم تھا اور آپ اس قدر نرم اور رافت پسند تھے کہ قرآن نے بھی ''بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۲۱)'' کہہ کر آپ کی نرم پسندی کی تصدیق کی، میں آپ کے ہاتھ میں ایک تلوار تھا، جی چاہتا تو آپ مجھ کو نیام میں رکھ لیتے اور طبیعت چاہتی تو آپ مجھ کو کھینچ لیتے پھر میں شمشیر براں ثابت ہوتا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ مجھ سے راضی وخوش تھے، یہ میری سعادت ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک حمدًا کثیرًا، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کے معاملات کے مختار بنائے گئے تو ان کی نرمی کے ساتھ میری شدت کا امتزاج مفید ثابت ہوا، ان کے لیے بھی میرا وجود تلوار تھا یا نیام میں رکھیں اور اگر نکال لیں تو میں قاطع و براں ثابت ہوں، میرا ابوبکرؓ کے ساتھ بھی یہی طرز رہا، یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی اور وہ دنیا سے اٹھے تو مجھ سے خوش تھے میں اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

''لوگو! اب میں تمہارا امیر بنایا گیا ہوں، مگر میری وہ شدت کم ہو گئی ہے، ہاں، اہل جور و ستم و عدوان کرنے والوں کے حق میں وہی عمر ہوں اور باقی دین دار اور سلامت روی اختیار کرنے والے؛ سو اُن کے حق میں تو میں بہت نرم ہوں۔''

لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ اپنے فطری جلال و شکوہ کو یکسر ختم نہ کر سکے اور ان کے خداداد رعب و وقار سے ہر شخص متاثر ہوتا۔ مصنف نے اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ سنایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:

''ایک روز فاروقِ اعظمؓ حجامت بنوا رہے تھے، درمیان میں زور سے کھنکارے تو حجام حواس باختہ ہوگیا اور اس تصور سے کہیں عمرؓ میری کسی بات پر نہ بگڑے ہوں، بے ہوش ہونے کے قریب ہوگیا۔''

کیا ٹھکانہ ہے اس رعب وداب کا کہ صرف کھنکارنے کی وجہ سے حجام غش کھا کر گر پڑا اور یہ بے چارہ بھی حجام تھا، فاروقؓ سے تو بڑے بڑے صحابہ بھی لرزہ براندام رہتے، چناں چہ لکھا ہے:

''ایک دن عمرؓ چلے جاتے تھے اور ان کے پیچھے صحابہ کی ایک جماعت، اچانک حضرتؓ کو کوئی کام یاد آیا جس کی وجہ سے بڑی پھرتی کے ساتھ پیچھے مڑے تو اکثر صحابہ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔''

بلکہ مصنف کی روایت سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت عمرؓ کی زندگی کے اس مخصوص رخ کی رعایت فرماتے، جیسا کہ لکھا ہے کہ:

''عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حریرہ پکایا اور سودہؓ کو بھی کھانے کے لئے مجبور کیا، لیکن سودہؓ برابر انکار کرتی رہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بڑے اصرار اور ردّ وقدح کے بعد تفنناً ومزاحاً حریرہ سودہؓ کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ لو! تم بھی عائشہؓ کے چہرے پر لگا دو، آپ یہ کہتے جاتے اور تبسم فرماتے، اتنے میں حضرت عمرؓ ادھر سے گزرے تو آپ کو محسوس ہوا کہ عمر یہیں آئیں گے؛ اس لیے آپ نے سودہؓ وعائشہؓ سے فرمایا: جلدی کھڑی ہو جاؤ اور اپنے چہرے دھولو! عمر آتے ہیں۔''

لینت ورقت

لیکن اس کے باوجود صرف خشونت مزاج شخص ہی نہیں تھے؛ بلکہ ان کے قلب میں رقت ونرمی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور سوز وگداز کے مواقع پر موم کی طرح پگھل جاتے، قلب کی آنکھیں بھی اشکبار ہوتیں؛ چناں چہ متمم بن نویرہ مشہور شاعر سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کو اپنے بھائی کا مرثیہ پڑھنے کا حکم دیا، نویرہ پڑھتے

ہوئے جب ان اشعار پر پہنچا:

وکنا کندمانیٔ جذیمۃَ حِقبۃً ۞ من الدھر حتی قیل لن یتصدّعا

فلما تفرّقنا کانّی ومالکا ۞ لِطول اجتماع لم نَبِت لیلۃً معاً

توعمر ؓ کو بے اختیار اپنے مرحوم بھائی کی یاد آ گئی اور رخسار پر آنسو ڈھلک آئے۔

مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

اگر حضرت عمر ؓ کو کبھی دوست یاد آ جاتے تو قریب میں سننے والے عمر کی زبان سے بار بار سنتے۔

''ہائے رات کتنی لمبی ہوگئی''۔

اور صبح ہوتے ہی نماز پڑھتے اور سیدھے اس دوست کے یہاں پہنچ جاتے، معانقہ کرتے اور دوست کی ملاقات سے خوش ہوتے اور پھر ان کی یہ طبعی نرم پسندی انسانوں سے گزر کر جانوروں کے حقوق میں بھی پوری قوت کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی، مسیب ؓ ابن دارم اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک روز عمر ؓ ایک اونٹ والے کو مارتے ہوئے اور ڈانٹتے ہوئے دیکھے گئے، جس نے اپنے اونٹ پر بہت زیادہ بوجھ لاد رکھا تھا۔''

خارشی اونٹوں کے زخم اپنے ہاتھ سے دھوتے اور ان کی دوا دارو کرتے۔ کہتے تھے کہ: ''کہیں تمہارے بارے میں بھی مجھ سے سوال و جواب نہ ہو''۔

محاسبہ

ان کو اپنے محاسبہ کا یہاں تک خیال تھا کہ ہر وقت ان کی زبان پر یہ کلمہ رہتا کہ:

''اگر فرات کی موجوں میں بکری کا بچہ بھی مر گیا تو عمر ہی سے اس کے بارے میں حساب و کتاب ہوگا۔''

دنیا کے کاروبار میں محاسبہ اور یہ ''خیال'' کہ ہم کو ہمارے افعال و اعمال کا حساب و کتاب بھی دینا ہے، تقریباً ہر ہر فرد بشر کے لیے ضروری ہے اور پھر وہ اشخاص و رجال جو

عوام کی فلاح وبہبود کی ذمہ داریاں اپنے دوش پر اٹھائے ہیں، اگر ان کی زندگی میں ''محاسبہ'' کا یقین واذعان ثانوی حیثیت رکھتا ہے تو اجتماعی زندگی کو اتنا بڑا دھچکا لگتا ہے جس کا تدارک آسان نہیں؛ بلکہ بہت دشوار ہے۔ کمیونسٹ ممالک ہوں یا امپیریلزم، جمہوریت ہو یا ڈکٹیٹرشپ، بہر حال ہر جگہ حل وعقد سے تعلق رکھنے والے ارباب اور نظم ونسق کے ذمہ دار، اعمال وکردار میں ''محاسبہ'' کے یقین کو اس طرح فراموش کئے بیٹھے ہیں کہ ان کی زندگی میں محاسبہ کی کوئی حقیقت ہی نہیں، دنیا کی تباہی وبربادی، اربابِ سیاست کی اغراض پسندیاں اور اس کارخانۂ عالم کا فساد، معاشرہ کا اختلال، بہت حد تک اسی ''ترکِ محاسبہ'' کا بدیہی نتیجہ ہے۔ فاروقؓ اپنے اعمال کی جواب دہی ایک لابدی امر سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ عمرؓ کا مختصر مگر روشن وتابناک زمانے کا کاروبار بھی صدیوں سے فائق چلا آرہا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دنیا اپنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر ترقیوں کے باوجود ''ابن خطاب'' کی مثالی خلافت کا ادھورا اور نامکمل خاکہ بھی پیش نہ کرسکی۔ فرات کی موجوں میں بکری کے بچے کی غرقابی کو بھی عمر ہی کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، مواخذہ ومحاسبہ کے اس یقین کامل کا کیا ٹھکانہ ہے۔ عمر کی اس خصوصیت کا دلچسپ اور عبرت افزا خاکہ پیش کرتے ہوئے مصنف نے یہ عجیب وغریب واقعہ سنایا ہے:

''ایک روز ''زیاد'' حضرت عثمانؓ کے پاس ان کے دورِ خلافت میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک حضرت عثمانؓ کا بچہ آیا اور چاندی کا کوئی سکہ بیت المال سے لے کر چل دیا۔ عثمانؓ نے منع نہیں کیا۔ زیاد اس پر بے اختیار رونے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے دریافت کیا کہ آخر کیوں رو رہے ہو؟ زیاد نے کہا کہ ایک روز میں یہیں حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں عمرؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ابن عمرؓ آئے اور بیت المال سے کچھ لے کر بھاگ پڑے، عمرؓ نے چیخ کر کہا پکڑ لو اور چھین لو، چھیننے والوں نے اس زبردستی سے چھینا کہ عمرؓ کا بچہ زار وقطار دھاڑیں مار کر رونے لگا اور آپ کی طرف سے نہ ڈانٹا گیا نہ دھمکایا گیا۔''

زیاد کی اسی بروقت گرفت وانتباہ کا جواب ذوالنورین نے دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"عمرؓ اپنے اعزہ واقرباء کو بیت المال سے کچھ لینے پر مرضیاتِ خداوندی کو حاصل کرنے کے لیے روکتے اور میں بھی ابتغاء وجہ اللہ اپنے اہل وعیال کو منع نہیں کرتا"۔

اوراس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ

"زیاد! اب تم عمرؓ کی مثال نہیں پاؤ گے، عمرؓ کی اب کوئی نظیر نہیں، عمرؓ کا نمونہ ملنا بڑا مشکل ہے۔"

اور بات بھی کچھ ایسی ہے کہ اس قرن میں بھی فاروق اعظمؓ اپنی خصوصیات میں یکتا ویگانہ ہی رہے، آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کچھ جان پہچان کر ہی آپ کو "عبقری" فرمایا تھا۔

ملکی احوال کا تجسس اور حکام کی خبر گیری

اعمال وکردار میں محاسبہ کے یقین کامل ہی کا نتیجہ تھا کہ عمرؓ اپنے حکام وولاۃ کے اعمال واقوال کی بھی بڑی تندہی سے خبر گیری کرتے تھے اور ان کے جزئی حالات پر بھی اتنی کڑی نظر تھی کہ کوئی بھی عامل اپنے صحیح حالات وکوائف حضرت عمرؓ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ امیر المومنین نے اس سلسلے میں جو اقدامات کئے تھے مصنف نے انہیں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سب کے ساتھ خود عمال وحکام کو بھی حکم تھا کہ:

"اپنے اپنے صوبے میں روانہ ہوتے وقت اپنے تمام سامان اور اشیاء کی فہرست مرکزی گورنمنٹ کے سپرد کر کے جائیں اور رخصت کے ایام گھر پر گزارنے کے لیے آئیں تو اپنے تمام سامانِ مملوکہ پر نظر کرائیں اور دن کے وقت میں "مدینہ منورہ" میں داخل ہوں تا کہ عوام وخواص دیکھ سکیں کہ ان کے پاس کیا کچھ ہے اور کیا نہیں"۔

مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر مرکزی خلافت کے پاس محفوظ فہرست سے اشیاء کی تعداد بڑھ جاتی تھی تو عمر براہ راست سخت مواخذہ ومحاسبہ کرتے اور حکام کو بتانا پڑتا کہ یہ سامان اور دیگر اشیاء کہاں سے حاصل کیں؟

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت عمرؓ بڑے سخت گیر اور بے موقع ومحل

تشدد پسند تھے، ہرگز نہیں! انہوں نے جہاں اپنے عمال و حکام پر یہ پابندیاں عائد کی تھیں تو دوسری جانب اس کی بھی کوشش کی گئی تھی کہ مشاہرہ اتنی بڑی مقدار میں بر وقت حکام کی جیب تک پہنچتا رہے جس کے بعد جلبِ زر کے ناجائز راستے اور زراندوزی کی غیر اخلاقی راہیں خود بخود بند ہو جائیں؛ چناں چہ اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عمار ابن یاسرؓ کو جب کوفہ کا والی منتخب کیا گیا ہے تو ان کا مشاہرہ ۶۰۰/درہم تھا عثمان ابن حنیف کے ۱۵۰/درہم اور عبداللہ ابن مسعودؓ کے ۱۰۰/درہم ماہوار تنخواہ تھی، بکریاں غلہ بڑی مقدار میں سالانہ اور وقتاً فوقتاً بڑے بڑے عطیات، جن کی تعداد بعض اوقات پانچ پانچ ہزار درہم کو پہنچ جاتی تھی وہ اس مشاہرہ سے علیحدہ رہے''۔

حکام کو اس قدر مالی وسعت دینے کے باوجود خود اپنی ذات پر خلافت کے کاروبار سے غیر استحقاقی طور پر ایک کوڑی بھی استعمال کرنے کے روادار نہ تھے۔ چناں چہ جب ان سے دریافت کیا کہ امیر المومنین خود اپنے لیے کیا پسند فرمائیں گے؟ تو اسی سوال کے جواب میں فرمایا:

''عمر کے لیے اللہ کے مال سے دو حلّوں کے سوا اور کچھ بھی جائز نہیں، ایک لباس جو سردی میں کارآمد ہو اور دوسری پوشاک جو موسم گرما میں کفالت کرے''۔

بڑی بڑی سلطنتوں کے تاج دار، نام نہاد جمہوری حکومتوں کے وزراء، خواہ وہ مرکزی ہو یا صوبائی، تعیش اور راحت کوشی کی جو پُرکیف اور پُرسرور زندگی گزار رہے ہیں، محاصل اور ہزار ہا ٹیکس کے عنوانات پر غریب عوام کی دولت کو لوٹ کھسوٹ کر دنیا بھر کے لذائذ اور تعیش کے لوازمات بے دھڑک پورا کر رہے ہیں وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ فارس وعجم، نوشیرواں اور کسریٰ کی حکومتوں کو الٹنے والا باشوکت وحشمت فاروقؓ اپنی ذاتِ خاص پر عوام کی خون پسینے کی کمائی ہوئی دولت کس حد تک خرچ کرنے کا روادار تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جو حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں آج کل حکومتوں کے کاروبار میں ان سے سبق نہ لے کر دنیا اپنا بڑا نقصان کر رہی ہے۔

عوام وحکام کا باہمی رشتہ

حکومت متسلطہ کے ذمہ دار اور رعایا کے افراد میں جو کشاکش ہمہ اوقات قائم رہتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہڑتال، اسٹرائک، ستیہ گرہ، توڑ پھوڑ اور اکثر ملوں اور کارخانوں میں ابتری پھیلی نظر آتی ہے، استبداد پسند گورنمنٹ تو درکنار؛ جمہور طرز پر کام چلانے والی حکومتیں بھی اس بڑھتے ہوئے مرض کا علاج اور موئثر مداوا دریافت کرنے سے تقریباً عاجز ہیں، بھوک اور افلاس سے پٹے ہوئے عوام حکومت کے کاروبار پر منتقمانہ انداز میں حملہ آور ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں کروڑھا؛ بلکہ اربوں روپے کا نقصان سامنے آتا ہے، جواب میں حکومتِ وقت بپھرے ہوئے شیر کی طرح دوڑتی ہے جس سے ہزاروں اور لاکھوں عوام گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں، کشتوں کے پشتے، لاشوں کے ڈھیر، خون کی ندیاں، زخمیوں کی چیخ و پکار، یتیموں اور بیواؤں کے نالہ وشیون اور ان حسرت انگیز ودہشت خیز آوازوں میں گولیوں کی خوفناک آوازیں ہر وقت اور ہر جگہ سنی جاسکتی ہیں۔ عوام اور حکومتوں میں یہ کشاکش اور منافرت یقیناً اس بات کا نتیجہ ہے کہ دونوں طبقے اپنے حدود اور اپنی ذمہ داریوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پہلے دن دونوں جماعتوں کو ان کی حقیقی ذمہ داری اور حدود سے واقف کیا، چناں چہ مصنف نے لکھا ہے کہ:

”حکام کو بار بار کہتے: تم رعایا کے خادم ہو اور عوام کو تنبیہ کرتے یہ تمہارے والی ہیں، ان کی اطاعت کرو اور سرکشی وعدوان سے ہرگز کام نہ لو۔“

اور اس کے ساتھ حکام کو بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ:

”تمہارے اور عوام میں کوئی فرق نہیں اور نہ کوئی امتیاز، بجز اس کے کہ تم ان کے امور کے نگراں اور ذمہ دار ہو۔“

دوررس نگاہ

امیر المومنین کو جو فراست اور سوجھ بوجھ قدرتی طور پر حاصل تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ

مفاسد کے چھوٹے چھوٹے؛ بلکہ حقیر رخنوں پر بھی نظر رکھتے اور اجتماعی و انفرادی زندگی میں جن گوشوں میں سے بھی برائیوں کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہوتا فوری طور ان کو بند کیا جاتا، چناں چہ ایک شخص کو صرف اس وجہ سے پیٹا گیا کہ:

''وہ اکڑ اکڑ کر چلتا، عمرؓ نے تنبیہ کی تو بولا کہ میں اپنی طبعی رفتار کو بدلنے پر قادر نہیں، دوبارہ مارا، لیکن رفتار وہی رہی، پھر پیٹا گیا تو رفتار بدل چکی تھی اور دعا دیتے ہوئے بولا کہ: ''امیر المومنین خدا تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے شیطان سے پیچھا چھڑا دیا''۔

لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو دیکھا جو بیش قیمت لباس پہنے ہوئے بہت اکڑ اکڑ کر چل رہی تھی، دریافت کرنے پر بتایا کہ یہ باندی ہے، عمرؓ نے فوراً ہی درّے سے مارا اور کہا کہ:

''شریف اور بڑے گھر کی عورتوں سے مشابہت پیدا کرنے کے لئے اکڑ کر چلتی ہے۔''

ایک آدمی صوفیانہ انداز میں چلا جا رہا ہے، پیچھے سے عمر کا سر پر درّہ پڑا اور اس کے ساتھ ایک گرجدار آواز کہ:

''سر اٹھا کر چلو، زہد و اتقا اس کا نام نہیں۔''

امیر المومنین کی زندگی کے ان چند واقعات اور مثالوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی دور بیں نظر اور مومنانہ فراست کے حدود اور بال و پر کس قدر وسیع اور کتنے مضبوط تھے، چھوٹی سی چھوٹی اور حقیر سے حقیر چیز پر ان کی نظر تھی، مفاسد کے تعفن انگیز پھوڑوں اور زخموں پر نظر رکھنا اور پھر ان کا کامیاب و مؤثر مداوا کرنا صرف عمر ہی کی خصوصیت ہے۔

خشک مزاج فاروق رضی اللہ عنہ

مؤرخین کا قلم فاروق رضی اللہ عنہ کا سراپا کچھ اس طرح تیار کرتا ہے کہ وہ بہت خشک مزاج، تشدد پسند اور سخت گیر قسم کے آدمی تھے، جن کی طبیعت میں لچک نہیں تھی

اور انتہا پسندی کے خاردار تاران کے حدودِ اربعہ پر کھینچے ہوئے تھے۔ اس قلم کاری اور تصویر کشی میں یورپ کے متعصب مؤرخین کے ساتھ اسلام کے حلقے میں وہ ناواقف بھی شریک ہو گئے، جن کو فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت وانصاف پسندی ایک آنکھ نہیں بھاتی، چاہتے ہیں کہ زبردستی، بلکہ خواہ مخواہ فاروق اعظمؓ کی شخصیت کو کسی نہ کسی عیب اور کسی نہ کسی برائی کے ساتھ ملوث کر کے چھوڑیں۔ خدا جانے دیوانوں کی یہ جماعت تاریخ کی ان موافق شہادتوں کو جن سے ان کے مزعومات وباطل دعاوی کی تردید ہو رہی ہے، تاریخ کے صفحات سے کھرچ کر پھینکنے کی کیا صورت سمجھے وسوچے بیٹھی ہے۔ صاف بات ہے اور بہت بے غبار حقیقت کہ جب تک تاریخ کے صفحات ان حقائق سے مزین وآراستہ ہیں اس وقت تک فاروق اعظم امیر المومنین کے سراپا کو بگاڑنے والے اس جدوجہد میں اپنی ہی شخصیت اور زندگی کے خدوخال بگاڑتے رہیں گے، لیکن مقالہ نگار کی یہ معروضات بھی بے انصافوں کے ہنگاموں اور شوروغل میں صدا بصحرا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ع

"مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر"

اس لیے بہتر یہی ہے کہ مؤرخین کی تعریضات کے اس سلسلے کو چھوڑ کر جو یقیناً بے اثر اور غیر مفید ہی ہے، ابن خطاب رضی اللہ عنہ کی سیرت سے چند وہ گوہر پارے سامنے لائے جائیں جن سے انفرادی واجتماعی زندگی کے جھمیلوں میں معلوم ہوگا کہ اسلام کا یہ غیور فرزند کس درجہ شاداب مزاج اور تروتازہ طبیعت کا مالک تھا، مصنف نے لکھا ہے کہ:

حضرت عمرؓ شعروادب سے بھی کافی ذوق رکھتے۔ ایک رات مکہ کی طرف جانے والے قافلہ میں شعر پڑھنے کی آواز آئی تو عمر بھی اپنی اونٹنی دوڑاتے ہوئے وہاں جا پہنچے، کچھ دیر صبح تک شعر سنتے رہے، رات کا آخری حصہ تھا، جلد ہی اذان ہو گئی اور آپ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے آئے۔ اسی طرح امیر المومنین عمرؓ کے ڈھلے ہوئے اور شگفتہ شعروشاعری کے ذوق کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"کبھی کبھی اشعار لہک لہک کر پڑھتے تا آنکہ صبح ہو جاتی"۔

سچ ہے کہ عسکری مزاج فاروق روز و شب کی مسلسل اور ان تھک محنتوں اور مشغولیتوں کے بعد ایسے دل کش و دل فریب مشاغل سے لطف اندوز ہونے کے بہت زیادہ ضرورت مند بھی تھے، تاہم کم از کم ان واقعات سے اس قدر تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی پر خشک پسندی و خشونت آمیزی کا الزام غلط ہے۔ یہی تو عمرؓ کی انفرادی زندگی تھی؛ لیکن اجتماعی زندگی کے خاص اس رخ کو مکدر کرنے والے کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ کچھ نہیں پا سکیں گے۔

ابو عبیدہ نے لکھا ہے کہ ''انطاکیہ'' میں مسلمان فوجوں کو زیادہ دنوں تک ٹھہرنے نہ دیا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شاداب علاقے کے دل فریب مناظر اور خوشگوار آب و ہوا، رعنائی و دل کشی فوجوں میں تعطل اور سستی پیدا کر دے، اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو مسلمانوں کا عسکری نظام ٹوٹ جائے گا اور جنگی مہمات پر مسلمان بری طرح پٹ جائیں گے۔ حضرت عمرؓ نے اسی سفارش پر جو کچھ تحریر فرمایا سنانے کی صرف وہی چیز ہے، لکھا تھا کہ:

''خداوند تعالیٰ نے متقین اور اعمالِ صالحہ کرنے والے مومنین پر اپنی نعمتیں حرام نہیں کیں۔ چناں چہ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾

یہ ہیں وہ عمر جن کو مؤرخ کی قلم کاری ایک سخت گیر متشدد اور تارک الدنیا ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں بڑا توسع تھا اور وہ ہمہ گیر مزاج کے مالک تھے، ہاں اتنا ضرور تھا کہ ''بیت المال'' کے اموال میں تصرف ذرا بھی جائز نہیں رکھتے تھے، اپنے ذاتی اندوختہ سے بڑی فراغت کے ساتھ اپنی ذات پر، احباب پر اور اہل و عیال پر خرچ کرتے۔ چناں چہ حضرت حذیفہ ابن الیمانؓ کا بیان ہے کہ ایک روز میں عمرؓ کے پاس سے گزرا تو انہوں نے مجھے کھانے پر بلایا، میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے عمدہ روٹی اور بہترین روغن زیتون ہے۔ میں نے عرض کیا کہ

امیر المومنین آپ دنیا کو تو اس کے کھانے سے منع کرتے ہیں اور خود کھا رہے ہیں، جواباً فرمایا کہ:

''حذیفہ! یہ میرا مال ہے اور جس سے منع کرتا ہوں وہ مسلمین کے اموال ہیں''۔

بات اصل میں وہی ہے کہ سمجھانے والے حضرت عمرؓ کی اسی احتیاط پسندی کو تشدد پسندی اور مصنوعی زہد کا نام دے کر ہر برے عنوان سے سمجھا رہے ہیں، ان ستم ظریفیوں پر اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''

تیر اندازی اور شہسواری

عمرؓ کی مشہور بلکہ شہرۂ آفاق شجاعت و بہادری، غیر معمولی قوتِ جسم، جس کے واقعات عوام کی زبانوں پر بھی سنے جاتے ہیں، یہ ان کی وہی جلادت اور قوت ہے جس سے اسلام کو بھی بہت بڑا فائدہ پہنچا۔

مصنف نے اس سلسلے میں یہ بھی ایک عجیب و دلچسپ روایت سنائی ہے کہ عمرؓ چاہتے تھے کہ مسلمان بچوں کو بھی پہلے دن سے بہادری اور شجاعت کے سبق پڑھائے جائیں؛ تا کہ تانا شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے بجائے امت میں ہر وقت خالدؓ و ابو عبیدہؓ، عمرو ابن عاصؓ جیسے مشہور اور مبارک جرنیل پیدا ہوتے رہیں اور ایک کھیپ کے بعد دوسری کھیپ سامنے آ کر جانے والوں کی جگہ لیتی رہے؛ چناں چہ لکھا ہے کہ:

''حضرت عمرؓ کو اصرار تھا کہ مسلمان بچوں کو شہسواری، تیر اندازی کی تعلیم مکمل طور پر دی جائی۔''

اگر پچھلے اسی زرّیں اصول پر عمل کرتے تو مسلمانوں کی تاریخ میں واجد علی شاہ اور محمد شاہ کے ایسے قصوں کے بجائے جن میں نسوانیت کے شرمناک اور عبرت انگیز واقعات بکثرت آتے ہیں؛ ہمت و بے باکی، شجاعت و بہادری کے انمٹ تذکرے نظر آتے۔ واجد علی شاہ کی لطف اندوزیاں اودھ کی حکومت کا تختہ نہ الٹتیں اور مغلیہ خانوادہ

کی عیش سامانیاں مسلمانوں کو بے تخت وتاج نہ بنا تیں، ایک طرف دوسری قومیں فتح وسربلندی کی طرف بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کی خصوصیات ان کی بداعمالیوں کے سبب دوسری قوموں کا طرۂ امتیاز بن رہی ہیں۔ اس پر کیا کہا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

بہرحال یہ تھا وہ عمر جو اسلام کا غیور فرزند ہے، اسلام کے انقلاب آفریں دور کا سنگ میل ہے، جس کا وجود اسلام اور مسلمانوں کے لیے حصنِ حصین تھا اور جس کی وفات نے ایک مثالی حکومت، ایک انصاف پسند خلافت اور ایک بیدار مغز سیادت کا دور ختم کردیا۔
بلاشبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عمرؓ کی موت پر بالکل صحیح کہا تھا کہ:

"إن موت عمر ثلمة في الإسلام لا ترتق إلى يوم القيامة."

***

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

صبحِ ازل سے شامِ حشر تک ـــ نہ جانے افق کائنات پر علم وکمال، دانش وبینش، عبقریت ونابغیت کے کتنے آفتاب وقمر طلوع ہوئے اور ہوں گے۔ زمین بیشماران ہستیوں کو اپنے بطن میں امانت کے طور پر لیے ہوئے ہے، جن کے مقدس وجود خود اس زمین پر کائنات کا اجالا، دنیا کی روشنی، چمنستان کی بادِ نسیم اور گلشن کے برگہائے گل تھے۔

نانوتہ کیا ہے! نہ کوئی تاریخی بستی، نہ کوئی نام آور شہر، نہ سیاحت گاہ عالم، نہ دامن کش قلوب؛ مگر خدائے تعالیٰ کی غیر محدود رحمتوں کو کون ہے کہ جو کسی خاص قوم، کسی علاقہ، کسی بستی، کسی خاندان تک محدود کرے، جب لطیف وقدیر ہستی ہندوستان میں امتِ مرحومہ کی زبوں حالی ونکبت، تنزلی اور پستی کی تحریر کلک تقدیر سے لکھ چکی تو اسی مقتدر وتوانا کی مشیت نے مریض امت کے لیے ایک ایسے طبیب کا بھی وجود مقدر کیا، جس کی تدبیر، جس کا علم، جس کا فضل اور جس کا کمال اس امت کیلئے نسخۂ شفا ہو، عمارت کو گرانے کا فیصلہ ہوا تو خلاقِ عالم نے ایک ایسا معمار بھی تجویز کیا جو تیرہویں صدی کے اوائل اور بارہویں صدی کے اختتام پر مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار ہو۔ اگر ''دہلی'' اجڑے تو معمورۂ ''دیوبند'' اس کے انفاسِ قدسیہ سے ایک تازہ رونق پائے۔ اگر دنیوی سلطنت لٹے تو علم ودانش کی ایک نئی حکمرانی وجود میں آئے۔ اے خدائے لم یزل ولایزال! تیرے بے نہایت افضال کا شکر کہ تو نے بربادی میں آبادی، تخریب میں تعمیر، موت میں حیات، اجڑنے میں بسنے کے انتظامات کیے۔ حضرت نانوتویؒ ازہر الہند دار العلوم

دیو بند کے بانی نہیں؛ بلکہ فکر کے امام ہیں۔ وہ صرف ایک عالم نہیں؛ بلکہ جنودِ ربانیہ کے سپہ سالار ہیں۔ وہ ایک فرد نہیں؛ بلکہ وقت کی امت ہیں۔ انہوں نے دارالعلوم قائم کر کے پچھلوں کو وہ متاعِ بے بہا عنایت فرمائی، جس کے بارِ احسان سے اخلاف کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

وہ کیا تھے؟ داعی الی اللہ، مبلغ اسلام، متکلم دین، حکیم الاسلام، محدث ومفسر، فقیہ ومناظر، عالم باعمل، درویش صفا کوش، فقیر خرقہ پوش، اسرارِ شریعت کے ایسے بحر ناپیدا کنار، جس نے عقائدِ اسلام میں پیدا کردہ رخنوں کی درستگی میں اپنی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ صرف کیا۔ آپ کے علوم کتابی نہیں، بلکہ کمالات وہبی ہیں، پھران معارف کو ایسی زبان سے ادا کیا جس کی کاٹ شمشیر براں سے تیز ہے۔ خود مولانا نانوتویؒ کے شیخ عارف باللہ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ موصوف کے متعلق فرماتے تھے کہ ”مولانا قاسمؒ کی نظیر اسلام کے شاندار ماضی ہی میں مل سکتی ہے۔“

مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ تحصیل علوم ہی میں ایک دوسرے کے رفیق نہیں، بلکہ سلوک وتصوف میں بھی ایک دوسرے کے رفیق سفر ہیں۔ ان دونوں کے شیخ مہاجر مکیؒ اپنے دونوں مریدانِ باصفا کے متعلق ”ضیاء القلوب“ نامی تصنیف کے آخر میں رقم طراز ہیں کہ ”انقلاب کا یہ رنگ بھی قابل دید ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے بیعت کی، حالاں کہ مجھے ان سے مرید ہونا چاہیے تھا۔“ مہاجر مکیؒ کا یہ ارشاد ان کی فطری تواضع کا آئینہ دار ہے، ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ کے علوم وکمالات ان کے مرشد کامل کے کمالات کا عکس وظہور ہیں۔ تاہم مرشدِ کامل کا یہ ارشاد دونوں باصفا ارادت مند حضرات کے علمی وعملی کمالات کا ایک پاکیزہ اعتراف ہے۔

امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ان دونوں حضرات کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، اس طرز کی ہستیاں ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ مبدأ فیاض کبھی کبھی ابر نیساں سے ان

قطرات کی بارش کرتا ہے جوانسانی صدف میں سب سے قیمتی موتی بنتے ہیں، ان دونوں اکابر کے تعارف میں یہ مختصر تفصیل اس وجہ سے ضروری تھی کہ شاہ صاحب نے صحیح امام بخاری، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور ہدایہ آخرین حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھیں۔ موصوف مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ کے علوم ومعارف کے سب سے بڑے ترجمان اور وارث تھے۔ یہ ہے وہ پرانوار وسنہری کڑی جو مولانا کشمیری کو ان دونوں سے جوڑتی ہے۔

***

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ

حضرت موصوف نے دہلی میں تعلیم پوری کی اور سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی۔ بدعات و محدثات کے خلاف جہدِ مسلسل میں صلابت کا یہ عالم تھا کہ اپنے مرشد کامل کے بعض افکار سے متصادم رہے۔ چشتی سلوک کے امام اور اہل اللہ کے حلقوں میں قطب و عالم ربانی کے القاب سے شہرت رکھتے ہیں۔ بدعات محدثات کی بیخ کنی میں تن تنہا وہ کام کر دکھایا جو علماء حق کی ایک مجلس اور انجمن ہی کر سکتی ہے۔ آج دیو بند کے مزاج میں سنت کا غلبہ، بدعات سے نفرت، اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ وافر اور دین حق کے قیام کے لیے سرگرمی بلاشبہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی وراثت ہے اور بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو بھی منہاج قویم پر کھینچنے والے موصوف ہیں۔ گنگوہ کی خانقاہ میں تزکیہ و تصوف کی تعلیم کے ساتھ درس حدیث بھی مسلسل شغل رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا خلیل احمد صاحبؒ، مولانا صدیق احمد صاحبؒ انبیٹھوی، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائپوری، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور اُن کے برادر اکبر حضرت کی خانقاہ سے طلوع کرنے والے آفتابِ ہدایت ہیں۔ آخر عمر میں زہریلے جانور کے کاٹنے کی وجہ سے شہادت کے عالی مقام پر رسائی ہوئی۔ پسماندگان میں حکیم مسعود صاحب نامی گرامی طبیب اور بڑے طنطنہ کے صاحبزادے تھے۔ آپ کا مفصل تذکرہ مؤلفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ "تذکرۃ الرشید" کے نام سے بار بار شائع ہوا ہے۔

***

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ صاحب

حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتویؒ کے فاضل روزگار تلمیذ، ملا محمود دیوبندی کے ابتدائی شاگرد، دارالعلوم دیوبند کے صدر نشیں اور تحریک استخلاصِ وطن کے امام، وطن مالوف دیوبند، عثمانی خاندان کے گلشن سدا بہار، فطری ذکی و ذہین، ستارۂ بلندی ان کے فلک سر پر ضوفگن، حضرت نانوتویؒ ایسا آفتابِ کمال استاذ میسر آیا تو اس چشمۂ نور سے انوار علم وولایت کے وہ ذخیرے اخذ کئے جن کی مثال ممکن نہیں۔ مولانا نانوتویؒ کے ایسے جاں نثار فداکار شاگرد کہ استاذی وشاگردی کی تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ حضرت نانوتویؒ ہی کیا، ان کے اعزاء واقارب کی خدمت بھی اس فدائیت سے انجام دی جوان کی خاص سعادتوں سے تعلق رکھتی ہے، فراغت کے ساتھ دارالعلوم میں معین مدرس بنادیے گئے، ابتدائی کتابیں زیر درس رہیں، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ آپ کے اسی دور کے شاگرد ہیں۔ بتدریج دارالعلوم کے عہدۂ صدارت پر پہنچے تو اپنے علمی وعملی کمالات سے اس عہدۂ جلیل کو وہ زینت بخشی کہ ہند وپاکستان کی دینی درسگاہیں اس اجاگر تاریخ سے خالی ہیں، حضرت مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ حلقۂ تلامذہ سے علم وعمل کے آفتاب وقمر اٹھے۔ صاحبِ سوانح حضرت شاہ صاحب کے علاوہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا کفایت اللہ صاحبؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا فخر الدینؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ وغیرہ آپ کے وہ تلامذہ ہیں جو آپ کے کمالاتِ علمی وعملی کا تعارف ہیں۔ حریتِ وطن کی تڑپ اپنے استاذ اکبر سے لی اور پھر یہ امین ووارث جہدِ آزادی کا خود علمبردار بن گیا، آپ سے متعلق تفصیلی تذکرے منظر عام پر آچکے ہیں، اس لیے ہیچ پوچ قلم اسی مختصر پر اکتفا کرتا ہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے فرزند، دارالعلوم سے فارغ اور اسی ادارہ کے صدر مہتمم، چوڑا چکلا جسم، رنگ سرخ سفید، گھنی ڈاڑھی، وجاہت ان کی قدم لیتی، دماغ کے بادشاہ، دل کے فقیر، ناز کی گود میں پلے ہوئے، جن کے لیے خدام کی نیاز مندیاں دست بستہ حاضر رہتیں، بھولے اس قدر کہ سکوں میں بھی فرق نہ کر پاتے۔ کف دست پر رکھ کر دریافت فرماتے یہ کون سا سکہ ہے۔ حدتِ مزاج اس قدر کہ بڑوں کے پتے ان کے سامنے آتے ہوئے پانی ہوتے، لباس فاخرہ، انتہائی نفاست پسند، پلنگ پر سفید چادر بار بار بدلی جاتی، ریاستِ حیدرآباد میں بعہدۂ صدر قاضی منتخب ہوئے، اس زمانے میں چودہ سو روپیہ مشاہرہ تھا جو آج کے دس ہزار کے مساوی ہیں۔ دیوبند سے حیدرآباد کا سفر ہوتا تو اعلیٰ درجہ کی سیٹ ریزرو کرائی جاتی، قرآن اور مسجد کے احترام میں منفرد تھے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا فرمائی، نوافل سے فراغت پر گھر تشریف لے چلے تو ایک طالب علم کو مسجد میں لیٹے ہوئے دیکھا جس کے پاؤں بجانب قبلہ تھے، حافظ صاحب نے وہیں دستی تنبیہ فرمائی اور معاً امدادِ طعام بھی مدرسہ سے بند کر دی گئی۔ اس وقت دارالعلوم کا کاروبار وسیع نہیں تھا۔ ادھر بندشِ طعام کا حکم جاری ہوتا ادھر اس کے اثرات سامنے آجاتے، دوروز کے بعد کسی ضرورت سے حافظ صاحب گشت کے لیے نکلے تو یہ طالب عالم اپنے کمرے میں چھپا ہوا درخت کے پتے کھا رہا تھا، دریافت کرنے پر بتایا کہ حضرت نے امداد بند فرمادی، مرحوم پر گریہ طاری ہوگیا اور بہت دیر تک خود اور وہ

طالب علم مصروفِ بکاء رہے۔ طالبِ علم کی خوش قسمتی کہ اسی وقت آستانۂ عالی سے کھانا جاری ہوا۔ اگر کسی طالب کی وفات ہوتی تو اس کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر تعزیت لیتے اور جب تک اس کی تکفین وتدفین نہ ہوجاتی گھر واپس تشریف نہ لاتے، گویا کہ طلبہ کے ساتھ اولاد کا سا معاملہ تھا۔ گفتگو بہ لہجہ تجوید وقرأت ہوتی، حیدرآباد دکن سے دیوبند تشریف لاتے تھے کہ ریل ہی میں وفات پائی۔ نظامِ حیدرآباد کی خصوصی فرمائش پر جسدِ خاکی حیدرآباد واپس لے جایا گیا اور خطہ صالحین میں دفن ہوئے۔ عمر مبارک غالباً ستر پچھتر کے درمیان تھی۔

اللّٰھم برّد مضجعہ و نوّر مرقدہ

* * *

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

خانوادۂ عثمانی کے چشم و چراغ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے چھوٹے بھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے برادر اکبر، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خادم خاص، الحاج حضرت عابد حسین صاحب قدس سرہٗ العزیز کے عہد میں دیوبند کا ہنگامہ شروع ہوا تو ایک مہتمم کی ضرورت پیش آئی، حضرت گنگوہیؒ اس دور میں دارالعلوم کے سرپرست تھے۔ نیابتِ اہتمام کے لیے مولانا عثمانی ہی کا انتخاب فرمایا۔ منحنی جسم تان بان؛ بلکہ مرزا پھویا تھے، لوگوں کو اس انتخاب پر حیرت ہوئی۔ حضرت گنگوہی سے عرض کیا، فرمایا کہ ہمارے اس تنکے کو لے جاؤ، یہ امنڈنے والے سیلاب کو روکے گا۔

''قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید''

وہ آئے اور دیوبند کے جزء و کل پر چھا گئے، سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی، تدبر کا سرمایہ جیب میں رکھتے، دماغ فراست سے لبریز تھا اور قلب شجاعت سے معمور، خود فرماتے کہ دشمن کو مارنا کوئی کمال نہیں؛ بلکہ سینے پر دودھ کا پیالہ رکھ کر سانپ کو پلانا چاہیے، ان کی زعفرانی چائے مشہور تھی، جو ایک فنجان پی لیتا عمر بھر کے لیے حلقہ بگوش بن جاتا۔ صبح و شام پورے دارالعلوم میں گشت فرماتے، ہر دفتر میں پہنچتے اور ہر درسگاہ میں، ہاتھ میں تسبیح جس کے دانے مسلسل گشت کرتے، آنکھوں پر چشمہ جو ناک کے آخری حصہ پر پڑاؤ کرتا، چشمے کے عقب سے جب نظریں اٹھاتے تو طلبہ ہوں یا اساتذہ، دشمن ہوں یا دوست، وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ انتظامی صلاحیت ایسی کہ جاروب کش اگر کہیں اپنے فرائض میں کوتاہی کرتا تو ہاتھ میں موجود بید سے اس کی مرمت ہوتی

اور اہتمام میں پہنچ کر اس کو تین روز کا کھانا مل جاتا، مولانا اعزاز علی صاحب کا بیان ہے کہ پٹنے والا جاروب کش بصورتِ تاخیر دریافت کرتا کہ مہتمم صاحب کب بید لگائیں گے اور کب مجھے کھانا ملے گا۔ مردم سازی کا جوہر نایاب رکھتے، علامہ کشمیریؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ انہیں کے عہد کے تیار آفتاب وقمر ہیں، کسی کو تصنیف وتالیف میں لگاتے، کسی سے حاشیہ لکھنے کا کام لیتے، کوئی اردو شرح کر رہا ہے، تو کوئی کسی مشہور کتاب کے ترجمہ پر مامور ہے۔ قیام دار العلوم کے اہتمام میں مستقل رہتا، طلبہ کی مجال نہیں تھی کہ دفتر اہتمام کے قریب پہنچ جائیں۔ تاجور نجیب آبادی جو پنجاب میں بابائے اردو تھے، دار العلوم سے فارغ ہو کر لاہور پہنچے تو وہاں ادیبوں کے پیشوا بن گئے۔ ایک بار کسی واقف کار نے دیوبند کا تذکرہ کیا، بولے کہ آج تک دل ودماغ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے خوف سے لبریز ہیں، اب بھی اگر کبھی کھڑاؤں پہنتا ہوں تو اس تصور میں کہ دار العلوم میں ہوں اور یہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی رہائش گاہ ہے چاپ نکلنے نہیں دیتا۔ حضرت شاہ صاحب کے عہد کا ہنگامہ مولانا عثمانی کے دور میں ہوا تھا، سقوط اشتہاء اس قدر کہ چند لقمے بھی نہ اٹھاتے، صرف چائے پر گزر ہوتا۔ مقبرۂ قاسمی میں دفن ہیں اور قبر عام طور پر معلوم نہیں ہوتی اس بے نشانی پر یہ شعر کس قدر برجستہ ہے۔

جن کے محلوں میں ہزاروں قسم کے فانوس تھے
جھاڑ ان کی قبر پر ہیں اور نشاں کچھ بھی نہیں

"اشاعتِ اسلام" کے مصنف اور بعض عربی دواوین پر ان کے ادیبانہ حاشیے علمی یادگار ہیں، صرف ایک بیوہ سے شادی کی، اُن کی وفات کے بعد پھر تاہلی زندگی سے آزاد رہے۔ زندہ تھے تو فخر الہند کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے، ختم ہوئے تو ان کا کوئی تذکرہ بھی باقی نہ رہا؛ حالاں کہ وہ علماء کے مربی، طلبہ کے راہنما اور کاروانِ علم کے قافلہ سالار تھے۔

***

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ

مرحوم دیو بند کے مشہور علمی خاندان کے چشم و چراغ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے بڑے بھائی، دار العلوم دیو بند کے مفتی اعظم، زہد و تقویٰ، دین ودانش، علم وفضل، سادگی و معصومیت کے پیکر زیبا، خدائے تعالیٰ نے کمالاتِ باطنی سے اس فیاضی کے ساتھ سرفراز فرمایا کہ ''قطب العالم'' کے معزز لقب سے شہرت ہوئی اور خدمتِ خلق کا وہ جذبۂ وافر لے کر چلے کہ محلّہ کی عورتوں کا باقاعدہ بازار سے سودا سلف لاتے۔ دار العلوم سے رخصت ملتی تو تمام دوپہر اس مشغلہ میں صرف ہوتا کہ گھر گھر پہنچتے اور بازار سے لانے والے سامان کی فہرست معلوم کرتے، سودا لاتے تو عورتیں کہتیں کہ مفتی صاحب ہم نے تو زردہ کا رنگ منگایا تھا آپ زرد رنگ لے آئے، پھر اسے واپس کرنے بازار جاتے، اسی آمد و رفت میں دار العلوم کا دوسرا وقت شروع ہو جاتا، اگر کوئی تعویذ مانگتا تو خود اس کے گھر دے آتے اور پھر دریافت کرنے جاتے کہ مریض کا کیا حال ہے۔ ''دل بدست آور کہ حج اکبر ست'' پر اس قوت سے عامل تھے کہ دیو بند سے قریب ایک گاؤں کے غریب مسلمانوں نے حضرت مفتی صاحب کو مدعو کیا، اپنے چند تلامذہ لے کر پہنچے، چائے پیش کی گئی، آج سے ساٹھ سال پرانا شیرہ ڈالا گیا، یہ سر کے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ مشروب مٹی کے پیالے میں لبالب، نو وارد مہمانوں کے سامنے پیش ہوا، نوجوان تلامذہ ایک ایک گھونٹ پی کر رک گئے، لیکن مفتی صاحب ہر جرعہ پر ''الحمد للہ'' ''جزاک اللہ'' بھائی کیا بہترین چائے بنائی ہے، ایسی چائے تو آج تک پی نہیں تھی، کہتے جاتے اور غٹا غٹ پیتے۔ دیہاتی پھولے نہ سمائے اور مفتی صاحب کی اس

داد سے یقین کر بیٹھے کہ چائے نہیں بلکہ خدا کے اس مقدس بندے کو کوثر و تسنیم پلا دی ہے۔
سبق میں تقریر بے حد مختصر، بلکہ نہ ہونے کے درجہ میں ہوتی۔ ایک شاگرد کا بیان ہے کہ
مفتی صاحب کے یہاں جلالین شریف کا سبق ہوتا، اگر طالب علم کوئی بات پوچھتا تو
قاری ان سے کہتے ''حاشیہ پڑھو، حاشیہ پڑھو'' حاشیہ سے بھی گتھی نہ کھلتی تو ''جمل و صاوی''
جلالین کی شرح سنوا دی جاتی۔ انہیں صاحب کا بیان ہے کہ اس اندازِ سبق سے العیاذ باللہ
مجھے تو یقین آ گیا کہ مفتی صاحب کورے ہیں، اپنا یہ تأثر حضرت شاہ صاحب کو جا سنایا اور
انہیں الفاظ میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا ''کہ ہاں ہاں! ایسا نہ کہنا، مفتی صاحب کے
سامنے تو بیٹھ جانا ہی برکت ہے''۔ لیکن طلبہ کا گروہ طالب علمی میں برکت کا کہاں قائل،
جماعت نے تجویز کی کہ ''مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ'' والی آیت پر مفتی صاحب کو گھیرا جائے۔
طلبہ نے دریافت کیا حسبِ دستور مفتی صاحب حاشیہ وغیرہ سنوانے لگے، طلبہ کا انداز آج
اور تھا، عاجز ہو کر حضرت مفتی صاحب نے تقریر فرمائی، یہ تقریر کیا تھی، ان وہبی علوم کی
ایک مسلسل لڑی جنہیں دریافت کرنے سے رازی کا دماغ عاجز اور جن کے سراغ میں
زمخشری ماندہ، اس روز معلوم ہوا کہ اہل اللہ اپنے باطنی کمالات چھپاتے ہیں۔ مفتی
صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے کمالاتِ علمی کو بھی چھپا رکھا ہے۔ ان
علوم و معارف کے باوصف حضرت شاہ صاحب کی علالت کے دوران چند ماہ کے لیے
ڈابھیل بخاری شریف پڑھانے تشریف لے گئے تو پہلے روز کے سبق میں فرمایا کہ
''بھائی! اللہ تعالیٰ مجھے محدثین کے طبقہ میں اٹھانا چاہتے ہیں، ورنہ شاہ صاحبؒ کی زندگی
میں حدیث پڑھانے کا کسے حق ہے، اللہ اکبر یہ کسر نفسی۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب
کے خسر مولانا محمود صاحب رامپوری کا بیان ہے کہ بزمانہ طالب علمی مفتی صاحب کی
مسجد میں رہتا، دیکھا کہ مفتی صاحب کا قیام مسجد کے ایک حجرہ میں ہے اور آپ ہمیشہ
پاؤں کو پیٹ سے ملا کر سوتے ہیں، کبھی پاؤں دراز نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ
''حضرت پاؤں لمبے کر کے سویا کیجیے۔'' فرمایا کہ ''میاں محمود! دنیا آرام کی جگہ نہیں ہے،''

پاؤں پھیلا کر تو قبر میں سوئیں گے۔" مولانا عبداللہ صاحب سجادہ نشیں خانقاہ کندیاں مغربی پاکستان جو حضرت مفتی صاحب کے شاگرد ہونے کے علاوہ آپ سے بیعت تھے، سرہند تشریف لائے تو راقم الحروف بھی آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا، دورانِ گفتگو مفتی صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا "میاں وہ تو ایک نعش تھی جو زمین پر چل رہی تھی" مطلب یہ تھا کہ مفتی صاحب فنائیت کے ایسے مقام رفیع پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں ایک چلتی ہوئی نعش قرار دیا جا سکتا تھا۔ سادگی کا یہ عالم کہ دارالعلوم دیوبند کی تحریک میں مولانا احمد رضا بجنوری مفتی صاحب کی مسجد میں رہتے، بعض مصالح کی بنا پر انہوں نے عارضی طور پر تحریک سے جدا ہو کر دارالعلوم میں دورۂ حدیث پڑھ لیا، بلکہ اس زمانہ میں مفتی صاحب سے بھی نیاز حاصل نہ کیا، تعلیم سے فارغ ہونے پر مفتی صاحب کے یہاں حاضری دی تو طویل غیبت کی بنا پر حضرت کا یہ خیال تھا کہ مولوی احمد رضا دیوبند میں نہیں ہیں، حاضر ہوئے تو حیرت سے دریافت کیا کہ مولوی احمد رضا تم دیوبند میں تھے؟ عرض کیا کہ جی ہاں حضرت، کیا دورہ بھی تم نے یہیں پڑھ لیا، "جی ہاں، ارشاد ہوا کہ "گویا کہ دل سے تم ہمارے ساتھ تھے۔" عرض کیا گیا بیشک۔ یہ تھی حضرت مفتی صاحب کی ساری سیاست، نقشبندیہ سلسلہ میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دارالعلوم سے مجاز تھے۔ دیوبند میں وفات ہوئی اور گورستان قاسمی میں گنجینۂ علم و عمل مدفون ہے۔ مزار پُرانوار پر آج بھی آثارِ ولایت درخشاں و آفتابِ رحمت ضوفشاں ہے۔

***

چودہویں صدی کے مجدّد
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

کہنے والے نے کہا تھا اور سچ ہی کہا، پندرہ سو سال پہلے کہا تھا اور کسی سازگار ماحول یا موافق فضا میں نہیں، بلکہ گرد و پیش گھٹا گھٹا، ذرّہ ذرّہ مخالف، گھر گھر دشمنی، فرد فرد آمادۂ مخالفت، قبائل برسرِ پیکار، خاندان معاند، قریش کے جیالے جان لینے پر تیار اور سب کا متفقہ فیصلہ یہ:

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: نہ سنو قرآن کو اور پڑھنے کے وقت غل غپاڑہ کرو شاید یہ تدبیر تمہیں غالب کر دے۔ اسی تاریک تر ماحول میں دبے بھینچے انداز میں نہیں، بلکہ کھلے اور اعلانیہ انداز میں سنانے والے نے سنایا۔ کیا سنایا؟ ایک پیغام سرمدی، کس کا پیغام؟ اسی کا جس کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی؛ چوں کہ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

ورنہ تو سورۂ کہف میں ہے کہ ایک دشمنِ خرد و ہوش نے جب اپنا سرسبز و شاداب باغ، شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی، کیاریاں پھول پھلواری سے لبریز، آب رسانی کے انتظامات، درخت قطار اندر قطار دیکھ کر نشۂ مال میں مستانہ نعرہ لگایا:

مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ: بولا مجھ کو نہیں آتا خیال یہ سب کچھ دیکھ کر، کہ خراب ہو یہ باغ کبھی۔

پھر ہوا کیا؟ یہ ہوا:

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى

عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

ترجمہ: اور سمیٹ لیا اس کا سارا پھل، پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو باغ میں لگایا تھا اور ڈھا پڑا تھا اپنی چھتوں پر اور کہنے لگا کیا خوب تھا کہ میں ساجھی نہ بناتا اپنے رب کا کسی کو۔

حالاں کہ اس تباہی اور بربادی سے پہلے اس کا خیالِ خام تھا کہ زمینی وآسمانی آفات اس کے باغ کو آنچ تک نہیں پہنچا سکتیں اور اگر کسی مصیبت نے بھول کر ادھر کا رخ کیا تو اپنے تمول کے طمانچوں سے یا پھر گروہی قوت سے پیچھے دھکیل دوں گا مگر جب جھنجوڑنے والے نے جھنجھوڑا تو

وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

ترجمہ: اور نہ کوئی اسکی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوا اور نہ ہوا وہ کہ بدلہ لے سکے۔

بلا شان وگمان تہلکہ خیز بربادیوں کے جب یہ مہیب منظر سامنے آتے ہیں تو منکر ہو یا مقر، مومن ہو یا کافر، ہر ایک کہہ اٹھتا ہے: هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ وہاں سب اختیار ہے اللہ سچے کا، اور رہا مومن تو کسی لمحہ اور کسی لحظہ بھی ہمہ جہت وسائل کے ہوتے ہوئے القھّار کی عظمت، طاقت وقوت سے اپنے دل ودماغ کو خالی نہیں کرتا، چناں چہ سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے بارے میں ارشاد ہے:

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اور ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں اور دیا تھا ہر چیز کا اسباب۔ زمینی طاقت کا یہ سرمایہ دار جس کو دینے والے نے اقتدار کے لیے مطلوب ہر چیز عطا کی تھی، یاجوج ماجوج کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مضبوط دیوار کی تیاری کے بعد بولا تو صرف یہ:

هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

ترجمہ: یہ ایک مہر ہے میرے رب کی، پھر جب آوے وہ وعدہ میرے رب کا گرادے اس کو ڈھا کر اور رہے وعدہ میرے رب کا سچا۔

حالاں کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ سر بہ فلک یہ دیوار، بلکہ سیسہ پلایا ہوا یہ حصار اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔ ارشاد ہے:

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

ترجمہ: پھر نہ سکیں کہ اس پر چڑھ آویں اور نہ سکیں اس میں سوراخ کرنا۔

کچھ سمجھے آپ؟ انسانی کوششوں پر اعتماد اور ایسا جو خود فراموشی سے خدا فراموشی کی طرف لے جائے، مومن سے تو بعید ہی ہے، رہ گیا منکر سو وہ اپنے وسائل واسباب کے بوتے پر زوال کا تصور نہیں کرتا، ٹھیک اسی وقت بطش شدید کا ایک جھٹکا اس کے تصورات کی کائنات کو درہم برہم کر دیتا ہے پھر کون ہے کہ اپنے کسی شاہکار پر اس پُراعتماد لہجے میں اعلان کرے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾

''ہم ہی نے اتارا اس قرآن کو اور ہم ہی حفاظت کرنے والے ہیں''

پندرہ سو سال کے طویل عرصے میں قرآن کے مضمون ومطالب۔ مقاصد ومعانی پر سفاکانہ حملوں کے ساتھ خود اس ''الذکر'' پر کیسی کیسی یورشیں ہوئیں، مگر یہ اسی آن بان کے ساتھ محفوظ ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ یہ عالم عالم اسباب ہے، خود قدیر وقادر نے اسباب اختیار کئے بلکہ ''لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾'' فرما کر اختیارِ اسباب کی راہ سمجھا دی تو اس دور میں جب کہ چھپائی کے یہ لگے بندھے اور ترقی پذیر اسباب نہ تھے، مگر حفاظت کی ذمہ داری لی جا چکی تھی، قرآن پر ایمان لانے والوں کو وہ بے نظیر حافظے عطا کئے کہ جوان، بچے، بوڑھے، مرد وعورت، پڑھے لکھے، اَن پڑھ، ادنیٰ اور اعلیٰ ہر صف، ہر حلقے میں حفاظ لاکھوں کی تعداد میں مہیا ہیں، حفاظت کے وعدے کے ایفاء کا یہ وہ مظاہرہ ہے جسے حریف بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اور چوں کہ قرآن دین کا سرچشمہ ومعدن ہے؛ اس لیے قرآنی حفاظت کے وعدے میں دین کی حفاظت کا بھی وعدہ نکل آیا، پھر اس پر بھی غور کیجیے کہ صرف قرآن نہیں اترا؛ بلکہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث کیا گیا اور ان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن ہی نہیں پہنچایا، بلکہ قرآنی نقشے کے مطابق افراد ورجال تیار کیے، اس سے معلوم ہوا کہ دین میں قانون کے ساتھ شخصیت بھی ایک مقام رکھتی ہے ''ما انا علیه واصحابی'' سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو مختصر یوں سمجھئے کہ دین نام ہے اتباعِ سنت بوساطت شخصیات کا، لہٰذا اسلام میں صرف قانون کو تھام لینا صحیح نہ ہوگا اور ایسے ہی ''نری شخصیت پرستی'' صحیح اسلام نہ ہوگا، جب اسلام مذکورہ بالا مجموعے کا نام ہوا تو ایمانیات پر گفتگو کرنے والا متکلم کہلائے گا، قرآن وحدیث سے احکام کا استنباط کرنے والے فقہاء ہوں گے، قرآن موضوع ہوگا تو مفسر کہلائیں گے، حدیث اور اس کے تمام گوشوں سے بحث ہوگی تو محدثین کا طائفہ سامنے آئے گا، صحیح نسبت احسانی کے حامل صوفیاء، دین پہنچانے والے تو مبلغ کہلائیں گے، دین سنانے والے واعظ، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جانبازی کرنے والے مجاہد، سرچشمہ دین سے بدعات ومحدثات کا غبار ہٹانے والے مجدد، یہ سب مل کر دین کی حفاظت کا کام کریں گے تو عالم اسباب میں خدا تعالیٰ کے اس وعدے کے ایفاء کا ظہور ہوگا جو ''نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ'' سے کیا گیا تھا۔

پس جس طرح جسم کی گاڑی کو اعضائے ظاہر وباطن مل کر کھینچ رہے ہیں، دین کے قافلے کی قیادت میں سب ہی کا اشتراک وحصہ ہے، پیش کردہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ تجدید دین، دین کا ایک اہم شعبہ ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہر صدی میں ایک اہم شخصیت اس ذمہ دارنہ منصب کے لیے پیدا کی جاتی رہے گی، چاروں خلفاء، ہر چہار فقہاء، عمر بن عبد العزیز خلیفہ راشد، سلسلہ تصوف کے مستند مکاتیبِ فکر کے چاروں سرخیل، ہندوستان میں مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ وغیرہ اسی مقدس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ کبھی تجدیدی شان کی جلوہ نمائی

فردِ واحد کے بجائے جماعت کی صورت میں ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ دین کے جس شعبے پر بدعات ومحدثات حملہ آور ہوں گے اور اس سے جس قدر ماحول ابتر ہوگا، تجدید اسی شعبے میں نمایاں ہوگی اور قربِ قیامت میں فتن چوں کہ کسی ایک ملک یا کسی ایک شعبے کے نہیں ہوں گے، بلکہ ایسے عالم گیر فتن پھوٹ پڑیں گے جس سے کل اسلام متاثر ہوگا، تو اوّلاً مہدی اور متصلاً عیسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت مجدد سامنے لایا جائے گا کہ جب تک بیماریاں معمولی ہوں تو معمولی طبیب وڈاکٹر کا معالجہ کام دے جاتا ہے، لیکن جاں گسل عوارض کی صورت میں اختصاصی معالج ہی درکار ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ مجدد کا کام سمٹتا اور پھیلتا رہتا ہے اور اسی لیے مجددین بھی فرقِ مراتب رکھتے ہیں، یہ بھی نہ بھولئے کہ کبھی مجدد کو اپنے مجدد ہونے کا علم تک نہیں ہوتا، بعد والے اس کے کارناموں کو دیکھ کر مجدد ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں؛ لیکن رہے نبی ورسول تو ان پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ وہ اپنی نبوت ورسالت سے لاعلم ہوں۔ اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ راقم السطور کے علم ویقین میں ''حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ'' بلاشبہ مجدد ہیں اور ابھی آپ مجھ سے سن لیں گے کہ خود حضرت کا اپنے بارے میں یہی خیال تھا، چناں چہ اپنے شہرۂ آفاق مجاز علامہ سیّد سلیمان ندوی سے ایسے ہی استفسار کے جواب میں فرمایا:

> ''خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن بہ مرتبہ ظن، یقین کی کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں، البتہ سلوک وتصوف میں بلاشبہ مجدد ہوں کہ اس شعبے کو میں نے ایسا نکھار دیا کہ سو سال تک بدعت وجہالت کا گرد وغبار اثر انداز نہ ہوگا''۔

جن سعید اشخاص کو حضرت کے ذوق وافتادِ طبع سے براہ راست واقفیت ہے، تصانیف وملفوظات کی وساطت سے آپ کی فطرت سلیم کا اندازہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت روایتی نہیں، بلکہ حقیقی کسر نفسی، نمائشی تواضع نہیں، بلکہ واقعی ہضم نفس کے پیکر

تھے، اپنے بارے میں بار بار فرماتے تھے۔

"میں بقسم کہتا ہوں کہ دنیا میں مجھے اپنے سے زیادہ کوئی ذلیل نظر نہیں آتا، بلکہ میں اپنے آپ کو ہر مسلمان سے فی الحال اور کافر سے فی المآل حقیر جانتا ہوں"۔

کیا ایسے متواضعانہ خیالات وافکار کے حامل سے ممکن ہے کہ وہ بلا وجہ اپنے لیے مجدد ہونے کا گمان رکھے؟ پھر اس کے ساتھ اسے بھی ملائیے کہ حضرت والا کے ہی عہد میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد ہیں، سیاسی ذوق میں دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے، لیکن الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر میں ہے کہ حضرت مدنیؒ سے سوال کیا گیا، حضرت تھانویؒ مجدد تھے، فرمایا "بلا شبہ مجدد تھے، خصوصاً سلوک وتصوف میں جو کام حضرت نے کیا وہ تجدید سے تعلق رکھتا ہے۔" اس لیے مجھ بے بضاعت کو تو یقین ہے کہ وقت کے ساتھ مجدد تھانویؒ کی تجدیدی شان کو تسلیم کرتے ہوئے امت کا صالح طبقہ آپ کے مجدد ہونے پر اتفاق کر لے گا، اب آیئے! پہلے تو ان اوصاف وممیزات کا جائزہ لیں جو مجدد ہونے کے لیے مطلوب ہیں، پھر اس فاسد گردوپیش کا جائزہ بھی ضروری ہے جس سے آپ کا عہد بری طرح متاثر تھا اور اس علمی وعملی تجدید کا نقشہ بھی سامنے لانا ہے جس سے آپ کی تجدید کے طول وعرض کا علم ہو۔ عرض کر چکا ہوں کہ مجدد کا منصبی فریضہ طاغوت کی پیدا کردہ اندھیریوں کو دور کرنا ہے، اس لیے ماننا ہوگا کہ مجدد شریعت اور اس کے قریب وبعید شعبوں پر تام مہارت کا حامل اور خفی وجلی گوشوں پر کامل بصیرت رکھتا ہے، شریعت کے شعبے تنوع وتعدد کے اعتبار سے بے شمار ہیں، تاہم ان میں کچھ اصولی ہیں اور کچھ فروعی، عقائد کا معاملہ مہتم بالشان ہے۔ عبادت، احکام، فرائض، واجبات، منہیات، صحتِ عقیدہ کے بعد ہیں۔ معاملات کی درستی تیسرے نمبر پر ہے، باطنی وظاہری نزہت نمبر چار پر اور معاشرت پانچویں درجے پر۔ الحمد للہ ان تمام شعبہ جات میں تھانویؒ کے قدم رسوخ کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔

اگر عقائد میں جھول وعمل صالح میں کوتاہی ہو تو پابند شریعت نہیں کہا جا سکتا، اس لیے جہاں مستند اور صحیح علم کی ضرورت ہے وہیں اتباعِ سنت کا اہتمام اس طرح مطلوب ہے کہ سننِ نبوی سے سرمو بھی انحراف نہ ہو، الحاصل علم صحیح ہو اور جن معادن سے اس کو لیا گیا ہو وہ صاف وشفاف ہوں؛ چوں کہ علم معلومات کی کثرت کا نام نہیں، بلکہ وہ اک نور ہے جو عالم ربانی کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے، جن اشخاص ورجال سے علم حاصل کیا جائے وہ ہمہ جہت ٹکسالی ہوں، چوں کہ اسلامی علوم نرے علوم نہیں، بلکہ اجزائے دین ہیں، اسی لیے مشہور ہے کہ "ان هذا العلم دين فانظروا عمن تاخذون دينكم" خدا کا شکر ہے کہ مجدد تھانوی کے اساتذہ اعتقادات میں سلف صالحین کی روش پر علوم میں عبقریت کے حامل، عمل میں اکابر کا نمونہ، اتباعِ سنت میں ممتاز، تزکیہ وتجلیہ کی مسافتیں طے کئے ہوئے، امانت ودیانت، تقویٰ وتورع، احتیاط وثقاہت کے پیکر تھے، ان خزینوں سے علوم کے جو موتی التھانویؒ کے جیب ودامن میں پہنچے ان کے آب دار وتابدار ہونے میں کیا شبہ ہے، پھر یہ بھی ہے کہ صرف حصولِ علم سے کیا ہوتا ہے، تاوقتیکہ علم کے تقاضوں کی تکمیل کا فکر سوار نہ ہو تو اس باب میں بھی تحقیق وتفتیش سے کام لے کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت کا کوئی عمل، علم صحیح سے ہٹ کر نہیں ہے، لاریب وہ عالم ربانی ہیں اور اس جلیل منصب کے لیے مطلوب تمام اوصاف بقوّت ان میں موجود ہیں، چند واقعات آپ بھی سن لیجئے کہ یہ دعویٰ مدلل ہو کر آپ کے سامنے آئے، ملفوظات میں ہے کہ:

> "اک روز ایک نو وارد نے حضرت والا کی خدمت میں قیمتی مصلیٰ پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ مصلیٰ خرید کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مولانا اشرف علیؒ کو پیش کروں"۔

اگرچہ حضرت کے یہاں یوں بھی ہدایا کے قبول کرنے میں احتیاط قاعدے اور

ضابطے تھے، لیکن یہ واقعہ منفرد نوعیت کا تھا، مگر حضرت نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، یہ شخص تین روز مسلسل اپنے ہدیہ کے قبول کرنے پر بہ لجاجت مصر رہا، اس کی بے قراری و بے تابی دیدنی تھی، اس لیے بعض مزاج داں بھی سفارش کے لیے کھڑے ہو گئے، اس پر حضرت نے فرمایا کہ ''یہ شخص مغلوب الحال ہے اور شرعاً اس کا مال لینا حرام ہے'' اللہ اکبر پیش کرنے والا جس ذاتِ اطہر کی جانب ہدیہ کی نسبت کر رہا تھا اس کے باوجود اک شرعی مسئلے کا اس درجہ اہتمام، نام نہاد مشائخ کی رسوائے عالم لوٹ مار میں حیرت انگیز ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ الجھے ہوئے مسائل میں ابو حنیفہؒ الامام آخری فیصلہ مبتلا بہ پر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر حضرت تھانویؒ تو بلاشبہ فقیہ الامت تھے جن کے فتاویٰ پر آج بھی کروڑوں مسلمان باطمینانِ خاطر حرام وحلال، جائز و ناجائز کے فیصلے قبول کر رہے ہیں، مگر آپ ہی کو اک روز نماز کے ختم پر دانتوں میں کچھ خون کا شبہ ہوا تو نماز کی صحت وعدم صحت کے بارے میں اپنی رائے پر اعتماد کے بجائے دو مستند اہل فتویٰ کو دکھا کر نماز کی صحت کا اطمینان حاصل کیا، ان علمائے ربانی کی یہی شان تھی۔ سنا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو ایک استفتاء انگریزی اشیاء کے استعمال وعدم استعمال کے بارے میں دیا گیا تو آپ نے جواب لکھنے کے لیے اپنے ممتاز شاگرد علامہ کشمیریؒ کو دیا، عقیدت کیش شاگرد نے والا شان استاذ کی موجودگی میں جواب سے گریز کیا تو حضرت نے فرمایا کہ ''مجھ پر فرنگ دشمنی جس درجہ غالب ہے اس کے ہوتے ہوئے میں خود کو مامون نہیں سمجھتا، خدانخواستہ کہیں فتویٰ طبعی جذبات سے متاثر نہ ہو جائے''۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

یہ واقعہ تو بے اختیار قلم پر آ گیا، میں تو آپ کو حضرت تھانویؒ کے ورع، تقویٰ اور احتیاط کے واقعات سنا رہا تھا، دانت کی تکلیف کے دوران لاہور کے کسی معالج نے دانت میں سونے کے استعمال کی تجویز کی، حضرت کو اس میں کچھ الجھن تھی تو باضابطہ

دارالعلوم کے دارالافتاء سے استفتاء فرمایا، اس وقت کے مسند نشینِ اہتمام وافتاء حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ و حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ نے تھانہ بھون حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ خود فقیہ الامت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہم اس پر کیا لکھیں، فرمایا کہ "یہ میری ذاتی الجھن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے لیے کوئی سہولت کی راہ نکال لوں۔" اگر مقالے کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس طرح کے احتیاط کے واقعات آپ کی سوانح سے بکثرت پیش کیے جاسکتے ہیں۔ علم کامل، عمل صالح، متورعانہ انداز کے ساتھ تدبر، مصلحت اندیشی اور اقدام وعمل میں جس درجے کی حکمت وبصیرت تجدیدی کام میں مطلوب ہے تو حضرت میں ان اوصاف کی تلاش میں کسی کاوش کی ضرورت نہیں، آپ اپنے عہد ہی میں حکیم الامت کے لقب سے معروف ہوچکے تھے، تربیت سالکین جو آپ کے خصائص میں ہے اس ذیل کی مراسلت مطبوعہ موجود ہے، اس کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ مکاید نفس پر اطلاع میں حضرت بے مثال واقع ہوئے ہیں، پھر صحیح تشخیص کے ساتھ کارآمد تجویز آپ کی انفرادیت ہے۔ غرضیکہ جو اوصاف ایک مجدد کی شخصیت میں درکار ہیں التھانویؒ ان کے جامع ہیں۔

اب آیئے اس ماحول کی جانب جس میں حضرت نے تجدیدی کام کا آغاز کیا تو معلوم ہے کہ ہندوستان میں باستثناء چند علاقوں کے اسلام ان واسطوں سے نہیں پہنچا جو رسول اعظمؐ فداہ روحی کے تربیت کردہ تھے، یہاں کا اسلام صوفیاء وعلماء کی دین ہے، جہاں جو چیز راسخین فی العلم اور محقق صوفیاء سے پہنچی وہ تو بے غبار ہے اور اگر درآمد کرنے والے خام کار ہیں وہیں الجھی ہوئی ہے، پھر یہ بھی ہے کہ ملکی اثرات حقائق کو بھی متاثر کرتے ہیں، دوسری طرف فرنگی اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے فرقہ بندیاں اور ان میں تصادم، حکمت عملی کا اہم تقاضہ تھا، اس لیے شیعیت وغیر شیعیت کے جھگڑے، دیوبند اور بریلی کی آویزشیں، تقلید وعدم تقلید کا ہنگامہ، شریعت وطریقت کی باہمی رقابت، بدعت وسنت کی مقابلہ آرائی، فرقہ پرستی، پیر پرستی، اور خدا جانے کتنی اور بلائیں بے

درماں، مستزاد قدیم وجدید تعلیم ایک دوسرے کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑی تھیں اور دونوں سے وابستہ حلقے ایک دوسرے پر تبرا کر رہے تھے اور اسے بھی کیوں چھوڑیئے کہ غیر منقسم ہندوستان میں سیاسی اختلافات نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا تھا، نیز پنجاب سے ختم نبوت پر جو سفاکانہ حملہ ہوا اس کی شدت نے تو پورے ماحول کو تنور بنا رکھا تھا، اس تیرہ وتار ماحول میں چودہویں صدی کے مجدد کو کام کرنا تھا۔

یہ تسلیم ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سے تجدیدی کام کی بنیاد پڑ چکی تھی اور امام دہلوی کو بھی اپنے دور میں اسلامی اقتدار وافکار کی حفاظت کا اہم کام انجام دینا پڑا، مگر اوّل الذکر کی تمام تر محنتیں اکبر کے الحاد وزیغ کے مقابلے میں تھیں اور ثانی الذکر کی کوششوں کا دائرہ دورِ زوال میں درپیش ابتلاء کے حل تک محدود تھا، اگرچہ مجدد تھانویؒ کے ماحول سے متعلق فتنے ان دونوں عظیم شخصیتوں کے دور میں تھے، لیکن ان فتنوں نے شدت اسی زمانے میں اختیار کی جو حضرت تھانویؒ کا عصر ہے اور اسے بھی مت بھولیے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت میں اکبری الحاد کے اثرات آہستہ آہستہ مضمحل ہو چلے تھے، فتنہ صرصر کی صورت میں نہیں رہا تھا؛ بلکہ اسلامی اقتدار ہونے کی بناء پر فتنے کی مزاحمت شدید تھی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے تجدیدی اوقات اس طرح گذر رہے تھے کہ مسلمانوں کا عروج اگرچہ تیزی سے زوال پذیر تھا، تاہم مقاومت کی توانائیاں یکسر ختم نہیں ہوئیں تھیں، لیکن مجدد تھانویؒ کے عہد میں صرف تن رنجور تھا اور امراض کے تابڑ توڑ حملے، دفاعی قوتوں سے محرومی، مزاحمت کے جذبات سے عاری دل ودماغ۔ خانقاہ نشین گنگوہ، سہارنپور، رائے پور اور دیوبند سے اسلام کا دھڑکتا دل دارالعلوم دیوبند ضرور مصروفِ کار تھے؛ لیکن مجددانہ کاروبار وہی شخصیت کر سکتی تھی جو خزاں آشنا ماحول پر دل سوزی وغمگساری کے مخلصانہ جذبات سے بہرہ ور ہو۔ موصوف کو ملت کے دینی وذہنی افلاس کے نتیجے میں مسلمانوں کے چند در چند مصائب کا احساس کس درجہ مضطرب کئے ہوئے تھا اس کا اندازہ اک مجلسی بیان سے ہو سکتا ہے، فرمایا کہ:

"اگر مسلمانوں کی کوئی مصیبت کھانے سے پہلے یاد آجاتی ہے تو میری
بھوک اڑ جاتی ہے اگر نیند سے پہلے یاد آجاتی ہے تو نیند اڑ جاتی ہے۔
ترکوں پر مصیبت آئی تو میرا حال یہ تھا کہ لقمہ منہ میں رکھتا تھا؛ لیکن نگلا نہیں
جاتا تھا"۔

اندوہ وملال کی یہ کیفیات اک سچے پکے مسلمان ہی کی خصوصیت ہے، ورنہ اب تو ملت کی حرماں نصیبی کا یہ حال ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو جن عالمی مشکلات کا سابقہ ہے اس پر کچھ نام نہاد مسلمان تو اسلام ہی میں کیڑے نکالنے لگے اور کچھ نادان دوست مسلمانوں میں کیڑے ڈالنے لگے فالی اللہ المشتکی۔

اور یہ بھی سنئے کہ ایک جانب موصوف ان کرب انگیز کیفیات سے دوچار تھے؛ لیکن اس عالم میں بھی آپ کی معروف احتیاط اس طرح زبان پر آتی کہ اسی مجلس میں مزید ارشاد ہوا:

"اس بات سے بھی ڈر لگتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرمائیں کہ جب سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا تھا تو رضا بالقضا کیوں نہ تھی اور یہ خوف بھی نہیں جاتا کہ کہیں یہ سوال نہ فرمادیں کہ مسلمانوں پر مصائب آرہے تھے تمہیں صدمہ کیوں نہیں تھا۔"

دیکھا آپ نے کہ اس بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل صراط پر مومن کا اندازِ فکر اور گفتار کیا ہوتا ہے، الم انگیز ان جذبات کے دوش بدوش مومن کی یہ بھی اک شان ہے کہ مسلمانوں کی آسودگی و آسائش پر اس کا ایمان اہتزاز میں آجائے، مجدد تھانویؒ میں یہ ایمانی روح بھی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے، خود فرماتے ہیں:

"جب میں باہر نکلتا ہوں اور مسلمانوں کی بڑی عمارتیں دیکھتا ہوں
تو دل خوش ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دنیاوی نعمتوں سے محروم نہیں
فرمایا"۔

اس مسرّت وطمانیت پر یہ اشکال نہ ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پر شکوہ عمارات،

رفیع الشان بنگلوں، امیرانہ کوٹھیوں کو قیامت کی علامت میں شمار کیا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس مضمون کی حدیث میں "یتطاولون" کا لفظ موجود ہے جس کا صاف وسیدھا مطلب عمارات سے آسودگی وآسائش مقصود نہیں، بلکہ اپنے رئیسانہ نخوت کے جذبات اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ کا مظاہرہ ہو، پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ دوسری قوموں کے مقابل اگر مسلمانوں کی پسماندگی رلانے والا سانحہ ہے تو ان کی آسودگی وخوشحالی مسرور کرنے والا واقعہ ہوگا۔

پھر نری دلسوزی سے کام نہیں چلتا؛ بلکہ معاشرے کو مریض بنانے والے اک اک جرثومے پر مجدد کو تام اطلاع ہونی چاہئے تو اس سلسلے میں حضرت کے مجلسی ارشادات اور آپ کی تصانیف شاہدِ عدل ہیں کہ آپ کو من جانب اللہ کیسی دور بین نظر اور کتنی دور اندیش عقل عنایت کی گئی تھی، مسلم معاشرے میں مرغوب پسندیدہ رسوم میں آپ کی حذاقت وفراست نے کن کن مفاسد کی نشاندہی کی ہے وہ آپ کا منفرد امتیاز ہے۔ شَہِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا کے اصول پر ایک دو ملفوظ پیش خدمت ہیں۔ عملیات کے سلسلے میں افراط وتفریط سب کو معلوم ہے، ایک طبقہ جادو منتر، ٹوٹکے، ٹونے کے استعمال سے بھی مجتنب نہیں؛ حالاں کہ ان کا بڑا عنصر استمداد بغیر اللہ اور کلمات کفر آمیز ہیں، دوسرا طبقہ اعمالِ قرآنی کو بھی شرک بتارہا ہے، استعمال کرنے والے جائز وناجائز، حرام وحلال کا فرق اٹھا کر اندھا دھند استعمال کررہے ہیں۔ ملت کے غمگسار نے اعمالِ قرآنی لکھ کر صراطِ مستقیم سمجھائی؛ لیکن یہ تنبیہ بھی ضروری سمجھی کہ ان عملیات کو ناجائز وحرام مواقع پر قطعاً استعمال نہ کیا جائے گا یا یہ کہ کسی عمل وتعویذ کو حقیقی مؤثر وتقدیرِ الٰہی کو بدلنے والا سمجھا جائے، اس ذیل میں بھی حضرت کی مجددانہ طبیعت اور محتاط روِش نے شرعی مسئلے کی جانب عاملین کو توجہ دلائی، فرمایا کہ:

> "عاملین کے پاس عورتیں شوہر کی تسخیر کے تعویذ کے لیے آتی ہیں اور یہ بے تکلف دیئے چلے جاتے ہیں، حالاں کہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر

حقوقِ واجبہ ادا کر رہا ہے تو اسے کلیتاً مسخر کرنے کا تعویذ یا عمل، دینا لینا حرام ہے اور اگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہے تو صرف ایسا ہی تعویذ یا عمل کیا اور کرایا جاسکتا ہے کہ شوہر حقوق واجب کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو"۔

دیکھنے میں تو بات چھوٹی سی ہے، لیکن میرا یقین ہے کہ عوام تو درکنار لاکھوں خواص کو بھی مسئلے کی اس نزاکت کا احساس تک نہ ہوگا اور سنئے! نہ فن طبابت پر اطلاع، نہ امراض کے نشیب وفراز سے واقفیت، نہ ادویہ کے خواص سے آگاہی، نہ موسم کے اتار نہ چڑھاؤ کا لحاظ، چند نسخے اِدھر اُدھر سے لے کر دوکانداری کے لیے مطب کھول دینا اور مریضوں کی جان خطرے میں ڈالنا شرعی نقطۂ نظر سے یہ بھی حرام ہے، اس عمل کی شناخت وقباحت پر بھی اپنی تصنیف اصلاح الرسوم نامی کتاب میں توجہ دلائی، مختصر یہ کہ معاشرے میں موجود اک اک رگ پر اس باخبر نے باخبر کرنے کے ساتھ علاج وازالہ کی مفید تجاویز اور مثمر تدابیر بتائی ہیں۔

اور جیسا کہ سنا چکا ہوں کہ غیر منقسم ہندستان کا اسلام ملکی اثر وتمدن سے متأثر ہوا تو خود بد نصیب مسلمان نے پیدائش سے موت کے بعد تک وہ رسوم ورواج بے تکلف اختیار کر لیے جس سے ایمان واسلام کی کشت زار خزاں آشنا ہو کر رہ گئی، سینکڑوں باطل رسوم میں گھرے ہوئے مسلمان کو اک اک رسم کے باطن میں موجود زہر ہلاہل پر حضرت نے اطلاع دی اور ماحول کے غلط اثرات کے نتیجے میں جس طرح مسلمانوں کو اقتصادی تباہ کاریوں کا شکار ہونا پڑا اور قرضے پر لی ہوئی سودی رقم کے خوف ناک اثرات کے نتیجے میں جس طرح معاشی ڈھانچہ بدل گیا، اس زبوں حالی سے نکالنے کے لیے کامیاب تدابیر کا سراغ لگایا، ان کو پڑھ لیجئے تو حضرت کے مجدد ہونے کا مسئلہ صاف وشفاف ہوجائے گا، حضرت ہی نے بتایا کہ غیر مسلم قوموں میں لڑکی نہ میراث میں شریک ہے نہ اس کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام۔ اس کوتاہی کی تلافی کے لیے دوسری قوموں نے شادی کے بعد دینے لینے کے غلط سلط طریقے ایجاد کیے تو دیکھا دیکھی

مسلمانوں نے بھی ان رسوم کا خود کو پابند کرلیا؛ حالاں کہ اگر لڑکیوں کا شرعی حق ادا نہیں ہوا تو باقی کی تمام صورتیں بے سود اور اگر حق ادا ہو چکا تو بلا وجہ کا یہ التزام، اس پر بھی نظر پہنچی کہ شادی کی بیشتر رسموں میں تفاخر و نمائش کے جذبات کار فرما ہیں اور موت کے بعد کی رسوم میں ایصالِ ثواب تو اک شرعی حقیقت ہے، لیکن رسمی جکڑ بندیوں میں آ کر وہ بجائے ثواب کے عذاب بن جاتا ہے۔ الحاصل اک ہمدرد مصلح شفیق معالج، اور بالغ النظر مجدد کے شاہکار آپ کی ہر تصنیف اور ہر مجلس سے نمایاں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ارشاد گرامی میں کتاب اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمسک کو امت کے صراط مستقیم پر رہنے کا سب سے قوی ذریعہ بتایا تھا، امام دہلوی نے اپنے دور میں تباہ حال ملت کے لیے ان ہی دو اہم بنیادوں سے کام لینے کی بنیاد ڈال خود قرآن مجید کی تفسیر لکھی، فہم قرآن کے اصول قلم بند کئے، امام مالک کے جمع کردہ ذخیرۂ حدیث کی شرح کے لیے قلم اٹھایا اور اسے بخت و اتفاق نہیں کہا جاسکتا کہ شاہ صاحب کے خانوادے کے نامی گرامی اشخاص ان ہی دو بنیادی امر کی خدمت میں قولاً و قلماً لگے رہے۔ ایسا نہیں بلکہ یہ شاہ صاحب کی اسکیم کے اجزاء ہیں اور مرحوم کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل ہے، ٹھیک اسی طرح مجدد تھانویؒ نے بھی قرآنی پیغام کو عام کرنے کے لیے اردو تفسیر پر قلم اٹھایا، یہ تفسیر بجائے خود کتنی منضبط، مستند اور باوقار ہے کہ ''قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' کے اصول کے مطابق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا وہ پرشکوہ تبصرہ سنیے جو بیان القرآن کے مطالعے کے بعد منتہی طلبہ کے سامنے فرمایا:

> ''میں اردو زبان سے حد درجہ بدگمان تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کا دامن علوم سے خالی ہے اور اسی لیے میں نے اپنے ذوق علمی کو محفوظ رکھنے کی خاطر نجی مراسلت بھی عربی میں کی یا فارسی میں، لیکن بیان القرآن کے مطالعے کے بعد اردو سے میری بدگمانی یکسر ختم ہوگئی، اتنی چست تفسیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔''

خود اس بھاری بھر کم تبصرے کو امام تھانویؒ نے سننے کے بعد فرمایا:

"کہ جب اتنے بڑے علامہ کی توثیق مجھے حاصل ہو گئی، اب میں مزید کسی توثیق کا منتظر نہیں ہوں"۔

قرآن کی روشنی میں ان احکام کی بھی ترتیب آپ کے پیش نظر رہی جو احکام القرآن کہلانے کے مستحق ہیں، یہ اہم علمی ذخیرہ حال ہی میں پاکستان میں چھپ گیا، میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ حضرت موصوف کے دور میں تقلید و عدم تقلید کے جھگڑے شباب پر تھے اور ایک گروہ تقلید کو شرک گردانتے ہوئے ابوحنیفہ الامام کو بڑا مجرم ثابت کر رہا تھا اور ان کی فقہ کو عقلی موشگافیاں بتا کر حدیث سے اس کا استناد پوری قوت سے توڑ رہا تھا، امام تھانویؒ نے اس طرف بھی توجہ کی اور آپ کی کوششوں کے نتیجے میں اعلاء السنن نامی وہ ذخیرہ علمی حلقوں میں پہنچ گیا جس سے حنفی فقہ کی استنادی حیثیت اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب اسے اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیاز بتانا مکابرہ ہے، بات بڑھتی چلی جاتی ہے، لیکن کیا کیا جائے، حکیم الامت کا واقعی امتیاز اس وقت تک نہیں کھلے گا، تاوقتیکہ شریعت و طریقت کو شیر و شکر کرنے کے لیے آپ کی بے پناہ کوششیں سامنے نہ ہوں۔ جہالت کی آندھیاں جب تیز رفتا ہو کر چلیں تو شریعت و طریقت میں ٹھنا ٹھنی کرادی گئی، حالاں کہ ان میں ایک قلب ہے اور ایک قالب، ایک روح ہے اور دوسرا کالبد۔ جھگڑا شروع ہوا تو مہاجر مکیؒ نے کسی خاص سلسلے میں بیعت لینے کے بجائے سلاسلِ اربعہ میں بیک وقت بیعت کی بنیاد ڈالی، مگر یہ تدبیر تریاق اسی وقت ثابت ہوئی جب مجدد تھانویؒ نے جسم و روح کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو استوار کیا اور یہ مسافت اس کامیابی سے طے کی کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ اکبر کو ایک منزل پر لا کھڑا کیا اور یہی کیا، آپ نے تو بانیٔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اس بدگمانی کو بھی ختم کیا جو اس غریب سے مذہبی حلقوں میں چلی آتی تھی۔

اک مجدد کی نظر سے سیاسی اتھل پتھل کا مہیب منظر کیسے اوجھل رہتا، جو ملت کو اس کے واقعی مقام تک پہنچانے کے لیے عالم ارواح سے بے قرار روح لے کر چلا تھا، اس

گوشے میں بھی آپ نے مومنانہ فراست کے قندیل روشن کیے، آپ کا سیاسی ذوق معلوم ہے اور جس جانب آپ کو دلچسپیاں تھیں وہ بھی متعارف ہیں، مجھ سے مختصراً اتنا سن لیجئے کہ آپ کے مجاز مولانا عبدالباری لکھنوی کی ''جامع المجد دین'' اور ''تجدید تصوف وسلوک'' نامی کتب جب ایک انشاء پرداز کے پاس تبصرے کے لیے پہنچیں تو ان صاحب نے بجائے تصنیف ومصنف کے امام تھانویؒ کو قلم کی زد پر لے لیا اور کئی قسطوں میں صرف حضرت کی شخصیت کو ہدف بنائے رکھا اور جب ان زہریلے خیالات سے رجوع کی توفیق ہوئی تو اس کا اعتراف کیا کہ موجودہ حالات نے سیاسی معاملات میں حضرت کی فکری اصابت کو تسلیم کرالیا۔

بہرحال بارہ سو کے قریب تصانیف کا یہ مصنف، لاکھوں مستفیدین کا یہ معلم، ہزاروں مسترشدین کا یہ مربی، اپنے اوصافِ جلیلہ، ممیزاتِ خصوصی کے اعتبار سے جب کسی خانے میں فٹ کرنے کے لیے جانچا جائے گا تو اہل نظر خانۂ تجدید ہی میں اس بوقلموں شخصیت کو فٹ کرسکیں گے۔ خاتمے پر اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف خود کرتا ہوں اور اس ہیچ پوچ تحریر کے پڑھنے میں آپ کے ضیاعِ وقت کے لیے معذرت طلب ہوں۔

بحر العلوم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

دنیا میں انسان بہت سی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے، کبھی پھولوں کے حسن سے، کلیوں کی چٹک سے، گلشن کی مہک سے، دریا کی روانی سے، ستاروں کی چمک سے، چاند کی چاندنی سے، پہاڑوں کی بلندی سے، حسن و جمال سے، دولت مند سے، مالکِ تخت وتاج سے؛ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف علم متاثر کرتا ہے یا کسی کا کمالِ دانش، راقم انہیں میں ہے جسے قوم کی خدمت، امانت ودیانت، سیاست وبصیرت نے متاثر کیا؛ مگر یہ اثر جلد ہی ختم ہوگیا؛ لیکن کسی کے علم وکمال کا اثر تو ایسا نقش بنا کہ مٹائے نہیں مٹتا۔ دوسری قوموں، دوسرے ملکوں، دوسرے مذاہب میں بھی باکمال گذرے ہیں؛ لیکن مشہور ہے کہ پردہ پردہ آنچ، اس لیے اپنی قریب کی شخصیت جسے شب وروز دیکھنے کا موقع ملتا ہے، جس کا لحہ لحہ سامنے ہوتا ہے، جس کا ظاہر وباطن ہمارے مشاہدہ میں ہے، اس سے متاثر ہونا تعجب انگیز، نہ حیرت خیز؛ بلکہ متاثر نہ ہونا باعثِ حیرت ہوگا۔

میرا تاثر

علامہ مرحومؒ کی وفات کے وقت میری عمر لگ بھگ چار سال تھی، اس عمر میں نہ شعور ہوتا اور نہ کسی کی شخصیت کے طول وعرض کو ناپنے کی صلاحیت، مجھے تو ان کا حلیہ، قدوقامت، شکل وصورت بھی پوری طرح محفوظ نہیں؛ لیکن جب شعور نے میری انگلی پکڑی اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے کے لیے قدم اٹھنا شروع ہوئے تو علامہ مرحوم کے

متعلق ارباب علم وکمال کے تاثرات میرے کانوں میں پڑے اوران پر لکھی ہوئی تحریریں مطالعہ میں آئیں، اب میں تعلیم کے اس مرحلے میں تھا جہاں کھوٹے کھرے کی پرکھ اوراچھے برے کا امتیاز علم وآگاہی کا فیض ہوتا ہے، پرواز میری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اگلوں اور پچھلوں کی علمی تحقیقات میرے سامنے تھیں، اسی دوران علامہ مرحوم کی تصانیف اوراانکے شاگردوں کی ترتیب دادہ تقریریں مطالعہ کرنے لگا تو مجھ پر کھلا کہ انکے علوم نادر ہیں۔

معلومات کا جوار بھاٹا ان کے سینے میں کروٹیں لے رہا ہے، ہر مسئلے پر وہ اپنی رائے رکھتے ہیں، پچھلوں کی تحقیقات سے انکا اختلاف ٹھوس بنیادوں پر ہے، کسی سے مرعوبیت ان کے یہاں قطعاً نہیں، وہ سونے اور ملاوٹی دھات میں ہزار اس پر ملمع کاری کی گئی ہو، پہلی نظر میں حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں، بڑے بڑے علم کے ستون بلکہ علوم کے پہاڑ جن کی علمی دھاک دنیا کے دل ودماغ پر بیٹھی ہوئی ہے، علامہ ان کی معلومات پر بھرپور تنقید کی صلاحیتوں سے بھرپور ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ استاذ اپنے شاگردوں پر مختلف جہتوں سے اثرانداز ہوتا ہے، کبھی کردار کی بلندی سے، کبھی بے پناہ شفقت سے، اپنے بیکراں اخلاص سے، اپنے رعب وداب سے، اپنی ٹیپ وٹاپ سے یا پھر اپنے اتاہ علوم سے، علامہ کے تمام شاگرداُن کے بے پناہ علوم سے متاثر ہیں اور پھر اس دور کے طالب علم جب کہ وہ اس عہد کے موجودہ رسمی علماء سے بھی ممتاز تھے، ان مستعد اور بااستعداد حلقوں میں نہ صرف یہ کہ مرحوم علامہ سے عقیدت، بلکہ عشق تھا۔ معلوم ہے کہ علم دوست طبقہ اسی شخصیت سے تاثر قائم کرتا ہے جو علم وکمالات کا بحر موّاج ہو۔

پھر جوں جوں میرا علم شعور بڑھتا گیا تو میں نے دیکھا کہ عرب وعجم علامہ کے علم کو تسلیم کررہا ہے اور جدید وقدیم حلقے یکساں ان سے متاثر ہیں، اپنی ناقص استعداد کے باوجود میں خود مرحوم کی تصانیف، ان کے چھوڑے ہوئے علمی اثاثہ سے استفادہ کے

قابل ہو گیا تو اس جاندار مقولے کی صداقت میں مجھے کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ چلتے پھرتے کتب خانہ تھے، حافظِ حدیث تھے، جدید اور قدیم علوم پر ناقدانہ نظر تھی، وہ اتنی علمی دستگاہ رکھتے کہ بڑوں بڑوں کی تحقیقات کو مدلل انداز میں مسترد کرتے اور خود جچی تلی رائے قائم کرتے تو مجھے ان کے علوم نے قائل کیا، نہ کہ ان کے باپ ہونے نے، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کا معترف ہوں نہ کہ بیٹا ہونے کی بنا پر۔

جائے پیدائش اور ابتدائی تعلیم

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا وطن وادیٔ لولاب ہے، بچپن کشمیر اور ہزارہ میں گذار کر دیوبند پہنچے اور دار العلوم میں داخلہ لیا، اس وقت دار العلوم میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی تھے، جن سے ہندوستان میں انقلابی تحریک ریشمی رومال وابستہ ہے، آزادی کی تڑپ ان کو اسلام اور اپنے بزرگوں نے دی، پھر نہ صرف اپنے عہد میں حریت پسندوں کے پیشوا ہوئے، بلکہ ہندوستان اور بیرون ملک کی نامی گرامی شخصیتیں ان کی شاگرد ہیں۔

میرے والد مرحوم ان کے جانشیں علمی ہوئے، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ایک بے وطن جس کے دیوبند میں نہ رشتہ دار، نہ خاندان، نہ قبیلہ، نہ مرید، پھر اسے جانشیں منتخب کیا گیا، حالاں کہ اس وقت شیخ الہندؒ کے ممتاز شاگرد موجود تھے، اگر مولانا انور شاہ اپنے علم و فضل میں سب سے بڑھے ہوئے نہ ہوتے تو ایک بے کس و بے وطن کو اس عظیم منصب کے لیے کون اور کب منتخب کرتا۔

دار العلوم جیسے ادارہ اور شیخ الہند جیسی ہستی کی جانشینی مولانا انور شاہ کشمیری کے بے پناہ علوم کی مضبوط شہادت ہے۔

علامہ مرحوم ۱۲۹۲ء میں اپنے وطن ورنو کے قریب دودھ وان نامی بستی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے مرحوم والد پیر معظم شاہ صاحبؒ سے حاصل کی، وہ بچپن سے نہایت ذہین، بڑے سمجھ دار اور یادداشت کے اعتبار سے بے مثل تھے۔

تدریس

دارالعلوم سے فراغت پر کچھ سال دہلی میں مدرسہ امینیہ میں تعلیم دی جس کے وہ بانیوں میں ہیں، پھر اپنے وطن کشمیر واپس ہوکر بارہ مولہ نامی بستی میں مدرسہ فیضِ عام شروع کیا جو کشمیریوں کی عام غفلتوں اور دین کی اہمیت سے نا آشنا ہونے کی بنا پر ترقی نہ کرسکا، علامہ صورت حال سے مایوس ہوکر بہ نیتِ ہجرت کشمیر سے روانہ ہوئے اور دیوبند میں اپنے استاذ شیخ الہندؒ سے ملاقات کے ارادہ سے پہنچے، استاذ کو جب معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کررہے ہیں تو اپنے اس باکمال شاگرد کے علمی فیوض سے محرومی گوارہ نہ فرمائی اور آپ کو دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے حکم دیا، مزید جکڑ بند کرنے کے لیے گنگوہ میں شادی کرادی، اس طرح علامہ ہمیشہ کے لیے دیوبند میں مقیم ہوگئے اور شیخ الہندؒ نے جب آزادیٔ وطن کے لیے خاص پروگرام کے تحت ہندوستان سے باہر جانے کا فیصلہ فرمایا تو آپ کو اپنا جانشیں منتخب کروایا، پھر تو آپ کا علم خوب چمکا اور دنیائے اسلام کے طلبہ نے آپ سے فائدہ اٹھایا۔

چناں چہ ہندوستان اور بیرون ہند کی علمی، سیاسی شخصیتیں آپ کی شاگرد ہیں، ہندوستان کا دانشور طبقہ آپ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال آپ کے متعلق کہتے کہ ''پانچ سو سال میں اس شان کا محقق پیدا نہیں ہوا۔'' عرب وعجم نے آپ کے فضل وکمال کا لوہا مانا اور آپ کے علوم کا دلوں پر سکہ قائم ہوگیا۔

علامہ کے سیاسی نظریات

علامہ ذہنی طور پر حریت پسند تھے اور ہندوستان کی آزادی کی تڑپ سے سرشار، چناں چہ آپ نے ۱۹۲۷ء میں پشاور میں جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی اور یہاں ایک معرکہ کا خطبہ دیا جس سے دنیا علامہ کے سیاسی فکر وبصیرت سے واقف ہوئی، اس خطبہ کے اقتباسات ہندوستان پریس نے شائع کیے، آپ شیخ الہندؒ کی ریشمی رومال تحریک کے بنیادی عناصر میں ہیں، چناں چہ برطانیہ سے حاصل شدہ

جس دستاویز کو جمعیۃ علمائے ہند نے شائع کیا ہے جو کہ اُس تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ہے جسے برطانوی حکومت نے شیخ الہندؒ کی تحریک کا جائزہ لینے کے لیے قائم کیا تھا، اُس میں آپ کو شیخ الہندؒ کی تحریک کا مضبوط کارکن بتایا گیا ہے۔

قادیانیت کی بیخ کنی

قادیانیت ایک مذہبی وسیاسی ہولناک فتنہ تھا، ایک زمانہ میں جواہر لال نہرو قادیانیت کو درست سمجھتے، لیکن جب جواہر لال نہرو نے لندن کا سفر کیا اور وہاں ان پر یہ حقیقت کھلی کہ قادیانیت کی سرپرستی برطانوی اقتدار کر رہا ہے اور اس کا مقصد استعمار کو مضبوط کرنا ہے تو ہندوستان پہنچ کر بمبئی میں پریس کو بیان دیتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ ''ہم ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، تو قادیانیت کے فتنے سے ہمیں نمٹنا ہوگا۔''

علامہ فتنۂ قادیانیت کو مذہبی وسیاسی حیثیت سے بڑا خطرہ سمجھتے، چناں چہ آپ نے اپنے تمام شاگردوں کو قادیانیت کے خلاف محاذ پر لا کھڑا کیا، احرار پارٹی کو قادیانیت کے خلاف سرگرم اور اپنی عمر عزیز کے تقریباً ۲۵ ر سال اس مقصد کے لیے صرف کیے۔ بلاشبہ تحریکِ قادیانیت کو زیر زمین کرنے والی جماعت کے امام صرف آپ ہیں۔

نمک تحریک

گاندھی جی نے جب نمک تحریک شروع کی تو آپ نے فتویٰ دیا کہ اسلام بھی پانی، گھاس اور نمک پر ٹیکس کا قائل نہیں، گاندھی جی نے اس تحریک میں علامہ کے اس فتویٰ سے جاندار تائید حاصل کی، علامہ نے تصانیف بھی چھوڑیں اور آپ کے شاگردوں نے آپ کی درسی تقریروں کو بھی عربی، فارسی اور اردو میں مرتب کیا جو آج بھی کائناتِ علم میں ایک نادر علمی ذخیرہ کی حیثیت رکھتی ہیں، آپ شاعری بھی فرماتے، آپ کے اشعار چھپ چکے ہیں۔

جامعہ ازہر قاہرہ، علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، لاہور یونیورسٹی، اسلام آباد، اسلام یونیورسٹی ملیشیا اور کراچی یونیورسٹی میں آپ پر پی ایچ ڈی کی گئی، آپ کی بہت سی

سوانح لکھی گئیں اور بہت سے مضامین ومقالات بھی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں لکھے گئے۔ آپ کے نام پر بہت سے دینی وعلمی ادارے ہیں۔ ۱۳۵۲ھ میں بہ عمر ۶۰ سال انتقال فرمایا اور دیوبند عیدگاہ کے قریب دفن کئے گئے، آپ کے مرقد پر علماء، طلبہ اور زائرین ہمیشہ پہنچتے ہیں۔

کشمیر ہمیشہ سے باکمال شخصیتوں کا مرکز رہا ہے، وادی کے حسن نے تو ہر ایک کو متاثر کیا، لیکن یہاں کی بلند قامت شخصیتوں سے عام طور پر واقفیت نہیں اور جب واقفیت نہیں تو اثرات کیسے ہوں گے، حالاں کہ نہرو خاندان، کنزرو، خانوادۂ کچلو سپرو کشمیر کے مشہور خاندان ہیں جو نہ صرف ملک پہ چھائے رہے؛ بلکہ ملک کی عظمتوں میں اضافہ کے سبب بنے۔

* * *

اعترافِ کمال

عربی کا مشہور مقولہ "المعاصرة سبب المنافرة" اپنی پشت پر معاصرانہ چشمک ورقابت اور معاصرین کی باہمی کشیدگی وتلخی کی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مقولہ کہنے والے کی زبان سے صرف ''کہنے'' کے درجہ میں نہیں؛ بلکہ بہت سی صداقتوں اور حقیقتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، نہ جانے کتنے اہل فضل وکمال ہوں گے جن کا فضل وتبحر معاصرین کی چیرہ دستیوں کی بھینٹ چڑھا اور کون بتا سکتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد ان اہل کمال کی ہوگی جن کے کمالات بازار میں صرف اس وجہ سے اپنی واقعی قیمت حاصل نہ کر سکے کہ ان کے معاصران کے حق میں سچی اور حقیقی شہادت دینے سے گریز کرتے۔ غالباً مشہور ادیب ومتکلم ''جاحظ'' نے معاصرین ہی کی ستم کیشیوں کا شکار ہونے اور ان کی نت نئی ظلم آفرینیوں کا مشاہدہ وتجربہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ ''پیشہ وروں کی رائے پیشہ وروں کے حق میں معتبر نہیں؛ کیوں کہ وہ عموماً رشک وحسد سے مغلوب ہو کر معاصر کے وقار وکمال کو تسلیم کرنے کا حوصلہ کھو دیتے ہیں۔'' اور جاحظ ہی کا قول ہے کہ ''خصوصاً ایک قاری کی رائے دوسرے قاری کے حق میں قطعاً شنوا نہیں؛ کیوں کہ پیشہ کی مناسبت سے جو حریفانہ چشمک اور معاصرانہ آویزش ان میں ہوتی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔''

ہندوستان کے مشہور اور اردو کے غزل گو شاعر مرزا غالب کو بھی انہیں معاصرانہ رقابتوں اور آویزشوں کا شکوہ کرنا پڑا۔

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکر غالبؔ کہ در زمانۂ تست

اس مظلومانہ شکوہ کا مخاطب وہی حریف ژاژ خواہ ہے جو سخن گستران پیشین کے ہر ہر شعر پر داد دیتے ہوئے زمین وآسمان کے قلابے ملاتا اور بیچارے غالبؔ کے کمالات شاعری اور ان کی ''شاعرانہ انفرادیت'' کا صرف اس وجہ سے انکار کرتا یا کرنے پر مجبور تھا کہ غالب کی معاصرت اس کو حاصل تھی اور پھر یہی نہیں، بلکہ اگر آپ تاریخ کے دفتر کو صرف معاصرانہ چشمکوں کی تاریخ معلوم کرنے کے خیال سے کھنگالیں گے تو معاصرین کے تعصب کی وجہ سے ان کی باہمی زندگی میں ایک ناقابل عبور خلیج حائل نظر آئے گی جو اسی ''معاصرت'' کا یقینی نتیجہ ہوگی۔

لیکن معاصرت کی اسی کشمش کے ذیل میں بعض معاصرانہ شہادتوں کی ہم کو کچھ ایسی استثنائی صورتیں اور انوکھی مثالیں بھی نظر پڑ جاتی ہیں کہ وہ معاصر کی حق پژوہی وحق پسندی کا ایک شاہکار ہونے کی حیثیت سے تاریخ کا گراں قدر اور گراں مایہ سرمایہ ہوتا ہے، حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے متعلق ان کے معاصرین کی شہادتیں صداقت نگاری وحق پسندی کا ایک نایاب ونادر نمونہ ہونے کی وجہ سے ہندوستانی علماء کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے اور خاکسار کا خیال ہے کہ امام العصرؒ کے متعلق ان کے بلند پایہ معاصرین کی شہادت اگر معاصرین کی صداقت پسندی اور صدق نوازی کا اعلان کرتی ہے تو دوسری جانب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام العصر کی عبقریت ہے جنہیں انفرادیت اور خصوصی کمالات وامتیازات نے معاصرین کو سچی اور جچی تلی شہادت کے دینے پر مجبور کر دیا تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ جب امام العصر کا تبحر علمی اور ان کی حیرت انگیز وحیرت خیز وسعتِ معلومات اپنوں اور بیگانوں کو شہادت دینے پر مجبور کر رہی تھیں تو پھر قریب سے دیکھنے والے اور صبح وشام ان کی علمی گہرائیوں کو ناپنے والے اپنے تاثرات واحساسات کا فراخ دلی وفراخ حوصلگی کے ساتھ اظہار نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

یوں تو امام العصر کے متعلق معاصرین کی سینکڑوں شہادتیں ہیں جو دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر کاغذ کے صفحات میں ثبت ہو چکیں ہیں؛ لیکن خاکسار اس وقت ان سینکڑوں ہم عصروں کے ہزارہا تاثرات واحساسات میں سے کچھ اقوال بطور نمونہ ''مشتے از خروارے'' پیش کرتا ہے۔ اس ذیل میں سب سے پہلے مجھ کور باطن ہیچ مداں کی نظر آسمانِ علم کے آفتابِ جہاں تاب، جن کی ضیا پاشیوں سے کرۂ ارض بقعہ نور بنا ہوا ہے یعنی حکیم الامت حضرت تھانویؒ خلد اللہ قبرہ نوراً کے حکیمانہ اقوال پر پڑتی ہے جن کی عظمت واہمیت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ سب سے پہلے انہیں کو پیش کر کے ناظرین کے لیے خوانِ خلیل سے لذیذ ترین غذائیں پیش کروں، حضرت تھانویؒ کی مجلس میں جب یہ ذکر آیا کہ مستشرقین یورپ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہتے ہیں کہ امام اپنے زبردست علوم ومعارف کی وجہ سے اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل واضح اور روشن علامت ہیں تو سننے والوں نے اسی پر حضرت موصوف کی زبانِ دربار سے یہ حکیمانہ ارشاد بھی سنا کہ:

> ''میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ کا وجود بھی ہے، اگر اسلام میں کوئی کجی ہوتی تو مولانا انور شاہ یقیناً اسلام کو ترک کر دیتے۔'' (حیاتِ انور: ص ۲۰)

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت جیسے ثقہ اور محتاط کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے یہ حکیمانہ ارشادات ہیں جن میں نہ خوش عقیدگی کی غلو پسندی کو دخل ہے اور نہ عقیدت مفرط کی کرشمہ کاریوں کی آمیزش ہے۔ اللہ اکبر علوم ومعارف کا یہ بحر بیکراں جو ایک حاذق ونباض حکیم کی طرح مخاطب یا مشار الیہ کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اور محیط گفتگو کرنے کا خوگر ہے، امام العصر کے وجود کو اسلام کی حقانیت کے دلائل میں سے ایک کامل ومکمل دلیل قرار دے رہا ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ بعض افراد جو اس غلط فہمی میں

مبتلا رہے ہیں کہ غیر معمولی فضل وکمال کا غلبہ انسان کی دوسری تمام صفات پر بلکہ عقل پر بھی غالب آجاتا ہے اور انسانی زندگی علمی مشاغل میں دب کر عملی زندگی کو اختیار کرنے سے محروم وناکام رہتی ہے، امام العصر کے متعلق بھی اگر کوئی فرد بشر انہیں غلط فہمیوں میں مبتلا ہو یا مبتلا کر دیا گیا ہو اسی شخص کے لیے حکیم الامت کا یہ محتاط اور اعتدال پسند ارشاد ایک تنبیہ ہے۔ جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ حضرت امام العصر کا طویل تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''حضرت مولانا انور شاہ عالم باعمل ہیں''۔

(رسالہ ''انوار العلوم'' پاکستان)

اور اسی ارشاد پر حاضرین میں سے جب کسی کو شبہ ہوا کہ شاید حضرت حکیم الامت شاہ صاحب کو صرف ایک ممتاز عالم سمجھتے ہیں اور ان کی جامعیت ونابغیت کے قائل نہیں تو انہیں صاحب نے عرض کیا کہ:

''حضرت وہ تو بہت بڑے عالم ہیں''۔

جامع ملفوظات نے لکھا ہے کہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

''بھائی! علم تو ان کا مسلّم ہی ہے، میں کہہ رہا ہوں کہ وہ عالم باعمل ہیں''۔

خاکسار عرض کرتا ہے کہ حضرت امام العصر کی احسانی زندگی کی تاب ناکیوں اور جلوہ ریزیوں پر اپنے وقت کے حکیم الامت کی شہادت سب سے بڑی اور بلند وواثق شہادت ہے اس کے بعد علم کے ساتھ عمل کے کامیاب وبارآور پیوند پر کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

اور اسی طرح یہ مشہور روایت بھی منظر عام پر آچکی ہے کہ جب حضرت امام العصر نے الشیخ التھانوی نور اللہ مرقدہ کی تفسیر بیان القرآن کے متعلق درس میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

''اردو میں ایسی چست تفسیر دیکھنے میں نہیں آئی، اس تفسیر نے سینکڑوں تفاسیر سے

بے نیاز کر دیا۔‘‘

تو یہی تأثرات جب حکیم الامت کے سامنے نقل کیے گئے تو سنا گیا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے بڑی مسرّت کے ساتھ فرمایا کہ:

’’جب اتنے بڑے عالم کی نظر میں میری تفسیر قدر و قیمت حاصل کر گئی تو اب کسی اور کی تحسین کا مجھ کو انتظار باقی نہیں رہا۔‘‘

نہ جانے ہندوستان اور ممالک اسلامیہ کے طویل وعریض خطہ سے کتنی بڑی تعداد نے حضرت حکیم الامت کی بلند پایہ تفسیر کو سراہا ہوگا اور خدا جانے علوم و معارف کے موتیوں کے پہچاننے والے جوہریوں کی کتنی بڑی تعداد نے اس تفسیر کے مجموعہ کو قدر و قیمت کی نگاہوں سے دیکھا ہوگا؛ لیکن خود حکیم الامت، امام العصر کے تاثرات کے بعد نہ کسی کی تحسین کے منتظر تھے اور نہ کسی تائید کے متوقع، ایک معاصر کے علوم و معارف سے غیر معمولی تاثر کی یہ کیسی قوی اور روشن شہادت ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اپنے اس حکیمانہ قول سے امام العصر مرحوم کی جامعیت پر سب سے اعلیٰ اور کامل شہادت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

’’حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے ایک ایک فقرہ پر ایک ایک رسالہ تصنیف کیا جا سکتا ہے۔‘‘ (حیاتِ انور، ص: ۲۰۷)

مجھ جیسا ہیچ میرز حضرت تھانویؒ کے اس حکیمانہ ومحققانہ ارشاد کی تفسیر کیا کر سکتا ہے جس کی بے بضاعتی و تہی مائگی حضرت حکیم الامت مرحوم کے اس ایک جملہ کی بھی تفسیر و تشریح سے انکار کرتی ہے۔ ’’فیوض الرحمٰن‘‘ کے مؤلف و مرتب نے اپنی چشم دید شہادت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مجلس میں حکیم الامت نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا، ہم نے ایسے ایسے عالموں کو دیکھا ہے جن کے سامنے خود کو جاہل سمجھتے ہیں۔‘‘ سچ یہ ہے کہ حکیم الامت کا یہ ارشاد ہضم نفس اور انکسار کا آئینہ دار ہے ورنہ علوم و کمالات کے اس بحر قمقام میں ہزار ہا اہل علم وفضل تنکے کی طرح بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اسی ذیل میں حضرت شاہ صاحب کا طویل تذکرہ فرماتے ہوئے ان کی حق پژوہی اور

صداقت شعاری پر ایک واقعہ سناتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

''حضرت مولانا انور شاہ صاحب تحریکاتِ خلافت کے موافق تھے، ایک صاحب نے ان کے سامنے میرے خلاف کہنا شروع کیا اور برابر کہتے رہے کہ مولانا انور شاہ صاحبؒ اس پر سرخ ہو گئے اور کہا کہ جاہل! جس کی عمر تقویٰ وطہارت میں گذری ہو اس پر اعتراض کس منہ سے کرتے ہو۔'' (ص: ۳۰)

یوں تو حضرت حکیم الامتؒ کے تاثرات وخیالات کی سینکڑوں شہادتیں ہیں جو حضرتؒ والا کے ملفوظات اور ارشادت میں منتشر ہیں، خاکسار نے انہیں صحیفوں سے ڈھونڈ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور معاصر کو منافرت کے بجائے مسالمت ومصالحت کے انداز وآئینہ میں دکھانے کی سعی کی ہے۔ اب دسترخوان پر سے ان نعمتوں کو اٹھاتا ہوں، اس لیے کہ ناظرین کے کام ودہن اس ذائقہ سے یقیناً آشنا ہو چکے ہیں اور کہنے والے خدا جانے کیا کیا کہہ رہے اور سننے والے نے نہ جانے کیا کچھ سنا ہوگا؛ لیکن اگر سچائی کی تلاش اور حقیقت کی جستجو کے لیے وہ ''حیاتِ انور'' کے ص: ۱۶ کو دیکھ سکیں تو اسی میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے یہ الفاظ پائیں گے، جلسہ تعزیت میں تقریر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا کہ:

''میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء اور فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی لیکن تبحر علمی، وسعتِ معلومات، جامعیت اور علوم نقلیہ وعقلیہ کے احاطہ میں حضرت شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا''۔

شیخ الاسلامؒ کی زبانِ مبارک سے امام العصر کی عبقریت وجامعیت کا اعتراف ایک معاصر کا اپنے معاصر کے حق میں ایک مضبوط واستوار شہادت اور حضرت امام العصر کے کمالات کا پورا پورا اعتراف ہے اور اسی طرح حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے امام العصر مرحوم سے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار ایک تعزیتی تقریر میں فرمایا کہ:

''مجھ سے اگر شام ومصر کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ

تقی الدین ابن دقیق العید، اور سلطان العلماء، حضرت شیخ عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے؛ کیوں کہ زمانہ کا تقدم وتاخر ہے، اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو ان خصوصیات کے حاصل ہونے کی وجہ سے ان کے ہی ہم مرتبہ ہوتے۔'' (نفحۃ العنبر)

اور علامہ عثمانی کے تاثر کی عملی شہادت یہ تھی کہ باوجود اپنے تبحر علمی، حذاقتِ عامیہ، بےنظیر فقاہت اور بےمثل جودت وذکاوت کے امام العصر مرحوم کے سامنے زانوئے استفادہ طے کیا اور فضل وکمال کے اس سمندر میں غوطہ لگا کر سینکڑوں درِّ نایاب وگوہرِ آبدار سے اپنی دستارِ فضیلت کو مرصع ومزین کیا۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ واعلی اللہ تعالیٰ مقامہ فی الجنۃ.

اور پھر یہی نہیں کہ صرف اپنے حلقہ وجماعت کے افراد امام العصر کی نابغیت سے متاثر ہوئے ہوں؛ بلکہ اور حلقے بھی اس اعتراف میں شریک ہیں، میرا اشارہ العلامہ المرحوم السید سلیمان الندوی (۱) کی جانب ہے موصوف اب تو خود مرحوم ہو چکے، لیکن جس زمانے میں ان کا قلم یارانِ محفل کے اچانک اٹھ جانے پر نوحہ گری کرتا اس کو دیکھ

(۱) یہ بھی تسلیم وتاثر کی حسین ودل آویز شکل ہے کہ اگر ایک جانب مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم امام العصر سے متاثر تھے تو خود امام العصر بھی علامہ مرحوم سے اپنے تاثر کا بارہا اظہار فرماتے تھے، مولانا محمد انوری لائل پوری مدظلہ، نے جو حضرت امام العصر کے ممتاز تلامذہ اور خاص متعلقین میں سے ہیں، موصوف کو حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات والاصفات سے جو شغف اور عقیدت ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوپاک میں مولانا سے بڑھ کر حضرت شاہ صاحب کا وصاف کوئی نہیں، آپ کو حضرت مرحوم کی چودہ سالہ معیت کا شرف حاصل ہے اور آپ کی ذکاوت وذہانت نے حضرت کے علوم ونوادر کو بڑی باریک بینی کے ساتھ دامن نگاہ میں سمیٹ رکھا تھا، پچھلے دنوں پاکستان سے تشریف لائے، تقریباً ہر مجلس میں ''تذکرۂ انور'' رہا، بہت سے واقعات سننے میں آئے، مولانا کی عقیدت ووارفتگی کہہ رہی تھی۔

در بند آں مباش کہ مضمون نماندہ است
صد سال می تواں سخن از زلفِ یار گفت

(اس فکر میں مت پڑ کہ مضمون ختم ہو گیا، زلفِ یار کی بات تو سو سال تک بھی چل سکتی ہے۔)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کر پتھر کا سینہ اور سنگ خارا کا قلب شق ہوتا، حضرت امام العصر مرحوم کے ہوش رُبا سانحۂ ارتحال پر رنج وغم کے آنسو بہاتے ہوئے سیّد مرحوم نے جو کچھ لکھا تھا اس میں سے ایک جملہ خود اس قدر جامع ہے جس کی تشریح کے لیے مولانا گیلانی کی روانی طبع اور دور رس قلم کی ضرورت ہے، لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں۔'' (معارف ۱۹۵۲ء)

مولانا احمد رضا بجنوری سے میں نے سنا ہے کہ ''راندیر'' کے ایک سفر میں مولانا یوسف صاحب بنوریؒ نے علامہ مرحوم سے امام العصر اور ایک دوسرے بزرگ کے متعلق رائے دریافت کی تو سیّد صاحب مرحوم نے موازنہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''دونوں صاحبوں میں زمین و آسمان کی نسبت ہے۔''

علامہ مرحوم کی بلند نظر میں امام العصر آسمانِ علم تھے، غرضیکہ خاکسار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ امام العصرؒ سے اپنے اور بیگانے قریب ونزدیک کے سب ہی حلقے

(گذشتہ سے پیوستہ) آپ نے سنایا کہ مظفر گڑھ (پنجاب) کے اجلاس میں حضرت امام کشمیریؒ اور حضرت العلام ندوی رحمہا اللہ تعالی نے شرکت فرمائی۔ سیّد صاحب مرحوم شاہ صاحبؒ کی قیام گاہ پر تشریف لائے اور معراجِ جسمانی کے متعلق کچھ استفسارات کیے، شاہ صاحب کو ابتداء میں سید صاحب کا رنگ مناظرانہ محسوس ہوا، اس لیے حضرت مرحوم نے جواب میں اختصار ملحوظ رکھا؛ لیکن جلد ہی سید صاحب نے اپنی سلامتی طبع سے واضح کر دیا کہ مقصود استفادہ ہے، مناظرانہ چھیڑ چھاڑ نہیں، مولانا لائل پوری کہتے تھے کہ اب حضرت شاہ صاحب کھلے اور اس قدر پھیلے کہ سمیٹنا مشکل ہو گیا، دوسری جانب سیّد صاحب محظوظ ہوئے اور بے حد عقیدت مند۔ شب میں امام کشمیری نے چارپائی کے کھٹملوں سے تنگ آکر فرشِ زمین پر بستر دراز کیا تو علامہ ندوی نے بھی احتراماً فرشِ زمین کو اپنا بستر بنایا، مولانا لائل پوری کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب اپنی مجالس میں سید صاحب کے کمالات کا جب ذکر فرماتے تھے تو ان کی ''اس ادا'' کا خاص طور پر ذکر کرتے رحمۃ اللہ علیہ، مولانا علی میاں ندوی نے ایک ملاقات میں خاکسار سے کہا تھا: ''عبقریت و جامعیت میں شاہ صاحب مرحوم کے بعد علامہ ندوی کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی اور اب اس کارواں کے آخری سالار قافلہ مولانا گیلانیؒ ہیں''۔ او کما قال۔

متاثر ہو رہے تھے اور پھر یہی نہیں، بلکہ حضرت امام العصر کی عبقریت وجامعیت بیرونِ ہند کے اہل نظر فضلاء پر بھی اثر انداز تھی اور ہندوستان سے باہر کے علماء بھی باوجود اختلافِ مسلک ومشرب کے ہندوستان کے اس جلیل القدر فاضل کے علوم ومعارف سے اپنے تاثر کا فراخ حوصلگی کے ساتھ اظہار کر رہے تھے۔ اس سلسلے کی مشہور روایت جو اپنی شہرت کی وجہ سے تفصیل وبیان سے بے نیاز ہے، لیکن جو نہیں جانتے انہیں کو باخبر کرنے کے لیے نقل کرتا ہوں۔

مصر کے مشہور صاحبِ قلم علامہ رشید رضا مرحوم جب دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور امام العصر نے ایک عظیم الشان استقبالیہ تقریب میں ان کے سامنے فقہ حنفی کے اقرب الی السنت ہونے پر ایک نہایت پُر مغز اور عالمانہ وفاضلانہ تقریر کی تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم تقریر کے اختتام پر بے ساختہ بولے کہ:

"واللہ ما رایت مثل ھذا الاستاذ الجلیل قط."

(نظامِ تعلیم وتربیت، ص: ۲۸۴)

یعنی اتنا بڑا جلیل القدر فاضل وعلامہ دیکھنے میں نہیں آیا اور معلوم ہے کہ رشید رضا مرحوم شافعی المسلک اور متصلب شافعی تھے؛ لیکن اپنے غیر معمولی تاثر کو جو ایک حنفی عالم سے محسوس کر رہے تھے نہ دبا سکے، نہ چھپا سکے۔ اور اسی طرح مصر کے ایک اور فاضل جو تقریباً صحیحین کے حافظ اور جدید علوم پر واقفانہ نظر رکھتے اور جن کو مولانا عثمانی مرحوم کا علم وفضل بھی مطمئن نہیں کر سکا یعنی علامہ علی مصری حنبلیؒ جب دیوبند تشریف لائے تو طلبہ ہی کے ہجوم میں ہندوستانی علماء کے متعلق "ھم أعجام" کہہ کر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے؛ لیکن امام العصر کا ایک مرثیہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ "انی تبت من اعتقادی" اور پھر ذاتی ملاقات کے بعد جب حضرت امام العصر کے بحرِ ذخّار سے براہ راست واقفیت ہوئی تو چلتے چلتے کہتے تھے کہ:

"لو حلفت أنه أعلم من أبي حنيفة لما حنثت."

(حیات انور، ص: ۳۱۷)

یہ فیصلہ کیوں نہ کیا جائے کہ اختلافِ مذاق کے باوجود حضرت شاہ صاحب مرحوم کے متعلق ان وقیع الفاظ میں غیر معمولی تاثرات کا اظہار، کیا حضرت شاہ صاحب کی عبقریت کی کھلی ہوئی دلیل اور اجاگر علامت نہیں ہے؟ میں اپنے خیال کو اب دعوے کی شکل میں پیش کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ امام العصر مرحوم کے بے پناہ علوم ومعارف، جامعیت اور جلالتِ قدر نے معاصرین کو ان شہادتوں کے پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ ایک ''ہندی عالم'' سے اس قدر تاثر کچھ غیر ممکن سا نظر آتا ہے اور پھر جن متاخرین اجلہ علماء کو حضرت امام العصر مرحوم کے علوم وکمالات کا شفاہی تخمینہ لگانے کا موقع نہیں مل سکا، لیکن حضرت مرحوم کے خامہ عنبر شامہ سے نکلی ہوئی بعض تصانیف ان کی نظر سے گذریں تو ان ''اعاظم رجال'' نے حضرت امام العصر کے علوم وخصوصیات کو نہ صرف سراہا، بلکہ ان کے حوالوں سے اپنی تصانیف کو مزین کیا۔ قسطنطنیہ کے فاضل جلیل علامہ زاہد بن الحسن الکوثری جو بعد میں مصر میں جلاوطنی کی زندگی گذارتے رہے اور جن کی علمی عظمتوں سے آج علمی حلقے کافی متعارف اور روشناس ہیں، ان ہی نے امام العصر کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ابن الھمام(۱) مثلہ فی استعارۃ الابحاث النادرۃ من الاحادیث الخ''

(حیات انور، ص:۱۸۱)

یعنی احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد اس امت میں حضرت شاہ صاحب مرحوم کے بعد کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا، علامہ کوثری ایسے وسیع النظر محقق کی یہ شہادت ''امام العصر'' کی امتیازی مقام پر بیرونی علماء کی

(۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال نے لاہور کے جلسہ تعزیت کی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا کہ اسلام کی ادھر پانچ سو سالہ تاریخ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے اور علامہ کوثری نے فرمایا کہ ''ابن ہمام کے بعد احادیث سے دقیق مسائل کا استنباط کرنے والا شاہ صاحب ایسا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ابن ہمام (متوفی ۸۶۱ھ) اور حضرت امام کشمیریؒ میں کم وبیش پانچ سو سال کی مدت حائل ہے، عالم اسلام کے ایک محقق اور دوسرے مفکر کی رائے کا آپس میں یہ توارد حیرت انگیز ہے۔

پہلی تمام شہادتوں پر بھاری ہے اور ایسے ہی مصر میں ایک اور جلاوطن، ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے امام العصر کا رسالہ "مرقاۃ الطارم علیٰ حدوث العالم" کا جب گہری نظر سے مطالعہ کیا تو مولانا یوسف صاحب بنوریؒ سے بار بار کہا کہ:

"إني أفضل هذه الوريقات على جميع المادة الذاخرة في هذا الموضوع، فإني أفضلها على هذه الأسفار الأربعة للصدر الشيرازي."

(حیات انور، ص: ۱۹۳)

یعنی حدوثِ عالم پر آج قدیم وجدید علوم میں جو کچھ مواد ملتا ہے اس سب پر میں اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں اور صدر شیرازی کی یہ طویل اور ضخیم اسفارِ اربعہ اس رسالہ کے مقابل میں ہیچ ہے۔

بہر حال مختصر یہ کہ متأخرین اہل علم غالبؔ کی زبان میں امام العصر کی جلالتِ قدر اور علو مرتبت کا یوں اعتراف کر رہے ہیں کہ ؎

ریختہ کے تم ہی استاذ نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

آخر میں ایک ہندی فاضل کا ایک عجیب وغریب تأثر پیش کرتا ہوں، یہ واقعہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے براہِ راست مجھ کو سنایا تھا کہ "شاہ صاحبؒ دار العلوم کی تدریس کے بالکل ابتدائی دور میں، "چھتہ مسجد" کے ایک شکستہ کمرے میں اقامت پذیر تھے۔ ایک روز دہلی سے مولانا امین الدین صاحب مرحوم بانیٔ مدرسہ امینیہ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے، اور فوراً ہی مولانا اعزاز علی صاحب کی معیت میں شاہ صاحبؒ سے ملاقات کے ارادے سے نکلے۔ مولانا اعزاز علی صاحب نے فرمایا کہ مولانا امین الدین صاحب نے جب شاہ صاحبؒ کو اسی شکستہ وخستہ کمرے میں فروکش پایا تو اشک آلود ہو کر مجھ سے بولے کہ:

"تم (یعنی مولانا اعزاز علی) نے ان کو (شاہ صاحبؒ کو) اس طرح سے رکھ چھوڑا

ہے یہ تو اس قابل تھے کہ ان کو "دولہا" بنا کر رکھا جاتا۔"

مولانا امین الدین صاحب کے یہ سید تھے سادہ تھے ان کے نیز معمولی تاثر اور معاصرانہ تعلق و عقیدت کی ایک دلیل ہے، مرحوم نے اپنے خصوصی شغف کا جس بے ساختگی کے ساتھ اظہار کیا اس میں قلبی ارتباط کی جھلک صاف نظر آرہی ہے۔

خاکسار نے اپنے موضوع پر اختصار کے ساتھ چند واقعات پیش کر کے معاصرہ کو منافرہ کے بجائے مناسبت اور مسالمت و موافقت کے رنگ میں دکھانے کی کوشش کی ہے، یہ ذخیرہ کافی طویل ہے اس مختصر سے مضمون میں تمام شہادتوں کو پیش کرنا مشکل ہے۔

* * *

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

وطن شاہجہاں پور، دہلی میں سکونت اختیار کی، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، حضرت شیخ الہندؒ کے معروف تلمیذ، جمعیۃ العلماء کے مؤسس، مدرسہ امینیہ کے رئیس الاہتمام، تعلیم الاسلام کے مؤلف، مفتی اعظم، خوش پوشش، مزاج میں نظافت پسندی گویا کہ ودیعت تھی، برقی چولہا جو طالب علمی میں خریدا گیا تھا، امینیہ کے اہتمام کے دور میں بھی محسوس ہوتا کہ ابھی بازار سے خریدا گیا ہے، بہترین خطّاط، اپنے کپڑے خود سی لیتے، اپنی ٹوپی خود بن لیتے، سیاسی بصیرت اعلیٰ ترین، مجلس کی تجاویز ایسی گھٹی بندھی لکھتے کہ کسی کو انگلی رکھنے کا حوصلہ نہ تھا، قد مائل بہ پستی، رنگ گہرا گندمی، بھنویں سفید اور دراز، شیروانی زیب بدن، پاؤں میں ہمیشہ گرگابی، دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ اور بڑے باوقار، میں دہلی تعلیم کے لیے پہنچا، تو ایک بار مفتی صاحب نے یاد فرمایا۔ سرسری گفتگو کے بعد، زیادہ سوالات رہائش، تعلیم، اخراجات طعام وناشتہ وپوشاک سے متعلق فرماتے رہے، اخیر میں فرمایا کہ افریقہ سے الحاج داؤد موسیٰ راجہ نے آپ کے تعلیمی مصارف کا نظم کیا ہے، ہر ماہ مجھ سے لیتے رہیے، جس دن رقم لینے کے لیے حاضر ہوتا تو وہ یوم الحساب ہوتا۔ ادھر پچھتّر سالہ بوڑھا، گھاگ، جہاں دیدہ، حاذق وتجربہ کار، تو دوسری طرف پندرہ سالہ نوخیز، ناپختہ کار، مصارف زیادہ پیش کیے جاتے۔ اس پر محاسبہ شروع ہوتا۔ اسے نہ بھولیے، بوڑھے شیر کے پنجہ میں کم سن، کہاں کھانا کھاتے ہو؟ بلّی ماران کے ہوٹل میں۔ کون سے ہوٹل میں؟ کالے خان ہوٹل میں۔ کون سے درجے کا؟

''درمیانی'' قیمت چالیس کیسے لکھی جب کہ وہاں درمیانی کھانے کی قیمت ۲۶ روپیہ ہے۔شیروانی کے لیے کپڑا کہاں سے خریدا؟ جامع مسجد کی فلاں دکان سے، کپڑے کی قیمت ساڑھے چارروپیہ ہے، تم نے آٹھ روپے کیسے لکھی؟ تھانہ، تھانیدار اور معصوم مجرم، انکشافِ جرم کا لازمی نتیجہ پانی پانی ہونا ہے، سو مجرم غرقِ آبِ شرم ہوتا۔ پھر ایک دن نصیحت فرمائی جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

''مولوی انظر! تم رئیسوں کو جانتے نہیں، کبھی یہ سخاوت کے طارم اعلیٰ پر ہوتے ہیں تو گاہے بخل کی زمین بنجر پر۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلۂ تعلیم جاری رہے، اس لیے سوچ سمجھ کر لکھا کرو، آدمی کی کیفیت یکساں نہیں رہتی، خدا جانے جب دینا شروع کیا تو کیا تاثرات تھے اور اب کیا ہیں؟

ایک بار صبح نو بجے فتح پوری مسجد میں کسی تقریب سے تقریر فرمارہے تھے، نہ مقررانہ جوش، نہ قائدانہ انداز؛ بلکہ فقیہانہ اطوار، گویا کہ معلم، الصبیان کو تعلیم دے رہا ہے، سامعین سے سوال تھا کہ عقلمند کون ہے؟ ظاہر ہے جواب کون دیتا، خود ہی فرمایا ''عقلمند وہ ہے جو نہ خود نقصان اٹھائے نہ دوسرے کو نقصان پہنچائے۔ مفتی اعظم کا یہ ارشاد آج بھی زندگی کے نشیب وفراز میں ''راہ نما'' ہے۔ مفتی صاحب بڑے ضابطہ کے آدمی اور اصول پسند تھے، دارالعلوم دیوبند میں ایک صاحب پر کوئی مقدمہ قائم ہوا، حضرت مدنیؒ ان صاحب کی حمایت میں تھے، شوریٰ کا اجلاس ہونے والا تھا، فراش خانہ دہلی میں ایک یونانی دواخانے کا پُرشکوہ افتتاح کے موقع پر جس میں اکابر مدعو تھے، زینے سے بالائی منزل پر چڑھتے ہوئے، مفتی صاحب آگے تھے اور مولانا ان سے پیچھے، مولانا نے کچھ کاغذات ان صاحب سے متعلق مفتی صاحب کو دیتے ہوئے فرمایا کہ انہیں مطالعہ کر لیجیے، فرمایا کہ ''مولانا! قصۂ زمین برسرِ زمین، دیوبند شوریٰ میں پیش کیجیے۔'' ایک جملہ اس سے بھی سخت ارشاد ہوا جسے نقل کرنے کی ہمت نہیں۔ یہ تھے مفتیٔ اعظم اور ان کا طنطنہ، اسّی سے زیادہ کی عمر میں دہلی میں وفات پاکر دائرۂ بختیار کاکی میں

آسودۂ خواب راحت ہیں؛ حالاں کہ مسند افتاء ہمیشہ کے لیے ان جیسے فقیہ کے لیے چشم براہ رہے گی۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

* * *

عزیزم مولوی انظر شاہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ افریقہ کی جو رقم بطور وظیفہ تعلیمی، آپ کی میرے پاس امانت تھی، وہ آپ کے استاذ جناب مولوی ادریس صاحب میرٹھی ادارہ شرقیہ عقبِ جامع مسجد دہلی کو دے دی گئی، اب آپ انہیں سے معاملہ رکھیں۔

میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

کفایت اللہ

کان اللہ لہٗ

مدرسہ امینیہ، دہلی

حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

عالم اسلام کی ایک نادرۂ کار شخصیت، محدث، مفسر، متکلم، سحر البیان واعظ، انشاء پرداز، پاکستان کے معمار، اس کی پارلیمنٹ کے رکن اور اس سلطنت کے پہلے شیخ الاسلام، قرار دادِ اسلامی کے مصنف، دیوبند کے عثمانی خاندان کے چشم و چراغ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دار العلوم اور مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن کے برادرِ خورد، حضرت شیخ الہند کے ارشد تلمیذ؛ بلکہ ان کی تحریک استخلاصِ وطن کے رکن، بولنے پر آتے تو مجمع پر اس طرح چھا جاتے کہ سامعین کے ذہنوں کو جس رخ پر چاہیں ڈال دیں۔ حلقۂ درس میں گل افشانی گفتار موسم بہار کا حسین منظر تھی، لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو شرح مسلم فتح الملہم کی تصنیف لطیف ان کی حدیثی کاوشوں کا شاہکار ہے۔ اپنے استاذ مرحوم حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن پر حواشی درج فرمائے تو پورے تفسیری ذخیرے کا لبِ لباب اور کتب خانۂ تفسیر سے بے نیاز کر دینے والا سرمایۂ علم فراہم کر دیا ہے جس کا فارسی ترجمہ افغانستان میں ہوا اور مزین و مطلی عکس ہانگ کانگ سے شائع کیا گیا۔ جمعیۃ العلماء کی صدارت کی، اس سے جدا ہو کر جمعیۃ علمائے اسلام بنا ڈالی اور اس پلیٹ فارم سے پاکستان کے تخیل کو ایک واقعہ کر دکھایا، نواب زادہ لیاقت علی خاں سابق وزیر اعظم پاکستان کا غیر منقسم ہندوستان میں مولوی محمد احمد کاظمی سے الیکشنی مقابلہ ہوا تو عطاء اللہ شاہ کی خطابت، حبیب الرحمٰن کی پکار، حسین احمد کی شجاعت، جواہر لال کی دوڑ دھوپ؛ بلکہ پورے قوم پرور حلقے کی حمایت اور انڈین نیشنل کانگریس کی امداد کاظمی صاحب کو حاصل تھی؛ لیکن علامہ عثمانی آندھی کی طرح اٹھے اور اپنے طوفانی دورے سے لیاقت علی خاں کی ڈگمگاتی

کشتی کو نہ صرف ساحل پر پہنچایا، بلکہ اربابِ نظر کا فیصلہ ہے کہ لیاقت علی کی اس الیکشن میں کامیابی پاکستان کے حق میں دوررس نتائج کی حامل بن گئی۔ دار العلوم میں تدریس کے بعد صدارتِ اہتمام پر آئے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ حاضر جواب اس بلا کے تھے کہ مخاطب کو دو لفظی گرفت میں الجھا دیتے، تلوّن، غیر مستقل مزاجی انھیں اس منصبِ عالی پر جانے سے روکتی رہی جس کے وہ واقعی مستحق تھے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن ان کے شاگرد تھے، ایک موقع پر ان پر عتاب ہوا، مجاہد ملت نے چند مہینوں کا وقفہ درمیان میں ڈال کر درِ دولت پر حاضری دی، علامہ مرحوم مسند پر جلوہ فرما تھے، شاگردانہ سعادت کے ساتھ ان کے پاؤں تھام لیے، بس پھر کیا تھا سینۂ بے کینہ صاف ہوگیا، چند منٹ کے بعد مجاہد ملت اٹھ آئے تو ہر آنے جانے والے سے ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے، بھوپال کا الیکشنی سفر فرمایا تو وہاں سے آ کر روئدادِ سفر اس تفصیل سے بیان کی کہ شب کا وقت، میں اپنے کمپارٹمنٹ میں مصروفِ آرام؛ لیکن جانشیں شیخ الہند کے زندہ باد کے نعروں نے مجھے بیدار کر دیا۔ قدرتِ کلام اس قدر حاصل تھی کہ معمولی بات کو بھی رازی کا فلسفہ، بوعلی سینا کی موشگافی، غزالی کا کلام بنا دیتے، حال ہی میں پاکستان سے ان کی تقریر بخاری کی پہلی جلد آئی جو ان کے کمالاتِ علمی کا آئینہ ہے۔ بڑے خوبیوں کے انسان، بلند صفات کے مالک اور عالی روایات کے حامل تھے، بھاولپور میں تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لیے پہنچے تو واقفین کا بیان ہے کہ درون پردہ سازشوں سے موت کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیے گئے، اس طرح علم کا ایک خزانہ اور کمالاتِ علمی کا گنج گراں مایہ پاکستان کے دار السلطنت کراچی میں ناقدر شناس طبقے کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہوگیا۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری علیہ الرحمہ

اسی کتاب کے انہیں صفحات میں سلوک وتصوف سے متعلق میرے جاہلانہ نظریات آپ کے مطالعہ میں آئیں گے اور یہ عرض کر چکا ہوں کہ نہ تصوف کے تمام سرمایہ سے کارہ ہوں اور نہ جاہلانہ رسوم جن کو تصوف کا نام دیا گیا ان کو قبول کرنے کے لیے طبیعت آمادہ!

تیرہویں و چودہویں صدی میں صرف حضرت تھانویؒ کے سلوک وتصوف سے عقیدت اور ان کے افکار و تعلیمات سے وابستگی رکھتا ہوں، ویسے بارہویں صدی کے اختتام اور تیرہویں صدی کے آغاز میں مطلع سلوک پر جو چند آفتاب و ماہتاب نمودار ہوئے ان میں قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ بڑی اونچی و بلند بالا شخصیت کے مالک ہیں، حضرت کے یہاں اتباعِ سنت کا غلبہ تھا اور تفقہ فی الدین کے پیکر۔ مجھ سے ایک بار دارالعلوم کے کتب خانہ میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر نے دریافت کیا کہ دیوبندیت کا امام کون ہے؟ میں نے بے تکلف جواب دیا کہ ''حضرت گنگوہیؒ'' اور یہ غلط بھی نہیں، دارالعلوم دیوبند کے بانی اگرچہ نانوتویؒ ہیں؛ لیکن حضرت مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی اور غلبہ تادّب کی بناء پر وہ کسی فکر سے تصادم نہ رکھتے، اگر گستاخی نہ ہو تو حافظ کا یہ شعر مولانا نانوتوی مرحوم کی حیات کی صحیح عکاسی کرتا ہے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت نانوتوی مرحوم ہر فکر کو قبول کرنے کے لیے

تیار تھے، عیسائی مشنریوں کا تعاقب، آریہ سماجیوں سے ان کے مناظرے، تاریخِ دیوبند کے شاہکار ہیں، مطلب صرف اتنا ہے کہ اپنے مرشد سیدنا الحاج امداداللہ مہاجر مکیؒ کے ایک خاص لون اور مشرقی رنگ کو حضرت نانوتویؒ اگرچہ قبول نہ فرماتے، لیکن اس پر کھلم کھلا تنقید بھی نہ تھی، یہ حضرت گنگوہیؒ ہی تھے جنہوں نے حضرت حاجی صاحب مرحوم کے بعض رسائل کو نذرِ آتش کر دیا اور جب حضرت سے عرض کیا گیا کہ یہ آپ کے مرشد کی تصانیف ہیں تو فرمایا کہ ''طریقت میں وہ میرے مرشد ہیں اور شریعت میں میں ان کا امام ہوں۔'' میں صاف صاف کہتا ہوں کہ دارالعلوم کے موجودہ حالات میں جب کہ حضرت حاجی عابد حسین المغفور کو اس کا بانی بتایا جا رہا ہے، کاش کہ یہ ہنگامہ برپا کرنے والے سوچتے کہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کی آویزشیں محض دارالعلوم کو مختصر رکھنے یا وسیع بنانے کے موضوع پر نہ تھیں جیسا کہ سمجھ لیا گیا، بلکہ دو فکر متصادم تھے، حاجی عابد حسین صاحب مرحوم فکر امدادالٰہی کے علمبردار تھے اور حضرت نانوتویؒ کی تائید میں حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ کا غلبہ اتباعِ سنت تھا جس کے نتیجہ میں دیوبند، دیوبند بنا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ حضرت گنگوہیؒ کو بانیٔ دارالعلوم کہا جاتا، مگر شاید اس وجہ سے نہیں اختیار کیا گیا کہ بناء وتعمیر سے ظاہری عمارت مراد لی گئی ہے۔

بہرحال دیوبندیت ایک فکر ہے، ایک اسکول ہے اور اس کے حقیقی معمار حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ اور سیّدنا الامام مولانا نانوتوی قدس سرہٗ ہیں، حضرت کے درِ دولت گنگوہ میں درسِ حدیث بھی ہوتا اور عرفان ومعرفت کے خم بھی لنڈھائے جاتے، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا حکیم الامت ومجدد وقت اس امت کو حضرت گنگوہیؒ نے گڑھ گڑھا کر دیا ہے، ورنہ اپنے آغاز میں یہ حکیم الامت بھی فکرِ امدادیت سے متأثر تھے، مولانا گنگوہیؒ نے چار حسین ترین اشخاص خانقاہ نشیں ایسے تیار کیے جن کا سلسلہ ان شاءاللہ قیامت تک رہے گا، دیوبند میں حضرت مولانا محمود حسن المعروف بشیخ الہند، سہارنپور میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب، رائپور میں حضرت شاہ

عبدالرحیم صاحب اور مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی ۔ میں اس دفتر میں ذکر خانقاہ رائپور کے امام ثانی کا کررہا ہوں یعنی حضرت شاہ عبدالقادرؒ۔ میں دیوبند میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کررہا تھا تو حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری علیہ الرحمہ کے چرچے مجھ تک پہنچتے، میری والدہ مرحومہ شباب سے نکل کر شیب کی پگڈنڈی پر چل رہی تھیں اور فکر آخرت ان پر سوار، کسی سے بیعت ہونا چاہتی تھیں، نظر انتخاب حضرت رائپوری قدس سرہٗ پر جا ٹھہری، ایک دن معلوم ہوا کہ حضرت سہارنپور تشریف فرما ہیں، حضرت مولانا زکریا صاحب مرحوم کے یہاں قیام رہا، بیعت کی درخواست کی تو مولانا رائپوری جو تواضع کا پیکر تھے اور اس وجہ سے کے والد مرحوم کے شاگرد بھی تھے، متواضعانہ کلمات فرماتے رہے، بار بار حضرت مدنی اور حضرت سہارنپوری کا وقیع ذکر فرماتے اور ان ہی سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، لیکن والدہ مرحومہ کے اصرار پر شرماتے ہوئے لجاتے ہوئے بیعت فرمالیا اور بجائے اس کے والدہ کچھ ہدیہ پیش فرماتیں، خود ہی حق شاگردی کے تحت ایک گرانمایہ رقم بطور ہدیہ عنایت فرمائی، میں نے صبح کو دل بھر کر زیارت کی۔

قد مائل بطول قامتی، بھاری بھر کم تن وتوش، نہایت گھنی ڈاڑھی، آنکھوں میں سرمہ، ہلکے ہلکے مسنون بال، چہار گوشہ ٹوپی، لمبا کرتا، اور نصف ساق تک پائجامہ، چہرے پر نورانیت، بشرہ پر معصومیت، باتیں بڑی معصومانہ، انداز محبوبانہ، اچانک صبح کو حضرت مدنی بھی دیوبند سے سہارنپور پہنچ گئے تو شیخ الحدیث کے کچے کمرہ میں ناشتہ کے لیے دسترخوان بچھا۔ نشست کچھ اس طرح ہوئی کہ حضرت رائپوری درمیان میں، دائیں جانب حضرت مدنی اور بائیں طرف مولانا زکریا صاحب کچھ دیر کے بعد حضرت رائپوری نے فرمایا کہ ''دو پہاڑوں کے بیچ میں آگیا ہوں۔'' حضرت مدنیؒ نے برجستہ جواب دیا'' کہ پہاڑ تو مولانا زکریا صاحب ہیں، کہیں یہ مجھے پیس کر نہ رکھ دیں اسی لیے میں نے آپ کو آڑ بنایا ہے۔'' تینوں حضرات مسکرائے تو حضرت رائپوری کے حسین ترین دانت نظر آئے، ناشتے سے فراغت پر میں دیوبند واپس آگیا اور والدہ مرحومہ بھی۔

پھر کئی بار خانقاہ رائپور جانے کی سعادت نصیب ہوئی، کبھی سائیکل سے، کبھی تانگے سے، یہ دریا کے کنارے آبادی سے دور ایک لمبا چوڑا باغ ہے جس کا نام ''گلشن رحیمیہ'' رکھا گیا۔ کچھ کچے مکانات کچھ جھونپڑے، کچھ لکڑیوں کے سہارے کھڑے ہوئے چھپر جن میں صرف چارپائیاں پڑی رہتیں اور ہواؤں کے خنک جھونکے یا لوؤں کے تھپیڑے مقیم حضرات کی خبر لیتے، ایک رات مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، عجیب منظر تھا، تین بجے شب میں سب کو جگا دیا گیا، وضو کا حکم ہوا اور پھر ہر ایک کے ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دو بسکٹ تھما دیے گئے، بیڈ ٹی پر میں بہت خوش ہوا، اس کے بعد دوسرا آرڈر یہ تھا کہ اب سب عبادت میں لگ جائیں، کوئی مصروفِ ذکر ہو گیا، کوئی تلاوت میں مشغول ہو گیا، کسی نے نوافل کی نیت باندھ لی، کہیں سے تسبیح کے دانوں کی کھٹا کھٹ سنی جانے لگی اور نماز فجر، پھر اشراق تک یہی مصروفیات، میرا خیال تھا کہ اشراق سے فارغ ہو کر ناشتہ کا دستر خوان بچھے گا، لیکن وہاں ناشتہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں چائے کا رسیا، اِدھر اُدھر خوب دوڑا، لیکن تیس چالیس سال پہلے کا یہ گاؤں یہاں دور دور تک بھی چائے کا نام ونشان نہ تھا، اس وقت ٹھیک میری حالت یہ بنی ہوئی تھی۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

مرحوم کی مجلس میں فتوح الشام پڑھی جاتی، مجاہدین اسلام کی شجاعت کے واقعات ہوتے تو حضرت کے جسم میں ایک مجاہدانہ حرکت نمایاں ہوتی اور جب اعداء اسلام کا غلبہ نظر آتا، تو چہرہ پر حزن وملال کی کیفیتیں دکھائیں دیتیں، خود بہت ہی کم فرماتے، بلکہ جب فرماتے تو ان کے معصوم انداز پر ہنسی آتی، پاکستان بن چکا تھا، لیکن ابھی پاسپورٹ و ویزا وغیرہ کا نظام قائم نہ ہوا تھا، شاید کسی پروانہ راہداری پر دولتین کا سفر ہو جاتا، اس لیے پاکستانی جو حضرت کے ہموطن تھے بیشتر رائپور پہنچتے اور مقیم ہوتے، ایک دن دوپہر کو حضرت قیلولے کی تیاری فرما رہے تھے، ایک پنجابی نے بڑی بے تکلفی سے کھڑے ہو کر کہا کہ

پھر کئی بار خانقاہ رائپور جانے کی سعادت نصیب ہوئی، کبھی سائیکل سے، کبھی تانگے سے، یہ دریا کے کنارے آبادی سے دور ایک لمبا چوڑا باغ ہے جس کا نام ''گلشن رحیمیہ'' رکھا گیا۔ کچھ کچے مکانات کچھ جھونپڑے، کچھ لکڑیوں کے سہارے کھڑے ہوئے چھپر جن میں صرف چارپائیاں پڑی رہتیں اور ہواؤں کے خنک جھونکے یا لوؤں کے تھپیڑے مقیم حضرات کی خبر لیتے، ایک رات مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، عجیب منظر تھا، تین بجے شب میں سب کو جگا دیا گیا، وضو کا حکم ہوا اور پھر ہر ایک کے ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دو بسکٹ تھما دیے گئے، بیڈ ٹی پر میں بہت خوش ہوا، اس کے بعد دوسرا آرڈر یہ تھا کہ اب سب عبادت میں لگ جائیں، کوئی مصروفِ ذکر ہو گیا، کوئی تلاوت میں مشغول ہو گیا، کسی نے نوافل کی نیت باندھ لی، کہیں سے تسبیح کے دانوں کی کھٹا کھٹ سنی جانے لگی اور نماز فجر، پھر اشراق تک یہی مصروفیات، میرا خیال تھا کہ اشراق سے فارغ ہو کر ناشتہ کا دسترخوان بچھے گا، لیکن وہاں ناشتہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں چائے کا رسیا، اِدھر اُدھر خوب دوڑا، لیکن تیس چالیس سال پہلے کا یہ گاؤں یہاں دور دور تک بھی چائے کا نام ونشان نہ تھا، اس وقت ٹھیک میری حالت یہ بنی ہوئی تھی۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

مرحوم کی مجلس میں فتوح الشام پڑھی جاتی، مجاہدین اسلام کی شجاعت کے واقعات ہوتے تو حضرت کے جسم میں ایک مجاہدانہ حرکت نمایاں ہوتی اور جب اعداء اسلام کا غلبہ نظر آتا، تو چہرہ پر حزن وملال کی کیفیتیں دکھائیں دیتیں، خود بہت ہی کم فرماتے، بلکہ جب فرماتے تو ان کے معصوم انداز پر ہنسی آتی، پاکستان بن چکا تھا، لیکن ابھی پاسپورٹ وویزا وغیرہ کا نظام قائم نہ ہوا تھا، شاید کسی پروانہ راہداری پر دو لتین کا سفر ہو جاتا، اس لیے پاکستانی جو حضرت کے ہموطن تھے بیشتر رائپور پہنچتے اور مقیم ہوتے، ایک دن دوپہر کو حضرت قیلولے کی تیاری فرما رہے تھے، ایک پنجابی نے بڑی بے تکلفی سے کھڑے ہو کر کہا کہ

حضرت میں وطن جارہا ہوں، کرایہ دے دیجیے۔ فرمایا: ارے ہمارے پاس کہاں دھرا ہے، دعا میں جٹ جا، کوئی دے گا تو دیں گے، بعد نماز ظہر لاہور کے ایک متمول جن کا غالباً بجلی کے پنکھوں کا کارخانہ تھا، واپس ہورہے تھے، انہوں نے سو سو کے پانچ نوٹ حضرت کے ہاتھ میں تھما دیے تو فرمایا کہ ''ارے وہ پنجابی کہاں ہے جو کرایہ مانگ رہا تھا، وہ صاحب کھڑے ہوگئے، حضرت نے یہ رقم ان کو تھمادی، وہ بھی عجیب آدمی تھا بولا کہ حضرت یہ تو پانچ سو ہیں مجھے تو کل سترہ روپے چاہئیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ ہم نے تو اسی وقت نیت کرلی تھی کہ جو کچھ آئے گا تجھ کو دیدیں گے'' جا تیری تو موجاں آگئیں۔''

ایک بار جمعیۃ العلماء کے لیے رائپور کا سفر ہوا، حضرت اقدس سے عرض کیا کہ جمعیۃ العلماء کا جلسہ رائپور کی مسجد میں کرنا ہے، اس پر اپنے دیرینہ خادم بھائی الطاف کو پکارا اور فرمایا کہ ''یہ بڑے لوگ آئے ہیں ان کا مسجد میں جلسہ کرلو۔'' بھائی الطاف بولے ''کہ حضرت تبلیغی جماعت آئی ہوئی ہے، اس کا اعلان ہو چکا ہے، حضرت بولے کہ ان کا کام سپیسل (اسپیشل) ہے۔ بھائی الطاف کو کبھی برا بھلا کہتے اور بعد چندے بطور تالیف قلب فرماتے کہ ''الطاف! تو برا نہ مانیو میں نے اپنے نفس کا نام الطاف رکھ رکھا ہے، اسی کو ڈانٹتا ہوں، تمہیں نہیں۔''

ایک مرتبہ میں حاضر تھا، مغرب کے بعد کا وقت ایک چارپائی پر حضرت اقدس، تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے اور سامنے کی چارپائی پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم دراز، حالاں کہ وہ حضرت رائپوریؒ سے بیعت تھے، لیکن پنجابیوں کے قلب میں محبت ہوتی ہے اور ظاہری تکلفات سے آزاد، مجلس جمی تو کسی صاحب نے کوئی سیاسی سوال حضرت سے کردیا، مولانا لدھیانوی کو آواز دے کر حضرت نے فرمایا کہ مولوی جی! دیکھو یہ ہمیں پریشان کررہا ہے، مولانا لدھیانوی اس پر چمک کر اٹھ بیٹھے اور پھر سیاسی موضوع پر ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی جسے حضرت رائپوری بھی بغایت توجہ سنتے رہے۔ ڈاکٹر سیّد محمود وزارت سے الگ ہونے کے بعد رائپور پہنچے اور کچھ دن

مقیم رہے، جس دن رخصت ہو رہے تھے اتفاقاً میں بھی خانقاہ میں تھا، موصوف نے حضرت کو کچھ ہدیہ دینا چاہا، حالاں کہ حضرت ہدیہ بے تکلف لے لیتے؛ لیکن خدا جانے ڈاکٹر صاحب کے ہدیہ سے طبیعت کو کیوں اباء تھا، بھائی الطاف کو یاد کیا اور فرمایا کہ کل گاؤں میں ایک موت ہوئی تھی اس کے متروکہ کپڑے، لحاف، گدا، اور غسل دینے کے لیے گھڑا اور لوٹے آئے تھے جو ہمارے یہاں پہنچادیے گئے، سب اٹھالاؤ، بھائی الطاف نے یہ سب چیزیں سامنے لارکھیں، تو ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب ہمارے یہاں تو اللہ کے نام پر بہت سی چیزیں آجاتی ہیں آپ کے ہدیہ کی ضرورت نہیں۔"

حضرت رائپوری کی حیات عجیب وغریب مراحل سے گذری، وہ بدعت کے مرکز بریلی بھی پہنچے، کسی اور سے نہیں بلکہ مولوی احمد رضا خاں صاحب کے خانوادہ سے تعلق رہا، وہاں معاملات کے کچھ جھول دیکھے تو کھڑے اور عیاذاً باللہ مرکز قادیان سے بھی رابطہ پیدا کیا، مگر قدرت جس شخصیت کو دین خالص کی خدمت کے لیے منتخب کر چکی تھی وہی قدم بہ قدم حفاظت کرتی رہی۔ آخر الامر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کے ذات سے وابستہ ہو گئے، پھر "وفاداری بشرط استواری اصل ایماں" کے اصول پر ہمیشہ عامل رہے، خانقاہ رائپوران کے دم سے آباد و پُر رونق تھی، جب دنیا سے اٹھے تو یہ گلشن خزاں رسیدہ ہو گیا، موت کے بعد عجیب سانحہ پیش آیا کہ کچھ لوگ ان کی میت کو رائپور منتقل کرنا چاہتے اور کچھ کا اصرار تھا کہ حضرت کی بستی ڈھڈھیاں میں بدستور مدفون رہیں۔ مولویوں کی جنگ شرعی جہاد بن جاتا ہے؛ چناں چہ اس موضوع پر بھی طبع آزمائی شروع ہو گئی۔ مضمون، مقالے دھڑا دھڑ آنے لگے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ پھر اس تلخ ترین داستان کا خاتمہ بالخیر ہو گیا اور اب ڈھڈیاں اس وجودِ اقدس کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے فیروزہ بختی کا اعلان کرتی ہے۔

برّد اللہ مضجعہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

خاکسار نے بخاری شریف، ترمذی شریف اسی مردحق آگاہ اور مسند آرائے حدیث سے پڑھنے کا شرف حاصل کیا ہے، بلکہ بیعت کی سعادت بھی حضرت اقدس سے ہے، ان کے خادم خاص جناب مولانا قاری اصغر علی صاحب مرحوم میرے شفیق استاذ تھے۔ مرحوم حضرت کے دولت کدہ پر مقیم، احقر کی تعلیم وہیں ہوتی، بیشتر حضرت قاری صاحب کی فرودگاہ پر تشریف فرما ہوتے، دید کا تو اکثر موقع ملتا؛ لیکن عرض ومعروض کا حوصلہ نہ تھا۔

تاہم یہ بھی کچھ کم نہیں کہ وہ خاکسار کو خوب پہچانتے، بچپن کی حماقت کے سوا اسے اور کیا کہیے گا کہ بمبئی تشریف لے جارہے تھے، رفیق سفر نصیر صاحب جو حضرت کے سسرالی رشتہ دار تھے، مجھ نادان نے براہ راست حضرت سے فرمائش کی کہ احقر کے لیے بحر الرائق لے آئیں اور رقم برائے خریداری بھی پیش کردی جسے حضرت نے لے کر رکھ لی، بحر الرائق آگئی اور قیمت بھی واپس فرمادی۔ وطن مالوف رمضان المبارک میں تشریف لے گئے، وہاں کے مشہور دوڑیا کی احمقانہ فرمائش ہوئی، حضرت نے اپنی معروف کریمانہ عادت کی بناء پر یہ گذارش بھی پوری فرمادی، آج جب یہ احمقانہ حرکتیں یاد آتی ہیں تو دل اور زبان انا اللہ الخ پڑھتے ہیں کہ مخدوم عالم سے نادان نے کیا کام لیا۔

الیکشن کا زمانہ تھا اور میری طالب علمی، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سوشلسٹ لیڈر کا صبح کو دیوبند میں پروگرام، طلبہ دیوبند کے جلسوں میں ہمیشہ زیادہ رہتے ہیں، اس روز صبح

کے اخبارات میں حضرت کا بیان کانگریس کے لیے خاص طور پر مسلمانوں سے ووٹ استعمال کرنے کی اپیل تھی۔لوہیا اسٹیج پر پہنچے تو یہ اخبار ہاتھ میں تھا۔ابتدائی تقریر دیو بند کی عظمت اور حضرت کے جلیل منصب کے اعتراف میں، لیکن پلٹے اور بولے کہ آزاد ہندوستان میں کسی شخص کو اپنی قوم کے لیے یہ مشورہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی رائے فلاں پارٹی کے لیے استعمال کریں۔اس پر مولوی محمد بھاٹا بارڈولی کے طالب علم جوابدہی کے لیے بول پڑے، یہ نوآموز، ادھر لوہیا ایسا گھاگ، تڑخ کر بولے کہ ''مولوی صاحب! اسٹیج پر آکر جواب دیجیے، تاکہ سب سنیں، بس پھر کیا تھا بھاٹا کا جوار بھاٹا ایک دم سکون پذیر ہوگیا، ایک دوسرے طالب علم نے باگ سنبھالی، لیکن اسٹیج کا نام سنتے ہی ان کی بھی سٹی گم ہوگئی، اب تیر وکمان میرے ہاتھ میں تھی، جواب شروع کیا تو اس آزمودہ کار لیڈر نے وہی آواز بلند کی یہاں آکر جواب دیجیے۔''لوہیا کو یقین تھا کہ ان نوآموز طلباء کو اسٹیج پر آنے کی ہمت نہیں اور آخر کار میدان لوہیا کے ہاتھ میں ہوگا، چیلنج پر یہ نادان کود کر اسٹیج پر پہنچ گیا، ۱۵ منٹ اول فول خوب کہا تو لوہیا کرسی سے کھڑے ہوئے اور کہا ختم کیجیے، میں نے آپ کو پہچاننے میں غلطی کی، ظہر بعد حضرت کی چائے کی مجلس میں مولوی شوکت خان عرف بھٹہ نے جو اس معرکہ کے شاہد تھے ساری داستان حضرت کو سنائی تو فرمایا کہ ''شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے''۔

بخاری شریف کے شب کے سبق میں خاکسار حضرت کے دائیں جانب ذرا فاصلہ سے ہوتا، دورانِ سبق کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تو فرماتے کیا کہتا ہے، پھر رخِ انور میری جانب فرماتے، پہچانتے تو فرماتے ''تو حضور''، اللہ اکبر نسبتوں کا اس قدر احترام! خدا تعالیٰ کا بے پایاں شکر کہ حضرت سے عقیدت شروع ہی میں قائم ہوگئی اور بڑے نشیب وفراز کے باوجود بدستور بلکہ مع اضافہ ہے، اللھم زد فزد۔اسّی سال سے زائد عمر فانی علم وعرفان، سلوک ومعرفت، مہمان نوازی، خورد نوازی، زہد وعبادت، غناء واستغناء اور بہت سے اوصافِ جلیل کے جلو میں گزار کر، عالم جاودانی کی مسافرت

اختیار کی۔ اور قبرستانِ قاسمی میں صبح قیامت تک خواب راحت کے مزے لیتے ہیں۔

***

مکرّم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا گرامی نامہ شرفِ صدور لایا۔

قوتِ حافظہ کے لیے بعد نمازِ عصر اوّل وآخر تین بار درود شریف پڑھ کر مع بسم اللہ ایک بار سورہ سَبِّحِ اسْمَ الخ پڑھیں، البتہ صرف آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى تین بار پڑھی جائے گی۔ داہنی ہتھیلی پر دم کر کر سینہ اور سر پر پھیر لیں، آپ کے جمیع مقاصدِ حسنہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد عفرلہٗ

ٹانڈہ الہ داد پورہ، فیض آباد۔

حضرت مولانا میاں اصغر حسینؒ صاحب

دیوبند کا وہ مشہور سادات خاندان جس کے نامی گرامی فرد میاں جی منےؒ شاہ تھے، جن کی معصومیت وسادگی کا یہ عالم تھا کہ اطفالِ دبستان بھی اس پیکر معصومیت کو فریب میں لاسکتے تھے۔ سنا ہے کہ میاں جی کے مکتب میں شہر کے بچے پڑھتے، مکتب میں کوئی گھڑی گھنٹہ نہیں تھا، ایک اینٹ رکھی ہوئی تھی جس پر دھوپ پہنچتی تو چھٹی کردی جاتی، شریر بچے جس روز قبل از وقت مکتب بند کرانا چاہتے، اسی اینٹ کو اٹھا کر وہاں لے جاکر رکھ دیتے جہاں دھوپ آچکی ہوتی اور کہتے کہ میاں جی اینٹ پر دھوپ آگئی ہے۔ میاں جی فوراً مدرسہ بند کردیتے، حالاں کہ مکتب کو کھلے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ گذرتا۔

اس سادگی پر تقدس اور انوارِ ولایت کا ایسا ہجوم تھا کہ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھنے کے لیے جن چند خاصانِ الٰہی کا انتخاب فرمایا ان میں میاں جی منے شاہ صاحب بھی تھے۔ حضرت میاں اصغر حسین میاںؒ، منے شاہ صاحب کے نواسے، بلکہ ان ہی کے زیر تربیت سلوک وتصوف میں مجاز ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل، حضرت شیخ الہندؒ کے خصوصی شاگرد، دارالعلوم میں ابوداؤد کا درس دیتے، جس قدر سبق مقصود ہوتا اتنے ہی ابوداؤد کے صفحے نکال کر اپنے ساتھ لے آتے، لگی بندھی تقریر اور نہایت ہی مختصر کلام ہوتا۔

کشیدہ قامت، بیشتر نیلا تہہ بند، گیروی کرتہ، سر پر چہار گوشہ ٹوپی، پاؤں میں چپل، آنکھوں میں ایک خاص ہیبت، جلالت مآب قسم کے بزرگ، جن سے نظر ملانا واقعی دشوار تھا۔ ایک بار دیوبند میں ایک مسلمان تھانیدار ڈیوٹی پر آگئے، شام کو میاں صاحب

کے دولت کدہ پر خصوصی مجلس ہوتی، مرحوم کے تعویذات اپنی تاثیر کی وجہ سے بے حد مقبول تھے، بلکہ اس کے شواہد موجود ہیں کہ جنات ان کے تابع تھے، ضرورت مند اصحاب میاں صاحب سے تعویذ لینے پہنچتے، یہ غریب تھانیدار بھی کسی ضرورت سے جا پہنچا۔ ساٹھ سال پہلے کا دور جس میں سر پر ہیٹ کوٹ اور پتلون سرکاری مہیب پوشاک تھی۔ تھانیدار اسی لباس میں پہنچا اور میاں صاحب کے قریب۔ جو کرسی تھی اسے کچھ ہٹا کر بیٹھ گیا، مرحوم نے ناگوار انداز میں اس حرکت کو دیکھا اور اپنے خاص لہجہ میں مجمع سے ارشاد فرمایا کہ یہ ہمیں باؤلا سمجھ رہا ہے اور ہم اسے باؤلا سمجھ رہے ہیں۔ معاً ساٹھ ستر سال پہلے کا تھانیدار مجلس سے باہر کر دیا گیا۔

گھر پر اگر کوئی پہنچتا تو تازہ اور گرم مٹھائی سے اس کی تواضع فرماتے، کمرے میں داخل ہوتے اور رقاب بھر کر مٹھائی لے آتے۔ خدا جانے ان کا یہ کمرہ دکانِ معرفت تھی یا شیرنی فروش کی کوئی نشست گاہ، مزاج میں ظرافت بے پناہ تھی، مولانا قاری محمد طیب صاحب ایک بار تشریف لے گئے، کشمیر کی خوبانیاں پیش فرمائیں۔ مہتمم صاحب نے اس وقت تک تازہ خوبانیاں نوش نہیں فرمائی تھیں، میاں صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ اپنے خصوصی لہجہ میں ارشاد ہوا کہ اوہو! آپ انہیں نہیں جانتے، یہ آڑو کی چھوٹی ہمشیرہ صاحبہ ہیں۔ دنیا اور اس کی الجھنوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے، ختم عمر پر دارالعلوم سے اپنا تعلق باقی رکھنا چاہا تو تفسیر ابن کثیر کا درس اپنے مکان پر تدریس کے لیے منتخب کیا، ہر شریک طالب علم کو دس روپیہ ماہوار جیب خاص سے عنایت فرماتے۔

مغرب کے بعد ایک خصوصی نشست ہوتی جس میں بعض اصحابِ علم بھی شرکت کرتے، بدقسمتی سے اس مجلس میں غیبت کا دروازہ کھل گیا جس پر میاں صاحب کو خاص تشویش ہوئی اور اربابِ مجلس کو تنبیہ کی۔ چند روزہ حفاظت کے بعد پھر وہی مرغوب غذا۔ حضرت میاں صاحب نے اس سلسلہ کو بند کرنے کے لیے عجیب حکیمانہ انداز اختیار کیا، شرکائے مجلس سے ارشاد فرمایا کہ آئندہ عربی میں گفتگو ہوگی، دوسرے روز مجلس جمی تو اہل

علم عربی کی ریاضت وتمرین نہ ہونے کی بنا پر کیف حالک؟ طیب، الحمد للہ سے آگے نہ بڑھ سکے اور اس طرح گناہِ بے لذت کا دروازہ بند ہو گیا۔ میاں صاحب صاحبِ کشف اور واقعی عالم ربانی تھے۔ موتِ غربت کا خاص شوق تھا، مرض الوفاۃ میں پورے گھرانہ اور تمام مخلصین کی شدید مخالفت کے باوجود راندیر ضلع سورت گجرات تشریف لے گئے تو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی تمنا پوری کی اور یہ عالم باعمل گجرات کی زمین میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

استاذِ کل، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ دارالعلوم دیو بند کے وہ نامی گرامی استاذ جن کی ۴۷ رسالہ زندگی کے ساتھ خدمتِ علم کی ایسی طویل تاریخ وابستہ ہے جس کی نظیر متاخرین علماء میں کمیاب نہیں؛ بلکہ نایاب ہے۔ ''فنافی اللہ، فنافی الرّسول، فنافی الشیخ'' کے مراتب تو مشہور ہیں لیکن مرحوم ''فنافی العلم'' تھے۔ ان کا علمی انہماک، دارالعلوم کی خدمت، طلبہ کے ساتھ شفقت، امانت و دیانت، تقویٰ وتورّع بے نظیر تھا۔ نصف صدی کے قریب دارالعلوم دیو بند کی اس طرح خدمت کی کہ سب کچھ دارالعلوم کو دیا یعنی اپنا شباب، اپنی قوتِ عمل، اپنے شب و روز، اپنا علم اور اپنا حسنِ عمل، حضرت علامہ کشمیریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جملہ تلامذہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے شاگرد ہیں، ترجمانِ دارالعلوم کی ایڈیٹری، دارالافتاء کی خدمت، اہتمام میں مسند نشینی، نظامتِ تعلیمات، نیابت صدر مدرسی، خدا جانے کتنے خدمت کے شعبے تھے جنہیں وہ مثالی طور پر انجام دیتے، شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حضرت شاہ صاحبؒ کے خصوصی مستفیدین میں تھے، اس استفادے کی قیمت بھی انہوں نے اس طرح ادا کی کہ راقم السطور کی پختت و پز میں ان کی بہترین صناعی و معماری کو تمام تر دخل ہے۔

۴۷ رسال کی عمر میں بمرض ''وجع الفواد'' داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ایک مقدس زندگی اندرونِ زمین کے تیرہ و تار ماحول کو حسنِ کردار کی روشنی و نور پہنچانے کے لیے تا ابد منتقل ہوگئی۔ راقم الحروف کے قلم سے ''تذکرۃ الاعزاز'' اور مولوی عبدالاحد صاحب

مونگیری کے قلم سے ''کردارِ اعزاز'' اور مرحوم کے بھتیجے سابق استاذ دارالعلوم دیوبند مولوی افتخار علی صاحب کی ''سوانح اعزاز'' وہ سوانحی خاکے ہیں جن میں ایک فنافی العلم، خادمِ علم وخادمِ دین کی زندگی پڑھی جاسکتی ہے۔ پسماندگان میں علاوہ صاحبزادی کے جناب قاری احمد میاں صاحب جو دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ قرأت کے استاذ ہیں۔ مولوی رشید احمد صاحب پاکستان کے کسی مدرسے میں تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں، فرزند اصغر مولوی حامد میاں صاحب دارالعلوم دیوبند کے استاذ عربی ہیں، خدائے تعالیٰ ان صاحبزادگان کو اپنے جلیل باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم برّد مضجعہٗ ونوّر مرقدہٗ

***

حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ "شیخ الحدیث"

ضلع مظفرنگر میں کاندھلہ مردم خیز اور مشہور قصبہ ہے۔ اللہ، اللہ! یہاں کیسی گراں قدر شخصیتیں پیدا ہوئیں اور اس سرزمین نے گلشن اسلام کو کیسے روح افزا پھول وپھل دیے، رئیس الاتقیاء مفتی مظفر، مرکز تبلیغ کے داعی الی اللہ، حضرت شیخ التبلیغ، حضرت مولانا ادریس صاحبِ تعلیق الصبیح، یہ حضرات بلاشبہ عالم ربانی، محقق، محدث، مفسر اور خدا جانے اپنی دستارِ فضیلت میں کتنے جاذب بہجت افزاء گل ولالہ رکھتے، معصومیت کے قطب مینار، سادگی کے شالا مار، دنیا سے ان کا تعلق بس ضرورت کی حد تک تھا۔ مشہور مزدور شاعر احسان دانش بھی اسی زمین کے شاعر تھے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کے والد ماجد حضرت مولانا یحییٰ صاحب کاندھلوی حضرت گنگوہیؒ کے مرید با اخلاص، بلکہ خادم خاص تھے۔ نام وَر فرزند نے، اپنے مشہور باپ کے تفصیلی حالات آپ بیتی میں لکھے ہیں۔ شیخ الحدیث علمی وعرفانی، ربانی ورحمانی، خصائل وشمائل اپنے آسمان جاہ خانوادہ سے لے کر پیدا ہوئے اور اپنی محنت، عرق ریزی، سعی وکاوش سے ان آبگینوں کو تراش کر کمالات کی انگشتری میں دیدہ زیب حیثیت دی، یگانہ روزگار محدث، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی کی زیر تربیت نہ صرف علمی تفوق حاصل کیا؛ بلکہ احسان وسلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے مہر نیم روز ہو گئے۔ اوجز المسالک، لامع الدراری، کوکب الدری، آپ بیتی، چھوٹے بڑے رسالے اور سب پر فائق وہ تبلیغی نصاب ہے جو ہر مسجد کا لاینفک جز بن گیا۔ لکھنے کا انداز محمد حسین آزاد سے ملتا جلتا۔ اتنا دلچسپ اور شگفتہ کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر چین نہ آئے اور تصنیف اپنے مطالعہ کی خود ہی جاندار محرک ہے۔ مرحوم قدیم روایات کے حامل، اور عصر جدید میں انہیں سانچوں میں انسانوں کے ڈھلنے کے داعی تھے۔ پرانی روایات سے ایک انچ پیچھے ہٹنے

کے لیے تیار نہ تھے۔اپنے بزرگوں سے دبیز وابستگی اور والہانہ تعلق رکھتے۔شرفِ زیارت، دسترخوانِ کرم وسخا سے زلہ ربائی بار بار میسر آئی۔میری والدہ مرحومہ کو حضرت رائے پوری شاہ عبدالقادرؒ سے بیعت ہونے کی آرزو تھی۔رائپور کا سفر مرحومہ کے لیے دشوار، سہارنپور حضرت تشریف فرما ہوئے تو دیوبند سے والدہ صاحبہ کو لے کر، حضرت شیخ کے دولت کدہ پر مقیم ہوا۔صبح کے ناشتے میں حسنِ اتفاق کہ حضرت مدنیؒ بھی پہنچ گئے، دسترخوان بچھا تو درمیان میں حضرت رائے پوری اور دائیں بائیں شیخین تھے۔ہر دو قوی الجثہ، شیخ ذرا زیادہ لحیم شحیم، حضرت مدنی کم، تاہم حضرت رائے پوری سے نسبتاً زیادہ تھے۔

حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ ''پہاڑوں کے بیچ میں آگیا ہوں۔'' حضرت مدنی کا ارشاد تھا کہ سہارنپوری پہاڑ سے بچنے کے لیے میں نے تو آپ کو آڑ بنایا ہے۔عجیب مجلس تھی، دکانِ معرفت کے تین امام گویا کہ مسجد، محراب و منبر۔ایک بار حاضری ہوئی، حکیم عبدالقدوس صاحب دیوبندی نے تعارف کرایا، یہ حضرت کا آخری دور تھا اور ''دم واپسیں برسرِ راہ ہے'' کا منظر، نام سنتے ہی سینے سے لگالیا اور اپنے خاص لہجے میں فرمایا: ارے جلدی وہ تازہ کھجور لانا، کھجور ایک انگشت کے برابر، گلاب جامن سے زائد خوش ذائقہ۔اپنے دست مبارک سے یہ فرماتے ہوئے کہ پیارے! ذرا منہ کھولیے، میرے منہ میں رکھ دی جس سال میرا دورۂ حدیث تھا، خاص وصیت یہ فرمائی کہ حدیث کے سبق میں وضو کے بغیر شریک نہ ہونا، ارشاد تھا کہ اگر اس کا اہتمام کرلیا تو عجیب نورانیت محسوس کروگے۔سینکڑوں خلفاء جانشین چھوڑے جن میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے خانقاہی نظام کا احیاء کیا۔ایک گرامی نامہ میں نسبت سے متعلق تفصیل فرمائی جو بدقسمتی سے ضائع ہوگیا۔اپنی تالیف ''نقشِ دوام'' سوانح علامہ کشمیریؒ ہدیہ کی تو اسی پر یہ مکتوب سامی شرفِ صدور لایا۔آقائے مدینہ کی احسانی تجلیات کا یہ پیکر اب جنت البقیع میں ہزاروں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آغوش میں نعمہائے آخرت سے کام ودہن کو تازہ بتازہ ذائقے دیتا ہے۔

برد اللہ مضجعہ ونور اللہ مرقدہٗ

مکرّم ومحترم مولانا انظر شاہ صاحب زادت معالیکم

بعد سلام مسنون، گرامی نامہ مع "نقش دوام" پہنچ کر موجب عزت ہوا، نقشِ دوام کا نام سن کر بہت بے چینی ہوئی، مجھے اکابر نور اللہ مرقدہم کے سوانح وحالات پڑھنے کا بہت غلبہ رہا۔ میرے اکابر کی جتنی سوانح طبع ہوئیں ان کو میں نے تمام رات جاگ کر پڑھیں۔

مولانا بنوری کی نفحۃ العنبر میں نے حجاز کے زمانۂ قیام میں دو مرتبہ سنی۔ افسوس کہ اب میں مردہ لاش ہوں کہ زمین پر پڑا ہوں۔ بدن کا کوئی حصہ کام کا نہیں رہا۔

حسبِ معمول دلّی سے دیوبند آنے کا پختہ ارادہ تھا، مگر میرٹھ پر اس قدر دورانِ سر ہوا کہ پہنچنا مشکل ہوگیا، اب تک پلنگ پر سوار ہوں۔ نماز بھی گھر پڑھ رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سفر کا تعب ہے، مگر یہ تعب اتنا طویل ہے کہ بظاہر رمضان کے اعتکاف کی امید نہیں۔

بخاری شریف کی خبر میں نے پہلے سن لی تھی، ترمذی کی خبر آپ کے خط سے ملی۔ اللہ تعالیٰ بہت مبارک فرمائے اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے علمی ورثہ میں آپ کو بخاری اور ترمذی ہمیشہ کے لیے حوالے کر دے، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کا صحیح جانشیں بنائے۔ آپ کا علمی انہماک اور حدیث سے ذوق وتعلق تو کثرت سے سنتا رہتا ہوں، آپ کی علمی اشغال کی خبریں میرے لیے بہت ہی مسرّت کن ہیں اور اس میں کوئی توریہ اور مبالغہ نہیں۔

مولوی صاحب! تقریری علماء تو بڑھتے جا رہے ہیں، مگر علمی اور کتابی علماء کم ہوتے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے علوم وفیوض میں برکت عطا فرمائے۔

حضرت شیخ مدظلہٗ
بقلم محمد شاہد غفرلہٗ
از راقم سلام مسنون
خدا کرے مزاج والا بعافیت ہوں۔
۲۱ر شعبان ۹۹ھ

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

اپنے خطوط کے آئینے میں

هذأ الخالون عن شجوي فناموا ۞ وعيني لا يلائمها منام
وما سهري لاني مستهام ۞ إذا ارق المحب المستهام
ولكن الحوادث ارقتني ۞ فلي سهر إذا هجد النيام

حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال کے بعد یہ دوسرا جاں گسل حادثہ ہے، جس کا مہیب تاثر متاع سکون کے لیے صاعقہ اور جس کے جاں سوز اثرات ''سرمایۂ اطمینان'' کے لیے برق تپاں ثابت ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت الاستاذ علامہ مناظر احسن گیلانی کی موت سے دیو بند حلقے کا ایک کامیاب قلم ٹوٹ گیا، اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کی وفات سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا اب اس کا اسی انداز میں پر ہونا صرف مشکل نہیں بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔ کم وبیش چالیس سال جس کا قلم متحرک رہا اور جس کے قلمی کارناموں سے ہندوستان کے علمی وسنجیدہ حلقے گونجتے رہے، اچانک علم و تحقیق کا وہ چشمہ خشک ہو گیا اور ایک مخصوص طرزِ انشا کا موجد، بلکہ صاحب طرز ادیب کی رحلت سے بزم علم سونی ہو گئی ؎

صد حیف زمزموں کا تسلسل نہیں رہا
سونا پڑا ہے باغ کہ بلبل نہیں رہا

وہ اپنے دائرہ فکر ونظر میں ایک ایسی انفرادیت کے حامل تھے، جس کا رنگ نہ کسی ادیب کی نگارشات میں دکھائی دیتا ہے اور نہ اس کی جھلک کسی اہل قلم کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ علمی تحقیقات کو خاص انداز میں پیش کرنے اور وسیع معلومات کو اچھوتے

اسلوب میں ڈھالنے کا جو سلیقہ ان کو عطا کیا گیا تھا آج انہیں کے ساتھ گیلان کے ایک گوشہ میں دفن ہو گیا۔ ذہانت وذکاوت کے ساتھ یادداشت اور قوت حافظہ کی جن بے نظیر وسعتوں سے مولانا کا دامنِ علم لبریز تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ بالکل قلم برداشتہ اور ارتجالاً کسی بھی موضوع پر تحقیقات کا وہ انبار لگا دیتے اور اپنی تحریروں کو علمی حوالوں سے بے تکلف مزین وآراستہ کرتے جاتے، ان کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دماغ علوم وکمالات کی ایک الماری ہے، جو ہر وقت کھلی رہتی، یا پھر کوئی مبسوط ومتنوع مضامین سے لبریز کتاب ہے جس کے صفحات مولانا کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور وہ جب چاہتے ہیں تحقیق ومعلومات کے ان گراں مایہ موتیوں کو نوکِ قلم پر اٹھا کر صفحات پر بکھیرتے جاتے ہیں۔ نیز واقعات سے حیرت انگیز استنباطات اور مصنف کی تحریر سے دل آویز ودلچسپ موشگافیاں ان کا خاص ملکہ اور مخصوص حصہ تھا، کم از کم اس طرز میں اس پایہ کی شخصیت اس حقیر کی نظر میں اب کوئی نہیں۔

ہندوستان کے مشہور مصنفین اور ممتاز اہل قلم کی تحریروں اور تصانیف کو دیکھنے کا موقع ملا، لیکن مولانا گیلانی کی انشاء میں جو دیکھا اور پایا؛ بلا مبالغہ اس ''طرز'' سے سب ہی خالی نظر آئے۔ وہ لوگ جو مولانا پر طویل بیانی، اغلاق وابہام، بے ترتیبی وژولیدہ بیانی کا الزام لگاتے ہیں، اگرچہ خاکسار کو ان اعتراضات میں سچائی کم، تعدی زیادہ نظر آتی ہے، بلکہ ان بے وقت کی راگنیوں کے مقابل سودا کا وہی جواب وردِ زباں ہوتا ہے جو اس باکمال سخنور نے ایسے ہی اعتراضات ونقائص ڈھونڈھ کر نکالنے والوں کو دیا تھا کہ ؎

سودا کے تئیں کہتے ہیں شاعر مغلق
کیا مصرع بے ربط کیا تو نے یہ تحریر

لیکن ان لوگوں کو بھی مولانا کی انشائی جدتوں کا مداح اور مخصوص انفرادیت کا ثنا خواں پایا، بلکہ بعض احباب تو یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے کہ ؎

''اس شخص کی تحریریں اس درجہ دل چسپ ہوتی ہیں کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی

نہیں چاہتا''۔

خود اپنا تو حال ہے کہ مولانا کا انداز تحریر، طرز نگارش، ادب وانشاء کا دل نشین اسلوب کچھ ایسا بھایا کہ اس مختصر قلمی زندگی کے سلسلۂ تلمذ کو انہیں کے دامن علم وکمال سے وابستہ کرنے میں سعادت پائی۔ ہندوستان میں ادیب، صاحب طرز انشاء پرداز کم نہیں، بہت زیادہ ہیں، خصوصاً علامہ شبلی مرحوم، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہم کہ یہ سب ہماری انشائی زندگی کے لازوال نقوش اور نہ مٹنے والے نشان ہیں، لیکن سید المحترم مولانا گیلانی جس خصوصیت اور مقام کے مالک تھے وہ انہیں کے ساتھ ختم ہوگیا۔ خدا شاہد ہے کہ نہ موازنہ مقصود ہے اور نہ ان علوم وکمالات کی حامل ہستیوں کے عمق وگہرائی کو ناپنا مطلوب، بلکہ اپنے دل اور دماغ پر جو اثرات قائم ہیں بلا کم وکاست انہیں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بعض اہم عنوانات پر مولانا کے خامہ عنبر شامہ نے جو کچھ چھوڑا ہے اس کو دیکھ کر تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ مولانا اگر شعر کی زبان میں یہ دعویٰ کرتے تو یقیناً برمحل اور واقعہ کے مطابق ہوتا کہ ؎

بانگ قلمم دریں شب تار
بس معنی خفتہ کرد بیدار

تقریباً دس سال سے ہندوستان کے بعض چیدہ اہل قلم اپنی تحریروں میں مرحوم کے عکس کو جس طرح اپنانے کی سعی وکاوش کر رہے ہیں اسی جدوجہد کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کا طرز اپنے دامن میں جو بے پناہ دلچسپی رکھتا تھا اس کی ہمہ گیر خصوصیات دوسروں کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں ؎

بہت بے اثر تم اسے جانتے تھے
زبانوں پہ ہے اب کہانی ہماری

اگرچہ ابھی تک کسی منتخب اہل قلم کی تحریر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر نہیں آئی؛ لیکن اس راہ میں جو کدوکاوش بعض ارباب فکر ونظر کر رہے ہیں، اس کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ

ہندوستان کے علمی حلقوں نے مولانا مرحوم کو ''صاحب طرز ادیب'' تسلیم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب مخدوم گیلانی کی موت کے بعد سنجیدہ اہل قلم، ان کی انشاء اور مخصوص طرز کا اپنے اپنے رنگ میں تجزیہ کر کے مولانا کے اچھوتے اور شاداب طرز سے علمی حلقوں کو باخبر کریں گے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس بے بضاعت کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی سے جس درجہ عقیدت و نیاز ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ کچھ عرصہ ان کی بابرکت و فیض بخش صحبت سے استفادہ کیا جاتا، اور اس خزانۂ علوم کے درِّ شاہوار کو باوجود اپنی تنگ دامنی کے سمیٹنے کی کوشش ہوتی، لیکن اسے بدقسمتی کہیے یا اتفاقات کہ مولانا مرحوم سے طویل ملاقات کا موقع نہ مل سکا، غالباً صرف ایک مرتبہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے موقع پر جب وہ ''حیدر آباد'' سے رکن کی حیثیت سے شریک ہونے کے لیے تشریف لائے تھے تو بہت ہی مختصر سی ملاقات ہوئی، جس کے نقوش نہایت اچٹتے ہوئے، جس کا خاکہ بہت ہی دھندلا سا قلب و دماغ میں جاگزیں ہے، اس لیے ان کی سیرت و کردار پر کوئی خاص چیز جو تجربہ و مشاہدہ سے متعلق ہو، نہیں لکھی جاسکتی، اور واقعہ تو یہ ہے کہ مرحوم اپنی زندگی کے بہت سے سوانح و ادوار سے خود ہی مطلع کر گئے، جس کے بعد اب ان کی حیات کا مرقع انہیں کی تحریروں سے تیار کر لینا بہت سہل اور آسان ہے۔

بہر حال کسی طویل شفاہی ملاقات سے محرومی کا تو افسوس ہے اور رہے گا، بلکہ اس سلسلہ میں تو اب اپنی حرماں نصیبی کے تصور سے بھی دل خون ہوتا ہے، تاہم اگر مکتوبات، انسانی زندگی کا آئینہ دار ہیں اور نجی خطوط سے شخصی کردار و اخلاق کو معلوم کر لینے کا اصول مسلّم ہے تو احقر نے مولانا گیلانی کے مکتوبات میں جس طرح ان کے کردار و اخلاق کو جلوہ گر پایا، اور جس طرح ان کی شمائل و خصائل کو نمایاں دیکھا، اسی کی روشنی میں ایک دھندلا سا خاکہ قلم سے کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

مولانا مرحوم جس پایہ کے محقق اور جس درجہ کے اعتمادی شخصیتوں میں سے تھے اس

کا بداہۃً نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ ان کے عقیدت مند و نیاز کیش ہزار ہا ہزار کی تعداد میں ہوں، اور پھر ان ہزاروں عقیدت مندوں کے وسیع حلقے پر نظر ڈالنے سے قلب میں انانیت، دماغ میں رعونت خواہ مخواہ پیدا ہو، لیکن ان بدیہی نتائج کے برخلاف خاکسار نے ان کی تحریروں اور مکاتیب میں جو تواضع، انکسار، ہضم نفس اور سلامتی طبع پائی، شاید ہی ہندوستان کے کسی اور مسند نشین کمال کی یہ خصوصیت ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرا ہی تجربہ ہے یا عموماً ان کی طرف سے اسی "کردار" کا اظہار ہوتا۔

بہر حال اس بے بضاعت نے اپنے آپ کو ان کا ہمیشہ چھوٹا سمجھا اور اسی یقین کے ساتھ جب ان سے مراسلت کی نوبت آئی تو جواب میں حضرت مولانا اپنے آپ کو "چھوٹوں کا بھی چھوٹا" پیش کرنے میں قطعاً عار محسوس نہ کرتے، بلکہ انکسار و اخلاق کا ایسا مظاہرہ فرماتے جس کو دیکھ کر خود شرم و ندامت سے پانی پانی ہونا پڑتا۔ ایک مرتبہ احقر نے ایک عریضہ تحریر کیا، جواب میں تاخیر ہوئی، یاددہانی کے لیے مکرر لکھا گیا، تو حضرت مولانا جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"آپ کا نوازش نامہ کیا ملا کہ تھوڑی دیر کے لیے گویا پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، حافظہ قطعاً مدد نہیں دے رہا ہے کہ یہ گستاخی آپ کے اس خانہ زاد خادم سے کب صادر ہوئی کہ جواب اور وہ بھی آپ کے گرامی نامہ کا میری طرف سے نذرِ تغافل ہوا"۔

گو خطوط کے جواب میں غیر معمولی طور پر کاہل ہوں، لیکن آپ کے خط کا جواب بھی نہیں دیا گیا، ایسا یاد نہیں پڑتا، تاہم بشریت کے لوازم سے مستثنیٰ نہیں ہوں، کوئی صورت کبھی اگر ایسی پیش آئی ہو تو دست بستہ معافی کا طلب گار ہوں۔ آپ کے والد ماجد قدس سرہ کے جو احسانات اس فقیر پر ہیں آپ لوگوں کی یاد کے ساتھ وہ بھی یاد آجاتے ہیں، امید ہے کہ آپ عفو و صفح سے ضرور کام لیں گے"۔

سبحان اللہ! معذرت کا کیا عجیب و غریب پیرایہ ہے جو ہر اعتبار سے اپنا مخدوم تھا، وہی خادم کی شکل و صورت میں جلوہ فرما ہونے کی سعی کر رہا ہے، بلا شائبہ تکلف، اہل

علم کو تو در کنار، خود خانقاہ نشیں رجال واشخاص میں جوان بلند اخلاق وشمائل کے حامل
ہونے کے خاص طور پر اہل ہوتے ہیں، اس فروتنی وتواضع کا نمونہ خال خال نظر آئے گا۔
میرا سب سے پہلا مکتوب جس میں حضرت مولانا سے قلمی کاروبار میں استفادہ کی
درخواست کی گئی تھی، اس کے جواب میں لکھا ہوا آیا کہ:

''جذبات سے لبریز آپ کا گرامی نامہ موجب عزت افزائی ہوا، اپنے آستانے
کے اس خادم، حقیر کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ زیادہ حسن ظن آپ کے اندر پیدا
ہو گیا ہے، بہرحال پہلے بھی آپ کے برادر بزرگ مولانا ازہر شاہ قیصر سے عرض
کر چکا ہوں اور وہی آپ کے آگے بھی دوہراتا ہوں ؎

اسی گھر سے ملا جو کچھ ملا ہے

مری جھولی میں ورنہ کیا دھرا ہے

مختصر یہ کہ اس سنگلاخ وادی میں ان کے قدم بڑے استوار واستقامت کے ساتھ
جمے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کے ساتھ مرحوم میں سیرت سازی، شخصیت بنانے، حوصلہ
افزائی اور ہمت بڑھانے کی بے پناہ اور بڑی قابل قدر طاقت تھی، بلکہ نوجوانوں کی
تربیت کا ان کو ایسا سلیقہ عطا کیا گیا تھا جو ان کی انفرادیت کا مستقل شعبہ ہے۔ اوروں
کے متعلق تو کچھ کہنے کا مجھ کو حق نہیں، لیکن جن تجرباتی مراحل سے خود گزر کے آیا ہوں ان
کا بیان نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوگا، اس حقیر کو قلم اٹھانے کی جرأت بھی نہ ہوتی اگر
مولانا مرحوم کے چند مکاتیب سے سرفراز نہ ہوتا، انہوں نے اپنے پہلے ہی مکتوب میں
اس تہی مایہ کو یہ باور کرایا کہ مجھ میں نہ صرف لکھنے لکھانے کی صلاحیت، بلکہ اس کاروبار کی
اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے دامن لبریز ہے، من آنم کہ من دانم، بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ
بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾؛ لیکن ان کی اس تربیت وانداز کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ ایک بے بضاعت وبے
مایہ کو کم از کم ہاتھ میں قلم اٹھانے کی ہمت ہوئی، خام وناپختہ کار نوجوانوں کی ہمت افزائی کا
یہ عجیب وغریب طرز شاید ہی کسی اور شخصیت کا امتیاز ہو۔

چند مکتوبات کے بعد جب اصلاح کی درخواست کی گئی تو انہوں نے لکھا کہ:

"ہر شخص کے رجحان، افتادِ طبع، اس کی اندرونی صلاحیتوں کی نوعیت کو معلوم کرنے کے لیے صرف چند سطریں اربابِ نظر کے نزدیک کافی ہوتی ہیں۔ خاکسار نے آپ کی کوئی مستقل تحریر تو نہیں دیکھی ہے، صرف متعدد مکاتیب ہی سے سرفراز ہوا ہوں، لیکن ان خطوط میں بھی جو کچھ میں نے پایا ہے اس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ "اسلام" کی خدمت قلم کی راہ سے ان شاء اللہ آپ آئندہ کریں گے، اس کی توفیق آپ کو بخشی جائے گی اور گو چھوٹا منہ بڑی بات ہے؛ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کشمیر کے سادات کے ایک خانوادہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہونے والی ہے"۔

آپ خود بتایئے کہ اس موقع پر مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے کیا اس سے مخاطب میں اپنی صلاحیت واستعداد سے کام لینے کی جرأت پیدا نہ ہوگی؟ سنگلاخ وحوصلہ فرسا وادیوں میں اترنے کی ہمت نمایاں نہ ہوگی؟

یقیناً ایسا ہوگا کہ خام وناپختہ کار اپنی اندرونی صلاحیتوں سے کام لینے پر نہ صرف خود کو آمادہ بلکہ مشتاق پائے گا۔

بہرحال مولانا کی تربیت کے اس خاص رخ سے مجھ جیسے بے مایہ لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے، انہیں کی ترغیب وتوجہ دلانے پر جب ایک ابتدائی مقالہ اصلاح کے لیے ارسال خدمت کیا گیا، تو چند روز کے بعد مقالہ کے ساتھ حسب ذیل مکتوب گرامی بھی صادر ہوا، مولانا نے ہمت افزائی کی راہ سے تحریر فرمایا کہ:

"کئی دن ہوئے کہ آپ کی امانت اور غیر معمولی محنت ومشقت کا ثمرہ اس ظلوم وجہول کی آنکھوں سے گزرا، جس عمر میں آپ نے اپنی قدرتی صلاحیتوں کا ثبوت اس مقالہ کی صورت میں پیش کیا ہے، اس کو دیکھ کر افسردہ پژمردہ دل میں امید کی نئی لہر اٹھنے لگی، حق تعالیٰ کا شکر بجالایا کہ مسلمانوں اور اسلام کی خدمت کے لیے ان شاء اللہ لوگوں کو قدرت کھڑا کرتی رہے گی۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ جس عمر میں آپ کا یہ کام بن پڑا

ہے یقین دلاتا ہوں کہ اس عمر میں اپنے لیے تو اس کو میں شاید معجزہ ہی قرار دیتا، یہ آپ کی پہلی کوشش کا پہلا نمونہ ہے۔

"ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات"۔ "با سالیکہ نکوست از بہارش پیدا"۔

سب سے پہلے تو آپ کے اس موروثی نیاز مند کا معروضہ یہ ہے کہ جس وادی میں آپ نے قدم رکھا ہے ہمت نہ ہاریے گا اور بڑھتے ہی چلے جانے کا عزم راسخ فرما لیجیے! ابتداء میں ممکن ہے نکتہ چینیاں بھی ہوں، لوگ حوصلہ شکنیوں سے پیش آئیں، لیکن بقول شخصے ؎

چلو نوجوانو! بڑھے جائیو!

دو جانب سے باگیں لیے جائیو

آپ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے کام میں لگے رہیے، حق مقتدر و توانا سے مجھے امید ہے کہ بہت جلد دنیا آپ کے مضامین و مقالات کی پیاسی ہو جائے گی، کم از کم میں نے تو اطمینان کی سانس لی۔ شکر بجالایا کہ دیوانوں کی جماعت میں ایک اچھے دیوانہ کا اضافہ ہوا"۔

مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم کی سوانح "تذکرۃ الاعزاز" شائع ہوئی تو احقر نے ایک نسخہ ارسال خدمت کیا، چند روز کے بعد مکتوب گرامی سے سرفراز فرمایا اور لکھا کہ:

"جی ہاں! بالکل غیر مترقبہ نعمت کی شکل میں آپ کے ہدیہ سنیہ سے سرفراز ہوا یعنی مخدوم و محترم مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ کی سوانح عمری، جو آپ نے مرتب کی ہے، تھوڑی دیر کے لیے اس مطالعہ سے استغراق نے سارے غم کو غلط کر دیا۔ مولانا ممدوح کے ساتھ تقریباً چالیس سال سے عقیدت و نیاز کا جو تعلق رکھتا ہوں اس تعلق کی تجدید بھی ہوئی اور بڑی مسرت اس کی ہوئی کہ جانے والوں کے بعد سبحانہ وتعالیٰ سے امید ہے کہ کام کرنے والے ان شاء اللہ ان کی جگہ پر آجائیں گے، "باطل" کے مقابلہ میں "حق" کی صف میں جو خلا پیدا ہو رہا ہے یہ خلا ان شاء اللہ خلا باقی نہ رہے گا، آپ کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے، جس خوبی اور سنجیدگی کے ساتھ آپ نے "نقش اول" کو کاغذ پر

ثبت کیا ہے، ممکن ہے کہ آپ کی نظر میں ابھی اس کی چنداں قیمت نہ ہو؛ لیکن نوجوانوں کی تربیت وتعلیم کا تجربہ جو رکھتے ہیں وہی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس آغاز کے پیچھے کتنا شان دار انجام جھانک رہا ہے۔"

صرف یہی نہیں بلکہ حضرت مولانا نے اسی "تذکرۃ الاعزاز" کے مطالعہ کے بعد برادر محترم مولانا سید ازہر شاہ قیصر کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ:

"بھائی میاں انظر سلمہٗ نے "تذکرۃ الاعزاز" لکھ کر اپنی پوشیدہ صلاحیت کا زندہ ثبوت پیش کیا ہے، صرف نام پر ذرا اول رکا، علم پر الف لام کچھ ٹھیک معلوم نہ ہوا، حیاتِ اعزاز، کردارِ اعزاز، اعزاز کی زندگی، شیخ الفقہ والادب، میں کوئی کسر نہ تھی۔ ان کو نہ لکھا، آپ سے عرض کر دیا، ان کی فرمائش پر ایک پروگرام لکھ کر بھیج رہا ہوں، ان کی تربیت کی طرف آپ کی توجہ کی خصوصی ضرورت ہے، بڑا ہونہار جوہر ہے، خدا نہ کرے کہ لاپروائی کا شکار ہو جائے"۔

مولانا کی تربیت کا یہ خاص رخ وانداز تھا جس کی جانب میں نے اشارہ کیا۔ معاذاللہ اپنی قصیدہ خوانی مقصود نہیں، نہ کبھی مرحوم کے ان وقیع کلمات سے ہمہ دانی کا واہمہ ہوا، بلکہ اس کے برعکس میں تو ان کے دامنِ علم وکمال سے اپنی وابستگی کو اپنے لیے فخر ومباہات کا باعث سمجھتا ہوں اور ان کے یہ بلند کلمات میرے لیے طرۂ امتیاز وافتخار ہیں۔

داغ غلامیت کرد رتبہ خسرو بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کو خام ونا پختہ کار نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا قابل قدر طریقہ وسلیقہ حاصل تھا، وہ اپنے نیاز مندوں کی جس انداز میں حوصلہ افزائی فرماتے نفسیاتی طور پر اس کا گہرا اور منفعت بخش اثر نمایاں ہوتا، دوسروں کے متعلق کیا عرض کروں، خود اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس انداز سے تربیت نہ فرماتے تو مجھ کو کبھی قلم اٹھانے کی بھی ہمت وجرأت نہ ہوتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرحوم

کمزوریوں سے صرف نظر فرماتے نہیں؛ بلکہ وہ ایک کامیاب وتجربہ کار مربی کی طرح نقائص وکوتاہیوں پر توجہ دلاتے رہتے، بلکہ اس سلسلے میں اپنے خیال میں اپنی بعض کمزوریوں پر بھی ان کی نظر تھی۔ احقر نے اپنا ایک طویل مقالہ اصلاح کے لیے ارسال کیا، جس میں ژولیدہ بیانی کافی حد تک تھی، تو مولانا نے گرفت فرمائی اور لکھا کہ:

''اس کے ساتھ آپ کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنی ہے، خاکسار کی کتاب ''تعلیم وتربیت'' کے متعلق معلوم ہوگا کہ صرف بیس دن کی محنت میں لکھی گئی اور وہ بھی فجائی طور پر قلم سے نکل پڑی، اسی کا نتیجہ ہے جیسی کہ چاہیے ترتیب کے لحاظ سے کتاب میں کافی نقص رہ گیا، اگرچہ ہمارے احباب نے کافی مروت سے کام لیا اور کتاب کی اس کمزوری کو اچھالا نہیں، یہ ان کی مہربانی ہے، مگر عیب بہرحال عیب ہے، میں ہرگز نہ اجازت دے سکتا ہوں اور نہ مشورہ دوں گا کہ میرے نقص کی لوگ پیروی کریں۔''

مکتوب گرامی کے اس اقتباس سے معلوم ہوگا کہ وہ نوجوانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرکے ناقص بنانے کے مجرم نہیں تھے، بلکہ معائب وکوتاہیوں پر بھی توجہ دلاتے اور سخت گرفت کرتے تھے، لیکن ہمت افزائی کی راہ سے مستعد طلبہ سے جو کام بن پڑتا، ضرور لیتے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اس کے ساتھ وسیع النظر، وسیع الحوصلہ اس درجہ تھے کہ غیر اسلامی علوم سے بھی استفادہ کرنے پر زور دیتے، بلکہ بڑی حد تک اصرار فرماتے۔ ایک مکتوب گرامی میں دریافت فرمایا کہ ''تم نے اب تک کیا پڑھا ہے؟'' تفصیل تحریر کی گئی تو جواباً لکھا کہ:

''لاہور یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے متعلق یہی عرض کروں گا کہ آئندہ اپنے تعلق کو کبھی ظاہر نہ کیجیے گا، بجائے احترام میرا احساس یہ ہے کہ علم کے دامن پر ان امتحانوں کی طرف انتساب شاید کوئی داغ ہی بن جاتا، یہ خود سوچیے ذرا ان تعبیروں کو، کوئی کہے مولوی فاضل مولانا انور شاہ یا منشی مولانا اشرف علی تھانویؒ، دل تو دل، کان بھی شاید اس کو برداشت نہیں کرسکتے، البتہ انگریزی زبان کے سیکھنے، پڑھنے میں آپ کا مبارک

ومسعود وقت جو صرف ہوا، مجھے تو اسلام اور مسلمانانِ ہند کے لیے یہ فال نیک نظر آرہا ہے، اور مجھے امید ہے کہ انگریزی میں جس حد تک ممکن ہو آئندہ بھی اپنی قابلیت کو بڑھاتے ہی چلے جائیں گے۔''

انگریزی حاصل کرنے پر ان کو اس درجہ اصرار تھا کہ اپنے اکثر مکتوب میں اس طرف شدت سے متوجہ فرماتے، ایک دوسرے سرفراز نامہ میں لکھا کہ:

''یاد پڑتا ہے کہ انگریزی میٹرک تک آپ نے پڑھ لی تھی، پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جو شد بد بھی انگریزی میں میسر ہو چکی ہے، بجائے گھٹانے کے اس کو بڑھائیے، حال ہی میں ''الفرقان'' میں مولانا نعمانی نے آپ کے والد ماجد قبلہ قدس سرہ کا خیال نقل کیا ہے کہ ''اسلام کی خدمت اس زمانہ میں انگریزی دانی کے بغیر مشکل ہے'' خاکسار نے بھی ''نظام تعلیم وتربیت'' میں شاہ صاحبؒ کا کوئی قول اس سلسلہ میں نقل کیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اب تو ہندی بھاشا بلکہ سنسکرت تک کی ضرورت اسلامی دین کے خدام کو پیش آگئی''۔

ان غیر اسلامی علوم سے استفادہ کرنے کا مشورہ ضرور دیتے، لیکن اس کے ساتھ ہی خالص اسلامی زندگی کو اختیار کرنے اور اسلامی عادات واخلاق کو شعار بنانے پر زور دیا جاتا۔ اپنے ایک مکتوب میں اسی عاجز کو تحریر فرمایا کہ:

''آپ اپنا کام کیے جائیے، کام سے مراد یہ ہے کہ تحصیل علم کی عمر جب تک ہو، اس کو تحصیل میں بسر کرنا چاہیے۔ علوم کے ساتھ ساتھ اپنی اسلامی زبانیں عربی وفارسی، اردو کے ساتھ یورپ کی کسی ایک زبان میں بھی کم از کم اتنی لیاقت حاصل ہو جائے کہ جو کتابیں عام معلومات کے متعلق اس زبان میں ہوں ان تک رسائی آسان ہو، اور آخری بات اس سلسلہ میں یعنی دینی خدمت کی راہ میں یہ ہے کہ جس حد تک تقویٰ واخلاص سے قریب تر رہنا ممکن ہو اس کی کوشش سے کبھی غفلت نہ کرنی چاہیے۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ. اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا''۔

غیر اسلامی زبانوں کو سیکھنے کا یہ اصرار بلیغ دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ خالص علم نواز انسان تھے کہ گم شدہ حکمت کو تلاش کرنے کے لیے ان کی جستجو کا دائرہ بے حد وسیع تھا، یہاں تک کہ اختلاف مذہب ومشرب کی دیواریں بھی اس استفادہ کی راہ میں حائل نہ ہوتیں، اس کے ساتھ مولانا مرحوم کی تعلیم وتربیت کا ایک مرکزی جوہر ان کی اپنے متعلقین کے ساتھ بے پناہ شفقت واخلاص ہے، نیازمندوں کو ماحول کی ناسازگاری سے وحشت اور مایوس کن حالات سے شکست کھانے کے بجائے پامردی کے ساتھ مقابلہ کی دعوت وترغیب فرماتے۔ راقم الحروف نے اپنے ایک عریضہ میں گرد وپیش کے ہمت شکن حوادث کا ذکر کیا تو ان کا قلب مبارک بے چین ہو گیا اور اپنے خط میں عزم وحوصلہ کو بروئے کار لانے کی یوں ترغیب دی، لکھا کہ:

''یوں تو اسلام پر غربت کے بہت سے دور آ چکے ہیں، لیکن ناآشنائی جو غربت کا صحیح ترجمہ ہے آج اسلام کے متعلق جتنی بڑھتی چلی جارہی ہے اس کا اقتضاء یہ ہے کہ ہر چیز سے کنارہ کش ہو کر اپنی ساری توانائیوں کو اسلام کے روشناس کرانے میں لگا دیا جائے، خواہ اس راہ میں کچھ بھی پیش آئے، لیکن قدم پیچھے نہ ہٹیں۔ آپ کے قلب مبارک میں قلمی کاروبار کا جو جذبہ پیدا ہوا ہے میرا خیال تو یہی ہے کہ وہ نفسیاتی نہیں بلکہ الہامی وملکوتی ہے، کھٹکا اگر کچھ ہے تو اسی کا کہ نوعمری کی وجہ سے کہیں آپ کے قدم میں زمانہ کے حالات لغزش نہ پیدا کر دیں''۔

اس کے بعد مولانا نے اسلامی تاریخ کی ایک طویل داستان، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر عام انسانوں کی مشکلات ومصائب کے دل دوز واقعات اور ہمت شکن حوادث کے مقابل ارباب عزیمت کے استقلال کے حیرت افزا قصے سنا کر آخر میں تحریر فرمایا کہ:

''اس کے بعد آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے آپ کو ان حالات سے نہیں، بلکہ حالات سے پیدا ہونے والے احساسات سے محفوظ کر لینے کی صلاحیت اگر پیدا کر چکے ہیں تو پھر کام کا میدان تو حد سے زیادہ وسیع ہے، ہم لوگ اب جو دنیا سے

رخصت ہو رہے ہیں یہی کہتے ہوئے رخصت ہو رہے ہیں کہ ؎

"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

غرضیکہ حضرت مولانا گیلانی کی موت اس کارگاہ حوادث کا ایک معمولی حادثہ و واقعہ نہیں؛ بلکہ ان کی موت علم و ادب، فضل و کمال، تحقیق و تدبر کی موت ہے، ایک دبستانِ علم و فکر کا ختم ہونا اور ایک مکتبۂ تعلیم و تربیت کا انہدام ہے، ایک زبردست مربی، مخلص بزرگ اور محبت و شفقت کا پیکر اٹھ گیا، علوم کا خزانہ خاک میں مل گیا، چالیس سال سے جس کے قلم کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی وہ علم پاش اور گوہر نواز قلم ٹوٹ گیا۔ میں اپنے متعلق تو کیا عرض کروں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

آتش اندر آشیاں بے رحم صیاداں زدند
در گلستاں مشتے خارے داشتم نہ گزاشتند

کاش کہ مکتبۂ برہان دہلی، مرحوم کے ان مکتوبات ہی کی اشاعت کا سروسامان کرے جو تحقیقاتِ علمیہ سے مالامال اور سالہا سال کے تعلیمی و تربیتی تجربہ کے آئینہ دار ہیں، وقت کی یہ سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے علمی حلقے اس طرف توجہ کریں۔

جانے والے پر خدا کی رحمت سایہ فگن ہو اور اس نجیب و کریم پر بے پایاں کرم والتفات کی ضیا پاشیاں ہوں ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

***

حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ

علمائے روزگار کا مخزن، فضلائے دہر کا معدن، نام ور شخصیتوں کا مرجع، علوم وفنون کا مرکز، اے خوش نصیب دار العلوم! مبدأ فیاض نے تجھے کن کن گوہر ولآلی سے نوازا اور کیسے کیسے آبدار و تابدار موتیوں سے تیرا دامن لبریز ہے، تو صبح چمن ہے کہ بادِ نسیم تیری روشوں پر مصروف خرام، تو ایسا سدا بہار گلشن ہے کہ تیرے پھولوں کا منہ دھلانے کے لیے شبنم بلندیوں سے اترتی ہے، یہ زبان استعارہ و تشبیہ کی ہے ورنہ تیرے لیے سب کچھ وہ فخر روزگار شخصیتیں ہیں جن کی نظیر اب چشم فلک دیکھ نہ سکے گی، انہیں میں تیری ماضی قریب کے مسند آراء حدیث و زینت بخش تخت علم وفن مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ بھی تھے۔

ہاپوڑ کی سرزمین نے اپنے بطن سے اس قیمتی موتی کو اچھالا اور دہلی پہنچا دیا۔ طفولیت مرحلۂ علم وکمال میں تربیت کے ادوار سے گذری جس میں پیہم مصائب اور تابڑ توڑ مشکلات رفیق سفر رہیں، دہلی نے اس گوہر آبدار کو اس مرکز ثقل کی طرف پہنچایا جسے خود دہلی کی تخریب نے تعمیر کیا تھا، یہیں یہ جوان رعنا حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت العلام مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہما العزیز کی کیمیا اثر نظر کا مرکز بنا، بدو فطرت سے جن صلاحیتوں کو لے کر چلے تھے ان کے اجاگر ہونے کا وقت آیا۔ فراغت حاصل کی اور یہیں مدرسی کے عہدے پر فائز ہوئے؛ لیکن سوئے تقدیر کہ ایک علامہ سے معاصرانہ چشمک چل پڑی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے اپنے تدبر سے کام لے کر ''مدرسہ شاہی مراد آباد'' کی صدارتِ تدریس پر روانہ کر دیا۔ نصف صدی کے قریب اس درس گاہ کو آب و تاب دیتے رہے۔ درمیان میں ایک بار دار العلوم دیوبند کی مسندِ صدارت

پر چند ماہ کے لیے تشریف لائے اور پھر مراد آباد لوٹ گئے، مجلس شوریٰ کے رکن منتخب کیے گئے اور جب مولانا حسین احمد مدنیؒ کا دمِ واپسیں بر سرِ راہ تھا تو نظرِ انتخاب اسی وجودِ زیبا پر جا رکی، شیخ الحدیث بنا کر لائے گئے اور چند سال کے بعد صدارتِ تدریس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ کیا آئے کہ خزاں رسیدہ چمن میں بہار آگئی، وہ اٹھے تو علمی بہاریں بھی ان کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔ حدیث ان کا فن تھا، بخاری شریف ان کی مخصوص کتاب تھی۔ قال اللہ وقال الرسول ان کا شغل تھا، نزاکتِ مزاج ان کا وصف تھا، نفاست پسندی ان کا امتیاز تھا۔ زاہد، پاکباز، عالم ربانی، قلب روشن، روح مزکی، نہایت صاف گو، معاملات میں بڑے بے غل وغش، واہمہ کے مریض، علالت اور ناتوانی کا ہر وقت ورد، علیل ہوں، مریض ہوں، ناتواں ہوں، ان کا کلمۂ طیبہ۔ بات بات پر بگڑنا، بگڑنے کے بعد سنورنا، غصے میں لگاوٹ، بزرگوں کے معتقد، صاحبزادوں کے لیے تیار، اب کہاں ملیں گی ایسی شخصیتیں اور کس چراغ کو ہاتھ میں لے کر تلاش کیا جائے ان خزینوں کو، بعمر چوراسی سال جس مراد آباد میں افقِ علم پر ابھر کر آئے تھے اسی افق میں قیامت تک کے لیے روپوش ہوگئے۔ وسطِ شہر میں قبر کا مطلع نمایاں ہے، لیکن آفتابِ علم غائب از نظر۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ

ہزارہ کے رہنے والے، دارالعلوم دیوبند کے قدیم استاذ، شباب سے شیب تک کا زمانہ دارالعلوم کی تدریس میں صرف کر دیا؛ بلکہ لحد بھی دیوبند میں تلاش کی، عجیب وغریب مزاج اور حیرت انگیز روایات کے مالک، جب بڑھاپے میں داخل ہوئے تو دارالعلوم کے لیے تبرک بن گئے۔ سردی کے زمانے میں مرزئی، اس پر فرغل، اس پر چادر اور پھر لحاف کا بوجھ کھینچ کر درس گاہ میں داخل ہوتے، آتے ہی لیٹ جاتے اور فرماتے کہ ارے! کوئی ہے جو مجھے داب۔ طلبہ جسم دبانے کی سعادت حاصل کرتے اور سبق ہوتا، عبارت کے اختتام پر ''فتدبر'' آتا تو اندر ہی سے دریافت فرماتے کہ اِس صفحہ کا فتدبر یا اُس صفحہ کا، نشاندہی پر تقریر شروع ہو جاتی، نامور شاگرد شاہ صاحب دارالعلوم کے صدر مدرّس ہو چکے تھے اور ان کے علم کا بحر مواج تلاطم پذیر تھا۔ مفتی محمود نانوتوی سابق رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند صاحبزادہ ہونے کی بناء پر کہنے سننے میں جری تھے عرض کرتے کہ:

''جب آپ سے پڑھایا نہیں جاتا تو مفت میں دارالعلوم سے مشاہرہ کیوں لے رہے ہیں؟ وہ دیکھیے آپ کے شاگرد حضرت شاہ صاحب کس شان کا درس دے رہے ہیں''۔

اس طنزیہ جملے پر یہ سادہ دل پٹھان، زائد کپڑے اتار کر پھینک دیتا، سنبھلتے ہوئے ارشاد ہوتا ''تو پھر میں کہوں گا کہ انور شاہ کو آتا ہی کیا ہے؟''

طلبہ کہتے کہ آپ عربی میں تقریر نہیں کر سکتے شاہ صاحب تو عربی میں تقریر کر لیتے ہیں۔ مرحوم کی عربی میں تقریر شروع ہو جاتی۔ اچھا آپ فارسی میں تقریر نہیں کر سکتے جب کہ آپ کے شاگرد فارسی میں قادر ہیں، اس پر فارسی میں تقریر ہوتی۔ فرماتے کہ میں کئی زبانوں کا ماہر ہوں، ان زبانوں کی فہرست میں اردو بھی داخل تھی، مفتی محمود صاحب نے عرض کیا اگر آپ اردو جانتے ہیں تو کریلا اور نیم چڑھا کا مطلب بتائیے؟ کچھ وقت کے لیے غوطہ زن ہوئے اور پھر ارشاد ہوا:

''اور'' حرفِ عطف نے کام خراب کر دیا ورنہ بات صاف تھی کریلا نیم پر چڑھ گیا۔''

اس سادگی، معصومیت سے طلبہ بھی خوب لطف لیتے اور ذمہ دارانِ مدرسہ بھی، مولانا معین الدین اجمیری صدر جمعیۃ علماء ہند دیوبند تشریف لائے تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے تمام اساتذہ کو مطلع کیا کہ اسباق جاری رکھیں، مولانا اجمیری گشت کریں گے خدا جانے مرحوم کو یہ اطلاع پہنچی یا نہ پہنچی وہ اپنی درس گاہ کو مقفل کر کے چلے گئے۔ ادھر مولانا معین الدین اجمیری روانہ ہو گئے، چائے کی مجلس میں مولانا عثمانی نے مزاحاً فرمایا کہ:

''مولانا اجمیری فرماتے تھے کہ آپ کے شیخ المنطق کو میرے سامنے پڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی، اس پر مولانا غلام رسول صاحب بستر باندھ کر اجمیر روانہ ہونے لگے کہ وہیں اپنا سبق سنا کر آؤں گا۔''

غرض یہ کہ حضرت مرحوم لطائف کی پوٹلی تھے۔ دیوبند کی جامع مسجد میں قیام تھا اور آئے دن شہریوں سے جنگ رہتی۔ ہر آویزش میں مدرسے کے ذمہ داران کی حمایت کرتے۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے فرمایا کہ:

''عید الاضحیٰ کی تعطیلات تھیں اور میں اپنے کمرے میں مصروف حاشیہ نویس کہ اچانک مولانا غلام رسول صاحب تشریف لائے اور کھڑے کھڑے فرمایا: ''اعزاز علی! اگر میں مر گیا تو کتنا مجھ کو ایصال ثواب کرو گے۔''

کچھ عرض معروض کے بعد جیب سے ایک تحریر نکالی جس پر اپنے تمام تلامذہ سے

ایصالِ ثواب کا وعدہ دستخطوں کے ساتھ لے رکھا تھا، میں نے بھی ایصالِ ثواب کی مقدار متعین کرتے ہوئے دستخط کردیے پھر پوچھا کہ:

''حضرت! یہ آج آپ نے کیسی مہم شروع کی؟''

فرمایا کہ ''میری شہریوں سے آویزش رہتی، مولوی حبیب ہمیشہ میرا ساتھ دیتا، لیکن اس بار کی لڑائی میں حبیب نے میری ترکِ حمایت کی، یہ میری موت کی علامت ہے، اس واقعہ کے چندروز بعد یہ کہنہ سال، سادہ لوح عالم، ہزارہ کا انسان اور استاذ الاساتذہ ہمیشہ کے لیے گورستانِ قاسمی میں پیوندِ خاک ہوگیا، تربت کی خاص علامت بے نشانی ہے۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

حضرت مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم بجنوری

بجنور کے رئیس خاندان کے چشم و چراغ، دل کے غنی، پوشاک کے غریب، عمل کے مسلمان، عقیدے کے مومن، معصومیت، بھولا پن اور سادگی کے پیکر، سینکڑوں بیگہ زمین کے مالک، بعض گاؤں بھی ان کی ملکیت میں، لیکن معمولی کرتا، شرعی پاجامہ، دتوڑی کا جوتہ، سر پر دو پلی ٹوپی، اپنے طرز میں صلابت کا یہ عالم کہ مولوی سلطان الحق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند ایک مرتبہ گرگابی پہن کر ان کے یہاں جا پہنچے تو بولے کہ ''اللہ جانے مولوی صاحب، تم میں بھی فرنگیت آ گئی۔'' اللہ جانے مرحوم کا تکیہ کلام تھا۔ شاہ صاحبؒ کے رفیق درس اور ایسے رفیق کہ اپنی امارت کے باوجود مرحوم کی غربت کے شریکِ کار، شاہ صاحب پٹھان پورہ مسجد میں امامت کرتے تو بجنور کا یہ رئیس زادہ حقِ رفاقت ادا کرتے ہوئے سقایہ بھرتا، بعد مغرب دونوں ہمراہ دارالعلوم آتے تو راہ چلتے شاہ صاحب مولانا مشیت اللہ صاحب کو آسمان پر موجود ستاروں کی تشخیص و تعیین، ان کی بروج و گردش، فلکیات کا سبق پڑھاتے۔ مولانا مشیت اللہ صاحب کو بھی اپنے اس نامور ساتھی سے عجیب و غریب تعلق تھا۔

زمانۂ طالب علمی میں گھر پہنچے اور اپنے ماموں مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب جن کی حذاقت پر اعتماد کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی، ٹی بی کے مریض کو بجنور علاج کے لیے ان کی خدمت میں بھیج دیتے۔ مولانا مشیت اللہ صاحب نے ان سے شاہ صاحب کا وقیع تذکرہ کیا اور یہ بھی خوش خبری سنائی کہ میری دعوت پر وہ بجنور آ رہے ہیں۔

حکیم صاحب طبی مشغولیت کے باوجود بڑے علم دوست وعلماء پرور تھے۔ پھر اپنے بھانجے سے آنے والے کا وقیع تذکرہ سنا تو سراپا اشتیاق بن گئے، اسٹیشن پر اپنے خادم کو استقبال کے لیے بھیجا، شاہ صاحب اترے تو بے ریش وبروت، جوان رعنا، حسن وکشش کا پیکر، خادم نے حکیم صاحب سے جاکر کہا کہ کیسا عالم؟ کہاں کا عالم؟ وہ تو ایک طفل نوخیز ہے۔ مشیت اللہ نے اس کے تعارف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ شام کو میزبان اور مہمان یکجائی کھانا کھاتے تھے کہ اچانک حکیم صاحب تشریف لے آئے، شاہ صاحب ان کو دیکھ کر سروقد ہو گئے، چارپائی پر نشست اس طرح تھی کہ سرہانے حکیم صاحب اور پائتی پر سبزہ آغاز مہمان، علمی گفتگو شروع ہوئی جس کا سلسلہ اس وقت کے مشہور عنوان ''امتناعِ نظیر'' پر جا پہنچا، حکیم صاحب اس زمانے میں امتناعِ نظیر پر کتاب تصنیف کر رہے تھے۔ چند ہی لمحات کی گفتگو کے بعد جوہر شناس حکیم صاحب نے شاہ صاحب کو پہچان لیا، بے اختیار کھڑے ہو گئے، ہاتھ پکڑ کر سرہانے بٹھا دیا اور خود سامنے کی چارپائی پر آ گئے۔ صبح ہوئی تو جس خادم نے طفل نوخیز کا عنوان دیا تھا اس سے فرمایا: میاں! جسے تم کمسن کہہ رہے تھے وہ ہم بڑوں کے کان کاٹ رہا ہے۔ پھر اپنی تصنیف پر شاہ صاحب سے تقریظ بھی لکھوائی جو حکیم صاحب کی مطبوعہ تصنیف میں موجود ہے۔

غرض یہ کہ اس خاندان سے شاہ صاحب کا تعلق اس درجہ مستحکم تھا کہ دارالعلوم دیوبند کی تعطیلات سالانہ بجنور گذارتے، بیمار ہوتے تو مولانا مشیت اللہ چوں کہ یہ جانتے تھے کہ شاہ صاحب پرہیز کے عادی نہیں، جبراً مرحوم کو بجنور لے جاتے اور یہاں مکو کی ترکاری، خرفے کا ساگ اور کاسنی کی بھجیا پیہم کھلاتے۔ رفیق درس ہونے کے باوجود بھری مجلس میں سوال کرتے تو لب ولہجہ یہ ہوتا ''اللہ جانے مولوی صاحب، وہ مسئلہ کیا تھا یاد نہیں رہا۔'' تعلقات کے استحکام کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کو تنبیہ آمیز لہجے میں مخاطب کر لیتے، ایک باران کے وطن کشمیر کا بھی سفر کیا۔ اپنے ہمشیرزادہ مولانا شفیق الرحمٰن کی شادی میری بڑی بہن عابدہ مرحومہ سے کر کے تعلقات کی اس

حسین عمارت کو رنگ و روغن بخشا۔ مولانا مشیت اللہ مرحوم ہر ماہ دیوبند آتے اور شاہ صاحب ہی کے پاس قیام کرتے۔ شاہ صاحب بھی اپنے خانگی معاملات میں انہیں اپنا مخلص گردانتے، جس دن شاہ صاحب کا سانحۂ وفات پیش آیا تو خانوادۂ انوری کی جانب سے مولوی سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم کو مامور کیا گیا تھا کہ وہ متعلقین کو ٹیلی گرام کے ذریعہ اس حادثے کی اطلاع دیں، سوئے اتفاق کہ مولانا مشیت اللہ صاحب کو بروقت ٹیلی گرام نہیں کیا جا سکا۔ وہ اس کوتاہی پر مولوی سلطان الحق صاحب سے مدتوں کبیدہ خاطر رہے۔

ہم پسماندگان سے بزرگانہ شفقتوں کا یہ عالم تھا کہ دیوبند آتے تو ہمیں گھیر گھار کر بجنور لے جاتے۔ راقم الحروف کی عمر نو دس سال کی تھی، ورمِ جگر کا مرض ہوا تو دیوبند آ کر زبردستی بجنور لے گئے اور میری دل بستگی کے لیے اعزاء میں سے ایک ہم عمر کو ہمراہ لیا، بجنور پہنچے، وہی خرفے کی ترکاری، کاسنی کا عرق، مکو کی بھجیا۔ رات ہوئی تو مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر سوئے۔ بچپن اور اس کی نادانیاں، والدہ مرحومہ کی یاد میں ساری رات چلایا اور ان کے تسلی آمیز رویے پر اور تو کچھ بن نہ پڑی۔ عیاذاً باللہ اپنی ننھی ننھی لاتوں سے مرحوم کی تواضع کی، اس پر بھی مکدر نہ ہوئے، صبح کو بہ مجبوری دیوبند روانہ کیا۔ چار عدد جوڑے خاکسار کے لیے، دو رفیق سفر کے اور یہ ہرگز نہیں بھولے گا کہ تانگے کے اردگرد طواف کرتے اور اضطرابِ تمام سے کہتے "اللہ جانے تمہیں کیا ہو گیا، تمہارے والد تو یہاں مدتوں قیام کرتے۔"

مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دیوبند آتے تو مجھے اور برادر اکبر کو بھی بہ خاموشی ایک گوشے میں لے جاتے، کمربند میں بندھے ہوئے پچاس سے سو تک کے نوٹ نکال کر ایسی اخفائی کوششوں سے ہماری جیب میں ڈالتے، گویا کوئی جرم کر رہے ہیں۔ راقم الحروف دارالعلوم سے فارغ ہوا تو اس کی مدرسی کے لیے ان کی سعی و کوشش خود ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بائیس سال گذرتے ہیں کہ یہ پیکرِ شرافت، مجسمۂ انسانیت،

شریفانہ روایت کا حامل بجنور کی خاک میں ہمیشہ کے لیے مستور ہو گیا۔ پسماندگان میں جناب مطلوب الرحمٰن صاحب بجنور میونسپلٹی کے ممبر رہے اور سب سے چھوٹے صاحب زادے جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔ مؤخر الذکر کے انداز واداؤں میں مرحوم باپ کی سیر چشمی، مہمان نوازی، مروّت وشرافت کی جھلک آتی ہے۔ خدائے تعالیٰ اس خانوادے کو اپنی خاص رحمتوں سے سرفراز فرمائے کہ بجنور کی زمین پر ان کا گھرانہ مرجع انام اور دارالاضیاف ہے۔

***

مرشدِ فتح پور

حضرت الحاج مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے ہندوستان کے کونے کونے میں خانقاہیں آباد اور ہو حق کے نعروں سے معمور تھیں۔ یہ اسلام کے اس خاص رخ کا پتہ دیتیں جس کا تعلق تعمیر باطن سے ہے، تصوف غلط کار صوفیاء کے کردار کے نتیجے میں بہت بدنام ہو گیا، دوسری جانب حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیم نے اپنے وفورِ علم اور زورِ قلم سے تصوف پر وہ ضرب کاری لگائی کہ آج بھی منکرین تصوف ان ہر دو فخر روزگار شخصیتوں کے تنقیدی لٹریچر کے خوشہ چیں ہیں؛ حالاں کہ دونوں حقیقی تصوف کے منکر نہیں اور کیسے منکر ہوتے جب کہ قرآن وسنت میں تصوف کی بنیادی اصطلاحات کا ذکر اور ان کی اہمیت کو واشگاف کیا گیا ہے؛ بلکہ ابن تیمیہؒ میں تو اہل نظر کو تصوف کی لہریں موجزن نظر آتی ہیں۔ شاہِ مصر کو جس وقت وہ اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے کے لیے اپنی پُرزور حفاظت سے مستعد کر رہے تھے اور مصر کا یہ کج کلاہ افسردگی کا ڈھیر بنا ہوا تھا تو ابن تیمیہ نے تین بار قسم کھا کر کہا کہ آپ حملہ کیجیے، آپ کامیاب ہوں گے۔ مایہ ناز شاگرد ابن قیم نے لقمہ بھی دیا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجیے؛ مگر ابن تیمیہؒ نے سنی ان سنی کر دی۔ جنگ ہوئی اور شاہِ مصر کو فتح نصیب ہوئی، کہا جاتا ہے کہ یہ ابن تیمیہ کا کشف تھا؛ مگر جب تصوف کو گورکھ دھندا بنایا گیا اور بدعات ومحدثات اور غلط افکار کا گرد وغبار اس کے چشمہ صافی پر تہ بہ تہ جمنے لگا تو ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کو پرستارِ سنت کا مظاہرہ کرنا پڑا، ہندوستان میں بھی تصوف پہنچا، اور حضرت مخدوم شیخ علی ہجویریؒ المعروف بہ ''داتا گنج بخش'' الدفین بہ لاہور،

اس کے شیریں نغمے ہندوستان لے کر پہنچے، اس قدسی صفت انسان نے کشف المحجوب کے نام سے کتاب بھی لکھی، ان ہی کے مزارِ پُرنور پر سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے چلہ کشی کی اور یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا تعارف ان ہی صوفیہ صافیہ کے نفوسِ قدسیہ سے ہوا۔ تاہم اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غلط کردار افراد حلقۂ صوفیہ میں داخل ہوتے رہے اور اپنی غلط روی سے تصوف جیسے انمول موتی کی رسوائی کا موجب بنے؛ تاہم بدعات کی آندھیوں میں سنت کے چراغ بھی ٹمٹماتے رہے، بعض خانقاہوں سے توحید کے سریلے نغمے، اتباعِ سنت کی نسیم سحر، تزکیۂ باطن کی شمیم انگیزیاں اور تقویٰ کی بھینی بھینی خوشبو مشامِ دل وجان کے لیے بہجت افزا ہیں، اکابرِ دیوبند جن حضرات کے خوشہ چیں تھے وہ سب تصوف کے علمبردار اور خانقاہی طور وطریق کے حامل تھے اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ نصف صدی قبل دار العلوم سے سندِ فراغ اس وقت تک کسی کو میسر نہ آتی تاوقتیکہ وہ کسی خانقاہ سے تزکیہ کی سند نہ لے آتا۔ گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی، دیوبند میں مولانا محمود حسن المعروف بہ شیخ الہندؒ، سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب، رائے پور میں حضرت شاہ عبد الرحیم اور ان کے لواحقین دبستانِ تصوف کے معلم اوّل وثانی تھے، ان سب خانقاہوں میں تھانہ بھون کی خانقاہ نرالی تھی۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ بلاشبہ تیرہویں صدی کے مجدد، اور اپنے عمل وکردار کے اعتبار سے طبقۂ علماء میں منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ استغناء، خودداری، قناعت وتوکل، تشخیص وتجویز، تعلیم وتربیت کے وہ سنگ میل انہوں نے تیرہ وتار راہ میں کھڑے کیے ہیں کہ صدیوں تک گم کردہ راہ مسافران نشانات سے راہنمائی پاتے رہیں گے۔

راقم السطور خود مولوی ہے اور مولویوں کی کمزوریوں سے بخوبی واقف؛ بلکہ ان میں مبتلا، لیکن تمام اکابر میں مولانا تھانویؒ کی شخصیت نے جس قدر متاثر کیا، ایسا متاثر کسی سے نہیں ہوا اور اگر کسی مریض وبیمار کی کسی حاذق ومعالج کے بارے میں جب کہ وہ

سینکڑوں سے ناکام علاج کراکر اس کی حذاقت سے فائدہ اٹھا چکا ہو شہادت قبول ہوتی ہے، تو سینکڑوں مولویوں کے قرب وجوار میں دور اور قریب سے دیکھنے کے بعد مولانا تھانوی کے بارے میں یہ شہادت معتبر ہونی چاہیے۔ حرص، طمع وطلبِ دنیا عام مرض ہے؛ لیکن حضرت تھانویؒ ان بیماریوں سے الحمد للہ تندرست وتوانا قلب رکھنے والے ہیں، ان کے یہاں روزانہ بڑی بڑی رقموں کے منی آرڈر صرف اس وجہ سے واپس ہوتے کہ وہ شرائط کے مطابق نہ تھے۔ ہدایا وتحائف کے دروازے پر ایسا مضبوط پہرہ لگایا کہ مرحوم کے یہاں کسی کو ہدیہ پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ قبول کرتے لیکن اپنی شرائط کے مطابق، مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوری، سابق صدر المدرسین مظاہر علوم سہارنپور حضرت کے ان خلفاء میں سے تھے جن پر خود حضرت کو ناز تھا۔ ایک بار ایک عریضے کے ذریعہ اجازت چاہی کہ قلیل آمدنی ہے، ہدیہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن صرف دو روپے کی کوئی چیز پیش کرسکوں گا، اپنی کوئی پسندیدہ چیز تحریر فرمائیں۔ جواب باصواب یہ تھا کہ آپ کا ہدیہ تبرک سمجھ کر قبول کیا جائے گا، لیکن دو روپیہ کا نصف یعنی ایک روپیہ بصورت نقدا نفع ہے۔ اب کیا عرض کروں، اگر کسی اور مرشد کے یہاں دو روپیہ کی قلیل رقم ہدیہ کرنے کی جرأت کی جاتی تو مرشد دی ہوئی خلافت ایک نہیں دو مرتبہ سلب کرتا۔

مولانا تھانویؒ ایک بار ڈھاکہ تشریف لے گئے، نوابِ ڈھاکہ ان سے عقیدت وارادت رکھتے، سکریٹری استقبال کے لیے آئے، حضرت تھانوی نے فرمایا کہ خود نواب صاحب کیوں نہیں آئے؟ تو غیر تربیت یافتہ اس سکریٹری نے کہا کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں پہنچتا؛ بلکہ پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے۔ مطلب اس منطق کا یہ تھا کہ آپ ضرورت مند ہیں نواب تک چل کر پہنچئے، نواب محتاج نہیں ہے کہ آپ تک پہنچنے کی زحمت گوارا کرے۔ حضرت نے اس کا معاندانہ شکن جواب دیا کہ ”ضرورت کی دو چیزیں ہیں دین اور دنیا، دنیا بقدرِ ضرورت ہمیں میسر ہے اور خدائے تعالیٰ نے دولتِ دین بھی میسر کی ہے، گویا کہ ہم دونوں شعبوں کو رکھتے ہیں، تمہارے نواب کے پاس

دنیا تو ہے، لیکن دین نہیں، ہم دنیا میں ان کے محتاج نہیں اور وہ دین میں ہمارے محتاج ہیں، اگر تمہارا قضیہ صحیح ہے تو نواب پیاسے ہوئے اور ہم کنویں۔ یہ فرمایا اور الٹے تھانہ بھون لوٹ گئے۔ اس کردار کا مظاہرہ تھانہ بھون کا یہ فقیر غیور ہی کر سکتا تھا۔ پھر صدیوں سے تصوف حق کے نعرے، ذکر جہری وسری کا مجموعہ، کچھ خاص مشاغل واذکار کا مرکب سمجھا یا جار ہا تھا۔ حضرت تھانویؒ پہلے وہ کامل ومکمل صوفی ہیں جنہوں نے تصوف کا حاصل معاملات کی درستگی، ذاتی وشخصی زندگی کو اسلامی خوبیوں سے جلوہ گر بنانے پر زور دیا اور اس نقطۂ نظر کو اس قوتِ استدلال کے ساتھ پیش کیا کہ تیرہویں صدی میں تجدید کا اڑتا ہوا پھریرا صرف اس مجدد وقت کے ہاتھوں میں ہے، ہزاروں ہزار خانقاہ نشین صوفیاء کو دیکھا کہ عبادت وریاضت میں طاق، ذکر وفکر میں بحر مواج، لیکن معاملات میں بالکل کورے، بلکہ عام انسانی اخلاق سے بھی معریٰ، چہ جائیکہ اسلامی شمائل کا پیکر ہوں، بعض کے یہاں تصنع توسع کے نام پر اور مکارم اخلاق کے لبادے پہنے ہوئے، لیکن ان کا باطن بہیمیت اور درندگی کا مظہر، سیاسی اشخاص؛ لیکن رمضان المبارک آتا ہے تو مسجدوں کو جہری ذکر سے لبریز کر دیتے ہیں، دنیا کو دھوکہ دینے والے، لیکن عشرہ اخیر کی طاق راتوں کو عبادت کے سوز وگداز سے بھرپور دکھاتے، رہ گیا سادہ دل مسلمان تو وہ اپنے دین کی متاع کو بے تکلف ان پر لٹا رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

حضرت مولانا تھانویؒ کی وحید وفرید شخصیت ہے جس نے حقیقی تصوف کا مطلب سمجھایا اور تصوف کی جلوہ آفرینیاں اپنے پیکر زیبا میں جلوہ گر کیں، طریقت کو شریعت کے تابع کیا اور ان دونوں کے مابین جاہلانہ تفریق کے تصورات کو مٹا ڈالا۔ وحدۃ الوجود والشہود جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے وہ آغوش گیر ہو گئے۔ ایک ہزار تصانیف سے جو مختلف موضوعات پر پھیلی ہوئی ہیں کتب خانۂ علم لبریز کر دیا،

بہشتی زیور گھر گھر پہنچ گیا اور بیان القرآن ہر درس گاہ کی رونق اور ہر مولوی کے کمرے کی زینت ہے؛ مگر ایک فرقہ ضالہ ومضلہ نے چودھویں صدی کے اس مجدد کو انگریز کا سی آئی ڈی بنا کر اپنی قبروں کو جہنم زار بنایا۔ ان ہی حضرت نے سینکڑوں خلفاء کی صورت میں صحیح تصوف اور تزکیہ وتقویٰ کے قنادیل روشن کر دیے۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب "حضرت تھانویؒ" کے ممتاز خلفاء میں تھے، طالب علمی کے زمانے میں اعظمی طلبہ کی وساطت سے مرحوم کا تعارف کانوں تک پہنچنے لگا تھا، میرا مدرّسی کا پہلا سال تھا، مولانا عبدالحق میاں سملکی کی دعوت پر ان کی معروف انجمن خدام الدین کا گجرات کا تبلیغی دورہ کر کے دیو بند پہنچا اور عید الفطر کے بعد اعظم گڑھ کے لیے رخت سفر باندھ لیا، اب میں اسے راز نہیں رکھنا چاہتا کہ یہ مجھ زبوں ہمت کی طویل مسافرت ایک اور شخصیت کی کشش میں تھی؛ لیکن پردہ اس پر فتح پور تال نرجا کا ڈالا گیا تھا، مدراس کے ایک طالب علم محمد شریف مدراسی میرے رفیق سفر تھے، جو اتفاقاً ہولٹ واقع ہوئے تھے، غالباً دوسری صبح کو گھوسی اسٹیشن پر اترا، حسنِ اتفاق کہ وہاں دارالعلوم کے کچھ قدیم وجدید طالب علم مل گئے، جنہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، کشمیری النسل ہونے کی بناء پر میں چائے کا بے حد عادی ہوں اور غالب کی روح کو دعا دیتے ہوئے یہ کہہ کر پیالی پی لیتا ہوں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

مگر عجیب بات ہے کہ شاہ گنج سے تا گھوسی مجھے کہیں چائے میسر نہ آئی۔ چائے کا خمار، سر کی گرانی، جسم کا کسل اٹھائے ہوئے میں اسٹیشن پر اترا، ان طلبہ کو دیکھ کر جان میں جان آئی کہ یہ چائے کا کوئی انتظام کریں گے؛ مگر یہ اللہ کے بندے بجائے چائے کے خربوزے لے دوڑے جو بالکل ہرے ہرے اور دیکھنے میں کچے معلوم ہوتے تھے، قہرِ درویش برجانِ درویش، بہ ہزار ناگواریٔ طبع انہیں کھانے کے لیے بیٹھا تو کام ودہن

شیرینی سے چپک گئے۔ اتنے شیریں، اتنے میٹھے، اتنے ذائقے دار خربوزے اب تک کھانے میں نہ آئے تھے، یہ اعظم گڑھ کے مشہور گاؤں ''ادری'' کے خربوزے تھے۔ ان طلبہ سے مقصدِ سفر بیان کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہاں سیٹھ عبدالرب صاحب حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے مسترشد خصوصی ہیں جو واردین وصادرین کو اپنے انتظام کے تحت فتح پور تال نرجا پہنچاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہات کی عجیب بات ہے کہ جہاں کسی کے پاس چند پیسے ہوئے اسے سیٹھ کہنے لگتے ہیں، عام آبادی غریبوں کی ہوتی ہے، دوسرا کوئی دولت کے اعتبار سے ممتاز ہوا تو سیٹھ سے اس کی شہرت ہوگئی۔

عبدالرب صاحب اچھے خاصے بیوپاری تھے، ان کے یہاں پہنچا، حسنِ خلق سے پیش آئے۔ ناشتے کا انتظام کیا جس میں پورب کی مشہور سوئیاں بھی تھیں، چائے بھی پلائی جو بدذائقہ نہ تھی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا استاذزادہ ہوں اور دارالعلوم کا مدرس تو اپنے خصوصی گھوڑے تانگے میں جو قدیم بگھی کی شکل کا تھا، مجھے فتح پور تال نرجا روانہ کردیا۔ دوپہر کے کھانے تک میں فتح پور پہنچ گیا، خیال یہ تھا کہ مولانا وصی اللہ صاحب مرحوم لمبے چوڑے آدمی ہوں گے، گورا چٹا رنگ ہوگا، طویل داڑھی ہوگی جو سینے تک پہنچ رہی ہوگی، سر پر گمبھیر زلفوں کا سایہ ہوگا، قدوقامت سے بڑھا ہوا کرتا، آنکھوں پر چشمہ، جس کے عقب سے ان کی عزرائیلی آنکھیں جھانک رہی ہوں گی، سونٹا بہ دست اور دوسرے ہاتھ میں ہزار دانہ تسبیح؛ لیکن ہائیں میں یہ کیا دیکھ رہا تھا۔

ایک پست قامت انسان، گٹھا ہوا جسم، سر پر چہار گوشہ ٹوپی، کرتے کا گریباں کھلا ہوا، نہ تسبیح کی جھنکار، نہ ہوحق کی للکار، کمرے میں تنہا کھڑے ہوئے مجھے دیکھتے ہوئے فرمایا: آیئے! تشریف لایئے۔ مرحوم بات کرتے تو منہ کے بائے میں ایک ہلکا سا خم محسوس ہوتا جو بھلا معلوم ہوتا، موصوف ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے نہ خوش نما واقع ہوئے تھے اور نہ جاذبِ نظر؛ بلکہ ٹھیٹ ایک دیہاتی محسوس ہوتے۔ دسترخوان

بچھا، جس پر مختلف ترکاریوں کے ساتھ چپاتیاں آئیں، وہ بالکل باریک اور ہوائی تھیں، دو لقمے بھی تکلف سے کرنا پڑتے۔ شام کو مجلس ہوئی تو حضرت کے جذب وجلال کا منظر دیکھنے میں آیا، ان کے سامنے کوئی ایسا سامع خصوصی ہوتا جس کا سر مولانا کے جلال کا تختۂ مشق بنا ہوتا۔ کچھ ارشاد فرماتے اور اس شخص کے سر کو کبھی جنبش دیتے کبھی نیچے کو گرادیتے، کبھی پیچھے کو دھکیل دیتے، بہت جوش آتا تو بات کرتے کرتے اپنی مسند سے تا مخاطب پہنچ جاتے، کبھی کھڑے ہوجاتے، کبھی بیٹھ جاتے، عبدالرب صاحب بھی پہنچ چکے تھے، مولانا ان کی کسی بات پر بگڑے تو ڈنڈا اٹھا کر ان کی خبرلی، میرے لیے یہ تمام مناظر عجیب وغریب تھے، خانقاہی رسوم وقیود سے ناآشنائی کی بنا پر حدِ ادب میں رہنے کا خوگر نہ تھا، حضرت مرحوم کی ان اداؤں پر بے اختیار ہنسی آئی، مگر یہ خوف بھی دامن گیر رہا کہ کہیں یہ عصائے موسوی مجھ فرعون پر نہ برسے۔ ایک ہفتے رہنا ہوا، پُرتکلف کھانے کھائے، چلتے ہوئے ایک بڑی رقم بطور ہدیہ دی، جس چارپائی پر تشریف فرما تھے اس پر چادر تھی وہ بھی اٹھا کر میری نذر کردی، دیوبند تک کا ٹکٹ لے کر دیا، اپنے دو خادموں کو ساتھ بھیجا، خربوزوں کا ایک جھابہ بھی، یہ سب خاطر مدارات استاذزادہ ہونے کی بنا پر تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ حضرت فتح پور کے لوگوں سے ناراض ہوکر گورکھپور تشریف فرما ہوگئے اور بعد چندے گورکھپور کو چھوڑ کر الٰہ آباد کو اپنا مستقر بنالیا۔

کچھ سال بعد میں الٰہ آباد پہنچا، دولت کدے پر حاضری دی تو معلوم ہوا کہ الٰہ آباد کے بعض اشخاص سے ناراض ہوکر کسی قریبی دیہات میں تشریف لے گئے ہیں، مایوس ہوکر لوٹنے کا ارادہ کررہا تھا کہ اچانک مولانا تشریف لے آئے، چند خدام ساتھ تھے جن میں مولوی ظہورالحسن صاحب کسولوی بھی تھے، جو خانقاہِ اشرفیہ تھانہ بھون کے نگراں اور حضرت تھانویؒ کی مطبوعات کو چھاپتے، مولانا مجھ سے بغل گیر ہوگئے اور بیٹھتے ہی دریافت فرمایا کہ کیا پروگرام ہے؟ عرض کیا گیا کہ حضرت زیارت مقصود تھی، وہ حاصل ہوگئی، اب واپسی کا خیال ہے۔ اس پر اپنے خاص انداز میں مولوی ظہورالحسن صاحب

کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

''حضرت اقدس (تھانویؒ) اسی پر فرماتے تھے کہ اپنا دل خوش کرلیا اور دوسرے کی خوشی کی فکر نہیں کی۔''

یہ کہتے ہوئے مولانا دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر مولوی ظہور الحسن صاحب کی طرف دراز ہوگئے، یہ منظر ایسا عجیب وغریب تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، مگر خیر ہوئی کہ سردی کا زمانہ تھا، میں دوشالہ اوڑھے ہوئے تھا، اسی میں لپیٹ لپٹا کر قہقہے کی گونج کو بند کیا، غالباً دو ایک روز الٰہ آباد میں قیام رہا۔

والدہ مرحومہ کو کینسر ہوا تو بمبئی ٹاٹا میموریل لے جانے کی تجویز ہوئی، بمبئی میں کرلا میں حضرت بھی تھے، باربار مجلس میں باریابی کا شرف نصیب ہوا اور پھر معلوم ہوا کہ مرحوم بارادہ حج بیت اللہ چند رفقاء کے ساتھ بحری جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں اور ایک رات جب کہ دارالعلوم کی درس گاہ سے سبق پڑھا کر نکل رہا تھا کسی نے یہ وحشت انگیز خبر کانوں میں ڈالی کہ حضرت کا وصال ہوگیا۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

بعد کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ میت مکہ معظمہ لے جانے کا عزم کیا گیا، لیکن برا ہو حکومت کے ضابطوں کا کہ جب مایوس ہو کر جسدِ خاکی نذرِ سمندر کردیا گیا تو سعودی گورنمنٹ کی اجازت میت کو ساحلِ سمندر پر اتارنے کی پہنچی۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ شعر واقعہ بن کر سامنے آیا، مرحوم حضرت تھانویؒ کے اصول وضوابط پر پابندی سے عمل فرماتے، ان کی مجلسوں میں علم وحکمت کے چرچے رہتے، خاص عادت یہ تھی کہ جب بیان فرماتے، کتابوں کو اٹھا اٹھا کر لاتے اور اس کے حوالے دیتے، اس سے ان کا

علمی ذوق نمایاں تھا، مجلس میں غیبت کے موضوع پر خاصہ کی گفتگو ہوتی اور اس بے حظ مشغلہ؛ بلکہ خوف ناک روحانی مرض کی زہرناکیوں پر خوب خوب بولتے۔ مدرسہ بھی تھا، جس میں خود بھی تعلیم دیتے، فتح پور تال نرجا میں ایک بڑی خانقاہ بنائی تھی، الٰہ آباد میں اگرچہ کرایہ کے مکان میں مقیم تھے؛ لیکن وہ بھی بہت کشادہ، طویل وعریض تھا، جواہر لال بھی اپنے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں الٰہ آباد ان کے یہاں دعائے خیر لینے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، اپنے وقت میں حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں بڑا امتیاز پیدا کیا اور خواص بلکہ اخص الخواص ان کی طرف رجوع کرتے۔ ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر خارجہ حکومتِ ہند جب وزارت سے علیحدہ ہوئے تو بہت سی خانقاہوں کا چکر لگا کر مولانا وصی اللہ صاحبؒ ہی کے دامن سے تا موت وابستہ ہو گئے۔ مجلس میں اس پر خاص زور رہتا کہ تم میرے بدن پر گرتے ہو عمل کرتے نہیں، کام کرنے والے اشخاص سے بہت خوش ہوتے اور ناکارہ لوگوں سے دل گرفتہ۔ ایک شعر ہمیشہ وردِ زباں رہتا۔

پھول کیا ڈالو گے تربت پر مری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

اور واقعتہً اب ان کی خاکِ نمناک کا پتہ ایسا گم ہے کہ کسی کا یہ شعر حسبِ حال ہو گیا۔

تیری گلی کی خاک بھی چھانی کہ دل ملے
ایسا بھی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

***

۸۶ ے

اخی المعظم اوصلکم اللہ تعالیٰ الی درجۃ العرفان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ ملا، اس کے لفظ لفظ سے محبت وخلوص وعقیدت اور تاثیر وانفعال مترشح ہورہا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ اہل اللہ کے حالات ومقالات سے ہرگز محروم نہ رہیں گے۔ ان حضرات کے ساتھ صحیح عقیدت وتعلق خالی نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح برابر خط لکھتے رہیے۔ میں آپ کو دل سے یاد رکھتا ہوں۔ خاص اوقات میں بھی۔ کام میں لگے رہیے۔

عاقبت روزے بیابی کام را(۱)

والسلام خیر ختام

وصی اللہ از فتح پور

مکرمی جناب شاہ صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت والا دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ کے سب خطوط مجھے ملے جس میں ایک تو آپ نے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کی تھی اور دوسرے مضمون کے متعلق یہاں سے جو باتیں لکھی گئی تھیں، (یعنی ان کا الاحسان میں شائع ہونا مناسب ہے۔ نیز یہ کہ آپ اس میں ذرا احتیاط کے ساتھ قلم اٹھائیں) تو آپ نے ان دونوں امور کے متعلق اپنے خیال سے مطلع فرمایا تھا۔ بس اس میں انہی دو باتوں کا ذکر تھا اور ان میں سے کوئی بات ایسی نہ تھی جس کے جواب کا آپ کو خاص انتظار ہوتا، البتہ دوسرے خط میں آپ نے بعض طلبہ کے حوالے سے اپنی تشریف آوری کے متعلق بعض غلط امور کے مشہور کیے جانے کی اطلاع فرمائی تھی اور اس پر تشویش بھی ظاہر کی تھی اور مجھ سے کسی

(۱) ایک دن بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ گے۔

مناسب اقدام کی خواہش ظاہر کی تھی تو بے شک اس خط کے جواب کا آپ کو شدت کے ساتھ انتظار رہا ہوگا؛ حالاں کہ میں نے اس کا جواب قصداً نہیں دیا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ آپ اس تاخیر کا سبب خود ہی سمجھ لیں گے کہ بہت سی چیزیں وقتی ہوتی ہیں، جو مرورِ زمانہ کی وجہ سے خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ شاید تاخیرِ جواب کا یہی منشا تھا۔ باقی مجھے آپ کے اس لکھنے اور اس پر اظہارِ تشویش پر تعجب اور سخت تعجب ضرور تھا کہ آپ سے اس کی امید نہ تھی کہ آپ ایسی معمولی معمولی باتوں سے اس قدر پریشان ہو جائیں گے اور یہ اس لیے سمجھتا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی عقیدت اور محبت ایسی نہیں کہ جوان امور کی جانب التفات کو بھی روا رکھے کہ مثل مشہور ہے کہ ''جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔'' یہ تو پہلے ہی سوچنے کی چیز تھی، ورنہ تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ کے متوسلین کے ساتھ اہل زمانہ کا معاملہ کچھ عجیب سا ہے جو نہ تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عقیدت کا مصداق ہے اور نہ یہ کہ عداوت ہے، آخر کیا شئ ہے؟ اس کو خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

رہا ابتلاء تو بے شک وہ ڈرنے کی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس سے پناہ مانگنی چاہیے؛ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سمجھیے کہ اہل حق کو ابتلاء بھی ہوتا ہے اور اس وقت ثبات واستقلال، علو ہمتی اور حوصلہ مندی کے ساتھ اس کا استقبال کرنا چاہیے نہ کہ ضعف وخوف کو عمل میں لانا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس جواب سے مطمئن ہو جائیں گے اور امید ہے کہ اس سے ان تمام اوہام کا خاتمہ ہو جائے گا جو بوجہ تاخیر جواب کے آپ کے ذہن میں آئے جن کا آپ نے خط میں تذکرہ بھی کیا ہے۔

بہر حال آپ مطمئن رہیں اور حسنِ اخلاق اور خلوص کو اپنا شعار بنائیں اور صدق کے ساتھ کام میں لگے رہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو ہر معاملہ میں اپنا معین وکارساز سمجھیں، اس عزم وجزم سے ناموافق فضا بھی موافق ہو جایا کرتی ہے۔

والسلام

وصی اللہ

بقلم جامی

اخی المکترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سے ناراض نہیں ہوں، خط میں تاخیر کی وجہ اپنی طبعی کمزوری ہے، ان دنوں صحت اچھی نہیں تھی، ممکن ہے کہ جب آپ کا خط آیا ہو بیمار رہا ہوں، بہرکیف آپ معاف فرمایئے۔ والسلام

(حضرت مولانا) وصی اللہ عفی عنہ

ناقل جواب رومی غفرلہٗ

مکرمی جناب انظر شاہ صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دیوبند سے ایک طالب علم کا خط آیا ہے۔ حضرت والا نے فرمایا ہے کہ اس کا جواب بھی شاہ صاحب کے نام لکھو اور لکھ دو کہ دیکھئے! اب اس کو آپ کیا کہیے گا کہ دیوبند کے طلبہ کا میرے بارے میں یہ خیال کہ میں دیوبند کا مخالف ہوں، آخر یہ رائے ان حضرات نے میرے متعلق کیوں کر قائم کی؟ اور میرے کس قول وفعل سے استدلال کر کے اس نتیجے پر پہنچا گیا ہے؟ خاموشی کے ساتھ ایک گوشے میں پڑا ہوا ہوں، مگر کتنے کرم فرما ایسے ہیں کہ جن کو میرا یہ طریقہ بھی شاق ہے؛ لیکن مجھے ان حضرات سے کوئی شکایت نہیں؛ کیوں کہ اس چیز کو سمجھ چکا ہوں، جب بھی دین کا کوئی کام کیا جائے گا اور جو شخص بھی کرے گا تو شیطان اس میں رخنہ اندازی کی کوشش کرے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی لوگوں کے درمیان شیطان اس قسم کی افواہیں اڑایا کرتے ہیں۔

البتہ مجھے شکایت جو ہے تو ان صاحب سے ہے کہ جنہوں نے مجھ کو یہ خط لکھا؛ کیوں کہ اور دوسرے کہنے والوں نے تو مجھے پس پشت کہا، مگر انہوں نے لکھا گویا میرے

منہ پر مجھے برا کہا، کیا عقیدت اسی کا نام ہے؟ بس اس بات کو ذرا آپ ان صاحب کو کسی اچھے عنوان سے سمجھا دیجیے، سر دست تو یہی ان کے خط کا جواب ہے۔ پھر اس خط کا جواب آنے پر خط کے بقیہ اجزاء کے متعلق کچھ جواب دیا جائے گا۔

والسلام

(حضرت مولانا) وصی اللہ

بقلم جامی

مکرمی و محبی جناب انظر شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں اور اب طبیعت بالکل ٹھیک رہتی ہے، علالت کے زمانے میں آپ کا خط آیا تھا، اس وقت طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے شاید جواب بھی کسی خط کا دینے سے رہ گیا ہو تو اس وقت میں معذور تھا اس کا کچھ خیال نہ فرمایئے گا۔

ادھر عرصے سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی، یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ اس وقت آپ دیوبند بھی ہیں یا نہیں؛ چناں چہ صرف طلبِ خیریت کے لیے لکھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کا خیال ہے اس کے لیے میں پھر کچھ کہوں گا، آپ اس کو کسی بے اعتنائی پر محمول نہ فرمائیں اور فوراً قیام اور خیریت سے مطلع فرمائیں۔

میرا پتہ یہ ہے:

مکان نمبر 380 B حسن منزل، شہر الٰہ آباد

والسلام دعا گو

وصی اللہ

اخی المحترم اعزک اللہ فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ شرفِ صدور لایا، خط کی تاخیر کی وجہ میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ

خیال ہو رہا تھا کہ خود لکھوں، آپ نے مضمون نہیں لکھا، اچھا کیا، مصالح کی رعایت مقدم رکھی، باقی احباب کی کرم فرمائیوں کا ذکر جو آپ نے کیا ہے وہ تو اس زمانے کی عام فضا ہے، کوئی نئی بات نہیں نہ تو خلاف توقع کوئی امر ہے؛ لہٰذا اس سے گھبرانا بھی نہیں چاہیے۔ استقلال اور ثبات قدمی اس کو آسان بھی بنا دیتی ہے، جب اس قسم کی پریشانی پیش آیا کرے تو حسبنا اللہ ونعم الوکیل کثرت سے لسان سے مع شرکت قلب پڑھا کیجیے اور اس کی اتنی تکثیر کیا کیجیے کہ قلب کو ایک سکون حاصل ہو کر توکل نصیب ہو جائے۔ آپ اس ماحول سے کبیدہ خاطر ہیں، مجھے بھی اس کا خیال ہے؛ لیکن موجودہ حالات میں وہاں سے ہٹنا اور کسی جگہ جانا بھی شاید آپ کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضر ہی پڑے۔ احباب شور غوغا الگ مچائیں گے، نیز وہاں کچھ طالب علم جمع ہیں، پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ ہے جو خالی از نفع نہیں۔ رہا ماحول کا تکلیف دہ ہونا اس کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ سازگار ہو جائے گا۔ بہر حال حق تعالیٰ سے اس کی امید رکھیے اور اس کی دعا کرتے رہیے، حالات ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے۔ کیا خبر کل کیا ہو، بس آپ تمام چیزوں سے یکسو ہو کر اللہ تعالیٰ سے اپنا صحیح تعلق قائم کرنے کی فکر میں لگ جائیے۔ پھر من کان للہ کان اللہ لہ کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیے۔ والسلام

دعا گو

وصی اللہ عفی عنہ

۷۸۶

اخی المعظم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آں محترم کا خط ملا، امسال کے سیلاب کی خبریں جو اخباروں میں شائع ہوئیں تو اس نے تمام احباب کو پریشان کر دیا ہے، ہر طرف سے خطوط آ رہے ہیں کہ خیریت سے مطلع کیا جائے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب تھا جو سیلاب کی شکل

میں آیا۔ ہمارے یہاں کے جو معمر اور سن رسیدہ لوگ ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اپنی عمر میں اتنا زبردست سیلاب یاد نہیں پڑتا؛ بہر حال مصیبت بڑی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ فضل اور احسان ہے کہ ہماری بستی کے مکانات محفوظ رہے۔ نقصان جو ہوا ہے فصل کا ہوا، مئو کے قریب جو سڑک پر پل تھا، وہ ٹوٹ گیا، کوپا اور مئو کے درمیان جو سڑک اونچی کی گئی تھی وہ بہہ گئی، یہاں سے کوپا تک پانی ہی پانی ہے؛ اگرچہ دو ہفتے سے زائد ہو گیا ہے پانی کو گھٹتے ہوئے، مگر ابھی کوپا کا پیدل راستہ صاف نہیں ہوا۔

تدبیر کے درجے میں بستی کے لوگوں نے محنت بھی بہت کی، کئی کئی دن شب و روز باندھ باندھتے رہے اور اس کی نگرانی کرتے رہے، لیکن جو چیز خدا کی طرف سے مامور ہو اس کا مقابلہ کس کے بس کا ہے۔ محض اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے گاؤں کے مکانات کو محفوظ رکھا، ورنہ ظاہری حالت تشویشناک ہو چکی تھی۔ بہر حال اب کوئی بات باعثِ تشویش نہیں، دعا کیجیے اللہ تعالیٰ آئندہ بھی محفوظ رکھے، مسجد کے دونوں درجے مع چھت اور فرش و پلاسٹر کا الحمد للہ کام مکمل ہو گیا ہے۔ استنجا خانہ، غسل خانہ بھی قریب قریب مکمل ہو چکے ہیں، اب صحن اور وضو خانہ رہ گیا ہے، اس کی تکمیل کے لیے بھی دعا کیجیے۔ سب لوگ بہ عافیت ہیں، مئو اور کوپا وغیرہ سے آمد و رفت کا ذریعہ آج کل کشتی ہے، اسی سے لوگ آتے جاتے ہیں، بجز طولِ وقت کے اور کوئی تکلیف سفر میں نہیں ہے۔

والسلام

دعا گو

وصی اللہ

***

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

خانوادۂ قاسمی کے گوہر شب چراغ، چمنستانِ قاسمی کے گل سرسبد، سحر البیان مقرر، ...عظِ ہزارداستان، نکتہ آفریں، نکتہ شناس، پرانی روایات کے حامل، لیکن جدّت سے بھی ...ور نہیں؛ بلکہ قدیم وجدید کے سنگم، ایسے دریا جس میں ہر طرح کی ندیاں آکر گھل مل ...ئیں، خوش رو؛ بلکہ مغل شاہزادوں کی طرح خوب رو، خوش پوشاک، قامت ایسا زیبا ...ہ ہر لباس ان کے بدن پر بہار دیتا۔ روئی کے گالے کی طرح سفید، بڑی آنکھیں جن ...بیز پلکوں نے خوشنما سائبان کی شکل اختیار کی تھی۔ چہرے پر معصومیت کا نور، خلوت ...جلوت میں فرشتوں کے ہجوم میں رہتے۔ جس مجلس میں پہنچتے صدر نشیں، جس محفل میں ...تے تو مسند آراء۔ حلم وتحمل، صبر وضبط، پوری زندگی پر حاوی، عفو ودرگذر زندگی کے ...شعبہ ومنزل میں نمایاں۔ ساٹھ سال سے زائد دارالعلوم کا اہتمام کیا اور اسے جہاں گیر ...یا، شرق وغرب کے سفر کیے اور دارالعلوم کی آفاقیت کے پھریرے اڑائے۔

قاری صاحب بلند وبالا نسبتوں کے حامل، عالم وفاضل، حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ...ں، علامہ کشمیری کے تلمیذِ رشید، زندگی کا بیشتر حصہ صاحبزادگی کی نزاکتوں میں گذرا، ...ن خاتمہ عمر مصائب سے لبریز، ذہنی الجھنوں کا مرقع، سوز وساز اور عداوتوں کا موسم ...ں، ان کے آباؤ اجداد کی پُرخلوص کاوشوں کا تاج محل، دارالعلوم پر قبضے کا پرانا پروگرام

بروئے کار لایا گیا۔ مرحوم سے متعلق غلط پروپیگنڈے، تہمت تراشی، افترا پردازی، مکر و فریب اور ظلم و ستم کی ایک سیاہ تاریخ ہے، اصلاحِ دارالعلوم کے عنوان سے ہر نا کردنی، کردنی اور ہر ناگفتنی، گفتنی کر لی گئی۔ اجلاسِ صد سالہ کے بعد یہ پورا دور اس مظلوم شخصیت کے ساتھ چیرہ دستیوں اور مظالم سے بھرا ہوا ہے۔ تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف، پمفلٹ، رسالے، اخبار و جرائد، نثر و نظم کے وہ زہر آلود تیر چلائے گئے کہ بے کسی و بے چارگی، بے بسی اور درماندگی ہچکیوں سے رونے لگی، مرحوم نے یہ پورا دور، صبر و ضبط تحمل و برداشت سے گذار کر سیدنا عثمان غنیؓ کی تاریخ دہرادی۔ کیا مجال کہ زبان کو غیبت سے آلودہ کیا ہو۔ یہ ہرگز نہ ہوا کہ اپنے دشمنوں کے حق میں کلمہ خیر کے سوا کوئی نازیبا بات ان کی زبان پر آئی ہو۔ جب افترا پردازیوں کا شباب تھا تو یہ فرمایا کہ میں نے صبر، سکوت اور استغناء کو اپنا لیا اور لاریب انہیں عناصر پر جاں، جاں آفریں کو دی، یہی کہا جا سکتا ہے کہ ستقدم الخصم الی موقع الفصل وانت علی الاثر ستقدم فتعلم یہ اپنے وقت کا عثمانؓ اب گورستانِ قاسمی میں جدامجد کے آغوش میں محوخوابِ راحت ہے اور قبر کے اردگرد یہ ندائے غیب با صدائے سروش بگوشِ ہوش سنی جا سکتی ہے۔

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مظلوم را جز بے گناہی نیست تقصیرے

دارالعلوم کے اس اختلافی عہد میں ایک مظلوم سے تعاون احقر کی سعادت ہے۔ اس دور میں جب کہ وہ غموں سے نڈھال، رنج و الم کا پہاڑ ناتواں جسم پر اٹھائے ہوئے بغرضِ علاج بمبئی تشریف لے گئے تو مجھے ''قائم مقام مہتمم'' بنایا، ان کی عدم موجودگی میں دارالعلوم کو کھولنے، تعلیم کا منقطع سلسلہ بحال کرنے کے لیے جو کوششیں خاکسار نے کیں اور ملک کو صحیح صورتِ حال سے واقف کرنے کے لیے جو بیانات جاری کیے بطور تحسین یہ دستیہ بمبئی سے احقر کے لیے تحریر فرمایا، جس کا مطالعہ اس وقت کے حالات کے پس منظر میں سود مند ہوگا۔

عزیزي العاقل السید انظر الفاضل دام بالمجد والفواضل

سلام مسنون دعاء مقرون۔

گرامی نامہ مؤرخہ ۲۵رجنوری ۸۳ء باعث تسکین قلب اور مسرت افزا ہوا۔ الحمدللہ کہ آپ مضبوطی اور عزم محکم کے ساتھ دارالعلوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ فتن کی گھٹائیں مختلف روپوں میں اٹھ اٹھ کر آرہی ہیں، لیکن آپ حضرات کے عزم وعزیمت سے ان شاء اللہ یہ سارے بادل چھٹ جائیں گے اور دارالعلوم اپنی جگہ پر قائم رہے گا اور ان شاء اللہ حامیانِ دارالعلوم سرخ رو ہوں گے۔

میری طبیعت الحمدللہ بہ نسبت سابق کے کافی اچھی ہے، ضعف بھی بتدریج گھٹ رہا ہے، لیکن معالجین ابھی کسی طویل سفر کی اجازت نہیں دے رہے ہیں، اس لیے ہفتہ عشرہ ابھی ادھر ہی قیام رہے گا۔ یہ جتنی بھی صحت ہوئی ہے وہ حقیقتاً آپ ہی حضرات کی دعاؤں کا ثمرہ ہے جس میں عورتوں اور بچوں کی معصوم پکار اور دعائیں بھی شامل ہیں۔ فجزاکم اللہ خیر الجزاء.

مجلس شوریٰ کی تشکیل کا سوال سامنے ہے۔ ایک ذہنی خاکہ منسلک ہے غور فرمالیا جاوے۔ مجلس کی تعداد میں میں نے مہتمم اور صدر مدرّس کو جو بحیثیت عہدہ ممبر ہوتے ہیں ذاتی طور پر مستقل ممبر نہیں ہیں، اس تعداد سے الگ رکھا ہے۔ مجلس میں ایک سرپرست بھی رہتا آیا ہے، میرے خیال میں اس وقت اس جگہ کے لیے مناسب مولانا آل حسن صاحب ہیں، وہ بھی اس تعداد سے الگ رکھے گئے ہیں، اگر وہ مجلس میں شریک عدد بن گئے تو ان کی رائے شمار میں آئے گی، ورنہ نہیں۔ مجلس شوریٰ کو زیادہ طویل وعریض رکھنا مصالح کے خلاف ہے، منسلکہ تعداد کچھ بڑھ گئی ہے؛ لیکن اسے اگر کم کریں تو نمبر ۱۰، ۱۸، ۲۵رکم کیے جاسکتے ہیں۔ سرپرست بھی اس تعداد میں شامل نہیں، وہ بھی بحیثیت عہدہ ممبر ہوں گے، مستقل ممبر نہیں ہوں گے۔ اس صورتِ حال سے شوریٰ کی تعداد تقریباً وہی ۲۱رہ جاتی ہے۔ عرض ہے کہ شوریٰ کی تکثیر مفید نہیں سمجھی گئی۔ یہ فہرست آپ حضرات

کے غور وفکر کے لیے ارسال ہے، میری ذاتی رائے ہے جماعت جو فیصلہ کرے گی وہی اصلح ہوگا۔ اس سلسلے میں مفتی ضیاء الحق صاحب کو بھی بلا لیا جاوے اور یہ خاکہ دکھلا دیا جائے۔ امید ہے کہ آپ سب مع الخیر ہوں گے سب حضرات حاضرین کی خدمت میں سلام مسنون۔

والسلام

محمد طیب

از بمبئی یکم فروری ۸۳ء

* * *

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ

قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر اپنی مردم خیزی میں شہرۂ آفاق ہے، اس زمین سے جو بھی اٹھا، آفتاب علم وحسنِ عمل کا بدرِ منیر بن کر اٹھا، بقول میر تقی میر ؎

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم اصلاً اسی قصبے کے باشندہ ہیں، آپ کے والد جنہوں نے حدیث میں صرف مشکوٰۃ شریف پڑھی پختگی علم اور ثاقب فہم کے مالک تھے، اپنے لختِ جگر کی ایسی تربیت کی کہ وہ افقِ علم کے ایک روشن سیارہ بن گئے۔ فراغت مظاہر علوم سے حاصل کی اور پھر دیوبند مکرر دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے تشریف لائے، حضرت شاہ صاحب سے حدیث پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، جس کے نتیجے میں زرِ خالص کندن ثابت ہوا، یہیں معین المدرس قرار دیے گئے، ترجمہ قرآن شروع کیا تو اس کی دھاک بٹھادی، صبح کو بعد فجر نودرہ کی عمارت مستفیدین سے بھر جاتی، جس میں منتہی طلبہ کے ساتھ واردین وصادرین بھی ذوق وشوق سے شرکت کرتے اور آخر اسی ترجمے کی مقبولیت نے انہیں شیخ التفسیر بنادیا، صورت پر بھولا پن، سیرت میں معصومیت، اداؤں میں ربودگی، گفتگو میں علم وتحقیق، مطالعے کے اس قدر شوقین کہ ہر وقت دارالعلوم کے کتب خانے پر مسلط رہتے، دارالعلوم میں داخلی فتنہ بعہد حضرت شاہ صاحب شروع ہوا تو رازداروں کا بیان ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم نے تنہائی میں بلا کر فرمایا۔ مولوی صاحب! امتحان کا وقت ہے، آپ کے استاذ شاہ صاحبؒ کی حمایت یا پھر ہماری

نصرت؟ بڑی سادگی سے جواب عنایت فرمایا کہ میں بہت کمزور دل واقع ہوا ہوں، امتحان کے قابل نہیں۔ خود استعفیٰ دیا اور ریاست حیدرآباد جا پہنچے، جہاں ان کا علم و فضل چمکا اور ان کا ذہن و دانش بہار بردوش بن گیا۔ آخر عمر میں شیخ التفسیر بنا کر پھر دارالعلوم لائے گئے، موطا امام مالک اور امہاتِ کتبِ تفسیر زیرِ درس رہتیں، طلبہ ان پر جان چھڑکتے اور مستفیدین حلقہ بگوش بن جاتے۔ علمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جب کانگریس کی تحریک شباب پر تھی اور ہر کانگریسی جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا، ریل کی لائنیں توڑی جارہی تھیں، بجلی کے تار کاٹے جارہے تھے، دھڑا دھڑ گرفتاری ہو رہی تھی اور پورا ہندوستان تحریک کے جھولے میں جھول رہا تھا، وہ اچانک اپنے استاذ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے دردولت پر تشریف لائے۔ علامہ مرحوم اس وقت اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے، یہ سلام کر کے بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ حضرت سنا ہے کہ کوئی تحریک چل رہی ہے، علامہ نے اخبار ان کی جانب بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ لیجیے، مطالعہ کر لیجیے۔ مولانا نے اخبار کے صفحے گنے جو آٹھ تھے، فرمایا کہ اگر کتاب کے آٹھ صفحات کا مطالعہ ہو تو کتنا فائدہ ہوگا یہ کہہ کر یہ جا وہ جا، علامہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایک بار خاکسار اور برادر اکبر مولانا ازہر شاہ قیصر بازار جارہے تھے، مولانا ادریس صاحب رہائشی مکان سے نکلے اور تیز قدم اٹھاتے مدنی مسجد میں گھسے چلے جاتے تھے، ہم دونوں نے بڑھ کر سلام کیا، بڑے بھائی نے دریافت کیا کہ حضرت خیر تو ہے؟ ارشاد ہوا والدہ صاحبہ اور اہلیہ میں کچھ تیز گفتگو ہو رہی ہے، مسجد میں جا کر تالیفِ قلب کی دعا کروں گا۔ خاکسار اور اس کے خانوادے کو گاہے گاہے دردولت پر مدعو فرماتے۔ ایک مرتبہ دسترخوان پر کھانا چنا جارہا تھا، چھوٹی بچی گھر میں سے نکل آئی، بچوں کی عادت کے مطابق اس نے پیسے طلب کیے تو مولانا نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا: اس کا کچھ حاصل نہیں۔

حیدرآباد کے ایک صاحب جو بی۔ اے۔ پاس اور ہلکے سے دماغی خلل کے مریض تھے، حضرت علامہ عثمانی کے یہاں وارد ہوئے اور اپنی غیر ارادی حرکات سے علامہ کو

خوب خوب مکدر کیا، مثلاً رمضان المبارک کا مہینہ، شب میں علامہ نے سحر میں اٹھنے کے لیے الارم لگایا، یہ صاحب اٹھے اور الارم کو قبل وقت ہی جام کر دیا۔ صبح کو کان پکڑی ہوئی تو ان صاحب کا عذر یہ تھا کہ ہمارے محبوب علامہ عثمانی کے آرام میں خلل آتا۔ علامہ کے یہاں سے راندۂ درگاہ ہوئے تو اپنی تمام حماقتوں کے ساتھ مولانا ادریس صاحب کے یہاں جا دھمکے۔ ایک بار میں اور بھائی دولت کدے پر حاضر ہوئے تو مولانا ادریس صاحب نے فرمایا ہم تو تھے ہی دیوانے، یہ ایک اور دیوانے آ گئے، خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ پھر ان کو چائے بنانے کا حکم ہوا تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد لائے جو سر کے بالوں سے زیادہ سیاہ اور ایلوے سے زیادہ کڑوی تھی۔

مرحوم قیامِ پاکستان کے زبردست مؤید تھے اور ان کے تخیل میں یہ نئی نویلی قائم ہونے والی سلطنت خلافتِ راشدہ کا عکس جمیل تھی، اس لیے جب پاکستان وجود میں آیا تو ہندوستان سے اٹھے اور لاہور جا پہنچے۔ مدرسہ اشرفیہ کے صدر مدرس ہوئے، قریب ہی کی کسی مسجد میں ترجمہ قرآن فرماتے اور خواص وعوام پر اپنے علم کی گہری چھاپ ڈال کر گذشتہ سال راہی ملک بقا ہوئے۔ عمر غالباً ستر پچھتر کے درمیان ہوئی۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

حضرت مولانا بدرعالم صاحب میرٹھیؒ

نیرنگی ہائے قدرت کہ نوحؑ کے یہاں کنعان، آزر کے یہاں ابراہیم وجود پذیر ہوئے اور عجیب وغریب روایات بطور یادگار و سرمایۂ عبرت اپنے پیچھے چھوڑیں۔ مشہور ہندی شاعر ''اقبال'' کو فخر تھا اور اسی فخر نے ان سے کہلایا۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اس میں یہ اور اضافہ کیجیے کہ پورا گھرانہ مغربی تعلیم سے آراستہ، کوئی کلکٹر، کوئی ڈپٹی کلکٹر، کوئی تھانیدار، لیکن ''مُخرِجُ الحَیِّ مِنَ المَیِّتِ'' نے اِنہیں ''اموات'' میں ایک جیتی جاگتی ہستی بھی پیدا کر ڈالی، دنیا سے چلے اور دین تک جا پہنچے، فرنگیت کے غبار سے دامن جھاڑا اور پھر زمزم سے ہمیشہ کے لیے اسے دھو ڈالا اور ایسا نچوڑا کہ فرنگیت کے آثار تک باقی نہ رہے، زہد و تقویٰ کی دھوپ میں اسے سکھایا، جسم زیبا پر لیا تو اس کی زیبائی میں اور اضافہ ہوا، سرخ و سپید چہرہ، منور آنکھیں، اس پر تابدار چشمہ، سر پر بالعموم رومال، نزاکت میں تاناشاہ، نفاست میں واجد علی، حدّتِ مزاج ایسی کہ ڈگری کبھی کم نہ ہوتی، مظاہر العلوم سے فراغت حاصل کی اور پھر دار العلوم میں حدیث دوبارہ پڑھنے کے لیے تشریف لائے، یہیں مدرّس ہو گئے۔ ڈابھیل میں مدرّسی اور طالب علمی کو ملا ڈالا، یعنی استاذ کے درسِ بخاری میں اپنے ہی شاگردوں کے ساتھ بے تکلف صف نشیں ہو جاتے اور سالہا سال کی علمی کاوش فیض الباری، تقریر بخاری، افاداتِ شیخ انور کے نام سے

کی ذات سے علم کو بڑی روانی۔ ڈابھیل میں عہدۂ صدر مدرسی تک پہنچے، پھر وہاں سے آئے اور دہلی میں ''ندوۃ المصنفین'' سے وابستہ ہو گئے۔ ''ترجمان السنۃ'' حدیث کی اردو میں معرکۃ الآراء تشریحات ان ہی کے علم ریز قلم کی یادگار ہیں۔ پاکستان بنا تو ''ٹنڈو الٰہ یار'' کے مدرسہ میں کچھ وقت گزارا اور پھر سعید روح سرزمین قدس یعنی مدینہ منورہ زادھا اللہ شرفاً جا پہنچی، اب جنۃ البقیع میں زید و بکر کے آغوش میں نہیں، بلکہ اجلہ صحابہ کے ساتھ قیامت کی نیند سوتے ہیں۔ خاتمۂ عمر پر بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری ہوا اور افریقہ تک ان کا فیض جا پہنچا۔ قاری اسحاق صاحب میرٹھی خلیفہ ارشد مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندی طریقے میں مجاز تھے۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

حضرت مولانا عبداللہ خاں صاحبؒ

دنیا میں آپ کس چیز کی تاثیر و خاصیت کا انکار کر سکتے ہیں۔ حیوانات، جمادات سب ہی کے اثرات مسلم ہیں، انگشتری پر نگینوں کا استعمال ہوتا ہے، اہل تجربہ کا کہنا کہ کوئی نگینہ بادشاہ بنا دیتا ہے اور کوئی تختِ شاہی سے اتار کر کنگال، کسی کی تاثیر شفاء ہے اور کوئی جان لیوا بیماریوں میں مبتلا کرتا ہے، یہ نگینے پتھر کے ٹکڑے ہیں جنہیں تراش خراش کر انگوٹھی میں فٹ کر دیا جاتا ہے، سب سے پہلے رسول کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ ''نام کا بھی اثر ہے۔'' چودہ سو برس کے بعد اب امریکہ کے ڈاکٹروں نے کہا کہ اسم مسمی پر مؤثر ہے؛ بلکہ اخبارات میں مضامین بھی آنے لگے جس میں اسماء کی تاثیرات بیان کی جاتی ہیں، عدد ہی کو لیجیے۔ صوفیاء کے چلوں، مشہور عالم جماعت تبلیغ کے چلوں پر ایک دنیا ہنستی رہی؛ لیکن اب متفق ہوئے جاتے ہیں کہ چالیس دن کا عرصہ مزاج میں تبدیلی، طبیعتوں میں انقلاب، شمائل و عادت پر تغیر کے لیے مستند عرصہ ہے، بعض طبّی نسخے تیار کیے جاتے ہیں اور حکیم کی ہدایت ہے کہ چالیس دن تک ان کو چھوڑ دیا جائے، تاکہ یہ دوائی اپنے اصل مزاج پر آجائے۔

قرآن کریم نے مشہور پیغمبر حضرت موسیٰ کے طور پر اعتکاف کی مدت چالیس دن بیان کی ہے، یہی موسیٰ اپنی سرکش قوم کے اس مطالبے پر کہ ہرگز ہم تجھ پر ایمان نہ لائیں گے تاوقتیکہ نہ دیکھ لیں خدا کو کھلم کھلا۔ (لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً) مفسرین کے بیان کے مطابق ایک خاص تعداد ہی کو لے کر چلے تھے۔

ایسے ہی قرآن مجید میں ستر (۷۰) کا عدد بھی زیر گفتگو آیا، عبداللہ بن ابی بن سلول

کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھی تو اس پر آیتیں نازل ہوئیں:
اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ کہ آپ ستر مرتبہ استغفار کیجیے، جب بھی ان منافقین کے حق میں قبول نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ میں دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں، غریب مفسرین کہتے ہیں کہ ستر سے کوئی خاص عدد مراد نہیں؛ بلکہ کثرت کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ خاکسار تو کہتا ہے کہ تکثیر کی جانب اشارے کے لیے تو اور بھی بہت سے عدد تھے، ستر کی تخصیص بلا وجہ نہیں۔

چار کا عدد بھی عجیب وغریب ہے، عناصر اربعہ یعنی آگ، ہوا، پانی، مٹی تو آپ نے بھی سنے ہوں گے؛ لیکن قرآن نے ایک موقع پر استعمال کیا ہے۔ وہی حضرت ابراہیم کی مشہور درخواست کہ مجھے دکھا دیجئے آپ کیسے زندہ کرتے ہیں؟ (رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى) تھوڑی سی ضروری قیل وقال کے بعد زندگی بعد الموت کا منظر دکھانے کے لیے جو نسخہ تیار کیا گیا تھا اس کے اجزاء چار ہی تھے (فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ) اب آگے بڑھ جائیے، ان گنت فرشتوں میں چار بے حد مشہور ہیں: جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل۔ بے شمار انبیاء ورسولوں میں چار نہایت شہرت یاب: ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آسمانی کتاب میں چار کی بے حد شہرت: قرآن، زبور، انجیل، توراۃ۔ ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ ہیں، چار خاص الخاص: ابوبکر، عمر، عثمان، علی، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ فقہی مکاتبِ فکر میں چار کی خاص شہرت: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی۔ رہا تصوف کا سلسلہ تو اس میں بھی چار شہرہ آفاق: نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ۔ دنیا میں یہ چاروں سلسلے پھیلے اور ہندوستان میں بھی پہنچ گئے۔

دہلی میں حضرت باقی باللہ علیہ الرحمہ جن کا مزار قطب روڈ پر ہے، جن کے خلفاء میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے نام نامی آتے ہیں، بت کدۂ ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلہ کے مؤسس اور معمار ہیں، تصوف کی اس شاخ میں اتباعِ

سنت کا غلبہ، جہر کے بجائے سری کیفیات اور نالہ وشیون کے مقابلہ میں سکوت وسناٹا بنیادی باتیں ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے نقشبندیہ طریق آسمانِ ہفتم تک پہنچا دیا۔ اکبری ضلال کے مقابلہ میں جس پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا، اس سے حضرت والا کی شخصیت تاریخی ہوگئی، اس تاریخ نے نقشبندی نقطۂ نظر کو عروج بخشا، چشتیہ سلسلہ اگرچہ ملک کے اطراف واکناف پر چھایا رہا؛ لیکن نقشبندی چراغ کی لو بھی برابر روشنی دیتی رہتی ہے۔

پاکستان میں خانقاہِ سراجیہ مجددیہ اس سلسلے کا مرکز ہے، حضرت مولانا عبداللہ صاحب مرحوم کا تعلق اسی خانقاہ سے تھا، کمسنی میں دلّی پڑھنے کے لیے تشریف لائے تو یہاں نقشبندیہ روشنی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے وجودِ اقدس سے فروزاں تھی۔ احقر کے رہائشی مکان کے سامنے چھوٹی سی مسجد ہے جو مفتی صاحب ہی کی سعی وکوشش سے تیار ہوئی، اسی میں آپ کا زاویہ تھا، یہاں اوراد ووظائف، معاملات ومعمولات نقشبندیہ انداز میں ہوتے؛ صبح کو بعد نمازِ فجر ختم خواجگان کا مشغلہ تھا جو اب بھی باقی ہے، نیک سیرت طلبہ اپنے ذوق کے مطابق زاویے تلاش کر لیتے، کوئی خانقاہ تھانہ بھون سے چمٹ جاتا، کوئی گنگوہ کی خانقاہ سے رابطہ پیدا کر لیتا، تو کوئی رائپور میں تلاشِ حق کے لیے پہنچ جاتا، نقشبندی ذوق کے حامل مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے دست حق پرست پر بیعت ہو جاتے۔ مولانا عبداللہ صاحب کا بدوشعور سے ذوق نقشبندی تھا، دیوبند پہنچے اور مفتی صاحب کے حلقے میں شریک ہو گئے، بیعت بھی اسی مردِ حق آگاہ سے کر لی، مشائخ کا تجربہ ہے کہ تعلیمی زندگی میں کوئی اور شغل تعلیمی جدوجہد کو متأثر کرتا ہے، اسی لیے محتاط شیوخ طالب علمی میں بیعت نہیں کرتے؛ لیکن مولانا عبداللہ صاحب بیعت ہو گئے تھے۔

تکرار کا دار العلوم میں رواج ہے، تکرار یہاں کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب دست وگریباں ہونا یا تکہ فضیحتی نہیں؛ بلکہ جماعت میں نمایاں استعداد کا طالب علم کمزور صلاحیت کے طلبہ کو گھیر کر بیٹھ جاتا ہے اور استاذ کے درس کا ان کے سامنے اعادہ کرتا ہے، اسی کو دار العلوم میں تکرار کہا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ مشہور نحوی اخفش، مسائلِ نحو کو

محفوظ کرنے کے لیے ایک بکری کو تختۂ مشق بنائے ہوئے تھا، یہیں سے بزاخفش کی شہرت ہوئی، میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں خود دیکھا ہے کہ کسی مجبوری کی بناء پر تکرار کرانے کے لیے بعض طلبہ کو طالب علم میسر نہیں آئے تو بجائے مایوس ہونے کے وہ ایسے جواں ہمت نکلے کہ دیوار کو مخاطب بنا کر استاذ کی پوری تقریر لوٹا دیتے اور یہ منظر تو بارہا دیکھا کہ طلبہ تقریر کی مشق و ریاضت کر رہے ہیں، جنگل میں نکل گئے اور درختوں کے ہجوم کو انہوں نے سامعین کا ہجوم باور کرلیا۔ ذرا تراخ پڑاخ قسم کے طلبہ ان پر ہنستے؛ مگر یہ اپنی محنت میں لگے رہتے، نتیجہ وہی خرگوش و کچھوے کی کہانی والا رہا، جنگلوں میں چلانے والے اسٹیج کے خوش نوا مقرر ہو گئے اور ان کے بے حظ مشغلے پر مذاق اڑانے والے محروم رہ گئے؛ حالاں کہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ تکرار کرانے والے کو اصلاً فائدہ پہنچتا ہے۔ تقریر کا سلیقہ، تدریس کا قرینہ، تفہیم کا انداز تکرار سے خوب حاصل ہوتا ہے اور پھر چوں کہ اس طالب علم کو تکرار کرانا ہوتا ہے تو یہ استاذ کی تقریر بھی پوری توجہ سے سنتا اور اسے محفوظ رکھتا ہے، رہا تکرار میں شریک طلبہ کو فائدہ تو کوئی اہم نہیں، تاہم کچھ نہ کچھ نفع پہنچ ہی جاتا ہے، خدا تعالیٰ جس کو جو بنانا چاہتا ہے اسی کے مناسب راستوں پر ڈال دیتا ہے۔ معلم الصبیانی میری تقدیر تھی، جیسے ہی میں نے دارالعلوم میں پڑھنا شروع کیا تو بزاخفش طلبہ کو پکڑا، تیس سال سے زائد کی بات ہوگی، لیکن اب بھی یاد ہے کہ انہیں میں ایک فیض الدین سپہ گری تھا اور دوسرا روشن علی منی پوری۔ انہیں پڑھنے پڑھانے سے کوئی تعلق نہ تھا؛ مگر وہ بڑے اچھے بزُ تھے، خدا جانے اب یہ کس حال میں زندہ ہیں یا راہی ملکِ عدم ہوئے؛ لیکن ان کی بدولت میں کم از کم نہ سہی اخفش، اخفش کے کفش برداری میں ہوں۔ کافیہ شروع ہوئی تو اس کی شروحات میں میں نے رضی دیکھنا شروع کی اور جامع الغموض، بخدا ایک سطر بھی ان دونوں شروحات کی نہ سمجھتا؛ مگر یہ دونوں بز مجھے ابن حاجب اور رضی سے کم نہ سمجھتے، دنیا بھی عجیب و غریب جگہ ہے بہت سے تو اپنے مستقبل کی عمارت کے معمار ہوتے ہیں اور ایک تعداد خودسازی تو نہیں؛ لیکن دوسرے کو بنانے

کا کیسا شریفانہ کام انجام دیتی ہے۔

بہر حال مولانا عبداللہ صاحب دوسرے طلبہ کے تکرار میں شریک ہوئے، پھر یہ عجیب بات ہے کہ یہ تکرار کرانے والے رفیق، مرحوم کے دور مشیخت میں ان سے بیعت ہوئے؛ حالاں کہ یہ خود عصر حاضر کے ممتاز دانشور ہیں، صوفیاء نے لکھا ہے کہ کسی کی جانب عوام کا رجوع قبولیت کی علامت نہیں۔ خواص رجوع کریں تو یہ مقبولیت عنداللہ کی علامت ہوگی۔ مولانا عبداللہ مرحوم اس بات میں منفرد رہے، ان کے بیشتر رفقائے درس معاصرت کے باوجود ان کے کمالاتِ باطنیہ کے سامنے سپر انداز ہوگئے اور بڑے خلوص سے۔

سنا ہے کہ دارالعلوم سے فراغت پر مولانا عبداللہ مرحوم اپنے مالوف وطن لوٹے تو مولویوں کی کساد بازاری سے متأثر ہو کر طب پڑھنے کا ارادہ کیا، کسی طبیب کے یہاں اس مقصد کے لیے جا پہنچے، وہاں نقشبندیت کے امام حضرت مولانا احمد خاں صاحب تشریف لائے، مولانا عبداللہ صاحب مرحوم نے دورۂ حدیث میں اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ مرحوم سے بارہا سنا تھا کہ اس وقت پنجاب میں نقشبندیت کے دو امام ہیں، ان میں ایک یہی مولانا احمد صاحبؒ تھے، استاذ سے وقیع ذکر سنا ہی ہوا تھا، اب جو دیکھا تو گرویدہ ہوگئے اور ایسے والہ وشیدا کہ مفتی صاحبؒ کی بیعت کو بھول بھال کر حضرت موصوف سے بیعت کی درخواست کردی، بیعت ہونے کے لیے ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دیا تو روشن ضمیر شیخ نے اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا۔ فرمایا کہ تم تو کسی شیخ کامل سے بیعت ہو۔ مولانا عبداللہ جو اس کو راز بنائے ہوئے تھے، اب انکشاف پر مجبور ہوئے، عرض کیا کہ دیوبند میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے مرید ہوں۔ شیخ بولے کہ کیا غضب ہے کہ مجھے پہلے نہیں بتایا تو مولانا عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ اب میری عقیدت آپ سے وابستہ ہوگئی۔ ارشاد ہوا کہ اگر ایسا ہے تو پہلے جاؤ اور مفتی صاحب سے اجازت لے کر آؤ، مفتی صاحب نے اپنا تمام تر تعلق اللہ سے کر رکھا تھا، نفس کے لیے کوئی چیز ہی نہ تھی؛ بلکہ نفس کو سلوک وتصوف کے ہاون میں ایسا کوٹا تھا کہ اس کی جگہ بے نفسی نے لے

لی تھی، جب مولانا عبداللہ صاحب نے حاضری پر مدعا ظاہر کیا تو مفتی صاحب تو گویا اس انقلاب کے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ اپنے خصوصی انداز میں فرمایا: مولوی صاحب! گویا کہ اس میں تو کوئی حرج ہی نہیں، بیعت کرلو اور میرے لیے بھی شیخ سے دعائے مغفرت کرانا۔ بلکہ ایسی تقریر کی کہ خود گویا کہ طفل مکتب ہیں اور مولانا احمد خاں صاحب معلم اوّل۔ مولانا عبداللہ صاحب خوشی خوشی یہ اجازت لے کر مولانا احمد صاحب کے یہاں پہنچے اور باضابطہ مرحوم سے بیعت ہو گئے۔

نقشبندی سلوک میں مرید سے دو اہم مطالبے ہیں:

(۱) خودرا از فرنگ واز خنزیر بدتر شمارند۔ مشائخ نقشبندیہ نے جس عہد میں یہ نعرہ لگایا، فرنگی اس وقت سب سے زیادہ مغضوب ومعتوب تھا اور رہا خنزیر تو اس کا بدترین ہونا تو ہمیشہ سے ہے۔

(۲) مرید را باید کہ بدست شیخ ہمچو میت بدست غسال ماند۔ پہلا سبق خاکساری، بے نفسی، فروتنی اور تواضع کا پیکر بننے کے لیے ہے اور دوسرا درس سپردگی وخودحوالگی کا ارادہ مصمم ہے، اسی وجہ سے تصوف اور تدریس کے مکاتب میں ایک جملہ شہرۂ آفاق حیثیت لیے ہوئے ہے کہ ''مریدے کہ قیل وقال کند وطالب علم کہ قیل وقال نکند ہر دو را بچراگاہ باید فرستاد۔'' یعنی مرید قیل وقال نہ کرے بلکہ عارف شیراز کے اس ارشاد کا جیتا جاگتا مرقع بن جائے۔

بہ مئے سجادہ رنگیں کن، گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

اور طالب علم کو مرید نہیں بلکہ مَرید بننا چاہیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ درس سے باہر استاذ کا حقیقی احترام اور دورانِ درس بغیر سمجھے ہوئے ایک قدم نہ بڑھے۔ مولانا مرحوم نے سپردگی وخودحوالگی کی وہ تمام سنتیں تازہ کردیں جو نقشبندیت میں مطلوب ومقصود ہیں، شیخ کے جلال واکرام میں وہ بے مثل مظاہرہ کیا جو اس راہ میں سب سے زیادہ ممد ومعاون ہے، سنا ہے کہ شیخ اپنے ان مرید کی اقتدا میں نماز پڑھتے تو مصلیٰ پر پہنچ کر اس خیال سے

کہ شیخ کی جانب پشت نہ ہو، جب تک تکبیر ہوتی شیخ کی سمت اپنا چہرہ رکھتے، بظاہر یہ بات معمولی ہے؛ لیکن جو سلوک و تصوف کے ذائقہ شناس ہیں وہی اس ادا کی صحیح داد دے سکتے ہیں۔ شیخ بھی جوہر شناس تھے، وفات کے وقت جانشینی سے متعلق جو وصیت تحریر فرمائی، اس میں لکھا تھا کہ ''میرا اپنا بیٹا بھی اس راہ میں کامل و مکمل ہے؛ لیکن مولانا عبداللہ صاحب کے ہوتے ہوئے کسی اور کو جانشین بنانا ظلم ہوگا''؛ چناں چہ مرحوم جانشین ہوئے تو نقشبندیت کے عرفانی محل میں فانوس کی حیثیت لیے ہوئے۔ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ان کے درس کے بیشتر ساتھی ارادت کا ان سے تعلق رکھتے اور خواص بلکہ اخص الخواص نے ان کی جانب رجوع کیا۔ اس راقم السطور کا مزاج بھی عجیب وغریب ہے بقول حسرت موہانی ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت میں
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت میں

حسرت مرحوم نے تو یہ شعر اپنے حالات کے پیش نظر کہا تھا، مگر شعر کا حاصل کسی شخصیت میں متضاد صفات کا جمع ہونا ہے، سو اپنی گناہ آلود ونگ انسانیت زندگی کے باوجود خانقاہوں کو جھانکا۔ ما ملا یا تو کچھ نہیں لیکن بات وہی ہے ؎

احب الصالحن ولست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

کاش کہ کوئی حضرت نظام الدین اولیاء جیسا مرشد کامل ہوتا، حضرت والا کی سوانح میں ہے کہ کوئی مسترشد سالہا سال سے صحبت نشیں تھا، مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور معرفت کی راہیں نہیں کھلیں تو اپنا حال ایک رباعی میں واضح کیا۔ جو شکوہ بھی تھا اور بیانِ احوال بھی، رباعی یہ تھی ؎

سالہا باشد کہ ماہم صحبتیم ۞ گرز صحبتہا اثر باشد کجا است
زہد تاں فسق ما را کم نکرد ۞ فسق از زہد شما محکم تر است

لکھا ہے کہ اس شکایت پر مرشد نے ایک نظر اٹھا کر مسترشد کو دیکھا تو عرفان کی سب منزلیں طے ہو چکی تھیں، بیمار جب آخری درجے میں علالت کے پہنچ جاتا ہے اور ساتھ ہی احمق بھی، تو وہ کسی ایسے نسخۂ شفا کی تلاش میں سرکھپاتا ہے جو چٹکیوں میں اس کے تن رنجور کو پُر شباب طاقتوں منتقل کر دے۔ یہی حال اپنا بھی ہے گویا کہ وہی عرب کی ایک مثال: لیت الشباب یعود ما۔ ایں کہ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

مولانا عبداللہ مرحوم کی نیک شہرت کانوں تک پہنچ رہی تھی، پاکستان بن چکا تھا اور سفر کی راہ میں پہاڑ کھڑے ہو گئے تھے کہ اچانک سننے میں آیا کہ مرحوم سرہند کے عرس میں تشریف لا رہے ہیں۔ اول تو سرہند کا عرس، خرافات ولغویات سے منزہ، پھر موجودہ ہندو پاکستان میں اس طرح کی تقریبات میں شرکت صرف سفر اور اپنے اعزہ واقارب سے ملاقات کا بہانہ ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نقشبندیہ سلسلے کے امام اور عرس جیسی لغو چیز میں شرکت، میں نے موقع غنیمت سمجھا، ظہور الباری اعظمی میرے ساتھ تھے، سرہند جا پہنچا، عصر کے قریب سرہند کے مشہور روضے میں قدم رکھا، مجدد صاحب کا مزار پنجاب میں روضہ ہی سے مشہور ہے، عصر کی نماز کے بعد باریابی کا شرف حاصل ہوا تو مشائخ سے متعلق تصورات یہاں بھی غلط ہو گئے۔ نہ جبہ و دستار، نہ تسبیح کے کھٹا کھٹ کرتے ہوئے دانے، نہ معتقدین ومریدین کا سربجیب حلقہ؛ بلکہ مرحوم گندمی گہرا رنگ رکھتے، قد بھی مائل پستی ہی تھا، سر پر پنجابیوں کی طرح رومال، تہبند، متوسط کرتا، گریباں کھلا ہوا، چہرہ پر ربودگی کے آثار، میں ذرا ادب سے بیٹھنے لگا تو فرمایا کہ ”شاہ صاحب! بے تکلف زیستن، خوش زیستن۔“ پھر چائے بنانے کا ایک خادم کو حکم دیا، چولہا پاکستانی جو برقی ہونے کے باوجود آواز نہیں دیتا، اس پر فرمایا کہ ”شاہ صاحب! ہمارا چولہا بھی نقشبندی ہے۔“ یہ اس سکوت وسناٹے کی جانب اشارہ تھا جو نقشبندیوں کا مشرب ہے، نہایت کم گو تھے اور بہت حلیم الطبع۔ عصر اور مغرب کے مابین حضرت مجدد صاحب کے مزار پر حاضری کا پروگرام تھا، ان کے باختصاص مریدوں سے معلوم ہوا کہ حضرت توجہ

دیں گے، میں بھی حلقے میں شریک ہو گیا، مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں، تشنہ می آرد سکندر را

دو دن حاضری رہی؛ لیکن مولانا نے سکوت کو اس قوت سے اپنایا تھا کہ کبھی کوئی بات زبانِ مبارک پر آتی ہی نہیں تھی، ایک دو بار اور زیارت کا موقع ملا اور یہیں سرہند میں۔ میرا خیال ہے کہ عمر ساٹھ سے متجاوز نہ ہو گی کہ اچانک پاکستان سے ان کے سانحۂ وفات کی اطلاع آئی۔

اب اس خانقاہ کے قافلہ سالار حضرۃ المحترم مولانا خان محمد صاحب القاسمی ہیں۔ کشیدہ قامت، دہرا بدن، پنجابی لباس، کئی بار شرفِ نیاز حاصل ہوا؛ بلکہ اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر دیوبند تشریف لائے تو غریب خانے پر ہی قیام فرمایا اور میری ظاہری سعادتوں کی انتہا یہ تھی کہ دار العلوم سے ملنے والی دستارِ فضیلت کو میری درخواست پر اپنے دستِ مبارک سے باندھی۔ خدا تعالیٰ ان نفوسِ قدسیہ کی روحانی، دینی و دنیاوی برکات سے مجھ ظلوم و جہول کو متمتع فرمائے، کہ اب زندگی میں نجات کے موہوم تصورات ان ہی حضرات کی کفش برداری کے نتیجہ میں خدائے رحمان و رحیم کا عطیہ سمجھتا ہوں، میں تو ہمیشہ ان حضرات سے کہتا رہا۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند ۞ آیا بود کہ گوشۂ چشم بما کنند

مگر ان کا بھی جواب یہ ہے کہ ع

دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

***

تازہ قلم

حضرت مولانا عبداللہ خاں صاحب

کندیاں، پاکستان

پاک باطن، پاکیزہ روح، روشن ضمیر، چودہویں صدی میں نقشبندیت کے بدرِ منیر، ظلمتوں کی شب دیجور میں نیم روز مہر، عرفانِ رب کی تنویر، نہ عبا و قباء، نہ جبے و دستار، نام نہاد مشائخ کے برخلاف سادگی، بلکہ دنیاوی وجاہتوں سے معریٰ، دیوبند بغرض حصولِ علم تشریف لائے تو فطری الہام اور سرشتی زہد و اتقاء کی تحریک پر، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی علیہ الرحمہ سے وابستہ ہو گئے۔ مفتی صاحب حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے خلیفۂ اجل، معصومیت، خدمتِ خلق، استغناء و توکل میں بے نظیر تھے۔ ان سے روحانی وابستگی شبابی دور میں حصار بن گئی۔ طالب علمی یکسوئی، گوشہ پسندی اور جلوتوں پر خلوت عادتِ ثانیہ تھی، دورۂ حدیث کے سال حضرت علامہ کشمیری قدس سرہٗ سے استفادہ، خوبیٔ قسمت کی عباء میں زرّیں تکمہ، دورانِ درس حضرت علامہ سے بارہا سنا کہ اس وقت نقشبندیت کے دو امام ہیں، ان میں سے ایک حضرت اکبر شیخ احمد صاحب علیہ الرحمہ تھے۔ فراغت پر اپنے علاقے میں حضرت کی دید کے ساتھ عقیدت ہو گئی اور بعد چندے بیعت کی درخواست کی۔ ہاتھ میں ہاتھ لینے کے ساتھ شیخ نے فرمایا کہ تم تو کسی شیخ کامل سے سابق میں وابستگی کر چکے ہو۔ عرض کیا کہ دیوبند میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ سے تعلق رہا اور اب آپ سے عقیدت یوماً فیوماً زائد ہے اور ہر آن اضافہ۔

ارشاد ہوا کہ یہ صحیح نہیں دیو بند جاؤ اور اپنے شیخ سے اجازت لے کر آؤ۔ وارد دیو بند
ہوئے اور شیخ کو اطلاع دی، یہاں بے نیازی کا سماں تھا، نہ گھیر گھار کر مرید کرنے کا ذوق
نہ دوسری جانب رجوع پر ارتداد یا باطنی سعادتوں سے محرومی کی وعید، بخوشی اجازت
پر حضرت شیخ احمدؒ سے وابستہ ہوئے اور کچھ زمانے کے بعد امامت نماز کی سعادت بھی
مولانا احمد رضا صاحب بجنوری اور مولانا حشمت علی صاحب نے دہلی میں اس طرح
دیکھا کہ بوقتِ امامت مصلیٰ پر تا اختتام تکبیر رخ حضرت مرشد کی طرف رہتا، نماز شروع
ہونے پر قبلہ رخ ہوتے۔ شیخ نے وفات کے وقت انہیں کو اپنا جانشیں منتخب فرمایا۔
۱۹۴۴ء کے بعد احقر دہلی میں تعلیم حاصل کرتا تو حضرت نے دہلی میں نزولِ اجلال
فرما کر میری تلاش کی، محرومیٔ قسمت شرفِ نیاز تقدیر میں نہ تھا۔ بعد میں حضرت مرحوم
سے مزید واقفیت پر سب سے پہلے نیاز سرہند میں ہوا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا، رسمی گفتگو
کے بعد دریافت فرمایا کہ شاہ صاحب! چائے نوش فرمائیں گے، میں نے بڑی بے تکلفی
سے طلب کی تو ارشاد ہوا کہ ''بے تکلف زیستن خوش زیستن'' چولہے پر چائے کی تیاری
شروع ہوئی تو خاموش چولہا تھا، فرمایا کہ ہمارا چولہا بھی نقشبندی ہے۔ دوسری ملاقات
میں عرض کیا کہ حضرت دعاء کر دیجیے یا کوئی ایسا وظیفہ کہ نماز ادا کیے بغیر چین نہ آئے۔
فرمایا کہ شاہ صاحب ایسی بات تو علم دین سے بھی پیدا ہو جانی چاہیے۔ حضرت
مجدد صاحب کے پُرانوار مرقد پر خاص حلقے میں معمول کے مطابق شریک فرمایا اور
ضابطے کی توجہ بھی؛ لیکن تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل۔

حضرت مرحوم پست قامت، گندمی رنگ، گٹھا ہوا بدن، ریش مبارک گھنی اور سادہ
پوشاک رکھتے، اب اس خانقاہ کے مسند آراء حضرت مرشد عالم، مولانا خان محمد صاحب
(متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) ہیں، جن کے ابر کرم سے دلوں کی کھیتیاں موسم بہار
کا منظر پیش کرتی ہیں، بدقسمتی کہ آج تک کندیاں حاضری کی سعادت سے محروم ہوں۔

حضرت الشیخ مولانا عبداللہ صاحب قدس سرہٗ کا مکتوب سامی، دہلی میں ملاقات نہ

ہونے کے مضمون پر مشتمل ہے۔ مرحوم کے بیشتر رفقاء درس نے ان سے بیعت کرلی تھی، یہ آفتابِ عرفاں برابر ضوء افشانی کررہا تھا کہ اجل مسمی نے ظاہری فیض رسانی کا سلسلہ منقطع کردیا اور پاکستان کی سرزمین عبدیت کے اس پیکر جمیل کو قیامت تک امانت کے طور پر اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ عمر فانی پچاس اور ساٹھ یا اس سے کچھ زائد بہاریں دکھا کر اعلیٰ علیین میں مع الصالحین جاودانی لذتوں سے ہم کنار ہیں۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

***

بعد الحمد و الصلاۃ و ارسال التسلیمات

فقیر محمد عبداللہ عفی عنہ بخدمت مخدوم زادہ مولوی سیّد محمد انظر شاہ صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ۔ گذارش کرتا ہوں کہ آپ کا نوازش نامہ شرفِ صدور لایا، یاد آوری کا کس طرح شکریہ کروں۔ شکر ہے اس ذات کا اس امر پر کہ آپ جیسے صاحب الحق لوگ فقیر جیسے ناکارہ کو مخاطب فرماتے ہیں۔ یہ فقیر مدت سے آپ کا غائبانہ واقف ہے، جس وقت آپ دہلی پڑھتے تھے مولوی عبدالکبیر صاحب کشمیری اس سال دیوبند میں تھے، فقیر دہلی گیا، وہ بھی ساتھ تھے، ان کے ذریعہ ملاقات کی سعی ہوئی؛ مگر مقدّر نہ تھا، ملاقات نہ ہوسکی، یہ فقیر دعا گوئی کی خدمت پہلے بھی کرتا ہے، اب ان شاء اللہ زیادہ اہتمام سے کرے گا۔

دوسرے معاملے میں فقیر ابھی تو آپ کے وہیں قیام کو بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ ان خرخشوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ فرمادے جو باعث تکدر و ایذا بن رہے ہیں اور حضرت شاہ صاحب رحمہم اللہ کے کمالات و علوم کا حامل بنادے، اس فقیر کی طرف سے حضرت والدہ ماجدہ زید مجدہن کی خدمتِ عالیہ میں تسلیماتِ نیاز مندانہ عرض کردیجیے اور سیّد محمد ازہر صاحب کی خدمت میں بھی، یہ بھی ان کی خدمت میں عرض کردیویں کہ عریضہ لکھنے میں اگرچہ بے انتہا کاہل ہوں، خاص کر اس سال میں؛ لیکن بحمدہٖ تعالیٰ آپ کی

یاد اور دعا گوئی سے غافل نہیں۔ والسلام

اگر ناموزوں نہ ہوتو قاری جلیل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں سلام عرض کردیویں۔

(حضرت محترم مولانا) فقیر عبداللہ عفی عنہٗ (خان صاحب)

خانقاہ سراجیہ کندیاں، پاکستان

۱۰ر جمادی الاولیٰ ۷۵ھ

***

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ بنوری

خوش رو، خوش پوشاک، خوش مزاج، خوش نہاد، نفاست پسند، نظیف الطبع، ذکی وذہین ومتیقظ، حافظہ بے نظیر، ذکاوت بے مثال، عالم، فاضل، محدّث، مفسّر، حضرت علامہ کشمیریؒ کے وہ باختصاص شاگرد جن پر علامہ کا علم ناز کرتا ہے، وہ تلمیذِ سعید جس پر استاذ کی روح پُرفتوح نازش کرتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ علامہؒ کے علوم کی اشاعت ان کے حصے میں ٹھیک اس طرح آئی جیسا کہ ابن قیم نے اپنے مشہورِ زمانہ، جلیل علامہ ابن تیمیہؒ، یا سخاوی نے ابن حجر عسقلانی اور قاسم بن قطلوبغا نے ابن ہمام کے بے مثال فن کی۔ مرحوم حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفۂ اجل حضرت سیّد آدم بنوری کے دودمانِ عالی سے تعلق رکھتے۔ نسلاً سیّد، وطناً جلال آباد، افغانستان۔ وطن ونسل کے الوان پوری طرح نمایاں، کبھی جمالِ سادات تو گاہے جلالِ جلال آباد، علامہ کشمیریؒ کے بے پناہ علم وفن کی شہرت سن کر دیوبند پہنچے تو حضرت علامہ دارالعلوم سے ترکِ تعلق کرکے گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ مولانا نے اپنی آمد، حسرت، تمنا اور ولولوں کا اظہار ایک تحریر جو برنگِ مقاماتِ حریری تھی، علامہ کو ان کے رہائشی مکان پر پیش کی، مطالعہ کے بعد دریافت فرمایا کہ ادب میں کیا کیا پڑھا ہے؟ سن کر فرمایا کہ مزید حاجت نہیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، آپ بہت دیر میں آئے تاہم آپ کو ملحق کیے لیتا ہوں۔

طلبۂ دارالعلوم کے اصرار پر مسجد خانقاہ میں ''موطا مالک'' کا درس شروع ہوا، میقاتِ صلوٰۃ میں کلام فرماتے ہوئے مختلف علوم زیر بحث آئے۔ بنوری نے کچھ عرض کیا تو فرمایا آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ عرض کیا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہی لکھا ہے،

فرمایا کہ شاہ صاحب سمجھے نہیں، پھر شاہ صاحب کے نظریہ کی مدلل تردید ہوئی، بنوری کہتے ہیں کہ اپنی مختصر علمی زندگی میں حیرت کا آج پہلا دن تھا کہ یہ علامہ، شاہ صاحب الدہلوی کے بھی افکار ونظریات کی جامد تقلید نہیں کرتا؛ بلکہ اپنے دامنِ علم میں وہ تبحر وتعمق رکھتا ہے کہ کھرے کھوٹے میں امتیاز کی بھرپور صلاحیت ہے، طبیعت اخاذ تھی اور گوہر شناس بھی، بس اس پہلے دن کی آشنائی کے بعد علامہ کے دامن سے خود کو اس طرح وابستہ کیا کہ موت کی آخری ہچکی تک عقیدتوں کا دامن ان کے ہاتھ سے کوئی نہ چھڑا سکا۔ ان کا کوئی سبق، کوئی مجلس، کوئی نگارش اپنے استاذ کے والہانہ تعلق وعقیدت کے تذکرے سے خالی نہ تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ کے علوم کو جتنا انہوں نے سمجھا شاید کوئی شاگرد سمجھا ہو۔

مرحوم کی عادات وخصائل، اطوار وشمائل پر ہر دو نسبتوں کا رنگ آتا جاتا، ایک بار حرم میں احقر کے ساتھ عصر کے بعد مغرب کے انتظار میں تشریف فرما تھے، ہجوم بے پناہ، حج کا زمانہ، ایک ''یمنی'' مولانا کے اوپر سے اس طرح پھلانگا کہ ان کو ضربِ شدید آگئی۔ مولانا نے حرم ہی میں اس کی خوب جم کر تادیب کی۔ چند منٹ کے بعد دیکھتا ہوں کہ اس یمنی کے پاؤں میں مولانا کا سر پڑا ہوا ہے اور ریال دے کر معافی اور اسے خوش کرنے کی کوشش بلیغ ہو رہی ہے۔ آکر مجھ سے فرمایا کہ میں نے حرم میں جدال کیا اور دیر تک اس پر متأسف۔ تحفظ ختمِ نبوت کے آخر دور میں رہبر تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کے یہاں وفد کی قیادت فرما رہے تھے، گفتگو میں تیزی آگئی تو بھٹو بولے کہ کیا استعفاء دے دوں؟ مرحوم جیب میں سے قلم نکال کر وزیر اعظم کی طرف دوڑے کہ ابھی لکھو، مگر قلب میں گداز اور روح پُرسوز تھی۔ کبھی جلال آتا، اور دیکھتے دیکھتے آنسو کی شکل میں آنکھوں سے بہہ جاتا۔ تنقید میں بے باک تھے، نہ رو ورعایت، نہ رکھ رکھاؤ، ایک بڑے محدث کے سبق میں چند ساعت کے لیے بیٹھے تو باہر نکل کر فرمایا: میں قطعاً محظوظ نہیں ہوا، تکیہ کلام ''آیا خیالِ مبارک میں'' تھا، جسے عجلت پسند طبیعت نے مخفف کر کے ''آخر میں'' کر لیا تھا، تقریر ودرس میں بار بار ''آخر میں'' کا تکرار ہوتا۔ قادیانیوں کے کفر کا جب

حکومتی سطح پر فیصلہ ہوا تو مولانا نے تقریر میں فرمایا کہ قادیانیت کے خلاف الف سے ہنگامہ شروع ہوا اور آج ''ی'' پر ختم ہو گیا، یعنی ''انور شاہ'' نے مؤثر مخالفت کا محاذ بنایا اور ''یوسف'' پر اس کا اختتام ہوا، لاریب کہ یہ تاریخی جملہ تھا جو ان کی زبان پر آیا۔ مختلف مدارس میں عظیم مناصب پر پہنچ کر کراچی میں خود عظیم درسگاہ کی بنیاد ڈالی ،مولانا کے دور میں زکوٰۃ قطعاً نہ لی جاتی۔ درس گاہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ افسوس کہ مولانا کے پس ماندگان بڑی تیزی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، غریب بڑا لڑکا بھی کسی سازش کا شکار ہو گیا۔

اہم علمی اداروں، تنظیموں کے رکن و سرپرستی کا کامیاب دور گزار کر آخر عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے اور اسلام آباد میں آخری ہچکی لی، اب اپنی یادگار مدرسے کے ایک پہلو میں خود بھی یادگار بن گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

گرامی نامہ میں کتابوں کی فرمائش کی تکمیل کی اطلاع، ایک مکتوب میں وہ تأثرات احقر نے حضرت تک پہنچائے جو مولانا منظور نعمانی نے پاکستان سے واپسی پر ''الفرقان'' میں تحریر کیے اسی پر مولانا کا جواب ہے۔

۶ر ستمبر ۱۹۵۲ء

برادرم عزیز القدر مولوی انظر شاہ وفقکم اللہ الخیر و اقر عیوننا بکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعوتِ محبت و اخلاص گراں قدر نامۂ شفقت نے بے حد مسرور کیا، یہاں بخیر ہیں اور علمی مشاغل میں مشغول ہیں، جواب میں بہت تاخیر کی اور کر رہا تھا کہ سورت جانے کا عزم ہوا، خود جا کر کتاب دیکھوں اور روانہ کر دوں اور ممکن رعایت بھی کروا سکوں اور نسخہ صاف حاصل کر سکوں، خانگی عوائق کی وجہ سے نہ جا سکا۔ آئندہ جمعہ کو عزم ہے، آپ کی علمی مشاغل و اشواق کا علم ہوا، بے حد خوشی ہوئی کہ خدا کرے ہمارے حضرت شیخ رحمہ

اللہ کی جانشینی کا فخر آپ کو حاصل ہو جائے۔

(خط بوسیدہ ہونے کی وجہ سے مکمل نہیں پڑھا جاسکا)

مجلسِ علمی کے لیے جو حضرت شیخ کی کتابیں ملی تھیں، ان کے چار صندوق بجنور میں ہیں۔ بہت اچھا ہوگا کہ آپ ان کتابوں کا معاملہ کروا دیں اور مولانا احمد رضا صاحب سے کہیں کہ وہ حاجی محمد صاحب کو لکھیں، اس طرح ایک معتمد بہ ذخیرہ مل جائے گا۔ والسلام

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۷ رنومبر

برادرم عزیز القدر مولوی انظر شاہ وفقکم اللہ الخیر واقر عیوننا بکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل سورت گیا تھا، صرف ایک نسخہ ''محرم آفندی'' کا ملا جو قدرے معیوب بھی تھا، لیکن دوسرا نسخہ نہ مل سکا اور قیمت ۱۵ ربتلا رہے تھے، بمشکل ۳ ر روپے کی رعایت کی اور بارہ روپے میں طے پایا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کو وہ وی پی کر دیں، پہنچ گیا ہوگا یا پہنچ جائے گا۔ مختصر المعانی کے لیے ''دسوقی'' سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ مستقل اس کی قیمت ندرت کی وجہ سے ۱۰۰ ر روپے ہے۔ لیکن شرح تلخیص المفتاح ہامش پر طبع ہے، اس کی قیمت ۳۵ ر روپے ہے ۳۰ ر تک ہو سکے گی۔ ان میں الایضاح اور عروس الافراح دونوں اہم ترین کتابیں شامل ہیں۔ افسوس کہ یہ نسخہ حضرت شیخ امام العصر مرحوم کے کتب خانہ سے مجلسِ علمی میں آ گیا تھا اور وہ کتب خانہ مجلس علمی کراچی کو منتقل ہو گیا۔ اگر کتب خانہ یہاں ہوتا تو میں ارسال کرتا اور مجلسِ علمی کو اس کی رقم دے دیتا۔ افسوس، اللہ رحم فرمائے، سابق خط میرا مل گیا ہوگا، والدہ صاحبہ کو سلام عرض کریں۔

محمد یوسف بنوری عفا اللہ

برادرم عزیز القدر مولوی محمد انظر شاہ نضر اللہ علمکم وعملکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نامۂ شوق نے ممنون کیا تھا، مختلف مشغولیت سے جواب میں تاخیر ہوئی، اس مژدۂ جاں فزا سے دل ودماغ کو ابتہاج ومسرت ہوئی کہ آپ تعلیم کی آخری منزل دورۂ حدیث پر پہنچ گئے، اللہ تعالیٰ اس سفر کی تکمیل کرا کر دوسری منزل کے سفر کا آغاز کرائے۔ یعنی محقق ومتبحر بننے کا سفر شروع ہو۔ اور امت کو نفع پہنچے اور ہمارے حضرت شیخ مرحوم امام العصر کی روح خوش ہو اور آپ کو ان کا صحیح جانشین ویادگار بنائے۔ بہت ممکن ہے کہ حضرت مرحوم کا یہ روحانی تصرف ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مرحلے پر پہنچایا، فراغ کے بعد حضرت شیخ مدنی دامت برکاتہم کے ہاتھ مبارک پر بیعت بھی کیجیے اور ان کی توجہات کا مرکز بنے جانے کی کوشش کی جائے، اگر زندگی نے وفا کی اور آمد ورفت کی وسائل میں مزید آسانیاں پیدا ہو جائیں تو شاید ہمیں بھی کچھ حصہ خدمت کا مل جائے۔ ''الفرقان'' کا وہ مضمون میں نے نہیں دیکھا، خیر وہ تو ایک مخلص کی نگاہِ محبت ہوگی، ربّ العالمین صحیح معنی میں اپنے فضل وکرم سے شیخ مرحوم امام العصر کے علوم کا واسطہ بنائے، ورنہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ والدۂ محترمہ کی خدمت بابرکت میں میرا اسلام نیاز عرض کر دیجیے اور دعواتِ صالحہ کی درخواست کیجیے، اس وقت دار العلوم اسلامیہ کی زندگی میں حضرت مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کی نوعیت کے اختلاف اور مخالفت ومخاصمت سے ابتلا پیش آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے اور علم ودین کی خدمت کا موقع اخلاص کے ساتھ نصیب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، گاہے گاہے اپنے احوال سے مطلع کرتے رہیے۔

برادرم محترم مولانا محمد ازہر شاہ سلّمہٗ سے سلام مسنون کہہ دیجیے۔ ''الفرقان'' کا وہ پرچہ اگر ارسال کر سکیں تو بھیج دیجیے، دیکھ کر واپس کر دوں گا۔

والسلام

محمد یوسف بنوری عفا اللہ

***

گوہر شب چراغ

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ہندوستان میں کم ہی ایسے خانوادے گزرے جن میں علم وآگہی، دین ودانش متوارث رہا اور اخلاف نے اپنے اسلاف کی روایات کو بدستور تابناک رکھا ہو۔ ان گنے چنے خوش قسمت خاندانوں میں دیوبند کا عثمانی خانوادہ بھی ہے جس کی خاندانی تاریخ روشن اور جاوید روایات بے مثال ہیں۔ مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، مولانا مہتاب علی صاحب، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، فقیہ الامت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نقشبندیؒ، حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ، یہ چند نام تو ارتجالاً قلم پر آ گئے۔ ورنہ اس خاندان میں بہت سے گوہر شب چراغ اور درِّ شاہوار ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایک شخصیت ساز ادارہ کا نام ہے، جس طالب علم پر آپ کی نظر پڑ گئی وہ خاک سے کاخ پر جا پہنچا۔ بارہویں صدی کے خاتمے اور تیرہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں جتنی کوہ پیکر شخصیتیں نظر آتیں ہیں وہ حضرت مرحوم کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تدبیر وتدبر کے دائرے میں ایسی منفرد شخصیت لے کر آئے کہ آج بھی دارالعلوم دیوبند کا زرّیں دوران ہی مرحوم کی بے مثال قابلیت اور بے نظیر انتظام کا مرہون منت ہے۔ شخصیت سازی کا وہ جوہر قابل اپنے سینے میں رکھتے کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ علمی پروانوں کو کمالات کی شمع فروزاں بنا دیا۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ جو مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے والد ماجد تھے۔

زہد و اتقاء کے پیکر، استغناء و للّٰہیت کی تصویر، فنائیت وعبدیت کے ہمالیہ، تواضع وفروتنی کے قلزم، نقشبندیت کے امام، تفقہ کی دولتوں سے مالا مال، لیکن بایں ہمہ از صبح تا شام بیوہ عورتوں، یتیم بچوں، بے سہارا انسانوں اور بے کسوں کے لیے غلام بے دام تھے، یہ تعبیر دل ودماغ کے لیے شدید ناگوار ہے؛ مگر کیا عرض کروں کہ صورتِ واقعہ کی ترجمانی کے لیے کوئی اور تعبیر مہیا نہیں، وہ اپنے محلے کی نالیاں اپنے ہاتھ سے صاف کرتے، بیوہ عورتوں کے غلّوں کی بوریاں پسوانے کے لیے لے جاتے، تمام محلے کا سودا سلف بازار سے لاتے اور إن اجري إلا علی اللّٰہ کا نعرہ لگا کر دنیا سے تعریف کے دو بول بھی لینے کے روادار نہیں تھے، پھر بتایئے ایسے بے نفس کو غلامِ بے دام کہنے کی گستاخی نہ کروں تو صحیح صورتِ حال آپ کو کیسے سمجھاؤں۔

رہ گئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تو ان کا میمون عہد اس منحوس قحط الرجالی دور سے اتنا قریب ہے کہ پاکستان میں کروڑوں اور ہندوستان میں لاکھوں ان کو دیکھنے اور سننے والے اب بھی موجود ہیں۔ علامہ خسرو علم، فصاحت و بلاغت کے شہسوار، تقریر و وعظ کے اپنے عہد میں بے تاج بادشاہ تھے۔ حق پسندی ان کا شعار، حق بیانی ان کا امتیاز تھا۔ جس مجمع میں منکراتِ شرعی پر دارو گیر کی ہمت وحوصلہ بڑے بڑے شیخ الاسلاموں کو نہ ہوتا، وہاں علامہ کی حق پسندی کی آبدار و تابدار تلوار یکا یک نیام سے باہر آجاتی اور پھر اس شمشیر کی کاٹ سے کبھی والیٔ حجاز کا لاشہ تڑپتا نظر آتا، کبھی نظامِ دکن خوں چکاں نظر آتے، تو گاہے حافظ ابراہیم سابق وزیر کابینہ غلطاں و پیچاں دکھائی دیتے۔ بڑے بڑے مجمعوں پر چھا جانا حضرت علامہ کا ادنیٰ کرشمۂ فصاحت، اور حریف کو دو جملوں میں چت کر دینا مرحوم کا کمال تھا، پھر ان سب اوصافِ جلیل پر عالمانہ معصومیت چھائی ہوئی، سینہ ایسا بے کینہ کہ کسی سے انتقام کی وہ سوچ نہیں سکتے تھے، قلب ودماغ علوم وکمالات کا وہ خزینہ کہ جب چاہتے موتی رولتے، اب تو اپنی یہی سب سے بڑی سعادت نظر آتی ہے کہ ان ہستیوں کو دیکھنے کا موقع لم یزل ولا یزال نے عنایت فرمایا، ورنہ اس منحوس دور

میں انسان نما بھیڑیوں سے جو قدم قدم پر سابقہ اور دین و دانش کے عیار تاجروں سے جو مرحلہ بمرحلہ لاحقہ ہے اس نے تو دنیائے دنی و دوں سے دل ہی اچاٹ کردیا۔

خیر یہ تو قلم بے تابانہ و بلا ارادہ عثمانی خاندان کی بعض نادر الوجود ہستیوں کی طرف مڑ گیا، ورنہ تو اصل ذکر و تذکار مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کا پیش نظر تھا، قطعاً یاد نہیں آتا کہ مرحوم مفتی صاحبؒ سے دید و شنید کا آغاز کب سے ہے؛ البتہ غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے یا اس کے آس پاس کا کہ مولانا عبدالحق میاں سملکی امیر انجمن خدام الدین کی معیت میں دہلی کا سفر ہوا، اس زمانے میں مفتی صاحبؒ اپنا سارا کاروبار قرول باغ میں جمائے بیٹھے تھے۔ ندوۃ المصنفین کی پُرشکوہ عمارت، عمارت میں سادگی، نظم و انتظام کی چستی، اہل علم کا اجتماع، دیدہ ور مصنفین کا حلقہ، ہر ایک زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ یہ چمن آرائی مفتی صاحبؒ کے سلیقے اور قرینے کی مرہونِ منت ہے۔ میں اس زمانے میں نہ صرف بے ریش و بروت؛ بلکہ کم سن تھا، لیکن بڑوں کی عظمت کا مظاہرہ ایسے ہی حالات میں ہوتا ہے۔ مرحوم مفتی صاحب ایک نادان بچے کے لیے صرف استاذ زادہ ہونے کی بناء پر بہ دل و جان پذیرائی میں لگ گئے۔ بڑا مکلف کھانا تیار کرایا۔ گہرے جذباتِ محبت وشفقت سے کھلایا، گویا کہ شعور کے عالم میں مفتی صاحبؒ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد میرا دہلی میں مستقل قیام تین چار سال رہا، ندوۃ المصنفین تو جانا یاد نہیں؛ البتہ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ ادارۂ شرقیہ جامع مسجد دہلی کے عقب میں جس کے روحِ رواں مولانا ادریس صاحبؒ میرٹھی تھے۔ وہاں دارالعلوم کے قدیم و جدید فضلاء کا اجتماع ہوتا، مفتی صاحبؒ کی یہاں بار بار زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔

۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں نے مجھے دہلی سے اٹھا کر دیوبند پہنچا دیا، کچھ سال تعلیم میں گزرے اور رسمی فراغت کے بعد یہیں دارالعلوم میں تدریس کا موقع مل گیا۔ ملازمت کے دوران مشکلات پیش آئیں تو مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن کا ناخنِ گرہ کشا گرہ کشائی کرتا، اس وقت کی مجلسِ شوریٰ میں سکہ رائج الوقت تھے، استاذ زادہ ہونے کی بناء پر ان

کی شفقتیں وعنایتیں نصیب تھیں۔ مفتی صاحبؒ سے اس دور میں بھی تعلقات لیے دیے رہے، مولا حفظ الرحمٰنؒ کی وفات کے بعد اب ہمارے ''ملجاو ماویٰ'' مفتی صاحبؒ تھے اور لاریب کہ انہوں نے ایسی بزرگانہ شفقت کا معاملہ فرمایا جس سے ان کی شرافتِ نسبی، وضع داری ومروّت دل پر نقش ہے۔

مفتی صاحبؒ شگفتہ ومہذب طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، شگفتہ بیانی کی ملاوٹ اسے نیش آلود نشتر کے بجائے شکر وانگبیں کا انجکشن بنا دیتی۔

کشمیر میں علامہ انور شاہ سمینار کے موقع پر میر واعظ منزل میں عشائیہ کے پروگرام کے ساتھ نام وَر شخصیتوں کی تقریر کا پروگرام تھا۔ سعید صاحب کی تقریر ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئی، سامعین تو نیاز مند تھے کیا بولتے؛ لیکن جب مفتی صاحب کھڑے ہوئے تو طویل تقریر پر چٹکیاں لیتے ہوئے اکبرالہ آبادی کی ایک رباعی پڑھی جس کا چوتھا مصرعہ ؎

تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تھا۔ بے چارے سعید صاحب خندہ زیرلب کے ساتھ منقار در پر ہوکر رہ گئے۔

ایک رات جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مفتی صاحبؒ، مولانا محمد میاںؒ، مولانا نورالدین بہاریؒ، مولانا سیّد احمد رضا بجنوری وغیرہ موجود تھے۔ بے تکلف احباب کے اس مجمع کا موضوع شوہروں کا اپنی بیویوں کے ساتھ تعلق اور اس کی نوعیت تھی۔ اچانک مولانا حفظ الرحمٰنؒ اٹھے، اندرونِ خانہ تشریف لے گئے اور معاً واپس آگئے، اس پر مفتی صاحبؒ مرحوم نے اپنے خاص لہجے میں فرمایا:

جی ہاں، یہ بھی ایک تعلق کی نوعیت ہے یعنی ''گرد اک شے کے گھومنا ہے طواف!''

یاد رہے کہ یہ حمد باری کا ایک مصرعہ ہے جس میں طواف کا ترجمہ کیا گیا ہے، اس بھرپور طنز پر مجاہد ملت خاموش ہوکر رہ گئے۔

مفتی صاحب مرحوم کی کس کس ادا کا ذکر کیجیے اور کس کس بات کو یاد کر کے ان کی یاد

تازہ کیجیے۔ یہ حقیر تقریباً آٹھ سال دارالعلوم میں ناظم مجلس تعلیمی رہا، یہ عہدہ اپنے اثر واقتدار کے لحاظ سے دارالعلوم میں اہتمام کے بعد دوسرا منصب تھا، مجلسِ شوریٰ میں مفتی صاحب کی شخصیت بڑی بھاری بھرکم تھی۔ کسی مسئلے پر بحث ومباحثہ کے دروازے کھلتے اور یہ عقلائے کل دور بینی ودور اندیشی کے بے بنیاد ہمالے تیار کرتے تو مفتی صاحبؒ کی دوٹوک رائے پر بحث کا اختتام ہوتا، اگر میں کسی مسئلے پر بولتا اور میری قیل وقال مفتی صاحبؒ کے منشاء کے خلاف ہوتی تو فرماتے:

''حضرت شاہ صاحبؒ (علامہ انور شاہ کشمیریؒ) ابن حزم اندلسی کی تیزیٔ تحریر کی بنیاد طحال کا عارضہ اور حدتِ جگر بتاتے، ہمارے شاہ صاحب (حقیر) بھی حدتِ جگر کے مریض ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی رائے اس مسئلے میں خاص بیماری کی نشاندہی کر رہی ہے''۔

یہ فرما کر میری گفتگو کو غیر وقیع قرار دیتے، اور اگر کبھی میری کوئی بات مرحوم کے منشا کے مطابق ہوتی تو فرماتے۔

''جی ہاں! سنی تو ناظم مجلس تعلیمی ہی کی جائے گی، بڑا باوقار عہدہ ہے اور یہی ذمہ دار ہیں''۔

غرضیکہ چٹکی بجاتے مفتی صاحبؒ الجھے ہوئے مسائل کو سلجھا لیتے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے انہیں خصوصی تعلق تھا، بربناء معاصرت بے تکلفی بھی تھی۔ ایک روز مہتمم صاحب مرحوم دہلی میں مفتی صاحبؒ کی رہائش گاہ پر زبردستی کے مہمان تھے۔ مفتی صاحب کبھی بریانی کی پلیٹ پیش کرتے تو مہتمم صاحبؒ فرماتے کہ جی ہاں اسے بھی کھاؤں گا۔ کبھی نرگسی کوفتوں کو بڑھاتے تو مہتمم صاحبؒ فرماتے جی ہاں یہ بھی لوں گا۔ الوان واقسام کے کھانے مفتی صاحبؒ نے اس طرح پیش کیے اور ہر ایک پر مہتمم صاحبؒ مرحوم کا یہی جواب تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کھانے میں بہت محتاط؛ بلکہ لیا دیا ہی کھاتے، مہتمم صاحبؒ کے اس طرز پر کہاں چوکنے والے تھے، بپھر کر بولے:

''جی ہاں! سب کھاؤں گا، کسی چیز کا انکار نہیں ہے۔''

ہم نیاز مند تو سناٹے میں آ گئے؛ لیکن مہتمم صاحبؒ جو مفتی صاحبؒ کے اداشناس تھے اس پر تبسم ریز ہو گئے۔

مفتی صاحبؒ میں حلم بھی غایت درجے کا تھا، وہ ناگوار باتوں کو برداشت کرنے میں بے مثال واقع ہوئے تھے۔

مفتی صاحبؒ کی علمی استعداد مضبوط اور سوادِ علمی ممتاز تھی، وہ دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں جو تعلیمی آخری سال ہے، امتیازی حیثیت سے کام یاب ہوئے، دارالعلوم کا وہ خیر القرون تھا، جب یہاں مجرد کام یابی بھی دشوار تھی؛ چہ جائیکہ اختصاصی نمبرات سے کام یابی، اس پر ان کے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی تصانیف کے ساتھ دو روپے نقد انعام عنایت فرمایا، مرحوم اس نقد انعام کو بطور تبرک سنبھالے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں درسِ نظامی کی دشوار تر کتاب ''بیضاوی'' سورۂ بقرہ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد ہوتی۔ مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں معین المدرّس مامور ہوئے تو آپ کو پڑھانے کے لیے دی گئی، بیضاوی کے درس میں پنجاب، پشاور، ایران، قازان، بخارا، سمرقند وغیرہ کے ممتاز طلبہ شریک تھے۔ مزید برآں علامہ کشمیریؒ سے حدیث کا درس لیے ہوئے فاضل طلبہ کو بیضاوی پڑھانا کھیل نہ تھا۔ اس لیے مرحوم کبھی کبھی بطور تحدیثِ نعمت فرماتے۔

''حضرت شاہ صاحب جیسے جبلِ علوم کے یہاں پڑھے ہوئے طلبہ کو پڑھانا مولوی صاحب کوئی آسان کام نہ تھا۔''

دیوبند کے ۱۳۴۵ھ والے واقعے میں مفتی صاحبؒ اپنے استاذ قدس سرہٗ کے جانبدار تھے اور جب یہ علمی قافلہ دیوبند سے بجانب ڈابھیل روانہ ہوا تو آپ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں افتاء کے شعبے کو سنبھالنے کے ساتھ حدیث وتفسیر وفقہ کی اہم کتابوں کے اسباق آپ سے متعلق رہے۔ کلکتہ میں تفسیر قرآن بیان کی

جس کا حلقہ عام وخاص پر پھیلا ہوا تھا، ندوۃ المصنفین کے بعد اگرچہ ان کی تمام تر مصروفیات انتظامی تھیں؛ لیکن اس کے باوجود علمی ذوق جو پختہ ہوچکا تھا بدستور قائم رہا۔ علامہ انورشاہ کشمیریؒ سیمینار میں اپنے استاذ پر جو ارتجالاً مقالہ لکھا وہ تمام مقالات میں بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعروشاعری سے مناسبت ان کا خاندانی ورثہ تھا، چوں کہ شعرشناس خوب تھے؛ اس لیے پُرمعنی شعر کوسن کر اچھل جاتے۔ خاص عادت یہ تھی کہ جو شعر پسند آتا اسے فوراً لکھ لیتے؛ چناں چہ ایک بار ایسا ہوا کہ ہوائی سفر کے مرحلوں میں جو پابندیاں موجودہ حکومت نے عائد کیں اور ہتھیار وغیرہ کی تلاشی کے لیے جو خصوصی تجسس کیا جاتا ہے میں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر مرحوم کے سامنے پڑھا۔

زنہار کوئی چابی کمر بند میں نہ باندھے
لوہے سے بہت ڈرتی ہے سرکار ہماری

مفتی صاحبؒ پھڑک اٹھے اور فرمایا کہ بھائی اسے لکھوادو۔ تحریر بڑی شگفتہ تھی، لیکن اس میں بھی طنز کا پہلو غالب رہتا، ایک مرتبہ برہان کا اداریہ لکھا تو دارالعلوم کے قدیم وجدید دور کا موازنہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:

”دارالعلوم کے قدیم دور میں دورۂ حدیث میں آج کی طرح پلٹنیں نہ ہوتی تھیں؛ بلکہ گنے چنے چند طلبہ ہوتے، لیکن کوئی علامہ کشمیریؒ بن کر نکلتا تو کوئی علامہ عثمانیؒ“۔

پلٹنوں کے لفظ کو پڑھیے اور سر دھنیے۔ عام مجالس میں بھی علمی موضوعات اگر چھڑ جاتے تو مفتی صاحب کو اپنے دماغ کے خزانے سے پرانی اور مستند معلومات نکالنے میں دشواری نہ ہوتی۔ ان کے زیر نگرانی ندوۃ المصنفین کی مطبوعات علمی شاہکار ہیں، جنھوں نے ملک وغیر ممالک کے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

علالت کا دور شروع ہوا تو بار بار عیادت کے لیے حاضری ہوئی، اب مفتی صاحب اپنا ضبط کھوچکے تھے۔ دارالعلوم کے حالات سنتے تو بے اختیار آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے بندھ جاتی۔ میں بمبئی سے واپس ہورہا تھا، نئی دلّی اسٹیشن پر اتر کر سیدھا ان کے

رہائشی مکان پر پہنچا، ناسوتی زندگی میں مفتی صاحبؒ سے یہ آخری ملاقات تھی۔ مرحوم کے عظیم کارناموں کو ان مختصر سطور میں نہیں سمیٹ سکتا۔ آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ندوۃ المصنفین میں اپنی کرسی پر تشریف فرما ہیں، عینک ان کے ہاتھوں میں ہے اور اپنے مخصوص لہجے میں فرمارہے ہیں:

ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

برّد اللہ مضجعہ

* * *

برادر عزیز!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بہت دنوں سے آپ کا خط نہیں آیا، حیدرآباد سے واپسی پر میری طبیعت زیادہ مضمحل ہوگئی تھی اور عوارض میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوروز سے نسبتاً بہتر ہوں، امید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ امن وسدھار کمیٹی پرواہ فیاض علی میرٹھ وسیع پیمانے پر جلسہ کررہی ہے، یہ بڑا اجتماع ہوگا اور اس میں غیر مسلم احباب بھی زیادہ تعداد میں شریک ہوں گے۔ عبدالحمید عاقل صاحب جو کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہیں اپنے خاص آدمی ہیں اور محمد عثمان آزاد صاحب کے عزیز ہیں، آزاد صاحب مجھ سے قدیم مخلصانہ علاقہ رکھتے ہیں، اجتماع کی اہمیت کے پیش نظر میں خود اس میں شریک ہوتا، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اب کسی عام اجتماع میں شرکت کے لائق نہیں رہا ہوں۔ اجتماع میں بڑے مقرر دو ہی ہوں گے، ایک شیعہ عالم کلب صادق صاحب اور دوسرے آپ، یہ اپنا ہی اجتماع ہے، اسی لیے سفارش کررہا ہوں، بہت اچھا ہو کہ آپ اجتماع میں شرکت کے لیے وقت نکال

سکیں۔ شکر گذار ہوں گا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی
۲۰ رمئی ۱۹۸۱ء

مؤرخہ ۲۹ رجون ۱۹۶۱ء

برادر عزیز

السلام علیکم

خط مع اشتہار پہنچا، اشتہار ''برہان'' میں ضرور دیا جائے گا، ''الجمعیۃ'' کی بات بھی ہو جائے گی، ان دنوں منیجر مولانا سیّد احمد رضا صاحب ہی ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن تشریف لے آئیں تو ان کے کان میں ڈال دوں گا۔ اصل میں منیجر اشتہارات کو ان چیزوں پر اعتراض ہوتا ہے، آپ گھرانے سے ہمارا تعلق رسمی اور جسمانی نہیں، حقیقی اور روحانی ہے اور اس تعلق کو ہم لوگ سرمایۂ آخرت خیال کرتے ہیں، حضرت الاستاذ کے احسانات فراموش کرنے کے لائق نہیں ہیں، ہمارے پاس تو جو کچھ ہے انہی کا فیض ہے۔ خدا کرے ''نقش'' کی زندگی طویل ہو اور اس کے ذریعے سے حضرت الاستاذ مرحوم کے علوم کے ایک حصے کی اشاعت ہو سکے، اچھا ہوتا اگر حجم ابتداء میں کم رکھتے، علمی اور مذہبی رسائل کی زندگی قائم رکھنا اب آسان نہیں رہا ہے؛ تاہم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ذی ثروت متوسلین ارادہ کرلیں تو اس ماہ نامہ کی بقا کچھ ایسی دشوار بھی نہیں ہے، امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی

چند یادیں، چند باتیں

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ

باتیں ہماری یادرہیں، باتیں پھر ایسی نہ سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا، تو دیر تلک سر دھنیے گا

۳۵ رسال کی عمر ہے، اس مختصر سی عمر میں نشیب وفراز، حالات کے انقلابات لائے ہوئے چرخ گردوں کے مصائب، لق ودق صحرا، ہجوم افکار، غموں کی طول طویل کہانی، اعزہ واقارب کا غم، دوست واحباب کی جدائی، کسی کی عارضی، کوئی پردۂ غیب میں اس طرح مستور کہ زندگی کے ان حدود کو پھلانگے بغیر اب اس سے ملنا ناممکن، بڑوں کے دستِ شفقت سے محرومی، زخم دل، زخم جگر؛ غرض یہ کہ نہ مصیبت ایک اور نہ پریشانیاں چند۔ بقول شاعر ؎

''محشر تلک کہوں اگر مختصر کہوں''

سب کچھ ہوتا رہا اور جب تک اس غم کدۂ حیات میں قیام مقدر ہے، سفینۂ حیات یوں ہی غموں کی ٹھوکر، پریشانیوں کی آندھی، افکار کے تھپیڑوں سے دوچار ہوتی ہوئی اس ساحل تک پہنچ جائے گی جہاں سے سفر ایک اور ہی عالم کا شروع ہوتا ہے، گویا کہ ایک آغاز جس کا انجام نہیں، زندگی گذارنا ہی ہے۔

''روکر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے''

عمر کی ابھی پانچ ہی منزلیں، ایک نوآموز سفر نے گرتے پڑتے طے کی تھیں کہ اس خاک دانِ عالم میں کسی انسان کے چند سہارے جو توانائیوں کا باعث اور پامردیوں کا سبب بنتے ہیں، ان میں سب سے بڑے سہارے کا ختم ہونا والد ماجد قدس سرہٗ کی وفات

تھی، پھران کے بعد ان کے تلامذہ، خدا تعالیٰ زندہ رہنے والوں کو زندہ وسلامت اور اس عالم سے سفر کرنے والوں کو رحمت کی بادِ بہاری سے لطف اندوزی کا موقع دے، انہوں نے اپنی شرافت و کریم النفسی سے وہ محبت وشفقت کا سلوک ہم سب ''اہل بیت انور'' کے ساتھ کیا، جس سے ہر قدم پر محسوس بس یہی ہوا کہ قدرت کی یہ کریمانہ نوازشوں نے شفقت پدری کے حرماں نصیبوں کو لطف وکرم کے یہ حسین پیکر ڈھال کر دیے ہیں اور سخاوت سے وہ کام لیا جو ان کی شایانِ شان ہے، یہ مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم بجنوری کی معصومیت سے لبریز محبت، یہاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کی شوخ شفقتیں، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بے نیاز و بانیاز مراسم، مولانا محمد انوری صاحب مدظلہٗ کے نیک سلوک، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا ذرا چلبلا کچھ چھیڑتا ہوا کچھ لگاتا ہوا رابطۂ اتحاد و یگانت، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کا بزرگانہ التفات، مولانا احمد بزرگ مرحوم کی مسلسل نوازشیں اور اباجی کے خادم خاص مولانا محمد ادریس سکھروڈوی کی غیر منقطع محبت، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کے عالمانہ فیوض اور ان سب میں دبستانِ انوری کے گل سرسبد مولانا حفظ الرحمٰن کی عنایتیں جو کچھ سبزہ کی طرح متواضع، گاہے پھولوں کی طرح، طناز ہواؤں کی طرح، روشن ستاروں جیسی، خوبصورت نغموں کی طرح، سریلی نیازمندوں کے سانچے میں اور گاہے ناز و انداز کی گرتی پڑتی اداؤں میں، کیا تھی محبت ان کی، کس سے کہیے، کس کو سنائیے۔

شاید ہی عمر میں کسی کے لیے اتنی صحت کی دعائیں کی گئی ہوں اور شاید ہی ایصالِ ثواب کا وفات کے بعد اس قدر اہتمام کسی کی خاطر ہوا ہو، دو مہینے اس عالم رنگ و بو سے کوچ کیے ہوئے ان کو گزرتے ہیں؛ لیکن حال بس یہ ہے ؎

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں
یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

دو مضمون غالباً دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ان کے بعد لکھے اور سوگوار دل

دو باغ سے اب یہ تیسرا مقالہ، کچھ اور غم کو ہلکا کرنے کے لیے کاغذ کے سپرد ہے، شوق
اشتیاق کی رہنمائی لیے ہوئے تیار ہو رہا ہے، کچھ باتیں ان کی تھیں جو میں نے
چاہا کہ ان کو بھی سنا ہی دیجیے، کب سے ملاقات ہوئی اور کہاں ملاقات، پوری داستان
انہیں دو عنوانوں کے تحت گھومتی نظر آئے گی۔

سب سے پہلی زیارت

خوب یاد ہے عمر پانچ سال سے زیادہ نہ ہوگی، شاید کچھ کم ہی ہو، والد صاحب کے
سانحۂ وفات کے چند ہی روز گزرے تھے کہ باہر مردانے میں ایک صاحب کھدر پہنے،
سفید شیروانی، تنگ مہری کا پاجامہ، بہترین کھدر کی سلیقے سے سلی ٹوپی، پاؤں میں
خوبصورت اس زمانے کے اعتبار سے قیمتی جوتا، ایک لوح مزار والد مرحوم کا لیے ہوئے
دن چڑھے گھر پر آیا، شور ہوا کہ مولانا حفظ الرحمٰن ابا کی مرحوم کے مزار کے لیے ایک پتھر
کندہ کرا کے لائے ہیں، بس سب سے پہلی یہی ان کی زیارت تھی اور اسی وقت سے دل
میں ان کا ایک تعلق گھر کر گیا، بنیاد جس کی بڑی مضبوط تھی۔

اس کے بعد بڑا زمانہ ایسا گزرا کہ ماحول کی تنگنائیوں میں پھنس کر لہو و لعب کے
خوف ناک دور شروع ہوئے کہ یہ سب متعلقین گھر پر برابر آتے رہے، لیکن نہ تو ان
سے ملاقات اور نہ ان کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کا موقع مل سکا، لیکن ادا مولانا حفظ الرحمٰن
صاحب کی ہمیشہ یہ رہی کہ جب دیوبند آتے ہمیشہ گھر پر تشریف لاتے، چند منٹ بیٹھتے
اور پھر سیدھے اپنے استاذ اور شیخ کے مزار پر حاضر ہوتے، گھر سے نکلتے ہوئے آتے
جاتے ان کو دیکھ لیا، اس سے زیادہ اور کچھ یاد نہیں۔

کچھ اور ملاقاتیں

اچانک ۱۹۴۳ء میں ایک عزیز کے مکان پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی قیام
کرنا پڑا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان سیاسیات کے ایک ایسے دور میں داخل ہو چکا تھا
جہاں بوڑھوں میں جواں مردی، جوانوں میں بلند حوصلگی، بچوں تک میں بے قرار عقیدہ

حریت پسندوں میں جو مقاصد کو حاصل کرنے اور راستے کی مشکلات کو انگیز کرنے کا وہ مچلتا ہوا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دے، یعنی راہ کی دشواریاں اور تلخیوں کو ہر طرف آگ لگ رہی تھی، بھلا اس آگ سے وہ کیسے محفوظ رہتا جو خود شعلہ جوالہ تھا، مراد مجاہدِ ملت مرحوم ہیں۔

چناں چہ ۱۹۴۲ء کی تحریک کے سلسلے میں طویل اسارت کا عرصہ گزار رہے تھے، رہا ہوئے تو سیدھے دہلی پہنچ کر جمعیۃ کی تنظیم اور آزادی کی جنگ کے بکھیڑوں میں ڈوب گئے، دہلی میں مرحوم کا ایک ادارہ تھا ''ادارۂ شرقیہ''، دیو بند مکتبِ فکر کے بلا واسطہ اور بالواسطہ تمام متعلقین جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتے اور سیدھے یہیں آتے، ادارہ جامع مسجد کے عقب میں اب بھی کھڑا نظر آئے گا؛ لیکن پچھلی محفلوں کی پُر حسرت یاد اور مستقبل وحال کی ایک داستانِ غم لیے ہوئے، بہر حال مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دہلی ہوتے تو جمعہ کے روز اس مجلس میں شریک ہوتے، تو یہ ذرّۂ بے مقدار بھی علم وعرفاں کی اس مجلس میں پوری پابندی کے ساتھ تو نہیں ہاں گاہے گاہے ضرور پہنچ جاتا، یہیں سے سب سے پہلے عقل وشعور کی پختگی کے دور میں ایک ناکام مجاہد مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو دیکھا جو انگریز دشمنی میں جدو جہد کے ریگستانی علاقوں کا ایک تھکا ماندہ مسافر نظر آتا، گریباں کھلا ہوا، ٹوپی ندارد، برہنہ پا، کاندھے پر چادر، لمبی ڈاڑھی جس کا طول ان کے مجاہدانہ تاریخ کے طول کا ایک پیمانہ تھا، آنکھوں میں سیاسی چمک، ہاتھوں میں بے تکا پن، کبھی بصیرت کے نایاب مرقعے اور کبھی ژولیدہ فکری کے ٹوٹے پھوٹے جال۔

پہلے دن دیکھا مجلس میں چلا رہے تھے، ادب واحترام سے ہر شخص گردن جھکائے ہوئے، جوشِ تقریر میں جیب سے سفری کا ایک دانہ نکالا اور اس کو کھاتے رہے، کس قدر حیرت انگیز تھی یہ بات، پھر کبھی دلّی میں چلتے پھرتے نظر آجاتے کھوئے ہوئے شاید کسی چیز کی تلاش میں:

''یہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں''

آپ کی خاص ادا یہ تھی کہ مجلس میں آتے اور ایک نظر تمام ہی لوگوں پر ڈالتے، لمبی لمبی پلکوں کے سایہ اور بھوری چمک دار آنکھوں کی گردش میں ہر ایک کی صلاحیت ان کو گھورتی نظر آتی، ان کی موجودگی میں کسی کو بولنے کی جرأت نہ ہوتی؛ حالاں کہ خود ان کی گفتگو کا بڑا حصہ فکری الجھاؤ، بے ربطی اور گفتگو کے تمام ہی آداب سے قطعاً خالی ہوتا؛ لیکن خدا جانے بات کیا تھی، سامنے سر جھکائے سب ہی بیٹھے رہتے، یہ آج بھی میرے لیے ایک معمہ ہے۔

اور اگر مجلس میں مجذوب سندھی موجود نہ ہوتے تو میرِ مجلس ہمیشہ مجاہد ملت ہوتے، یہ زمانہ مولانا مرحوم کی عسرت اور بڑی تنگ دستی کا تھا، وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کچھ اس طرح شریک ہوئے تھے کہ تن، من، دھن سب انہوں نے لگا دیا، ادارۂ شرقیہ میں ایک آنہ کا چندہ ہوتا، سب دیتے، مولانا ادریس صاحب میرٹھی کے یہاں چائے بنتی، ناؤ و نوش کے ایک آدھ دور پر یہ مجلس ختم ہو جاتی، تاہم عرب کے قدیم ماحول کی طرح یہ ایک ایسی بزم تھی جس میں ہر شخص پہنچ سکتا، یہاں اونچ نیچ کا کوئی فرق نہ تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مجاہدِ ملت لاہور کے سفر سے دہلی پہنچے۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی اور سیدھے ''ادارۂ شرقیہ'' میں! آج غالباً کسی دوست کو چند احباب ان کی گم شدہ چیز کے ملنے پر ''مٹھائی'' کے مطالبے سے تنگ کر رہے تھے، مجاہدِ ملت مرحوم بھی پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس پروگرام میں یہ کہتے ہوئے شریک ہو گئے کہ ''ہمارا بھی بستر ریل میں گم ہو گیا تھا اور پھر مل گیا۔'' تنگ دستی میں بھی فراخیٔ حوصلہ اتنا پایا تھا کہ میں ہمیشہ ان کے متعلق یہ سمجھتا کہ مولانا سیاسیات کے بکھیڑوں میں الجھ کر کچھ اس طرح گم ہو گئے کہ شاید مذہبی حدود کی پابندیاں ان کی اپنی زندگی سے کوسوں دور جا کھڑی ہوئیں، لیکن آپ حیرت کے ساتھ سنیں گے کہ یہیں ''دارالعلوم دیوبند'' کے ایک فاضل کو جو دہلی کی ایک درس گاہ میں تدریس کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز تھے، تنگ اور ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنے دیکھا تو ان کو مجاہدِ ملت نے وہ کچھ کہہ دیا جو رسمی ''امر بالمعروف ـــــ اور نہی عن

المنکر'' کے ٹھیکیداروں سے بالکل ناممکن ہے۔ انہیں دنوں وہ دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے قرول باغ مکتبہ برہان میں معمولاً جاتے اور دو تین میل کی یہ مسافت وہ پیدل طے کرتے؛ لیکن اتنی سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ کہ ابھی یہاں تھوڑی دیر میں وہاں اور آناً فاناً قرول باغ۔

اب ۱۹۴۷ء کا زمانہ قریب آ لگا تھا، کانگریس کے اونچے نیچے سب ہی کارکن جیلوں کی کوٹھڑیوں سے نکل کر آزاد ہندوستان کے نئے نقشے تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے، دہلی ان دنوں سیاسی لیڈروں کا کہنا چاہیے گڑھ بنی ہوئی تھی، وہ تو چلے آ ہی رہے تھے جن کو واقعی ہندوستان کا مالک کہنا چاہیے؛ لیکن برسات کے کیڑوں کی طرح ان خودساختہ لیڈروں کی بھی بھرمار نظر آتی جو چند رضا کاروں کی جماعتوں کے قائد کہلانے میں بڑا فخر سمجھتے۔ مبالغہ نہ جانیے میں نے مولانا آزاد مرحوم کی قیام گاہ پر ''پارلیمانی وفد''، ''وزارتی مشن'' کے دور میں اڑتی پھرتی کاریں، رنگ برنگ کے جگمگاتے ہوئے موٹر اگر دیکھے تو دوسری طرف ایسے لیڈروں کو بھی جو پاؤں میں گھسی ہوئی چپل اور ہاتھ میں ایک سونٹا، بغل میں ایک ٹوٹا پھوٹا چمڑے کا تھیلا زمین پر گھستے ہوئے دیکھا جن کے پیچھے نہ قوم، نہ جماعت، نہ تاریخ، نہ کردار۔

یہ وقت بڑا ہی خطرناک تھا اور ہندوستان کے مستقبل کی کشتی حالات کے تموّج انگیز دھاروں پر اس طرح بہتی چلی جا رہی تھی جیسے تیز دھاروں پر ایک کمزور تنکے کا سفر۔

کشتی کے اصل مسافر کانگریس اور لیگ معلوم ہوتے؛ لیکن انگریز کی سیاست نے ان ڈانواڈول کشتی میں خوب ہچکولے دینے کے لیے آس پاس کچھ ایسے بے ہنگم ''صدائے برنہ خاست'' قسم کے آدمیوں کو بھی جمع کر لیا تھا جن کو خود معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں، کیوں ہیں اور کیا ہوگا؟ قوم پرور مسلمان ان دنوں خاص زد میں تھے جن کو کانگریس کبھی سینے سے لگاتی اور کبھی دھتکارتی، لیکن ''لیگ'' راہ کے ان ہی گراں بار پتھروں کو ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہی تھی۔ بلا مبالغہ اس وقت ہر قوم پرور

مسلمان کارکن لیگ کا ''قلم قلتوں'' سے بڑھ کر بظاہر گاجر مولی کی طرح ایک قاش نظر آتا جس کو کاٹنے والے کے ظالمانہ ہاتھوں نے اس بے دردی سے کاٹا کہ کاٹنے میں بھی کوئی سلیقہ ملحوظ نہ رہا۔ جمعیۃ، احرار اور اسی طرح کی دوسری جماعت ان دنوں دہلی میں ہر روز جلسے کر کے اپنی زندگی کا ثبوت دیتیں، لیکن لیگ کی پامردیوں کے مقابلہ میں احرار جلدی ہی جھٹکا بن کر رہ گئی اور جمعیۃ قربانی کا بکرا بننے کے لیے میدان میں کھڑی رہی۔

ایک جلسے کی روداد آپ بھی سن لیجے، شب کے کوئی ۹ ربجے ہوں گے کہ جامع مسجد کے سامنے پھیلے ہوئے ایک میدان میں جمعیۃ کا عظیم جلسہ، مجاہدِ ملت سے لے کر شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ تک ہر کارکن موجود، اسٹیج پر وہ نورانی صورتیں جنہیں عظمتیں جھک جھک کر سلام کرتی ہوں؛ لیکن شب کے ۹ ربجے سے لے کر غالباً صبح کے ۳ ربجے تک جلسے کو باقاعدہ قائم رکھنے کی کوششیں لیگ کے بے قاعدہ ''فوج ظفر موج'' کی کارروائیوں میں گرد ہو کر اڑ گئیں۔

ان ہی دنوں مرحوم خاکسار جماعت کے واحد لیڈر علامہ مشرقی دہلی پہنچے، تقریر کا آغاز ہوا تو خطابت کی گولہ باری کا جواب لیگیوں کی چاند ماری سے کچھ اس طرح ملا کہ علامہ اسٹیج سے غائب، بجلی غائب، خاکسار کے چند نیم جاں رضا کار نو دو گیارہ اور اسٹیج پر لیگ کے سورما قابض۔

یہی زمانہ تھا کہ مجاہدِ ملت مرحوم دہلی نہیں؛ بلکہ پورے ہندوستان میں لگی ہوئی آگ کا مقابلہ کر رہے تھے۔ آج لاہور کے اسٹیشن پر، کل جالندھر کی وررودگاہ میں اور پھر علی گڑھ کے اسٹیشن پر اور ایسے ہی دہلی کی سڑکوں پر تمام ہنگاموں کا مقابلہ اور ہر ایک کے سامنے سینہ سپر، دہلی میں سڑکوں پر طوفان کی طرح ان کو چلتا پھرتا دیکھ کر سہم جاتا؛ کیوں کہ ان کے تعاقب میں لیگ کے کارکن اٹھتے ہوئے طوفان کی طرح پیچھے پیچھے چلتے۔ روزانہ یہ افواہیں سننے میں آتیں کہ مجاہدِ ملت کی جان لینے کی پوری تیاریاں ہو چکیں، لیکن عزم وعزیمت کا یہ پیکر، کیا مجال کہ کسی طاقت سے متاثر ہو، یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہو چکا

اور آزادی کی صبح خوں آشام سورج کی کرنوں کے ساتھ ہندی مسلمان کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔اب حفظ الرحمٰن کا مقابلہ مسلمانوں سے ہٹ کر ہندوستان کے ان فرقہ پرستوں سے تھا جو ملک کا ایک ایک گوشہ مسلمانوں کے وجود سے خالی دیکھنا چاہتے تھے، دیکھتے دیکھتے دہلی زندہ لاشوں کا گورستان اور مردہ جسموں کا لاش گھر بن گئی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ''ادارۂ شرقیہ'' میں دن کو اس حالت میں سویا کہ تمام دہلی عروس البلاد نظر آتی تھی، ۳ بجے دن میں اٹھا تو جامع مسجد کے سامنے چند کتوں کی آوازیں اور فوجیوں کے قدموں کی چاپ کے سوا اور کچھ نہ تھا، تمام دلّی سونی ہوگئی اب صرف قاتل کا ظالمانہ ہاتھ تھا اور مقتول کی مظلوم گردنیں۔

اس طرح جب دلّی بجائے گل ولالہ کے خون کی چھینٹیں پھینکنے لگی تو میں ڈرا سہادیو بند پہنچ گیا اور نہ جانے ہزاروں مظلوم اسی طرح ادھر سے ادھر ہو گئے۔یہی زمانہ تھا کہ جب انگاروں اور شعلوں کی لپیٹ، جلتے ہوئے مکانات، اجڑتے گھر، خون کی بہتی ہوئی دھاریں، کشتوں کے پشتوں کے درمیان مولانا حفظ الرحمٰن نے وہ خدمات انجام دیں جن کے بعد وہ صحیح معنوں میں مجاہدِ ملت بنے۔

بس اس دور میں اتنا سنا کہ وہ تلواروں کی چھاؤں کے نیچے مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازے اور پریشان زندگی کو یکجا کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، ان کا یہ مومنانہ کام موت کے آخری لمحے تک جاری رہا۔

میں پورے خونی ہنگامے میں دیو بند مقیم رہا اور دارالعلوم سے فراغت کے بعد اس عظیم درس گاہ کی خدمتِ تدریس میسر آئی، اب مولانا حفظ الرحمٰن مسلمانوں کے واحد غمگسار اور تمام اداروں کے تنہا محافظ تھے اور دارالعلوم سے تو ان کا تعلق خون و گوشت کا تھا، وہ یہاں کے پورے کاروبار پر چھائے ہوئے تھے، ہر تیسرے مہینے وہ دیو بند آتے، ملاقات ہوتی، دہلی جانا ہوتا تو ان کے دفتر کا بھی پھیرا لگتا، جس دفتر میں ان کی آواز کی گونج ہو داخل ہونے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی، ابھی وہ چلا رہے ہیں، چیخ رہے

ہیں، برس رہے ہیں اور پھر ہر ایک کا کام کر رہے ہیں۔ کھانا سامنے ہے، پلیٹ میں ساگ، بھاجی، دو موٹی موٹی روٹیاں، کھانے کے بعد برفی کے چند ٹکڑے، الٹے سیدھے کھانے کو اندر ڈالا، پیہم نوالوں کا تسلسل، شاید شباب ان کے سامنے عمر بھر ہاتھ جوڑتا رہا؛ لیکن صحت کی پوری عمارت تباہ کر کے ہی بے قراریوں نے چین لی، ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لیے ہم بھی اپنی زندگی میں انہیں سے مدد مانگتے اور ہمارا کام نکال کر ایسی مسرت محسوس کرتے کہ گویا خود ان کو کوئی بڑی دولت ہاتھ آ گئی۔

ایک دو واقعات آپ بھی سن لیجیے، چند اساتذہ جو دارالعلوم کے احاطہ میں مقیم تھے، اچانک ان کو مدرسہ سے اپنا قیام ترک کرنے کا حکم ہوا، یہ حکم اساتذہ کے لیے بڑی الجھن کا باعث تھا، گھوم پھر کر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تک پہنچے، صبح کا وقت وہ دفتر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''آؤ جی مولانا'' یہی ان کا ابتدائی جملہ ہوتا، علیک سلیک کے بعد حرفِ مطلب درمیان میں آیا تو خواہ مخواہ ان کا پارہ تیز ہو گیا، یہ ان کی عادت تھی اور ان کے اداشناس سر جھکائے سنتے؛ کیوں کہ یقین ہر ایک کو یہی ہوتا کہ اس گرج دار گھنگھور گھٹاؤں کے بعد ابرِ رحمت کے چھینٹے ہیں۔

''میں کچھ نہیں کر سکتا، میں کیا کر سکتا ہوں، جائیے فلاں صاحب سے کہیے، میں کیا ان کاموں کے لیے رہ گیا ہوں، اسی طرح کے ہنگامے لیے پھرتے ہیں۔''

خدا جانے کیا کیا کہہ گئے؛ لیکن دیوبند آئے تو اسی معاملے کو پہلی نشست میں اس طرح طے کرا کر اٹھے کہ ترجمانی ہماری ہم سے زیادہ اچھی انہوں نے کی، شام کے وقت ایک عصرانہ سے واپس آ رہے تھے، میں سامنے پڑا، کہنے لگے کہ:

''لو! تمہارا کام ہو گیا، بہت ہنگامہ اٹھا رکھا تھا۔''

میں نے موقع پا کر عرض کیا، کون سا بڑا کام تھا جس کو آپ کر کے احسان جتا رہے ہیں، وہ کام...... کر دیجیے تو ہم جانیں، مسکرائے اور بولے کہ ''موقع کے منتظر ہیں، جس

دن ہاتھ آگیا، کندھے پر بٹھا کر لے جائیں گے۔‘‘
خوشی سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا اور اس مہم کو سرانجام دینے کی ہماری مسرت بھی بلاشرکت غیرے انہوں نے لی تھی، وجہ خوشی کی صرف اتنی تھی کہ گذارش اس نالائق کی تھی، جس کی تعمیل وہ اپنی سعادت سمجھتے، وہ اس زمانہ میں پاؤں کے زخم میں مبتلا تھے، چپل پہنے ہوئے، ہاتھوں میں ایک خوب صورت چھڑی جس کے سہارے وہ چل رہے تھے، ان کی کشیدہ قامتی پر یہ نازک چھڑی کیا بہار دے رہی تھی۔

ایک اور واقعہ

ایک قانون تیار ہوا کہ ابتدائی مدرّسین صرف اپنے درجے کی کتابیں پڑھائیں، ظاہر ہے کہ یہ دفعہ ہم مبتدی اساتذہ کے لیے بہت نقصان رساں تھی؛ کیوں کہ تدریسی لائنوں پر ہر طرح کی ترقی میں رکاوٹ، امروہہ میں ان سے ملاقات ہوئی اور مجھ ہی کو تمام اساتذہ کی طرف سے یہ خدمت انجام دینا پڑی، حسبِ عادت سنتے ہی بگڑ اٹھے کہ تم کوئی قانون چلنے بھی دو گے یا نہیں؟ نشیب وفراز سمجھائے، لیکن ان کی حاضر جوابی کے سامنے کس کی چلتی، بیٹھے، برس گئے اور پھر خود ہی خاموش ہو گئے۔ اگلے مہینے شوریٰ کا اجلاس تھا، ایک طویل یادداشت اساتذہ کی طرف سے پیش ہوئی جس میں اس قانون سے پیدا شدہ خرابیوں کا جائزہ لے کر نظر ثانی کی درخواست تھی۔ معمول کے مطابق وہ اس مہم کو بھی سر کر لائے، شام کو جمعیۃ الطلبہ ہال میں ایک استقبالیہ میں شریک ہوئے، میں نے عرض کیا کہ آپ نے میری لکھی تحریر دیکھی ہوگی، کس قدر چست اور جچی تلی تھی؟
’’طولِ بیان‘‘ کے سوا اور اس میں کیا رکھا تھا‘‘ وہ جب یہ کہہ رہے تھے تو شفقت اور ہمت افزائی کے ملے جلے انداز نے ان کا موڈ کچھ ایسا کر دیا تھا کہ آج بھی اس کی یاد سے سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے، میں کبھی کبھی ان سے کہتا کہ موجودہ جگہ نہ کوئی ترقی اور نہ اس کے امکانات، جواب ہمیشہ یہ ہوتا:
’’اچھا فلاں جگہ چلے جاؤ، بارہ سبق روزانہ پڑھانا ہوں گے اور تنخواہیں تین تین

سال تک غائب''۔

اسی طرح شفقت کے ساتھ ہمارے تمام معاملات پر نظر رہتی اور اچھا برا ہر موقع پر سمجھاتے رہتے، کبھی میں کہتا کہ خود تو آپ پارلیمنٹ کے ممبر بنے ہوئے ہیں اور ہم کو ''کرم کتابی'' بنا چھوڑا، یہ کیا انصاف ہے، ہنستے اور کہتے کہ ''آجاؤ سیاسی میدان میں، میری طرح تم بھی آگے آگے ہو گے اور مخالفانہ پوسٹر تمہارے تعاقب میں۔'' اب کہاں یہ شفقت اور کس طرح نصیب ہوگی یہ مخلصانہ ہمدردی۔

میں پچھلی جمادی الاولیٰ میں اچانک بیمار ہوا اور ریاح باسوری کا قلب پر خاص حملہ، بیماری طویل بھی رہی اور شدید بھی، وہ شعبان کے مہینے میں دیو بند آئے، مجھ کو دیکھنے کی بہت کوشش کی؛ لیکن ہجوم کار میں گھر کر دہلی پہنچ گئے، یہاں سے انتخابی دوروں کا پروگرام شروع ہوا تو اخبارات میں دیکھا کہ وہ مرادآباد میں ہیں۔ ایک دن اچانک جلی سرخی کے ساتھ اخبار ''الجمعیۃ'' میں ان کی شدید علالت کی اطلاع شائع ہوئی اور ایک دوروز کے بعد ''بمبئی'' میں ٹاٹا میموریل ہسپتال کے لیے ان کے ارادۂ سفر کی خبر آنے لگیں، دل بے چین ہوا کہ کیا بیماری ہے؟ کہیں موذی کینسر تو نہیں، ورنہ ٹاٹا میموریل میں داخلہ کا کیا سوال، جو مخصوص ہی اس خوف ناک مرض کے لیے ہے۔ غالباً مہینے دو مہینے بعد وہ دہلی آئے اور میں دیو بند سے چل کر ان کی عیادت کے لیے دہلی پہنچا، شام کو وزیر برق وآب پاشی کی کوٹھی کے لان میں وہ سبزہ زار پر بیٹھے تھے اور ساتھ ہی چند کرسیوں پر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، مولانا عرشی رام پوری وغیرہ، ڈوبتے چاند کے اردگرد تاروں کا یہ ہجوم۔

میں بیماری سے ناتواں نہیں؛ بلکہ نیم جاں ہو چکا تھا، انہوں نے جو مجھ کو دیکھا اپنا مرض بھول کر میری کمزوری اور علالت کی طرف لگ گئے، مریض تیاردار بن گیا، بار بار کہتے ''بہت سوکھ گئے؛ لیکن گھبرانا نہیں یہ مرض مہلک نہیں، ہاں پریشان کن ضرور ہے۔'' لکڑی کے سہارے اٹھے اور ایک کونے میں رکھے ہوئے سیب کی کچھ قاشیں لے آئے اور مجھ کو

باصرار دینے لگے ''لو مفرحِ قلب ہے، ذرا کھاؤ۔'' میں نے عذر کیا تو وہ حسب دستور سراپا اصرار بن گئے، مولانا اکبر آبادی نے ''میاں تبرکاً ہی لے لو'' کہہ کر شعر پورا کر دیا۔

آج ان کے چہرے پر غیر معمولی نورانیت تھی، کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت نے رگ رگ سے طاقت وتوانائی سلب کر کے باطنی نور کو ان کے تمام جسم اور خصوصاً چہرے پر بکھیر دیا، مغرب کی اذان ہو گئی انہوں نے گرتے پڑتے نماز پڑھی، میں نے رخصت چاہی تو پھر تسلّی آمیز لہجے میں بولے کہ:

''گھبرانا مت یہ مرض مہلک نہیں، بلکہ اس سے عمر بڑھ جایا کرتی ہے۔''

حفظ الرحمٰن موت کے دروازے پر

ہزاروں میل کا سفر جو ابھی ان کو ملک وملت کی خدمت کے لیے کرنا تھا، موت نے بعجلت جہاز میں سوار کرا کر طے کرا دیا، وہ امریکہ گئے، ایک مکتوب کے ذریعہ وہاں سے بھی ہمدردی اور عیادت کا پرانا فریضہ ادا کر دیا، اچانک دہلی آ گئے۔ غالباً تیسرا دن تھا کہ میں اور برادر محترم مولانا سیّد محمد ازہر شاہ صاحب قیصر اور چند احباب ان کی قیام گاہ پر پہنچے جو بحیثیت ممبر پارلیمنٹ ان کو ملی ہوئی تھی۔ اجازت چاہی تو دیکھا کہ ہندوستان کا یہ عظیم مجاہد بستر مرگ پر تنکے کی طرح پڑا ہوا تھا، جس کی ساری طاقت سلب کرنے کے لیے موت زور زور سے ہچکولے دے رہی تھی۔ اس آہنی جسم کو موت نے یہ دیکھ کر کہ اس قدر قوی وتوانا ہے ہچکولے بھی اتنے دیے کہ اب وہ توانائی کا ڈھیر نظر آتے۔ کچھ دیر موت وحیات کی اس کشمکش میں ان کو مبتلا دیکھ کر دل بھر آیا، انہوں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں، وہی آنکھیں جو ہمیشہ کھلی رہیں، آج بڑی ناتوانی وضعف کے ساتھ کھل رہی تھیں۔

''اچھے ہو؟'' اور پھر بھائی سے مخاطب ہو کر ''تم بھی اچھے ہو، بچے خیریت سے ہیں؟''

انہیں شکستہ جملوں پر یہ ملاقات ختم ہو گئی اور اس ناسوتی زندگی میں ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

***

تازہ قلم

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

شعلہ جوالہ، بلکہ آتش نشاں، حریت کوش، آزادی کی جنگ میں سپہ سالار، ملت کے غم خوار، ملک کے غم گسار، عالم، فاضل انشاء پرداز، مصنف، مؤلف، حضرت علامہ کشمیریؒ کے باختصاص شاگرد، سیاسی بصیرت ممتاز، تقریر میں بے مثال، حاضر جواب، معاملہ فہم، سیاسی گتھیوں کو چٹکی بجاتے حل کرتے، تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو دونوں ہاتھ شیروانی کی اوپر کی جیب میں، اس کے بعد محسوس ہوتا کہ ریکارڈ شدہ تقریروں کا کیسٹ کھول دیا گیا، ہندوستان کے گنے چنے چند بے مثال مقررین میں سے تھے۔ مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند پہنچ کر سند فراغ حاصل کی اور علامہ کشمیریؒ کے مختص تلامذہ میں شمار ہوا، دارالعلوم دیوبند اور بیارم پیٹ جنوبی ہند میں تدریس کا وقت امتیازی حیثیت سے گذارا۔

دارالعلوم میں تحریک شروع ہوئی تو اس کے جانباز سپہ سالار ہو گئے، دار جیل جانے والے اس کاروانِ علم وفن کے ایک رکن تھے جس کی قیادت علامہ کشمیری مرحوم فرمارہے تھے، چند سالہ تدریس کے بعد "گاندھی جی" کی تحریک نمک سازی میں شریک ہو کر ہمیشہ کے لیے ہندوستانی سیاست کالاینفک جز بن گئے، آزاد ہندوستان کے لیے بارہا پر نوبت جیل میں زندگی کا بڑا حصہ گذر گیا۔ ہندوستان آزاد ہوا تو مسلمانوں کی اجڑی ہوئی زندگی کو بنانے سنوارنے میں ایسے جٹے کہ جاں گسل بیاری تک شب وروز کی یہی

کے علمبردار تھے۔ مصروفیت تھی، بلاشبہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ دارالعلوم دیوبند کے مؤثر رکنِ شوریٰ، جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ، آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن، ان کی وفات پر جنوبی ہند کے ایک رکن نے کہا تھا: ''باوجودیکہ ہم مولانا کی زبان نہیں سمجھتے تھے؛ لیکن جب وہ بولتے تو درودیوار کو لرزہ ہوتا۔'' مرحوم دیدہ زیب تھے، سفید بال، سفید بھنویں ذرادبیز، سروقامت، سفید شیروانی، ہلکا چست پائجامہ، سر پر گاندھی کیپ؛ لیکن اس کی دیوار بڑی، سرما میں بالوں کی ٹوپی استعمال کرتے، بعض اوقات خوب برستے اور ضرورت مند کی جان کو آجاتے؛ لیکن ہر ایک کا کام اور ہر ایک کی ضرورت پوری کرتے، ہمارے پورے خاندان کے لیے تو مخلص فداکار تھے، ہر غمی وخوشی میں شریک، ہماری ترقیات سے خوش، بری بات پر خوب ڈانٹ پلاتے، غالباً ایک بار برادرِ اکبر جناب ازہر شاہ قیصر نے میری کچھ شکایت خط میں لکھ دیں، مولانا نے ایک خط مجھے تہدید آمیز اور دوسرا مرحوم بھائی کو افہام وتفہیم کے لیے لکھا؛ لیکن مولوی انیس صاحب دہلوی جو مرحوم کی مراسلت کے ذمہ دار تھے ان کی غلطی سے میرا خط بھائی کو اور بھائی کا مجھے مل گیا، میں دہلی پہنچا تو دیکھتے ہی فرمایا کہ ''خط بدل گئے، حالاں کہ میں نے انیس کو بار بار کہا تھا کہ دیکھ کر خط رکھنا۔''

راقم نے دیوبند سے ''نقش'' نامی مجلہ نکالا، اس میں ایک نوٹ جمعیۃ العلماء کی پالیسی کے خلاف آگیا جو سراسر بچپن کی نادانی تھی، اس پر بڑا تندوتیز مکتوب موصول ہوا جو آپ کے مطالعہ میں آئے گا، مندرجات کا یہ تضاد خصوصی توجہ طلب کرتا ہے کہ ایک طرف ''طفلِ مکتب'' دوسری جانب ''ہر فن مولا''۔ بہرحال ثورانِ غضب اور شفقت مفرط کا یہ آمیزہ میری سعادتوں کی دلیل ہے۔

دوسرا گرامی نامہ والدۂ مرحومہ کے لیے ہے جس میں میری شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جواب میں معذرت ہے۔

احقر ان کی وفات کے بعد کئی مضمون ان پر لکھ چکا ہے، ان سے متعلق باتوں کا

ڈھیر ہے، لیکن نہ اب فرصتِ نگارش، نہ قلم درماندہ کو جرأتِ بیان، آخر کار کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر عالم باقی کو روانہ ہوئے اور اپنے پیچھے ملت کو ہمیشہ کے لیے بے سہارا چھوڑ گئے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے انہیں عشق تھا، اس لیے ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''۔ قبرستانِ ولی اللہ'' میں ذرا پیچھے دفن ہو کر شاہ صاحب سے بزبانِ حال شاید کہتے ہوں

کشتۂ کہ عشق داردنہ گذاردت بدینساں
بہ جنازہ گرنہ آئی بمزار خواہی آمد

* * *

۸ر ستمبر ۵۳ء

مخدومہ ومقدسہ مدظلہا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور اس تقریب کو اپنی رضا و سعادت بخشے۔

میری طرف سے سب عزیزوں کو مبارکباد دیجیے، میں خود ضرور حاضر ہوتا، مگر وقت اتنا تنگ ہے کہ نہ پہنچ سکوں گا؛ تاہم میری خوشیاں اپنے عزیز بھائی کے ساتھ ہیں، اللہ زوجین میں تعلقات کی استواری، خلوص ومحبت اور جذباتِ خیر عطا فرمائیں اور اس تعلق کو سب کے لیے بہتری کا ذریعہ بنائیں۔ والسلام

بقلم خادم (مولانا) محمد حفظ الرحمٰن

سیوہارہ

عزیزم انظر سلمہٗ

سلام مسنون

نقش کا پہلا نقش نظر سے گذرا، ''جائزے'' کے عنوان میں جمعیۃ علماء کے متعلق جو ارشاد ہے مبارک ہو۔ جمعیۃ علماء کی مصلحت پرستی، بے ایمانی بہرحال تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے؛ اس لیے کہ تمہارے باپ اور وقت کے عظیم محدث نے بھی ساری عمر جمعیۃ علماء ہی کو اپنایا، اب اگر سیاست میں تم جیسا طفلِ مکتب اپنے اکابر پر چھینٹے نہ اڑائے گا تو آخر یہ حق کس کو ملے گا۔

میں خوب جانتا ہوں کہ یہ تمہارا قلم نہیں ہے؛ بلکہ کسی جمعیۃ علماء دشمن کی دریوزہ گری کا نتیجہ ہے؛ اس لیے تم کو شاید احساس بھی نہ ہوا ہو کہ ان عبارتوں کا کیا مطلب ہے۔

مجھے ضرورت نہیں ہے کہ ان عناد پرور جملوں کا جواب دے کر تم کو سیاست کی ابجد سمجھاؤں اور حق و باطل کا فرق بتلاؤں؛ اس لیے کہ تم کو کسی سے سیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خود ہی ہر فن مولا ہو۔

بہرحال اگر آپ کی یہی روش ہے تو افسوس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔

دعاگو

محمد حفظ الرحمٰن

۲۱؍جولائی ۵۹ء

***

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک انسان اپنے ملکی اثرات، قومی خصوصیتوں، نسلی اور قبائلی امتیازات اور خاندانی روایات سے جدا نہیں ہوسکتا، اگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں تو پھر مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے اس جوش اور ولولۂ جہاد کا؛ بلکہ حریت پسند جذبات کا کس طرح انکار ممکن ہے جو مرحوم کو اپنے خانوادے سے وراثتاً ملے تھے، آپ ہی کے جدامجد مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانوی لدھیانہ سے پہلے شخص تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی استخلاصِ وطن کی تحریک میں براہِ راست مجاہدانہ شرکت کی تھی؛ گویا کہ مولانا اس لگی ہوئی آگ کے دور کے تماشائی نہیں تھے، بلکہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ درّانہ اس میں کود بھی پڑے تھے، شہادت کسی اور کی نہیں؛ بلکہ اس ہنگامہ خیز دور کے اس مصنف کی ہے، جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر قریب ترین کا مشاہد بنا ہوا تھا، استخلاصِ وطن کا مشہور ڈائری نویس عبداللطیف ــــــ اپنے روزنامچے میں رقم طراز ہے:

''ہم ہمیں دو دیس از یمہ دوز مردان تونک با مولوی عبدالقادر متوطن لدھیانہ آمادۂ ستیزہ شدند۔ ص: ۷۷''

یعنی ۲۷ رجون کو مولانا عبدالقادر صاحب کی زیرسرکردگی ٹونک کی ایک تازہ دم ٹکڑی فرنگیوں سے متصادم ہوگئی۔

مترجم جناب خلیق احمد صاحب نظامی کا یہ اضافہ بھی قابل غور ہے:

''مولانا عبدالقادر صاحب نے لدھیانہ سے دہلی آکر مسجد فتح پوری میں قیام کرلیا تھا۔'' (ص:۱۹۷)

مصنف ومترجم دونوں کی یہ وضاحت مولانا عبدالقادر صاحب کی شرکتِ جہاد کو ہر شک وشبہ سے بالاتر قرار دے رہی ہے، معلوم یہی ہوتا ہے مولانا موصوف نے صرف رسماً ہی شرکت نہیں کی تھی؛ بلکہ اس رستہ خیزی دور میں دہلی ہی فروکش ہو گئے تھے، اس ہنگامے کے بظاہر فرد ہونے کے بعد مولانا ہی کی ذات گرامی تھی کہ آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ لے کر ان کی عام اشاعت کا سروسامان بہم پہنچایا، اور یہیں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ شعلہ بدامن ہونے کے ساتھ شعلہ زن بھی تھے اور جو آتش فشاں ابھی تک ان کے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا، پھوٹ کر وہ ہی آتش سیال ملک میں ہر طرف تموّج پذیر؛ بہر حال ایک ایسے ماحول میں نشوونما پانے والے طفل نوخیز سے کیسے ممکن تھا کہ حریت پسندی کے اس سودا سے اس کا سر سایا نہ ہو جو اس کے خانوادے کی وراثت تھی، پھر اس بات کو بھی نظر انداز نہ کیجیے کہ جس عہد میں مولانا لدھیانوی کا عہدِ طفلی تا شباب گذر رہا تھا وہ ہی اس بدقسمت ملک کا وہ ہنگامی دور ہے جس میں آزادی کی آگ ملک کے اندرونی حصوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی اور اسے بھی ملحوظ رکھیے کہ مولانا اس سرزمین پنجاب کے ایک فرد تھے جہاں کے باشندے پُر جوش طبیعتوں کے اعتبار سے پورے ہندوستان کے نمکھن کہے جانے کے مستحق ہیں۔

طالب علمی

چناں چہ وہ جس زمانہ میں دارالعلوم میں طالب علمی کا دور گزار رہے تھے، حضرت مولانا زکریا صاحب سہارنپوری جن کا تعلق مظاہر العلوم سہارنپور سے تھا مصلحتِ وقت کہیے یا جذبات کا ٹھٹھر جانا، اس علمی ودینی درس گاہ کو حریت پسندی کی پرچھائیوں سے

بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی، پھر بھلا کیسے ممکن تھا کہ مولانا سہارنپوری اس نمناک ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود آزاد فضاؤں میں گرم سیر ہوتے، ادھر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی میں معاصرت، طبیعت کی تیزی اور ولولوں کا عہد شباب، مولانا زکریا صاحب ہی کا بیان ہے کہ میں جب کبھی دیوبند آتا اور مولانا لدھیانوی سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ اپنے ایک مخصوص طنزیہ جملے کا نشانہ بناتے، طنز اسی جمود و تعطل پر تھا جس سے مظاہر العلوم اور اس کے فرزند گزر رہے تھے یا گذارے جا رہے تھے۔

اس خاکسار کے قلم میں اب وہ تاب اور حوصلہ نہیں کہ اس طنز کو نقل ہی کر دے، کچھ بھی ہو اتنی بات تو واضح ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن اس دور میں اپنے اندر دعوتی رنگ پیدا کر چکے تھے اور ان کی ہنگامہ ریز طبیعت کسی مصلحتی فقدان عمل سے ساز کرنے کے لئے تیار نہ تھی، پھر دار العلوم کا ماحول اس پر مستزاد۔ اس کارخانۂ علم و عمل کے بانی ہی نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انہیں بکھرے ہوئے منتشر جذباتِ حریت کو دار العلوم کی شکل دے دی، جن جذبات نے لاکھوں ہندوستانیوں کے لیے سر و تن کی قربانی اور گھر و بار کی ویرانی آسان تر کر دی تھی، سننے کے قابل ہے یہ ایک تاریخی لطیفہ بھی ہے کہ خود دار العلوم پر بھی ایک ایسا وقت آیا کہ جو مصلحت اندیش طبقہ اس دانش گاہ کو جنگِ آزادی سے دور رکھنے کے لیے پر تول رہا تھا، ٹھیک انہی اوقات میں جب حضرت شیخ الہندؒ حریت پسندی کے طوفان اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ سوچا یہی گیا کہ حضرت مرحوم کو بھی وقتی مصلحت کے اس گُر سے واقف کر کے ان کی مساعی کو بھی محدود تر بنا لیا جائے، اس منصوبے کی تکمیل کے لئے المغفور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ آپ کی تحریک کے شدید ردِ عمل سے دار العلوم کو بھی نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے اور بات غلط بھی نہیں تھی؛ بلکہ برطانیہ کے دار العوام میں خاص دار العلوم پر بھی سوال و جواب ہو چکا تھا اور فرنگی سیاست کے بڑے بڑے جغادری ہندوستان میں دار العلوم کی ان تیز گامیوں پر مطلع تھے جو اس

ادارے کے سربراہ کی قیادت میں مسلسل جاری تھیں، القصہ مولانا گیلانیؒ کا بیان ہے کہ تحریک سے عارضی دست برداری کے اس پیغام لطیف پر حضرت شیخ الہندؒ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ان سے جا کر کہہ دو کہ حضرت بانی قدس سرہٗ (مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کے ان عزائم پر میں سب سے زیادہ مطلع ہوں جو اس دانش گاہ کے قائم کرنے سے متعلق ہیں اور یہ بھی کہو کہ دارالعلوم درحقیقت ایک فوجی چھاؤنی ہے جس پر بانی قدس سرہٗ نے علم ودانش کا پردہ ڈال دیا۔ والقصۃ بطولہا۔

حاصل اس جملہ معترضہ کا یہ ہے کہ اس فوجی معسکر میں حبیب جیسا بانکا مجاہد طالب علمانہ داخلہ لینے کے بعد ایک جاں سپار وفدائے حریت مجاہد بن کر نہ نکلتا تو اور کیا بنتا، جس درس گاہ کے چھوٹے اور بڑے حریت پسندی کی آگ کو نگل رہے تھے، اگر ان کے نہاں خانے سے یہی آگ انگارے بن کر نہ نکلتی تو پھر کیا سردیانی کے ذخیرے یا ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے سامنے آتے، کوئی الجھا ہوا سوال نہیں ہے صاف اور بے غبار حقیقت کو آخر کس لیے فلسفیانہ موشگافیوں کے نذر کر دیا جائے۔

بہر حال یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ مولانا کی سہ آتشہ شخصیت میں ان کی خاندانی روایات، دارالعلوم دیوبند کے حریت پسند محرکات اور سرزمینِ پنجاب کی شعلہ نوائی کو خاص دخل تھا، پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خود کاتبِ حروف کا عہد طفلی تھا اور مرحوم ایک ایسی عمارت تھے جو شباب کے دور سے گزر کر بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی، اس لیے ان کے سیاسی کارناموں و دینی خدمات کا احصاء نہ کر سکتا ہوں اور نہ کرنا چاہتا ہوں، البتہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالباً چالیس سال وہ ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک آندھی کی طرح گرم رفتار رہے، ہندوستان کی کون سی ایسی حریت پسند جماعت ہے جس سے مولانا کا قریبی تعلق نہ رہا ہو، کانگریس، جمعیۃ علماء، خلافت کمیٹی اور آخر میں ان کا اوڑھنا بچھونا جماعتِ احرار تھی، جس کے وہ رئیس الاحرار تھے، بارہا ان کی تقریروں میں سنا گیا کہ اس مؤخر الذکر پارٹی کے پچاس ہزار رضاکار تھے، جن کی قیادت وہ انجام دیتے،

اس جماعت کا دائرۂ کار پنجاب خصوصی طور پر اور یو پی میں سہارنپور، میرٹھ، مراد آباد، بجنور، دہلی اور کشمیر تک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ پنجاب بشمول ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو وہ اپنے ناخن تدبیر سے کھولتے اور ہر تحریک میں ان کی قائدانہ شرکت ہوتی، بالآخر آزادی کا جو خواب وہ خاندانی طور پر دیکھ رہے تھے ۱۹۴۷ء میں اس کی بھیانک تعبیر سامنے آئی۔ مہیب ومدہش؛ اس لیے کہ وہی لدھیانہ جوان کی جائے پیدائش تھی اور جہاں کے ذرّے ذرّے میں وہ آزادی کے نقیب کی حیثیت سے روح پھونک چکے تھے آزادی نے اسی لدھیانہ کو ایک اجڑا ہوا دیار اور ان کی آنکھوں کے سامنے شہر خموشاں بنا دیا، سوچتا ہوں کہ ان کا سوانح نگار اس دلدوز سانحہ کی تعبیر کن الفاظ وانداز سے کرے گا کہ اسی لدھیانہ میں ان کا گھر اجڑا، ان پر حملہ ہوا، اور وہ معاشی ابتریوں کا شکار ہوئے، اپنوں نے آنکھیں چرائیں، غیروں نے آنکھیں دکھائیں، ایک کیمپ میں وہ مقیم رہے اور ایک مہاجر قافلے میں بعنوانِ ہجرت اس پاکستان میں ان کو پناہ ملی جس کے تخیل کی پاتال پر ربع صدی انہوں نے تیشہ زنی کی تھی، ہندوستانی سیاست اگر ہچکولے لے رہی تھی تو ان زلزلوں کا شکار کم از کم حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ دوبارہ ہندوستان آئے؛ لیکن یہاں زمین وآسمان بدل چکا تھا، اپنی جلیل خدمات کا کوئی گراں قیمت معاوضہ تو درکنار اس ساری فدائیت کا کوئی معترف بھی نہیں ملتا تھا، غالباً ان کا سکونِ دل ہلا، ان کے دماغ نے جواب دیا، ان کے عزائم ٹھٹھر گئے، ان کے ولولوں نے یہ کہہ کر کفن کی چادر ہمیشہ کے لئے تان لی ؎

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

مکرر عرض کرتا ہوں کہ سیاسی زندگی کے نشیب وفراز اور اس راہ کے پیچ وخم میں ان کی الھڑ جوانی اور بے باک کارناموں کے لیے خود ان کے فلذالکبد مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کی تالیف ''رئیس الاحرار'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

فتنۂ قادیانیت اوراس کی سرکوبی

یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ ازہرالہند دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ علمی ودینی سیاسی وسماجی متنوع خدمات کے کسی شعبے میں پیچھے نہیں رہے۔اس عظیم درس گاہ کی تربیت زندگی کوایک ایسے رخ پر ڈالنے کی ضامن ہے جہاں کا فاضل کبھی محدث، گاہے مفسر، داعی، امیر کارواں، مبلغ دیں اور ہمہ جہت کوششوں کا امین ہوتا ہے،اسے مسیلمہ کذاب کے مقابل میں فریضۂ حق ادا کرتے ہوئے شمشیر بہ دست بھی دیکھا جاسکتا ہے اور خانقاہوں کے گوشوں میں ہوحق کے نعروں میں مصروف بھی، وہ تبلیغ دین کے لیے کمر بستہ بھی نظر آئے گا اوراس کا فیضانِ علم چہارسو مواج بھی دکھائی دے گا۔

ان روایاتِ پارینہ کی امین ومحافظ رئیس الاحرار کی ذات بھی تھی، ادھران کا شباب تھا اور دوسری جانب فتنۂ قادیانیت کا عروج، ان کی خصوصی جماعت نے دین کے سب سے بڑے مہلک فتنے کومحسوس کیا اوراحرار کی تمام توانائیاں دین محمدی کے خلاف اس کھلی بغاوت کو کچلنے کی خاطر جمع کردی گئیں، پنجاب کے ایک ایک گوشے میں فضلائے دارالعلوم کی طرف سے ختمِ نبوت کے راگ اس پُرسوزلب ولہجہ میں الاپے گئے کہ اب ۱۹۷۴ء میں ان کی بازگشت پاکستانی پارلیمنٹ میں سنی گئی، انہوں نے قادیانی کی زمین پر نعرۂ حق بلند کیا اور کشمیر کے کوہساروں کی چوٹیوں تک اسے پہنچادیا۔

چھوٹا منہ اور بڑی بات مجھے یقین ہے کہ مولانا کی یہ جلیل خدمات ان کے لیے زادِ آخرت ثابت ہوں گی اور انصاف پیشہ مؤرخ کا قلم مستقبل قریب میں جب ان ذرّوں سے قادیانیت کے خلاف جدوجہد کا آفتاب بنائے گا تو اس کی شعاعوں میں حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے وجود کونظرانداز نہیں کرسکتا، مقدمہ بھاولپور جس میں ان کے استاذ ودینی قائد علامہ امام العصر حضرت مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری طاب اللہ ثراہ نے سب سے پہلے امتِ مرحومہ کے سامنے قادیانی فرقے کوامت سے علیحدہ کرنے کی راہ دکھائی۔مولانا حبیب الرحمٰن اوران کے خاندان کی شرکت اس مقدمے میں ایک

حقیقت ہے، علامہ مشرقی سے دو دو ہاتھ، سر سکندر حیات خاں سے نبرد آزمائی، خضر حیات سے جنگ وجدال، مسجد شہید گنج کے لیے تڑپ؛ مولانا کی خدمات کے وہ جلی عنوانات ہیں جن میں ان کے کارناموں کو تلاش کیا جا سکتا ہے اور یہ تو کل کی بات ہے کہ ہندوستان میں اس جماعت کی بے راہ روی پر اکابر علماء کو مرکز واحد پر جمع کرنے کی پوری ذمہ داری مولانا حبیب کے دوشِ ناتواں پر تھی، پاکستان میں کچھ پہلے اور ہندوستان میں ۱۹۷۴ء میں اس جماعت کی طویل قلابازیوں کے بعد اس کے چہرے سے وہ نقاب کشائی خود جماعت کے امیر نے کی اور تاریخ کے اس ہائلہ کو دلی ہی کی زمین پر دہرایا گیا اور اسی شکل وصورت میں جس میں عنایت اللہ مشرقی نے اپنے فکر کے پورے سرمائے کو جمنا کی موجوں کے نذر کیا تھا۔ اسی سے بالکل قریب اسی دہلی کی شاہجہانی مسجد کے زیر سایہ اس جماعت نے بھی اپنے تخیل کو ہوا سے بھرے ہوئے غبارے کی طرح فضا میں اڑا دیا اور اس طرح مولانا حبیب الرحمٰن کی اس دانش مندی کو تسلیم کر لیا اور ان کی عاقبت بینی کی تصدیق کر دی جو انہوں نے ۲۵ رسال پہلے اس جماعت کے ڈھانچے کا جائزہ لینے کے بعد قائم کی تھی۔

مولانا مرحوم ایک وقاد طبع ہونے کے باوجود طالب علمی ہی میں سیاسی جھمیلوں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے کہ طالب علمی کی واقعی مراعات وہ قائم نہ رکھ سکے؛ مگر اس کے باوجود وہ فطری طور پر علمی ذوق کے آدمی تھے، صبح کو ان کے یہاں حضار مجلس کے سامنے ایک تفسیری نشست ہوتی جس میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پڑھے جاتے اور مولانا تفسیری نکات اہتمام سے بیان فرماتے۔ حضرت شاہ عبد القادر الدہلوی کے ترجمے سے انہیں عشق تھا اور اس پاکیزہ الہامی ترجمے کے مسلسل مطالعے سے اس کی گہرائی وگیرائی پر تام واقفیت رکھتے، عام مجلسوں میں بھی آیاتِ قرآنی اور حضرت شاہ صاحب کے افادات کو جاذب انداز میں پیش فرماتے، اپنے استاذ حضرت علامہ کشمیریؒ کے ارشادات پر بھی عبور تھا اور جا بجا ان کا افادہ فرماتے، سیاسی بکھیڑوں کے باوجود دعوتی رنگ بھی ان پر

غالب تھا اور غیر مسلم حلقے کو اسلام کی خوبی وزیبائی پر مطلع کرنے کی تڑپ سے خالی نہیں تھے۔

آزاد ہندوستان میں جب فرقہ پرستی ذہنیتوں کی اتھل پتھل کر رہی تھی اور مسجد کے بلند وبالا میناروں سے اذان کی آواز بھی فرقہ پرستوں کو ناگوار گذرتی تھی تو مرحوم مولانا نے ان ناگوار جذبات کو ایک عجیب انداز میں ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا، اذان کا ہندی ترجمہ شائع کیا اور غالباً اس کے ساتھ مختصر تشریح بھی، خاص اشاعت غیر مسلم حلقے میں کی گئی اور بتایا گیا کہ خدا کی عبادت کے لیے یہ دعوت خود اپنی تعبیر میں کتنی شیریں اور کتنی لطیف ہے۔ مولانا کی یہ کوشش بروئے کار آئی اور اذان کی آوازوں سے بدکنے والا طبقہ ان حلاوت آمیز کلمات کا مٹھاس خود محسوس کرنے لگا۔

غیر مسلم دوست احباب کا وسیع ترین حلقہ جو مولانا نے اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بنایا تھا اسے اسلام کی خوبیوں پر مطلع کرتے اور اس طرح بلا وجہ بدگمانی کی بنا پر اس تلخی اور بُعد کو دور فرماتے جو مختلف مذاہب نے دیدہ ودانستہ اسلام کے خلاف پیدا کر دی ہے۔

خطابت

عجیب بات ہے کہ جس طرح بعض ملکوں اور علاقوں کی خصوصیات وہاں کے باشندوں سے اس طرح مربوط ہو کر رہ گئیں کہ ان روایات سے منفک کر کے وہاں کے باشندوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح بعض اداروں وعلمی درس گاہوں کا حال ہے کہ ان کے زیر دامن تربیت پانے والے بعض اپنی انفرادی خصوصیات رکھتے ہیں، جماعتی زندگی میں بھی ان کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں، غرضیکہ احرار پارٹی پنجاب جس کا مسقط الراس ہے، اس پارٹی میں جمع ہونے والے اور خصوصاً سطح کے افراد، غالباً کوئی ان میں بدقسمت ہوگا جو خطابت کے جوہر سے خالی ہو، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سحر آفریں خطابت، مظہر علی اظہر کی وکیلانہ بحث، صاحبزادہ سیّد فیض الحسن، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور چھوٹے بڑے تقریباً تمام ہی احراری ایک جوش وخطابت کا کامل ومکمل نمونہ

تھے، ہر ایک کا رنگ جدا اور طرز نرالا تھا۔

غالباً یہ ۴۶-۱۹۴۷ء کا زمانہ ہے، جب ہندوستان کی سیاسی زندگی بڑی تیزی سے کروٹیں بدل رہی تھی، وزارتی کمیشن اور اس سے پہلے ایک کمیشن اور پھر لارڈ ویول کی شملہ کانفرنس، سیاست کے منظرِ عام پر ایک منظر کے بعد دوسرا منظر سامنے آ رہا تھا، یہی وہ وقت تھا جب مسلم لیگ اپنے اس دعویٰ کو کہ وہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے، واقعات وشواہد سے مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہوئی تھی اور جیسا کہ سیاسی چکمہ بازیوں کا عام حال ہے خاص اس جز میں بھی یہ جماعت اپنے سیاسی ہتھیار قوت وسرعت سے استعمال کرتی۔ قوم پرور جماعتیں اور قوم پرور مسلمان زد پر تھے، جگہ جگہ اکابرِ سیاست کو پامال کیا جا رہا تھا، غالباً شملہ کانفرنس کی واپسی پر مولانا ابوالکلام آزاد دھر لیے گئے اور جو طوفانِ بدتمیزی ریلوے پلیٹ فارم پر برپا کیا گیا اس سے سیاست کا سارا پانی ہی گدلا ہو گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے تمام ارکانِ جماعت ہندوستان کے طول وعرض میں ان چیرہ دستیوں کا شکار تھے۔

یہی وہ وقت تھا کہ راقم دہلی میں طالب علم تھا، اپنی آنکھوں ہی نے یہ منظر دیکھا کہ بلی ماران کے ایک جلسہ میں جسے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم خطاب کرنے والے تھے، دہلی صوبائی مسلم لیگ کے سربراہ شیخ عبدالسلام مرحوم نے اپنی فوج ظفر موج کی قیادت کرتے ہوئے جلسے میں جو ہلڑ بازی کی وہ اب بھی یاد ہے، غرضیکہ لیگ کی اس سیاست نے ہندوستان کے وسیع ترین علاقے کو قوم پرور جماعتوں کے لیے مقتل بنا ڈالا، اس وقت دہلی میں ایک خاص جلسہ اس مقصد کے لیے ہونے والا تھا کہ قوم پرور مسلمانوں کا نقطۂ نظر بھی فرنگی سیاست کے کشتی بانوں کے سامنے آئے، یہ جلسہ اپنے مقصد کے اعتبار سے وقیع تھا اور مسلم لیگ اسے اپنے لیے ایک بڑا چیلنج تصور کرتی تھی، خوب یاد ہے کہ دہلی میں غالباً اس جلسے کے لیے کئی بار اہتمام کیا گیا، اکابر جمعیۃ میں سے کوئی مشہور اور غیر معروف ایسا نہیں تھا جو اس وقت دہلی میں موجود نہ ہو، مگر نیشنل گارڈ کے

جواں مردوں نے بار بار کوشش کے باوجود جلسے کا انعقاد ناممکن بنادیا، پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا، لیکن ایک روز جامع مسجد کے سامنے اردو پارک میں ایک عظیم ترین اجتماع کا اعلان جس میں جمعیۃ علماء کے ساتھ احرار پارٹی کے بھی گرتا دھرتا شریک ہوئے۔ رات کو ایک طرف اسٹیج پر جواہر لال نہرو، سردار پٹیل؛ بلکہ کانگریس کے چوٹی کے لیڈر اور دوسری جانب قوم پرور حلقہ کا لب لباب، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سحر انگیز خطابت کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ تمام رات مخالفین کو نہ صرف اپنی بات سنائی، بلکہ شاہ صاحب نے سننے والوں ہی سے پاکستان کی مخالفت میں ہاتھ اٹھوادیے تھے۔

بہر حال عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قوم پرور مسلمانوں کو اپنے خاص نقطۂ نظر کو عوام میں پہنچانے کے لیے کبھی کبھی احرار پارٹی کی بھی ضرورت پیش آتی، پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ احرار میں ہر شخص مقرر تھا اور سب کے خطابت کے رنگ جدا جدا تھے، البتہ بعض اربابِ خطابت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ساحرانہ انداز کی کامیاب یا ناکام نقل کی کوشش کرتے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی تقریر اور خطابت بھی ایک امتیازی وصف لیے ہوئے ہوتی تھی، وہ بالعموم کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے اور ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ لیتے اور ان کے خطابت کی غزل شروع ہوتی، غزل کی طرح ہر مصرعہ جدا ہوتا، لب و لہجے کی شوکت، بھاری بھرکم انداز، جس بات کو کہتے وسیع انداز میں، جس مصرعہ کو اٹھاتے قیامت بنادیتے، ایک مصرعہ سنانے کے بعد اپنے داہنے ہاتھ سے ڈاڑھی کو موڑتے اور ہونٹوں میں دبالیتے، وہ دورانِ خطابت اس کا بھی اندازہ لگا لیتے کہ مجمع ان کی منثور غزل سے کس حد تک متاثر ہورہا ہے، ٹھیک ان اوقات میں چشمے کے نیلگوں گلاس کے عقب سے وہ اپنی عقابی نظروں کو اذہان کے تجسس میں روانہ کرتے اور احتساب کے بعد مصرع ثانی اٹھاتے، تقریر پنجابی آمیز اردو میں ہوتی، وہ بین الاقوامی سیاست پر تبصرہ کرنے کے بعد اچانک مجمع سے کہتے ''میں دریافت کرنا چاہتا ہوں''، کبھی کبھی اپنی پارٹی کی عظیم اکثریت کا بیان کرتے تو لہجے کی پوری قوت و استحکام سے

فرماتے ”میرے پاس نصف لاکھ تعداد میں رضا کار ہیں یہ ہندوستان کی تمام قوم پرور پارٹیوں میں ایک منفرد خصوصیت ہے۔“ فرنگی سیاست کے تارو پود کو بکھیرتے، ملکی سیاست پر تبصرہ ہوتا، اور بین الاقوامی سیاسی مدو جزر کی نشاندہی کرتے، تقریر کا اختتام بھی بہت البیلا تھا، وہ عام مقررین کی طرح خاتمے پر دھیرے دھیرے پہنچنے کے عادی نہیں تھے؛ بلکہ اچانک کسی جملہ کو پہلے سے زیادہ پُرشکوہ انداز میں کہتے اور دفعتاً کرسی سے اٹھ جاتے۔

دارالعلوم دیوبند میں وہ آخر زندگی میں آئے، یہ سفر ان کی زندگی کا آخری سفر تھا، شام کو بعد عصر مسجد کے وسطی دروازے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر طلبہ کو خطاب فرمایا، جس میں تمام اکابر دارالعلوم، حضرت مولانا قاری محمد طیب اور ان کے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ تھے۔ راقم اس وقت مسجد کے اندرونی حصے میں ان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، ان کی گردن کی عقبی حصہ میں کھڑی ہوئی ہڈی ان کی موت کا اعلان کررہی تھی، وہ حسبِ دستور تقریر سے بے تابی کے ساتھ اٹھے تو زبانِ حال یہ کہہ رہی تھی ؎

باتیں ہماری یادرہیں باتیں پھر ایسی نہ سنیئے گا
کہتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

حاضر جوابی

مرحوم بلا کے حاضر جواب تھے اور کسی وقت ان کو خاموش کرنا ممکن نہیں تھا، مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے کہ ایک بار غالباً لکھنؤ یا مرادآباد میں کوئی کانفرنس ہورہی تھی، جس میں دیوبند سے بھی شرکاء کی ایک جماعت عازم سفر ہوئی، سہارنپور اسٹیشن پر شام کو گاڑی سے سفر تھا، اچانک پنجاب سے آنے والی گاڑی میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اور ان کے رفیق سفر ایک ڈبے سے نمودار ہوئے اور اسی گاڑی سے روانہ ہوگئے جس میں دیوبند کے عام شرکاء بھی تھے، لکسر کے اسٹیشن پر گاڑی میں کافی تاخیر ہوتی ہے اور عموماً مسافر شب کا کھانا یہیں کھالیتے ہیں، دیوبندی شرکاء نے دسترخوان بچھادیا اور ہر ایک نے اپنے زادِ راہ کو کھول

کر دسترخوان پر چن دیا، مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم لدھیانوی کی تلاش میں نکلے کہ انہیں بھی کھانے میں شریک کیا جائے، دیکھا وہ اسٹیشن کے ایک گوشے میں اپنے رفیق کے ساتھ کھانے میں مصروف ہیں، مولانا سلطان الحق صاحب اپنی تمام نیازمندیوں کے باوجود کہنے میں جری اور سننے میں وسیع الحوصلہ تھے، وہ اس منظر کو دیکھ کر بے قابو ہو گئے اور بولے کہ "مولانا! آپ میں اور مولانا مدنی میں بس یہی تو کمی ہے، اگر مولانا مدنی ہوتے تو جماعت کے بغیر کبھی لقمہ نہ توڑتے۔"

مولانا سلطان صاحب سمجھتے تھے کہ یہ ایک تیر ہے جو بالیقین نشانے پر بیٹھے گا، لیکن مرحوم رئیس الاحرار نے ایک پُرزور قہقہہ لگایا اور فرمایا کہ "غلط کہتے ہو، مجھ میں اور مولانا مدنی میں اگر صرف اتنا ہی فرق ہوتا تو اس کمی کو کبھی کا پورا کر چکا ہوتا۔" اس حاضر جوابی کے ساتھ طبیعت میں بڑی بے تکلفی اور وارستگی تھی، جس میں پنجابی روایات کو بھی خاص دخل تھا، ان کا قلب اپنے اساتذہ کی عظمت اور اہل اللہ کے احترام سے لبریز تھا، مگر یہ احساسِ عظمت مصنوعی تکلف کی شکل کبھی اختیار نہ کرتا۔

ایک بار دیوبند میں دیکھا کہ وہ دفتر اہتمام میں گاؤ تکیہ پر اپنے خاص انداز میں لیٹے ہوئے تھے، ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی، دونوں ہاتھ گردن کے نیچے اور ان کے خطابت کا آبشار بلندیوں سے نیچے گر رہا تھا اور سامعین میں حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ خود ان کے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مرحوم بھی تھے، رائے پور کی خانقاہ میں بعد مغرب انہیں اس حال میں بھی پایا کہ ان کے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری ایک چارپائی پر تشریف فرما تھے اور مقابل کی دوسری چارپائی پر مرحوم رئیس الاحرار اپنے مخصوص بے تکلفی کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے؛ لیکن اس کے باوجود جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ان کا دل و دماغ نہ صرف احساسِ عظمت کا آشیانہ؛ بلکہ اپنے اساتذہ اور اکابر دین کے ساتھ وارفتگی اور عقیدت کا دلکش مرقع تھا۔ وہ اساتذہ کی اولاد، بلکہ ان کے متعلقین سے بھی

وضع داری کا معاملہ کرتے۔ دہلی میں ایک بار ان کے ایک صاحبزادے نے ہندوستان کے ایک باعظمت صاحبزادے کی شان میں کوئی ناروا بات کہہ دی، وہ تیزی کے ساتھ اٹھے اور اپنے پاؤں کا جوتا اٹھا کر بے تکلف اپنے اس بچہ پر پل گئے، یہ تعبیر صورت واقعہ کی حقیقی ترجمانی کے لیے اختیار کی گئی ہے، کہتے جاتے تھے کہ "وہ صاحبزادہ تجھ سے ہزار درجہ بہتر اور اس کا باپ تیرے باپ سے لاکھوں مراحل آگے ہے، پھر تجھے کیا حق ہے کہ اس صاحبزادے کے بارے میں ایسی نازیبا بات منہ سے نکالے۔"

غرضیکہ اپنے اکابرین سے والہانہ تعلق اور ان کے متعلقین کی خبر گیری مرحوم کا خاص امتیاز تھا، اگرچہ کبھی وارفتگی مزاج کی بنا پر تعلق کے مظاہرے میں دوسرے کے لیے کافی الجھن پیدا ہو جاتی، عرض کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۰ء کے بعد ۱۹۴۷ء تک یہ راقم دلی میں طالب علمی کرتا تھا، ایک بار غالباً جمعیۃ علماء کی کسی بلائی ہوئی میٹنگ میں شرکت کے لیے دہلی تشریف فرما تھے، مجھے معلوم ہوا تو ان سے ملاقات کے لیے فرودگاہ پر پہنچا، مرحوم اس وقت ایک مجمع میں تشریف رکھتے تھے اور وہی مشہور و معروف خطابت کی آتش باری جاری تھی، میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تو مولانا نے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "میرے پاس اس وقت کچھ دینے کے لیے نہیں ہے، اگر جمعیۃ نے مصارفِ سفر دیدیے تو کچھ تمہیں بھی دے دوں گا۔"

اس واقعے پر ۳۰ رسال سے زائد گزرتے ہیں، مگر اب بھی اس ذہنی الجھن کو فراموش نہیں کر سکا، جو اس وقت اس جملے کو سننے کے بعد محسوس ہوئی تھی، مگر وہ اپنی بے تکلفی، خلوص اور بزرگانہ شفقت کی بناء پر اس امر کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا، دہلی میں پارلیمانی وفد جس میں کرپس بھی شریک تھے آیا ہوا تھا، ہندوستان کا سیاسی دماغ کھینچ کر دہلی پہنچ چکا تھا اور ونڈسر پیلس جو آصف علی مرحوم کی قیام گاہ تھی مولانا ابوالکلام آزاد کی عارضی رہائش گاہ کی بناء پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں کے لیے مخصوص تھی، فتح پوری اورینٹل کالج کے طلبہ نے ایک روز مولانا

آزاد مرحوم سے ملاقات کا پروگرام بنایا، قبیل فجر طلبہ کا یہ وفد "وینڈسر پیلس" حاضر ہو گیا، خاکسار بھی اس میں شریک تھا، اس وقت مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر ماسٹر تارا سنگھ، سر چند ولال ترویدی، لالہ بھیم سین، پنڈت پرتاب سنگھ کیرون اور پنجاب کے بہت سے زعماء ملاقات کے منتظر تھے۔ اجمل خاں صاحب نے ہم طلبہ کو بتایا کہ مولانا غسلِ صبح گاہی میں مصروف ہیں، کچھ وقفے کے بعد مولانا آزاد مرحوم نے طلبہ کو باریابی کا موقع عنایت فرمایا، طلبہ کی یہ جماعت اندر قدم رکھ رہی تھی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اندر سے باہر تشریف لا رہے تھے، انہوں نے ایک چسٹر زیب تن فرما رکھا تھا، سر پر سرخ رومال اور وہی طویل و عریض چشمہ ان کی آنکھوں پر، مشافہہ نہ ہو میری تمام کوششوں کے باوجود مرحوم کی اچانک مجھ پر نظر پڑ گئی، الامان والحفیظ، ان کا اس وقت کا بزرگانہ عتاب آسمانی قہر سے کم نہ تھا، وہ اس پر بہت ناراض تھے کہ تم اس گئے گزرے انداز میں ملاقات کے لیے کیوں آئے، ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور حسبِ دستور گرج رہے تھے، پھر ان تمام طلبہ سے مجھے علیحدہ کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں براہِ راست لے کر پہنچے اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ:

"آپ اسے پہچانتے ہیں، یہ ہندوستان کے دینی و علمی کارواں کے قافلہ سالار خاتم المحدثین مولانا انور شاہ کشمیری کا چھوٹا بچہ ہے۔" مرحوم جب کسی کا تعارف کراتے تو بے حد وقیع کلمات استعمال فرماتے، یہ منظر بھی بارہا دیکھا کہ وہ اپنے مکان پر تشریف فرما ہیں، فون آیا، انہوں نے جواب کے لیے فون اٹھایا اور سائل کے سوال پر جواباً فرماتے "میں مولانا حبیب الرحمٰن بول رہا ہوں۔" تکلف برطرف اپنے بچوں کو بھی مولانا کے ساتھ خطاب فرماتے۔

سخنِ دلنواز

مرحوم کی باتیں بھی عجیب و غریب ہوتیں، غالباً پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ نصیحتوں کے احتسابی جائزے میں بے نظیر واقع ہوئے تھے، ایک بار یہ خاکسار دہلی نظام الدین

اولیاء تانگہ پر جا رہا تھا، دوسری جانب سے وہ کار میں واپس تشریف لا رہے تھے، خدا جانے انہوں نے مجھے کس طرح دیکھ لیا، تانگے کے بالکل قریب کار رک گئی اور مولانا دروازہ کھول کر صاف ستھری سڑک پر نکل آئے۔ علیک سلیک کے بعد میرے اس سوال پر کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ فرمایا "مولوی یوسف امیر جماعت تبلیغی کے پاس گیا تھا، اس سے کہہ کر آیا ہوں کہ اپنی جماعت میں مولوی اور لیڈروں کو مت گھسنے دینا، ورنہ تیری ساری تحریک و دعوت تباہ ہو جائے گی۔"

ایک مرتبہ دیو بند میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نے مولوی یوسف امیر جماعت تبلیغ سے پوچھا کہ یوسف! صحیح بتا تیرا جواہر لال حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس پر مولوی یوسف بولا کہ مولانا ہر رات تہجد کے بعد دعا کرتا ہوں، اے اللہ! اگر جواہر لال کی حکومت تیرے لیے پسندیدہ ہے تو اسے بقاء طویل عطا فرما اور اگر ناپسندیدہ ہے تو اس کا بیڑہ غرق کر دے۔"

فرماتے ہیں کہ میں نے یہ بات جواہر لال نہرو کو سنائی تو اس نے پُرزور قہقہہ لگایا، آزاد ہندوستان میں پنڈت جی کی وزارتی جاہ وجلال سے ان کی بے تکلف طبیعت نے کبھی مرعوبیت قبول نہیں کی تھی، جواہر لال کی بھی اپنے خاص عملے کو ہدایت تھی کہ مولانا جب اور جس وقت ملاقات کرنا چاہیں ان کی آمد و رفت کو عام ملاقاتی ضابطوں سے مستثنیٰ رکھا جائے، واقف کاروں کا بیان ہے کہ وہ جاتے اور خاص اس صوفہ پر جا کر جواہر لال سے قریب بیٹھ جاتے جو پنڈت جی کا مخصوص تھا اور پوری بے تکلفی سے اس کے کاندھوں کو تھپتھپاتے، ایک روز فرمایا "پنڈت جی! کامیاب حکومت کے غرہ میں مت رہنا، ہندوستان کی موجودہ ترقی ان دو تین بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے جو آپ کے ملک میں تشریف فرما ہیں، (اشارہ حضرت مولانا مدنی، حضرت رائے پوری کی جانب تھا) کبھی کبھی ان کی خانقاہوں میں حاضری دے کر نیک دعائیں لے آیا کرو۔" جواہر لال اس نیک مشورے پر مسکرا کر رہ گئے، دلّی کے سرکاری دفتروں میں پہنچ جاتے تو اونچے

بچے ، بڑے زادوں کے کاندھوں پر اپنا دستِ شفقت رکھ کر ''بیٹا'' کے ساتھ خطاب ہوتا اور بڑے شب اس دل نشیں انداز اور سخن دلنواز سے رکے ہوئے کام اور رشتہ کار میں پڑی ہوئی الجھنوں کو چٹکیوں میں حل کرا لیتے۔

راقم الحروف جب دیوبند سے فارغ ہوا تو ایک بار دلی میں اپنے مکان پر مجھ سے فرمایا کہ ''اب کیا کرے گا؟'' میں نے عرض کیا آپ کا جو مشورہ ہو، فرمایا اگر میرا مشورہ مانتا ہے تو کھتولی ضلع مظفر نگر چل، وہاں زمین کا ایک قطعہ لے دوں گا، چھپر ڈال لے اور مدرسہ انوریہ کا افتتاح کر دے، میرے دو بچے محمد احمد اور سعید الرحمٰن تیرے ساتھ رہیں گے، اس عجیب وغریب تجویز پر میں ساکت، صامت رہ گیا، مولانا نے حسبِ دستور داڑھی کو خم دے کر دانتوں میں دبایا، عتابی نظریں میرے چہرے پر ڈالیں اور فرمایا کہ اچھا تیرے سمجھ میں نہیں آتی چل کوئی اور بات کر۔

اصابتِ رائے

خدا تعالیٰ نے انھیں سیاست وفراست، تدبیر وتدبر کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور جن سے وہ ملکی مسائل میں کام لیتے ان کی تو عام طور پر شہرت ہے، مجھ کو یہ بتانا ہے کہ مرحوم عام معاملات میں بھی اصابت رائے اور عاقبت اندیشی کے جوہر سے خالی نہیں تھے؛ چناں چہ طالب علمی سے فراغت کے بعد میرے شفیق استاد اور خاص مربی مولانا قاری اصغر علی صاحب مرحوم نے حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ کے یہاں خاکسار کا پیغام دیا، انھی دنوں دہلی کا سفر ہوا تو مرحوم مجھ سے دریافت فرمانے لگے کہ شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ میں نے قاری صاحب مرحوم کی اس تجویز کا ذکر کیا، سنتے ہی ایک مقدس ترین شخصیت کا نام لے کر فرمایا کہ ''وہ اس میں مخالف رہیں گے، اس لیے اس خیال کو چھوڑ دو۔'' بعد کے واقعات نے مرحوم کے اصابت رائے کی تصدیق کر دی، انہیں خانوادۂ انور کے ساتھ غیر معمولی شغف تھا، مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں پڑتا کہ ان سے ملاقات ہوئی ہو اور انہوں نے خالی ہاتھ آنے دیا ہو۔

والدۂ مرحومہ ایک زمانے میں لدھیانہ کے مشہور ہسپتال میں زیرِعلاج تھیں، راقم بھی ان کے ساتھ تھا، اتفاقاً عید وہیں آگئی، مولانا مرحوم نے جس طرح کے ملبوسات اپنے بچوں کے لیے تیار کیے اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور اعلیٰ خاکسار کے لیے بھی تیار کیے، اور جب اس تعلق کے اظہار کے لیے قلم حرکت کرتا ہے تو بے اختیار اپنے والد ماجد قدس سرہٗ علامہ کشمیریؒ کا وہ مشہور قول یاد آتا ہے ''مجھے ہندوستان میں صرف دو ہی وفادار خاندان ملے، ایک بجنور میں مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم اور پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ''۔

آہ کہ اب یہ دونوں حضرات تودۂ خاک کے نیچے مصروفِ خواب ہیں اور خانوادۂ انوری کے مخلصین کی فہرست میں ان اہم شخصیتوں کا فقدان ہے۔ والد ماجد بھی مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے ساتھ خاص تعلق رکھتے، مرحوم جس زمانے میں جیل میں ہوتے اور والد ماجد کا پنجاب کا سفر ہوتا یہ ناممکن تھا کہ لدھیانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے مکان پر تشریف فرما نہ ہوں، شورشِ دارالعلوم کے بعد جب کشمیر سے دیوبند مراجعت فرمارہے تھے تو اس زمانے میں مولانا مرحوم ملتان سینٹرل جیل میں اسیر تھے، والد مرحوم نے ملتان کا سفر فرمایا اور جیل ہی میں ان سے ملاقات فرمائی۔

اب اخلاص ومحبت، بزرگانہ شفقت ومودت کے یہ بلند وبالا مینار زمین کے برابر ہوچکے اور ان کی تصاویر کی وساطت سے جو پسماندہ محروم قسمت حلقے کے ذہنوں میں ہیں صرف اتنا سن لیتے ہیں ؎

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

* * *

حضرت مولانا محمد انوری لائل پوریؒ

مرحوم مشرقی پنجاب کے مشہور شہر لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ کے باشندے تھے، دار العلوم دیوبند اپنے والد مرحوم کے ہمراہ تعلیم کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر فوراً حاضری دی۔ گرمی کا زمانہ، دوپہر کا وقت، حضرت مرحوم کے اردگرد معتقدین کا ہجوم، جن میں ایک صاحب حضرت شیخ الہندؒ کو دستی پنکھا جھل رہے تھے اور حضرت آرام وراحت کے خیال سے بڑھتے ہوئے ہجوم سے بہ آوازِ نرم کہتے "بھائی ذرا دور رہیے، حضرت کو تکلیف ہوگی۔" یہ پنکھا کرنے والے دار العلوم دیوبند کے صدر مدرّس رئیس العلماء حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ تھے، بقول حضرت مولانا انوری لائل پوری حضرت شاہ صاحب کی یہ سب سے پہلی زیارت تھی اور معصومیت کی گڑھی گڑھائی تصویر پہلے ہی لمحے میں مولانا انوری کے قلب مشتاق میں جاگزیں ہوگئی۔ دورۂ حدیث مرحوم نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا اور اپنے استاذ کے عاشق زار ثابت ہوئے، بیعت کا بھی تعلق انہیں مرحوم استاذ سے تھا، بعد میں خلافت حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد لدھیانہ کے قریب ایک قصبہ میں مدتوں تعلیم دیتے رہے، مقدمہ بھاولپور میں مسلمان لڑکی کی جانب سے شاہ صاحب نے انہیں کو وکیل بنایا تھا، شاہ صاحب سے متعلق ایک مستقل سوانح "آئینۂ کمالاتِ انوری" کے نام سے شائع کی، خانوادۂ انوری سے تعلق اور قلبی روابط کا یہ عالم تھا کہ برادر اکبر نے جب دیوبند سے

''انور'' نامی ہفتہ وار جریدہ شائع کیا تو مرحوم اس کے سب سے بڑے معاون تھے اور خاکسار کی ادارت میں شائع ہونے والا ''نقش'' حضرت مرحوم کے الطاف وعنایات سے تین سال تک شائع ہوتا رہا، خود خریدار بہم پہنچاتے، پاکستان سے ترسیل رقم کے ذرائع مہیا کرتے، والدہ مرحومہ کے لئے حج کا انتظام فرمایا اور خاکسار کے رہائشی مکان کی تعمیر میں مدد فرمائی، تقسیم ہند کے بعد لاہور پاکستان منتقل ہوگئے اور مدرسہ انوریہ کا افتتاح کیا۔ ۱۹۶۴ء میں یہ ظلوم وجہول ایک ہفتے کے قریب لائل پور میں ان کا مہمان رہا، اعلیٰ میزبانی وضیافت کے ساتھ کل پاکستان میں مسافرت کے اخراجات مرحوم ہی نے کیے، کھانے پر بیٹھتے تو شروع سے آخر تک اپنے استاذ کا ذکر فرماتے، خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ لائل پور کا بڑا حلقہ ان کے سلسلۂ بیعت وارشاد میں شریک تھا، چند سال گذرتے ہیں کہ ۷۰ رسال کے قریب عمر پاکر دار فانی سے رحلت فرمائی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ لائل پور کی پوری تاریخ میں جس قدر ہجوم ان کے جنازے میں تھا کسی اور کے جنازہ میں دیکھا نہیں گیا، ولی صورت وسیرت، نیک طبیعت ونیک نہاد، علم دوست وعلم پرور شخصیت کے مالک تھے۔ غالباً تین لڑکے پسماندگان میں ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے سمدھی تھے، آپ کی ایک صاحبزادی رئیس الاحرار کے صاحبزادے مولوی محمد انیس الرحمٰن مظاہری کے نکاح میں تھیں جواب خود بھی مرحوم ہوچکے۔

اللّٰھم نور مرقدھما وبرد مضجعھما

***

اور بڑھتی گئی تاریکی

حضرت مولانا محمد میاں صاحب دہلویؒ

دنوں کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے، کہنے کو ۴۰ سال سے زائد عرصہ گذرا، لیکن تصور اور عالم خیال میں بیتا ہوا یہ زمانہ اب بھی اس طرح گشت کرتا ہے کہ شاید آج ہی کی بات ہے؛ حالاں کہ تقریباً ۱۳۵۸ھ کا ہے، جب کہ ایک بے نام ونشان دارالعلوم کے شعبۂ فارسی میں کودکی کے ایام دبستانِ علم وفن میں گذار رہا تھا، فارسی کا پہلا درجہ، ہاتھوں میں ایک کتاب آئی یہ ''تاریخ اسلام'' تھی، جس کے مصنف مولانا سید میاں مرحوم، دیوبند ہی کے کتب خانہ ''اعزازیہ'' سے شائع ہوئی تھی، اب یہ تو یاد نہیں کہ پڑھانے والے نے مصنف سے بچوں کے ذہنوں کو کچھ قریب کرنے کی کوشش کی بھی یا نہیں اور اگر مرحوم استاذ کچھ اس طرح کی کوشش کرتے بھی تو بچپن کی غفلتیں اور طالب علمانہ لاابالی پن اسے کیوں کر محفوظ رکھتا، پھر یہ بھی یاد نہیں کہ سید الملۃ مرحوم سے کب اور کہاں اور کس حال میں پہلا نیاز حاصل ہوا؛ البتہ آوارہ گردی کی تمام سنتیں تازہ کرنے کے بعد جب ایک مجہول وتلوم دارالعلوم کے شعبۂ عربی میں داخل ہوا اور مطالعہ کا شغف دل ودماغ کی کائنات میں چٹکیاں لینے لگا تو علمائے حق اور ان کے شاندار کارناموں سے واقفیت کے لئے مرحوم مولانا محمد میاں صاحب ہی کی تیار کردہ دستاویز سامنے تھی۔

۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا جو کھینچ کر ۱۹۴۷ء کی حدود میں جا پہنچا، اس فقیر بے نوا کا دہلی میں گذر مسجد فتح پوری کے ایک گوشے میں موجود ''اورینٹل کالج'' جس میں

پنجاب یونیورسٹی کے امتحان ہوتے تھے، ان ہی میں شرکت کے لیے چند سال دہلی میں رہنا ہوا جو واقعی دہلی تھی یعنی ہندوستان کا دل اور اپنے زائرین کا دل لینے والی، جس دہلی کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ''دل لی'' صحیح کیا تھا، جس کی راتیں اس قدر پُرامن تھیں کہ شب کے وسطی حصہ میں فتح پوری سے طلبہ روانہ ہوتے اور صدر بازار کے ایک مشہور مسلم ہوٹل میں جاکر چائے کی چسکیاں لیتے، یہاں چائے کی پیالی ایک آنے میں ملتی، کڑھا ہوا دودھ اور اس پر بالائی کی جمی ہوئی تہہ، گرمیاں آتیں تو نئی سڑک پر شب کے ابتدائی حصے سے لے کر درمیانی حصے تک ایک قلفی فروش بیٹھتا، طلبہ کا یہ ہجوم کبھی انہیں لذیذ قلفیوں سے کام ودہن کو لطف اندوز کرنے کے لیے جا نکلتا، دن اتنے پُررونق کہ جدھر نکل جاتے دلّی کی مشہور ومخصوص رونقیں جاذبِ نظر بنتیں، دلّی اب بھی ہے مگر دل لینے والی اب وہ ادا کہاں۔

بہرحال بلیماران میں جمعیۃ العلماء کے مرکزی دفتر میں کبھی فقیرانہ صدائیں لگانے کے لیے جا نکلتا تو ''مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم'' کی گھنی داڑھی، سفید بھنویں، سر پر کلاہِ قلپاقی تن زیبی، آواز کی گرج اور لب ولہجے کی شوکت مسلمانوں کے عہدِ شباب کی یاد دلاتی، شب کی مجلسوں میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فکرانگیز گفتگو، متین لب ولہجہ اور اس میں شوخی وظرافت، مسلمانوں پر آنے والے ہولناک مصائب کی خبر دیتی، جس میں موت کے ساتھ حیات اور زیست کے پہلو بہ پہلو کشمکش زندگی دیکھی جاسکتی تھی، ایک جانب ایک منحنی جسم، چہرے پر رونقِ تقویٰ، آنکھوں پر شبابی وشادابی، سر پر دوپلی ٹوپی، لمبا کرتا، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تولیہ، آنکھوں پر چشمہ جو حقائق کو گہری نظر سے دیکھنے کا عادی بن چکا تھا، ہاتھ میں قلم، سامنے کاغذات کا پلندہ، سب سے بے نیاز، اور سب کا نیازمند نظر آتا۔ یہی تھے ہمارے مرحوم ''مولانا محمد میاں دیوبندی''۔ کبھی نماز ہوتی اور عشاء کے لئے دفتر ہی میں صفیں آراستہ ہوتیں تو امام مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہوتے یا مرحوم مولانا محمد میاں، رہ گئے مولانا حفظ الرحمٰن تو امام ہونے کے باوجود ہمیشہ

ری ہی نظر آتے۔
۱۹۴۷ء کے ہچکولے دلّی کے لیے زلزلہ ثابت ہوئے، محفلیں اجڑ گئیں، مجلسیں
م برہم ہوگئیں، ایک دوسرے سے جدائی اور ہجر کی شبِ دراز، پھر یہ دیوبند ہے اور
ں کے علمی چرچوں میں سکون دل ودماغ کی تلاش، مجلسِ شوریٰ کے جلسے ہوئے تو
لانا محمد میاں صاحب مرحوم بھی دلّی سے آنے والی جماعت کے ایک رکن ہوئے،
بند کی مجلسِ شوریٰ اور اس کے اجلاس جنہوں نے نہیں دیکھے، انہیں کون سمجھا سکتا ہے
یہاں کا زمین وآسمان جدا، نشیب وفراز، عروج وزوال، ترقی وتنزلی کے ہنگامے صحیح
ی میں جمہوریت اور شورائیت یا پھر حاکمیت اور کج کلاہی، اراکین شوریٰ سے اس
ول میں کون بے نیاز ہوسکتا اور رہ سکتا ہے، طالب علمی ختم ہوئی اور وہ دور آیا جس کے
علق دہلی مرحوم ہی کے ایک بزرگ ودانا ''غالب مرحوم'' نے کہا تھا۔ ع

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہیں دارالعلوم میں تدریس کی سعادت میسر آئی اور ضرورتوں نے اراکین شوریٰ کی
رگاہ تک پہنچادیا، مرحوم مجاہد ملت کی حیات میں شفقتِ برادرانہ کچھ اس انداز میں نصیب
وئی کہ ہر مشکل کا حل، ہر الجھن سے نجات، ہر پریشانی کا مداوا اور ہر ابتلاء سے گلوخلاصی
ٹکیاں بجنے میں حاصل ہوتیں، بیچارے مولانا محمد میاں مرحوم یوں بھی خاموش، زاویہ
سند، عزلت نشیں اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے، نہ درباداری، نہ رونقِ مجلس، نہ کسی
کوان کی ضرورت، نہ وہ کسی کی ضرورت رکھتے۔ دیوبند آتے، مہمان خانے میں قیام ہوتا،
شوریٰ میں شرکت فرماتے اور یہیں کے کتب خانے سے مستعار کتابیں لے کر مطالعہ
کرتے۔ یہ تھیں ان کی مصروفیات، کبھی کبھار دارالعلوم کی مسجد میں مل جاتے تو خود ہی
سراپائے نیاز بن کر مصافحہ کرتے، خیر وعافیت پوچھتے۔ اللہ اللہ باقی خیر صلا۔
اس زمانے کا صرف ایک واقعہ یاد ہے کہ اس عاجز نے دارالعلوم میں ترقی کے
لیے درخواست دی، ''ملّا کی دوڑ مسجد تک'' مجاہدِ ملت مرحوم کو یہ درخواست دی گئی، اس

ٹیک لگائے ہوئے قلم ہاتھ میں، شوریٰ کی کارروائی کی تحریر اور اس کو ضبط کرنے کا کام ان ہی سے متعلق۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنی مخصوص بے تکلف مجلسوں میں مرحوم کو ''حیوانِ کاتب'' فرماتے، واقعی وہ حیوان کاتب دکھائی دیتے، مجلس کی بحث وتمحیص میں شرکت برائے نام ہوتی، زیادہ وقت ان کا لکھنے لکھانے میں گزرتا، کارروائی کی رپورٹ ایسے چست انداز میں لکھتے کہ قیل وقال کی گنجائش نہ رہتی، کبھی کسی خاص مسئلے پر بولتے تو قلم ہاتھ سے رکھ دیتے، جو کچھ کہتے اسے مجلس ہمہ تن ہو کر سنتی، لہجے کی شوکت، تعبیر کی ندرت، استدلال کی قوت، سب کچھ ہی ہوتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی گڑے ہوئے مردوں کو بھی اکھاڑ لیتے، یعنی طے شدہ امور جن پر مدتیں گذر چکی ہوتیں مولانا محمد میاں مرحوم ان پر بحث کا دروازہ کھولتے اور دادِ انصاف دیتے۔

ایک دو سال گذرتے ہیں کہ ان کے ایک مرحوم استاذ کے صاحبزادے کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ انہیں کوئی بھی کتاب پڑھانے کے لیے نہ دی جائے، یہ صاحبزادے غیر مسلح نہتے بھاگم بھاگ دلّی جا پہنچے اور دیو بند سے تا دلّی خدا جانے مولانا محمد میاں مرحوم کے پاس کتنے خطوط لکھ ڈالے، یاد کچھ ایسا پڑتا ہے کہ اس فیصلے کے بعد ایک دو نشستوں میں مرحوم نے اپنی علالت کی بناء پر شرکت نہیں کی، جب آئے تو پہلے اسی مسئلے کو لیا جس کی تمہید بھی خوب تھی، الحاصل مسئلہ طے کرایا اور یہ پابندی اس غریب استاذ سے اٹھالی گئی۔ اس روز محسوس ہوا کہ یہ مختی جسم مسائل پر شافی گفتگو بھی کر سکتا ہے اور اپنے مرحوم اساتذہ کی نیاز مندی اور شاگردی کے حقوق بھی ادا کرنے کی سعادتوں سے بہرہ ور ہے۔

راقم الحروف کو بھی ایک حادثہ پیش آیا، خوفزدہ ہو کر مرحوم کو خط لکھا، وہ شوریٰ میں شریک ہوئے، ملاقات میں فرمایا کہ ''اس بار حاضری کا ارادہ نہیں تھا؛ لیکن آپ کا خط دیکھ کر حاضر ہوا ہوں، اور پوری طرح تیار ہو کر، اگر مسئلہ زیر بحث آیا تو انشاء اللہ آپ کی بھرپور حمایت ہوگی۔'' ان کے وعدے میں استحکام تھا اور لہجہ میں رس، افسوس کہ اب یہ والہانہ تعلق رکھنے والی ہستیاں نایاب ہوتی جاتی ہیں۔

ایک اور قصہ سن لیجیے، یہ دہلی ہے اور "تحریک شیخ الہند" پر مرحوم کے قلمی تازہ شاہکار کی نقاب کشائی کی رسم، راشٹر پتی بھون کی سر بفلک عمارت، جس میں عروج وزوال کی داستانیں وہاں کے ذرّوں میں منتشر، خود صدر جمہوریہ کو نقاب کشائی کرنا تھی، یہ خاکسار بھی شریک ہے، آج ایک نیا منصوبہ لے کر دیوبند سے یہاں حاضری ہوئی، جیب میں ایک عزیز کی درخواست ہے جس پر مرحوم کی سفارش مطلوب ہے، قریب بہ مغرب رسم ختم ہوئی، ہجوم اٹھا، کچھ دروازے سے باہر نکلنے لگا اور کچھ موقع سے فائدہ اٹھا کر راشٹر پتی بھون کے شاندار درودیوار میں عظمتِ رفتہ کے آثار تلاش کر رہا ہے، میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، انہوں نے آنکھ اٹھائی، وہی نیاز مندانہ انداز، وہی متواضعانہ لہجہ، لیکن نقاہت اس پر مستزاد، بھلا کیا وقت تھا اس ہمہ ہمی میں کسی گزارش کا، لیکن پھر بھی عرض کیا کہ ایک درخواست پر آپ کی سفارش مطلوب ہے، فوراً کرسی پر تشریف فرما ہو گئے، پہلے جیب سے قلم نکالا، درخواست لی، پڑھی اور قلم چل پڑا، نہ انکار نہ لیت ولعل، کیسا ردّ وقدح، کہاں کا تغافل، لکھ کر میری جانب یہ کہتے ہوئے بڑھایا کہ "شاید یہ سفارش کارگر نہ ہو، مگر مجھے تو حکم کی تعمیل کرنا تھی۔"

اب سوچتا ہوں کہ یہ کیسی جرأتِ بیجا تھی اور کیسا تھا مرحوم کا حلم، کہ وقت کی تنگی مانع ہوئی اور نہ کوئی انکار وتأمل کیا، ان کی یہ ادا دل میں اس وجہ سے اور خانہ نشین ہوئی کہ اسی صبح میں ایک صاحب سے سفارش لینا چاہی تھی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا اور یہیں راشٹر پتی بھون میں ایک اور صاحب ملے تھے جن کے پیکر طناز کو دیکھ کر میں اس درخواست کی جرأت بھی نہیں کر سکا تھا۔

یہ عروس البلاد بمبئی کا دیو ہیکل مسافر خانہ ہے کئی منزلہ، میں یہاں کی بالائی منزل میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ مقیم ہوں جو کینسر کے مہلک مرض سے صحت کی تلاش میں ساحل بمبئی تک جا پہنچی تھیں، ایک صبح بالائی منزل سے نیچے آیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا بیٹھا ہوا خود اپنے ہاتھ سے اپنے کپڑے دھونے میں مصروف ہے، یہ تو کوئی جانی پہچانی

شخصیت ہے جس کے خدوخال سے نگاہیں اگرچہ دوربین نہ سہی مگر آشنا ہیں، یہ تھے سیّد الملۃ مرحوم مولانا محمد میاں، جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ، جو جمعیۃ کی فراہمی مالیات کے لیے سفر کرتے ہوئے بمبئی وارد ہوئے تھے، کہنے کو تو یہ بات چھوٹی ہے، مگر ان کی اس ادا میں ان کی تواضع، فروتنی اور خاکساری کی ایک داستانِ عبرت پنہاں ہے۔ خدا تعالیٰ نے مرحوم کو متانت اور سنجیدگی کی دولت فراواں عنایت فرمائی تھی اور یہ ان کے لیے ایک حفاظتی سامان تھا؛ لیکن پھر بھی بے تکلف احباب ان سے چھیڑ چھاڑ کر لیتے جس سے خود مرحوم بھی محظوظ ہوتے۔

مرحوم مجاہد ملت کو چاٹ اور چٹ پٹی چیزوں کا بڑا شوق تھا، ضلع بجنور کی روایتی غذا اُڑد، اور دیہات کا مرغوب کھانا چنے کا ساگ اور بیسن کی روٹی رغبت سے لیتے، ادھر میری والدہ مرحومہ ان چیزوں کو پکانے کا خاص سلیقہ رکھتیں، مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، سردی کا زمانہ، چنے کے ساگ کی ریل پیل، میں نے اکثر اراکین کی دعوت اسی ساگ پات سے کردی، مرحومہ والدہ صاحبہ نے بھی خاص اہتمام سے دونوں چیزیں تیار کرائیں اور واقعتاً کھانے والے انگلیاں چاٹنے لگے، کھانا نمٹ گیا، سب فارغ ہوگئے، مرحوم سیّد الملت پہلے تمام پلیٹوں سے ساگ صاف کرتے رہے اور بعد میں بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے بتدریج لینے لگے، مدعوئین منتظر کہ مولانا اٹھیں تو وہ بھی چھوٹیں، مسلسل انتظار کے بعد مجاہد ملت بولے کہ:

”مولانا آپ تو لپٹ ہی گئے؟“

”جی ہاں! آپ کو تو سنت پر عمل کی توفیق ہے نہیں، مجھے تو کعبہ میں جھاڑو دینا ہی ہے۔“ (سید الملت)

مجاہد ملت کہاں خاموش رہنے والے تھے بولے:

”مولانا آپ کا ادب مانع ہے، ورنہ جس توے پر یہ روٹیاں تیار ہوئیں وہ بھی آپ کے سامنے پیش کرتا کہ اس حجر اسود کو بھی بوسہ دے دیجیے۔“

اب یہ یادیں سینے کا داغ ہیں، نہ وہ ظرافت رہی اور نہ وہ محفلوں کا جھرمٹ، سب پیوندِ خاک ہوئے اور خاک کا بستر ان کا گوشۂ عافیت ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

مرحوم کی تصانیف مضمون کی زرخیزی، عنوانات کی جاذبیت، ذیلی سرخیوں کی شوکت، فتویٰ اور تقویٰ، علم وعمل، ورع وپرہیزگاری، سیاسی دلچسپیاں، قیدوبند کے آلام، شاندار کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے گا؛ مگر مجھ بے بضاعت کو تو ان کی زندگی کے اس نادر باب نے گہرا تاثر دیا کہ وہ مدرسہ شاہی سے نکلے، جمعیۃ علماء کی نظامت تک پہنچے، پھر نیابتِ صدارت دہلی، وہاں کے اونچے حلقوں میں پذیرائی اور دوڑتی بھاگتی دنیا سے رابطہ، یہ ممبرانِ پارلیمنٹ، وہ وزیر باتدبیر، یہ امیر طناز، وہ رئیس کج کلاہ، مگر مولانا محمد میاں مرحوم کی کھدر کی شیروانی، کھادی کا لمبا کرتہ، شرعی پاجامہ، دھوڑی کا جوتہ، سرپر دو پلی ٹوپی، ہاتھ کا تولیہ، چہرہ کی ڈاڑھی، مسجد کی نمازیں، آہِ سحر گاہی، شب بیداری، جلوتوں میں خلوت، حدیث کا درس، فتوے کے لیے قلم، جیب کی تسبیح نہ چھوٹنا تھی اور نہ چھوٹی، کہنے کو تو بات معمولی ہے؛ لیکن اپنے ڈگر یہ پر یہ استواری بڑی بات ہے، بقول شاعر ع

وفاداری بشرط استواری اصلِ ایماں ہے

اور یہی ان کی زندگی کا وہ روشن باب تھا جس کی یادیں زمزمۂ افلاک میں ان شاء اللہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔ عنوان میں دیے ہوئے سربریدہ مصرعہ کو اب پورا کیجیے، جس سے صورتِ حال کی تاریکی اور اس کے مہیب پہلو کھل کر سامنے آجائیں گے ع

ایک چراغ اور بجھا، اور بڑھے گی تاریکی

***

حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ

قوی ہیکل، مضبوط ہاڑ، دراز ریش، سر پر دو پلی ٹوپی، سردیوں میں رومال، متحرک آنکھیں، خاموشی میں بھی ہونٹ متحرک رہتے، تحریر سادہ و پرکار، تقریر کا انداز نرالا، بولتے اور کچھ وقفے کے لیے خاموش، ایک بار دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کو سکوت وسکون کی تلقین کرتے ہوئے کرسی سے چمکار رہے تھے، ذہین وفطین، گفتگو مؤثر، دارالعلوم کے فاضل، علامہ کشمیری کے باامتیاز تلمیذ، جیدالاستعداد، مصنف، مؤلف، مناظر اور مبلغ، حضرت رائے پوریؒ کے مجاز، امروہہ میں تدریس کے زمانے میں مناظروں میں الجھے اور اپنی ذہانت وحاضر جوابی سے بڑے معرکے سر کیے، بریلی کے زورآور، زباں دراز چغادری مناظروں کو باربار شکست دی، مناظروں سے دل بھر گیا تو قلم وقرطاس سنبھالا، ''الفرقان'' بریلی کے بعد لکھنؤ سے تاحال شائع ہوتا ہے۔

مولانا سیمابی طبع کے مالک، خیالات وافکار، رجحانات ونظریات میں ہمیشہ مدّوجزر رہتا، جب کبھی کسی حلقے میں داخل ہوتے تو تحریر وتقریر کی پوری قوت اسی کو ''حق'' بتانے میں صرف کرتے، حلقے سے باہر آتے تو یا سکوت کرتے یا دھجیاں بکھیر دیتے، جب کسی تحریک سے جڑتے تو شب وروز اس کے فروغ واشاعت میں مصروف ـــــ تحریک سے وابستہ افراد کے لیے پیہم سفر، دمادم مراسلت، وقفہ وقفہ سے مؤثر خیال وارد ہوتا تو مولانا کے خط کا ورود ضروری تھا، گویا کہ شوراشوری اور پھر بے نمکینی، غضب یہ تھا کہ وہ اسے اپنی زندگی میں حق گوئی وحق پژوہی کا نمایاں عنوان دیتے۔ مقدمہ قائم کرنے، دلائل بہم پہنچانے اور مرحلہ بمرحلہ سب کچھ کو حق بتانے کے فن میں لاریب مشاق، ماہر اور چابک

وست تھے۔

علی میاں مرحوم اور ''مولانا'' میں فاصل، جسے عمر بھر وہ پُر نہ کرسکے کہ اوّل الذکر جو یائے حق معلوم ہوتے، افراد سے تا تنظیمات اسی کی تلاش میں ان کی صحرانوردی تھی، جب کہ مؤخر الذکر ہر حلقے میں جاتے، پھر یکا یک باہر نکل آتے۔ ان کی تصانیف، نگارشات، سادگی کے باوجود بھرپور ہیں۔ مناظرانہ طبیعت تھی، اس لیے منطقی ترتیب خاص جوہر ہے۔ احقر سے ان کے بہت پرانے مراسم تھے اور خط و کتابت بھی رہتی، ایک بار ان کے یہاں چوری کا حادثہ پیش آیا جس کا جواب ملاحظہ میں آئے گا۔

دارالعلوم کے اندوہناک واقعات کے بعد صرف ایک ملاقات ہے، احقر اور مولانا اسلم صاحب القاسمی لکھنؤ اُن سے عرض معروض کے لیے پہنچے، دارالعلوم پر قبضہ ہو چکا تھا، دو بار ملاقات شب اور صبح میں ان کی رہائش پر ہوئی، سب کچھ سننے کے بعد جواب یہ تھا کہ ''میں اس وقت کوئی جواب نہیں دے سکتا میرا جواب یہی ہے۔'' اس وقت محسوس ہوا کہ وہ بہت دور جا چکے ہیں، اتنا دور جہاں سے واپسی ممکن نہیں، اس قضیہ کے بعد بار بار مراسلت کا موقع ملا اور ہر جواب کا پس منظر یہی ہے، ۸۰ رسال سے متجاوز عمر کے بعد لکھنؤ کے گورستان میں ہمیشہ کے لیے سکوت کی چادر لپیٹ کر محو خواب ہیں گویا کہ ع

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آہی گیا

***

باسمہٖ تعالیٰ

از بمبئی

عزیزم محترم! زیدت عنایتکم

سلام مسنون!

ملفوف مرقومہ ۱۶ر ذی القعدہ مجھے مل گیا تھا، میں آج صبح ہی یہاں پہنچا ہوں ان شاء اللہ ۱۵ ر اگست کے آخری جہاز سے روانگی ہوگی، آپ کے مہتمم صاحب بھی آ

جا رہے ہیں، آپ کے لیے اللہ سے کچھ مانگنا ایک نہیں کئی وجوہ سے خود میرے لئے
وسعادت ہے، اس لیے ان شاء اللہ کمی نہ کروں گا۔

آپ نے جس موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے لکھنؤ میں اصرار فرمایا تھا، اس پر اچھی
ی تفصیل سے لکھ دیا ہے، خدا نے چاہا تو ذی قعدہ کے ''الفرقان'' میں (جو عیدالاضحیٰ
ب شائع ہو سکے گا) وہ چھپ جائے گا، میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ٹھیک
ھا دیا ہے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی

۱۴/اکتوبر، ۱۹۸۱ء

برادر مکرم! احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا

سلام مسنون

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔

حادثہ کی اطلاع پر اظہار ہمدردی کے لیے ممنون ہوں، عجیب معاملہ ہے! میرے
ن سنبھل جا کر گھر والوں کو کسی نے یہ بتا دیا کہ بہت ہی سنگین واقعہ ہوا، با قاعدہ مقابلہ
وا اور چوٹیں آئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سب اعزہ پریشان ہو گئے، بعض لکھنؤ کے لیے دوڑ
ے اور بیچارے سفر کی انتہائی زحمت برداشت کر کے یہاں پہنچے، مجھے بہت ہی دکھ
وا، آپ سے بھی کسی صاحب نے بڑے عظیم مالی نقصان کا ذکر کیا، جو کچھ ہوا، اگرچہ
لچسپ ہوا، اور لکھنے کی فرصت ہوتی تو لکھنے کے قابل تھی؛ لیکن طوالت طلب ہے کہ اپنا
ور آپ کا وقت کیوں خراب کیا جائے، بیشک کچھ تو ہوا لیکن نقصان گویا کچھ نہیں ہوا، بس
تنا جتنا کہ ہماری غفلت کے علاج کے لیے ضروری تھا، ہم غفلت کی نیند سو رہے تھے، وہ
شاید چھت کے اوپر سے آئے اور گھر میں سے دو بکس نکال کر باہر لے گئے، کچھ دور پر
جا کر اندھیری گلی میں ان کو کھولا، ان میں صرف کپڑے تھے، ایک ایک کپڑا نکال کر باہر

پھینکا، وہ شاید صرف زیور اور نقدی کے طالب اور امیدوار تھے اور بکسوں میں اس جنس کی کوئی چیز نہیں تھی، چھوٹے لڑکے مولوی خلیل الرحمن سجاد سلمہٗ کی ایک گھڑی تھی جو ندوہ کے درجۂ عالمیت میں امتیاز سے پاس ہونے کی بنیاد پر ۸؍ سال پہلے ان کو انعام میں ملی تھی، وہ انہوں نے بطور یادگار کے رکھ چھوڑی تھی، اتفاق سے وہ ان ہی میں سے ایک بکس میں تھی، بس وہی انہوں نے قبول فرمائی اور بکس اور کپڑے جن کو انہوں نے باہر پھینک دیا تھا اسی طرح چھوڑ کر چلے گئے، بس یہی ہے اس واقعہ کا طول وعرض۔ اس سے سینکڑوں گنا زیادہ نقصان میرا یہ ہوا کہ خط وکتابت کا کام بڑھ گیا جو میرے لیے پہاڑ کی چڑھائی کے برابر ہے، مجھے غالباً سب سے زیادہ عدمِ مناسبت خط وکتابت سے ہے، اس وقت چوں کہ ایک کاتب نصیب ہیں، اس لیے بلا ارادہ یہ تفصیل لکھوادی، خود لکھنا ہوتا تو شاید اس سلسلے میں ایک دو سطریں لکھتا۔

واقعہ یہ ہے کہ میرا مزاج وہی ہے جس کی آپ نے تشخیص کی ہے کہ جب میں نے جماعتِ اسلامی کی بنیادی دعوت کو صحیح سمجھا اور اطمینان ہوگیا تو اس کو قبول کرلیا، جب اپنے حق میں علیحدگی ضروری سمجھی تو علیحدگی اختیار کرلی، یہ ۱۳۶۱ھ کی بات ہے جہاں تک میرے علم میں ہے اس وقت تک ہمارے خاص اکابر نے اس کے بارے میں وہ رائے ظاہر نہیں کی تھی جو بعد میں ظاہر ہوئی اور مدت تک اس کے بارے میں لکھنے بولنے میں اپنے لیے احتیاط ضروری سمجھی تو مدت تک یہی رویہ رہا پھر جب اس کا اظہار ضروری معلوم ہوا تو ایسا ہی کیا، میں نہ رائے کی غلطی سے محفوظ ہوں اور نہ اپنے نفس کی طرف سے بالکل مامون؛ لیکن چاہتا یہی ہوں کہ غلط کام مجھ سے سرزد نہ ہوں۔

آپ نے تازہ طبع میرے اس بیان کا ذکر کیا ہے جو کتابچے کی شکل میں آپ کی نظر سے گزرا ہے وہ تازہ الفرقان میں بھی آرہا ہے؛ بلکہ دراصل الفرقان ہی کے لیے لکھا گیا تھا، ۱۴؍ اکتوبر سے پہلے اس کی اشاعت ضروری سمجھ کر اسے چھپوادیا گیا، میں نے یہ ساری سرگزشت اور آپ بیتی تب لکھنے کا فیصلہ کیا جب میں نے اس کو اپنے لیے ضروری

...ھا، حالاں کہ اس سے پہلے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ میرے احساسات بہت پہلے
...ے کیا تھے۔
حضرت شیخ الحدیث کے بارے میں آپ کا قیاس صحیح ہے، میں نے اس سلسلے میں
...ں کے آخری مشورے کا ذکر غیر ضروری سمجھ کر نہیں کیا، ۷۶ء میں مجھے وہ معذوری لاحق
...ئی جس کی وجہ سے سفر کرنا میرے لیے سخت مشکل ہو گیا، اس کے بعد ۳-۴ سال تک
...ں نے کوئی سفر نہیں کیا، مجلسِ شوریٰ اور عاملہ کے کسی جلسے میں بھی شریک نہیں ہوا، غالباً
...ال ۹۹ھ میں شوریٰ کا جلسہ بلایا گیا جس میں اجلاسِ صد سالہ کے بارے میں کچھ اہم
...یں طے کرنی تھیں، حضرت مہتمم صاحب نے مجھے بار بار تاکید و اصرار سے تحریر فرمایا
...ہ جیسے بھی ہو سکے اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے اور علی میاں کو ساتھ لانا بھی
...ہارے ذمہ ہے، میں نے ارادہ کر لیا اور وہ سفر کیا، اس حاضری میں یہ محسوس ہوا کہ جس
...م کی خرابیوں نے میرے اندر کئی سال پہلے استعفیٰ کا شدید داعیہ پیدا کیا تھا وہ اب
...ت بڑھ گئی ہیں، تو میرے اندر پھر وہ داعیہ اور بھی زیادہ شدت سے پیدا ہوا، اس وقت
...ضرت شیخ الحدیث مدینہ منورہ تھے، میں نے ان کو پھر لکھا کہ دل میں اس کا سخت
...ضا ہے تو شیخ نے جواب لکھا کہ اب میں منع کرنا تو مناسب نہیں سمجھتا؛ البتہ حضرت
...جی صاحب اور حضرت گنگوہیؒ کا معمول تھا کہ اہم معاملات میں سات دن مسلسل
...تخارے کا مشورہ دیتے تھے، یہی تم کو میرا مشورہ ہے۔
استخارے کے لیے ہمارے اکابر اپنی رائے کو فنا کرنے کی بھی تلقین کرتے ہیں،
...ں اپنی رائے اور اندرونی داعیہ کو فنا کرنے پر اس وقت قادر نہیں ہو سکا اور منتظر رہا کہ
...ب ایسا کر سکوں تو استخارہ والا عمل کروں، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، بہر حال جو کچھ
...ں نے لکھا ہے براَتِ ذمہ کی نیت سے اور شہادت سمجھ کر لکھا ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ۔
میں اپنے خلاف سننے اور پڑھنے کا اور ہر طرح کے خرافات بھی سننے پڑھنے کا عادی
...ا ہوں، پہلے بریلوی حضرات کی عنایتوں کا برسہا برس تک نشانہ بنا، وہ نہایت نامہذب

لوگ تھے، بھونڈی گالیاں بولتے اور لکھتے تھے، اس معاملے میں بہت ہی گھٹیا کا اس کے
لوگ تھے، اب ادھر چند سالوں سے جماعت اسلامی کے اہل قلم کی عنایتوں کا نشانہ بنا
ہوا ہوں، یہ لوگ صاحبِ فن ہیں، بہرحال یہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور نئی
چیز نہیں ہوگی۔

مولانا احمد سعید صاحب علیہ الرحمہ کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، جمعیۃ علماء کے مخالفین سیاسی
بحثوں کے علاوہ؛ بلکہ اس سے زیادہ بزرگانِ جمعیۃ پر ذاتی حملہ کرتے تھے اور نہایت ہی
ذلیل درجے کی کردار کشی، مولانا مرحوم نے اپنے پر کیے جانے والے اس سلسلے کے
حملوں کا ذکر کرتے ہوئے امروہہ کی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ ایک دفعہ ایک بوڑھا
اونٹ کسی گاؤں سے گذرا، گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے ڈگڈگی بجاتے ہوئے اس
کے پیچھے ہو لیے، بوڑھے اونٹ نے مڑ کر بھی نہ دیکھا، اپنی راہ چلتا رہا، بچوں کا غول بھی
ڈگڈگی بجاتے ہوئے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا، یہاں تک کہ بیچارے بچے تھک کر رک گئے
اور اب گاؤں واپسی کے لیے سوچنے لگے، تو بوڑھے اونٹ نے مڑ کر کہا ارے بچو! تم
ڈگڈگی میرے پیچھے بجا رہے ہو، تمہیں خبر نہیں ساری عمر کمر پر دھونسے بجے ہیں۔
(دھونسہ، غالباً نقارے کو کہتے ہیں)۔

میرے کتابچہ والے بیان میں جہاں آپ کا ذکر ہے وہاں میں نے وہ پورے
الفاظ نقل نہیں کیے جو آپ کے بارے میں حضرت مہتمم صاحب سے عرض کیے تھے،
میں نے عرض کیا تھا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے کہ ”مولانا انظر شاہ کا جو حق مجھ پر ہے
اور جو تعلق ان کے ساتھ ہے وہ دار العلوم کے کسی استاذ کے ساتھ نہیں ہے الخ“۔

آگے وہ پوری بات کی تھی جو آپ نے کتابچے میں پڑھی ہوگی؛ میں نے الفرقان
میں حاشیہ میں ان الفاظ کا ذکر کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں قرابت اور دیگر تعلقات کے
عدمِ لحاظ کے بارے میں انتہا پسند ہوں، مجھے اس کا اعتراف ہے، لیکن یہ عدمِ لحاظ
دار العلوم جیسے معاملات ہی میں ہے، جہاں تک میرا اندازہ ہے ذاتی معاملات میں نہیں

ہے، اس وقت ایک کاتب نصیب تھے اس لیے خط طویل لکھا گیا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ایک دوسرے کے لیے دعا اور خیر خواہی کی توفیق عطا فرمائے، اصل حقائق عالم آخرت میں ظاہر ہوں گے۔ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ والسلام

محمد منظور نعمانی

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۱/اپریل ۸۶ء

برادر مکرم مولانا محمد انظر شاہ مسعودی صاحب! احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے آپ بعافیت ہوں، اس وقت یہ عریضہ ایک ضرورت سے لکھ رہا ہوں، جو کچھ مطلوب ہے اگرچہ اس کے ملنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں ہے؛ لیکن امکانِ عقلی بہر حال ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سب کچھ ہے، بس اسی پر نظر رکھتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں، استاذنا حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ایک دن درس میں فرمایا تھا کہ "اکفار الملحدین" جب لکھی تھی تو اس میں ایک فصل روافض کے اکفار سے متعلق بھی تھی؛ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (عثمانیؒ) کی رائے ہوئی کہ اس فصل کو اس میں شامل نہ کیا جائے، کیوں کہ اس کا امکان ہے کہ بعض علماء اس سے اختلاف کریں، اس سے کتاب کے اصل موضوع ومقصد (قادیانیوں کی تکفیر کے مسئلہ) کو بھی نقصان پہنچے گا، میں نے ان کی اس رائے کو صائب سمجھا اور وہ فصل کتاب سے نکال لی۔

حضرت استاذ قدس سرہٗ نے صرف اتنا ہی فرمایا تھا (اس کی کچھ وضاحت میں آگے اپنے معلومات اور کچھ قیاس کی بنیاد پر کروں گا) آپ سے تو اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کیا حضرتؒ کے متروکہ مسودات میں روافض کے اکفار سے متعلق یہ فصل آپ کی نظر سے گذری ہے یا اس بارے میں آپ کو کچھ علم ہے مجھے بس اسی کا جواب چاہیے،

خدا کرے آپ کے ذریعہ کچھ پتہ چل جائے۔

(وضاحت) واقعہ یہ ہے کہ "اکفار الملحدین" جس وقت لکھی تھی اس کے کچھ بعد مراد آباد میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس ہونے والا تھا، اس وقت تک جمعیۃ میں تمام مکاتبِ فکر کے اکابر ومشاہیر علماء شامل تھے، علماء اہل حدیث میں سے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا داؤد غزنوی، علماء فرنگی محل میں سے مولانا عبدالباری فرنگی محلّی وغیرہ (سب مرحومین) اور علماء بدایوں میں سے مولانا عبدالماجد بدایونی، یہ سب حضرات اس اجلاس میں شریک تھے، حضرت مولانا محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار علیہ الرحمہ اجلاس کے صدر تھے، میں نے ان سب حضرات کو پہلی دفعہ اس اجلاس میں دیکھا تھا (میں اس وقت طالب علم ہی تھا، میں دارالعلوم اس کے اگلے سال گیا ہوں)۔

میرا قیاس وگمان ہے کہ حضرت استاذ قدس سرہٗ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا ارادہ یہ رہا ہوگا کہ کتاب اس وقت تک چھپ جائے تو جمعیۃ کے اجلاس میں پیش کر کے ان تمام علماء کی تصدیق وتائید واتفاق حاصل کرلیا جائے تو قادیانیوں کے تکفیر کا مسئلہ ان تمام مکاتبِ فکر کے علماء کا متفقہ مسئلہ ہوجائے گا، اس مقصد کے پیش نظر حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ نے روافض کے اکفار سے متعلق فصل کو نکال لینے کا مشورہ دیا اور حضرت استاذ قدس سرہٗ نے اس کو قبول فرمالیا، لیکن یا تو کتاب اس وقت تک طبع نہیں ہوسکی یا کسی اور سبب سے یہ کام اس وقت نہیں ہوا، تاہم کچھ اکابر علماء کی تصدیقات "اکفار الملحدین" کے ساتھ شامل ہیں جن میں اپنی جماعت کے اکابر علماء: حضرت تھانوی، حضرت سہارنپوری، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے علاوہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی تصدیق وتقریظ بھی ہے (یہ جو کچھ لکھا اپنے معلومات اور کچھ قیاس کی بنیاد پر لکھا ہے، واللہ اعلم)۔

آخر میں ایک بات خاص طور سے لکھتا ہوں، ہماری بدقسمتی سے دارالعلوم سے

متعلق جو واقعات پیش آئے اور جو اختلاف پیدا ہوا، غالب گمان ہے کہ اس سلسلے میں کبھی آپ کے متعلق کوئی ایسی بات بھی کی ہوگی جو غیبت کی حد میں آئی ہوگی اور غیبت سنی بھی ہوگی، میں آپ سے اس کی معافی چاہتا ہوں، آپ معاف کردیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ واللہ یحب المحسنین.

اس طرح کا اگر کوئی بھی حق کسی صاحب ایمان بندے پر ہے تو میں اللہ کے ارشاد ''وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ'' پر نظر رکھتے ہوئے اور اس سے اپنی مغفرت کی امید کرتے ہوئے اس بندے کو بری کر چکا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعائے خیر و رحمت کرتا ہوں، الفرقان میں اس کا اعلان بھی غالباً ایک دفعہ سے زیادہ کر چکا ہوں، الغرض اگر بالفرض آپ پر اس عاجز کا کوئی اس طرح کا حق ہو تو آپ اس سے بری ہیں، آپ کے لیے دنیا و آخرت کی خیر و فلاح کی دعا کرتا ہوں اور خود دعا کا محتاج و طالب ہوں۔ اللہ ہم سب کی چھوٹی بڑی غلطیوں کو معاف فرمادے اور فضل و کرم کا معاملہ فرمائے۔

(یہ عریضہ رجسٹری سے ارسال کرنے کا ارادہ ہے تاکہ پہنچنے کے بارے میں اطمینان رہے) والسلام

منظور نعمانی

لکھنؤ ۶/ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ

برادر مکرم مولانا محمد انظر شاہ صاحب زید مجدکم

سلام و رحمت

خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔ میرے ایک خط کے جواب میں آپ کا عنایت نامہ غالباً اوائل رمضان میں ملا تھا، اس کا جواب میں نے رمضان مبارک کے بعد لکھا اور سادہ ڈاک ہی سے بھیج دیا تھا، اس میں آپ کو لکھا تھا کہ اس کی وصولیابی کی اطلاع مجھ کو

دے دی جائے تاکہ اطمینان ہو کہ آپ کو مل گیا۔

لیکن آپ کی طرف سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید میرا وہ خط آپ کو نہیں ملا، اس صورت میں آپ کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ میں نے جواب نہیں دیا، حالاں کہ آپ کے عنایت نامے میں بعض باتیں ایسی تھیں جن کا جواب میرے لیے ضروری تھا، خاص کر بھائی ازہر شاہ صاحب مرحوم کے حادثۂ انتقال پر خط بھی نہ لکھنا۔

یہ سطریں اس وقت صرف اسی غرض سے لکھ رہا ہوں کہ اگر میرا خط نہ ملا ہو تب اسی سے مجھے مطلع کر دیا جائے، اگر ملا ہو تو ایک کارڈ پر دو سطر لکھ کر اس سے مطلع کر دیا جائے، خدا کرے یہ عریضہ آپ کو مل جائے اور آپ کا جواب بھی مجھے مل جائے۔ دعا گو اور طالب دعا ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
لکھنؤ، ۲۶ / ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ

برادرم مکرم مولانا انظر شاہ مسعودی صاحب احسن اللہ الیکم والینا

سلام مسنون

عنایت نامہ مؤرخہ ۲۳ / جولائی موصول ہوگیا، مجھے صرف یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ میرا عریضہ آپ کو ملا یا نہیں، خیال تھا کہ اگر ڈاک کی بدنظمی کی وجہ سے نہ ملا ہوگا تو آپ خیال کریں گے میں نے اطلاع ورسید سے بھی بے اعتنائی برتی۔

عنایت نامے سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ میرا پہلا عریضہ بھی پہنچ گیا تھا اور دوسرا بھی مل گیا تھا، فالحمد للہ۔

کوئی انتہائی احمق ہی ہوگا جو سمجھتا ہو کہ آپ یا آپ کے رفقاء دارالعلوم سے اس

بے تعلقی کی وجہ سے معاشی تنگی اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے، اگر آپ مجھے اس درجے میں سمجھتے ہیں تو میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ بفضلہٖ تعالیٰ میرا یہ حال نہیں ہے۔

جہاں تک یاد ہے بھائی مولوی ازہر شاہ صاحب کے حادثہ پر خط نہ لکھنے کو میں نے بغیر کسی تاویل اور عذر و معذرت کے اپنی تقصیر ہی لکھا تھا، شاید یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس معاملے میں اس سے بھی زیادہ قصوروار ہوں جتنا آپ سمجھتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی اصلاح فرمادے اور معاف فرمادے۔

آپ نے اس عنایت نامہ میں جو چند ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جن کا میری ذات سے تعلق نہیں ہے اور مجھے ان کے بارے میں ذاتی علم بھی نہیں، میں ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا؛ لیکن جو باتیں خود مجھ سے میرے کسی قول یا فعل یا حال سے متعلق ہیں یا جن کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر علم ہے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ان میں اکثر و بیشتر بالکل بے اصل اور خلافِ واقعہ ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے ان کو صحیح اور واقعی سمجھ کے ہی لکھا ہوگا؛ کیوں کہ جس مقصد سے زحمت فرما کے یہ دس صفحہ کا عنایت نامہ لکھا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کوئی ایسی بات نہ لکھیں جس کو صحیح نہ سمجھتے ہوں یا احتمال ہو کہ وہ میرے نزدیک صحیح نہ ہوگی، مجھے ان باتوں کے بارے میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں لکھنا ہے جس کے سامنے جانا ہے (اور بظاہر میرے لیے وقت زیادہ دور نہیں ہے) وہ علیم وخبیر اور سمیع و بصیر ہے۔

خاص کر چند باتیں عنایت نامہ میں ایسی تھیں جن کے بارے میں لکھنے کا تقاضا خود میرے دل میں بھی پیدا ہوا (ان کا تعلق مجھ سے نہیں بعض دوسرے حضرات سے ہے) لیکن لکھنا لاحاصل سمجھا۔ آخری بات یہ ہے کہ میں نہ فہم و فکر میں محفوظ عن الخطا ہوں، نہ عمل میں، بالکل ممکن ہے کہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں؛ لیکن دارالعلوم کے معاملات میں میں نے جو کچھ کیا، صحیح وصواب سمجھ کر کیا، اگر خطا اور غلطی ہوئی ہے تو ربّ کریم سے معافی کا خواستگار اور امیدوار ہوں۔

دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں۔ والسلام

چوں کہ میں اس سلسلے میں خط وکتابت کو اب مفید نہیں سمجھتا، اس لیے آپ مجھے بھی معذور تصور کریں اس میں ہرگز کسی ناگواری کے تاثر کو دخل نہیں ہے، واقعہ یہی ہے۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

باسمہ تعالیٰ

برادر مکرم محترم زید معالیکم

سلام مسنون

مولوی محمد صدیق گونڈوی نے آپ کا ملفوف پہنچایا، میں تو آپ کے لکھنے سے بھی نہ سمجھ سکا کہ ''توارد'' میں کیا گناہ ہے! اور پھر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے اس لفظ کے اثر سے مجھ میں کچھ انقباض بھی محسوس کیا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ! مجھے تو آپ کا یہ خط پڑھنے سے پہلے کبھی وہم اور وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ آپ سے یا مجھ سے کوئی قصور ہوا ہے، مختصر یہ کہ از اوّل تا آخر واہمہ کی کرشمہ سازی ہے اور شاید دارالعلوم کی خاص فضا میں اب ان چیزوں کی بڑی پیداوار ہے۔

۲۶ رشعبان کو پھر حاضر ہونا ہے، اگر ملاقات ہوئی تو آپ کو زبانی مطمئن کرنے کی بھی کوشش کروں گا، آپ سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی عفا عنہ

***

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، نزاکت ونفاست سرمایۂ زندگی، رنگ پکا، داڑھی نہ عام مولویوں کی طرح دراز، نہ متنورین کے انداز میں فرنچ کٹ، سر پر انگریزی بال، بالوں کی ٹوپی، شیروانی لازمۂ پوشاک، غالباً ضلع بجنور وطن، وطن ثانی آگرہ، اکبر آبادی نسبتِ وطن باقی وطنی نسبتوں پر غالب، مولانا متمول گھرانے سے تعلق رکھتے، والد ڈاکٹر پیشہ، پھر خدا جانے کیا بات پیش آئی کہ بجائے اسکول وکالج کے دینی درس گاہوں کا رخ کیا، اور مختلف گھاٹوں کا پانی پیتے ہوئے دار العلوم دیو بند آ پہنچے، دورۂ حدیث علامہ کشمیریؒ سے پڑھا اور باختصاص شاگردوں میں شمار ہوئے، دیو بند میں خوش قسمتی سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سے راہ ورسم ہوئی جو پھر اٹوٹ تعلق کی شکل اختیار کر گئی، اس تعلق نے حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سے بھی قریب کیا۔

دیو بند میں تحریک کا آغاز ہوا تو ''مہاجر'' اخبار میں لکھنا شروع کیا، لکھتے لکھتے ہندوستان کے معروف انشاء پرداز گردانے گئے، بہت سی کتابوں کے مصنف، لیکن ہر موضوع پر انشاء کا غلبہ، جو قافلۂ علمی دیو بند سے بجانب گجرات رواں دواں ہوا ان کے رکن تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کے عہدے پر فائز رہے، مدارس میں مشاہرے قلیل، اضافۂ تنخواہ کی درخواست کے مسترد ہونے پر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ٹھانی، ڈابھیل میں وداعی ملاقات علامہ کشمیریؒ سے ہوئی تو فرمایا کہ ''مولوی صاحب! آپ نے ہم سے تنخواہ کے اضافہ کے لیے گفتگو نہیں کی، ورنہ میں اس مہم میں آپ کا معاون ہوتا، اچھا جایئے خدا تعالیٰ آپ کو ایم اے کرائے۔'' ''گفتہ او گفتہ اللہ بود'' ایم اے پر گاڑی رک گئی، حالاں کہ بہت سے تلامذہ نے ان کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی

ڈگریاں لیں۔

دہلی میں [illegible] کالج میں عہدۂ تدریس پر رہے، یہاں سے [illegible]
عالیہ کلکتہ میں پرنسپل کی حیثیت سے پہنچے، انگریزی ماحول کا دور تھا، [illegible]
کلکتہ میں اپنے لیے تدریس کی خواہش ظاہر کی، موصوف کا جواب [illegible]
وہاں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر [illegible]
ہوئے، یہاں سے ریٹائرڈ ہوئے تو حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کے ادارے [illegible]
ہوگئے، خاتمۂ عمر پر دارالعلوم کی شیخ الہند اکیڈمی سے وابستہ تھے۔ آزاد روش [illegible]
زندگی کے ہر پہلو پر اس کا رنگ نمایاں۔ اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ سے نسبت [illegible]
علی گڑھ میں اپنی زیر نگرانی سب سے پہلا مقالہ برائے P.H.D. (پی-ایچ-ڈی)
علامہ کشمیریؒ پر ہی تیار کرایا۔ ذاتی صلاحیتوں و خوبیوں کے باوصف مولانا مفتی عتیق
الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کی امانت پوری زندگی میں حاصل رہی، یہ تعلق بڑھا [illegible]
خصوصی ارتباط دارالعلوم کے حالیہ قضیہ میں حیرت انگیز رنگ اختیار کرگیا اور دونوں
مرحومین میں بظاہر یگانگت، حقیقتاً بعد المشرقین تھا۔ کہ مفتی صاحب مولانا قاری محمد طیب
صاحبؒ کے موقف کے مضبوط مؤید، جبکہ اکبرآبادی صاحب دوسری جانب میں، چونکہ
یہ راقم الحروف بھی قاری صاحبؒ کی جماعت کا فرد تھا؛ اس لیے اب ملاقاتیں لیے دیے
انداز میں ہوتیں، صبح گاہی سیر و تفریح کے عادی تھے اور میں اسی مرض کا پرانا مریض،
تفریح گاہ کی سڑک بھی ایک تھی، یونہیں کبھی کبھی دوچار ہوتے، پرانی روایات کے حامل
تھے، رکتے اور خیریت دریافت فرماتے۔

بعارضۂ کینسر مبتلا ہوئے اور کراچی کی سرزمین پر آخری سانس لی۔ اب دارالعلوم
کراچی کے گورستان میں اپنے قدیم استاذ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ
کے ساتھ محوِ خواب استراحت ہیں۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ۔

***

برادر عزیز و مکرم! السلام علیکم

آپ کا خط آیا تھا، مگر افسوس ہے کہ اب مصروفیتوں کا یہ عالم ہے کہ خط کا بروقت ...اب دینا بھی مشکل ہے، آپ کا شکوہ شکایت بجا سہی؛ لیکن اصل یہ ہے کہ آپ کو ...رسے کے حالات کا علم نہیں، آپ اس کو دور سے دیکھ رہے ہیں اور اس میں شک نہیں ...کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تنخواہیں زیادہ ہیں، کام کم ہے، چھٹیاں بہت ہیں، سرکاری مدرسہ ...ونے کی وجہ سے عافیتیں کافی ہیں، مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سرکاری درس گاہ ہے، ...ر چیز قاعدہ قانون کے تحت ہوتی ہے، میں تم سے کبھی غافل نہیں ہوا، برابر خیال میں ...وں؛ لیکن کوئی جگہ تو خالی ہو؟ یوں تو پرنسپل جس کو چاہے اور جب چاہے نہیں رکھ سکتا ...ہے، ایک تم ہی نہیں، جانے کن کن لوگوں نے لکھ رکھا ہے، ہر مولوی کی نگاہ مدرسہ عالیہ کلکتہ پر ہی پڑتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو جگہیں پُر ہیں وہ روز روز خالی نہیں ہوتیں اور نئی کوئی اور جگہ گورمنٹ نے پیدا نہیں کی ہے، اب ان حالات میں میں کروں تو کیا کروں؟ ...چھا یہ بتاؤ کہ تم دیوبند میں کون کون سی کتابیں پڑھا رہے ہو؟ تنخواہ کیا ہے؟ اور تم کو سب ...سے زیادہ کس فن سے دلچسپی ہے؟ ''دارالعلوم'' میں تمہارے مضمون پڑھتا رہتا ہوں ...ماشاء اللہ تم میں بڑی صلاحیتیں ہیں، اگرچہ نگرانی اور صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے، تعجب ...ہے کہ مولوی حفظ الرحمن اور مولوی عتیق اور مولوی محمد میاں وغیرہم کے مجلسِ شوریٰ میں ...ہوتے ہوئے بھی تم کو مدرسے سے شکایتیں ہیں، میں دیوبند آیا تو میں لازمی طور پر شاہ ...منزل میں قیام کروں گا، ورنہ وضع قدیم کے مطابق مفتی منزل میں، مگر خیر یہ فرق محض لفظی ...اور اعتباری سا ہوگا، ورنہ دونوں ایک ہی ہیں، تمہاری شادی ہوگئی یا نہیں؟ مخدومہ و محترمہ ...جنابہ والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام مسنون و مزاج پرسی، برادر عزیز میاں سیّد از ہر شاہ ...اور دیگر بھائیوں بہنوں کو دعائیں، حکیم صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام

مخلص سعید احمد

الحاج مولانا محمد میاں سملکیؒ

سملک جوڈابھیل سے بالکل متصل بستی ہے وہیں کے باشندے تھے، خاندانی طور پر زمین وجائداد کے مالک، ان کے والد آج سے ایک صدی قبل افریقہ منتقل ہو گئے، پھر خدا تعالیٰ نے وہ دولت عطا فرمائی کہ دوکان، فرم، مکانات، فیکٹریاں؛ بلکہ سونے کی کان تک کے مالک رہے، مولانا محمد میاں دارالعلوم پڑھنے کے لئے آئے اور دو شخصیتوں کے عاشقِ زار بن کر رہ گئے، ایک والد مرحوم اور دوسرے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، ان کی غیر معمولی ثروت و دولت کی وجہ سے والد ماجد کو ایک حد تک ان سے بعد تھا، ادھر یہ عاشق سوختہ جگر، برائے تقریب عم محترم مولانا سیف اللہ شاہ صاحب سے تعلق دیدنی تھا، افریقہ روانہ ہونے لگے تو مشایعت کے لئے والد نے دہلی تک سفر کیا، اسٹیشن پر دونوں ایک دوسرے کے باچشم نم نہیں؛ بلکہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ بغل گیر ہوئے، حاجی صاحب افریقہ پہنچے لیکن استاذ کی یاد نے بے قرار رکھا اور پھر بعجلت واپس ہندوستان آ گئے، طبیعت عجیب پائی تھی، دھوبی ان کے کپڑے دھوتا، کبھی کچھ مانگتا تو نئے ڈھاکہ کی چکن کا کرتہ، چھالٹی کا پائجامہ، چلغوزوں وبادام سے لبریز تھیلیاں؛ بلکہ عید الاضحیٰ پر فربہ بکرا دے ڈالتے، کبھی حساب پر اترتے تو ایک ایک کپڑے کی دھلائی پوری کشمکش کے ساتھ دیتے، اسٹیشن پر قلی سامان اٹھانے کے لیے لمبی اجرت مانگتا تو بڑے بڑے بستر خود ہی سر پر اٹھا کر ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر چلے جاتے اور اسی وقت چائے مع فواکہات ڈبہ کے مسافروں کو بھی پلا دیتے، والد مرحوم کی شدید ڈانٹ ڈپٹ کو لقمۂ حلال سمجھ کر بہ بشاشتِ قلب ہضم کر جاتے، میری

ہمشیرہ راشدہ خاتون نے بچپن میں گڑیا کی شادی کی تو حاجی صاحب نے رئیسانہ جہیز کی تیاری کی، بازار سے کمخواب واطلس اور بنارس کی مشہور پوت گزوں کپڑا خرید کر لائے، سوئے اتفاق کہ معصوم بہن اس جہیز کو لے کر گھر میں داخل ہورہی تھیں تو والد ماجد عصر کے لیے باہر وضو فرمارہے تھے، نظر پڑ گئی، بچی سے سوال کیا، انہوں نے گھبرا کر سب کچھ بتادیا، اسی وقت حاجی صاحب کو حکم ہوا کہ:

"یہاں سے نکل جائیں، یہ صاحب اپنی ثروت سے ہمارا علم خریدنا چاہتے ہیں۔"

مولانا بدر عالم نے مجھ سے فرمایا کہ بارہا ان کی معرفت حضرت شاہ صاحب نے حاجی صاحب کو پیغام پہنچایا کہ آپ ہمارے پاس سے چلے جائیں، کہیں لوگوں کا یہ خیال نہ ہو کہ ہم نے آپ کو آپ کے تمول کی وجہ سے اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے ہی ہماری پرورش کی اور بعالم اسباب ہمارے رگوں میں دوڑنے والا خون حاجی صاحب کی دولت سیال ہے، گھر میں بیماری ہوتی یا کوئی تقریب، علیحدہ سے اس کے اخراجات بھیجتے، ہر عید الاضحیٰ پر والد مرحوم کے لیے ایک بکرے کی قربانی کرتے، یہ معمول ان کی اولاد نے بھی محفوظ رکھا۔ مجلسِ علمی ڈابھیل کو قائم کیا تا کہ اس سے اپنے محبوب استاذ کی تصانیف شائع کی جائیں اور بلاشبہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تمام تصانیف کو محفوظ کر گئے، مجھے اور میرے برادر اکبر مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کو خطوط لکھتے تو ان میں توبیخ، تہدید، شفقت آمیز تنبیہ وانتباہ ہوتا، بری باتوں پر ڈانٹتے، کوئی اچھی خبر پہنچتی تو بڑے بھائی کے انداز میں انعام دیتے۔

خوب یاد ہے کہ میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تو ایک سو چھ روپئے کا منی آرڈر بطور انعام ان کی جانب سے موصول ہوا، والدہ مرحومہ نے حج کی تمنا ظاہر کی تو دو سوالات قائم کیے، اوّل یہ کہ کیا آپ تمام عبادات کا اہتمام کرتیں ہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر حج کا شوق دامن گیر ہے تو خود کتنی رقم پس انداز کی ہے؟ اس کے باوجود فرسٹ کلاس سے ان کے حج کا انتظام کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے لیے برادر اکبر نے کسی

پریشانی میں سفارش کی تو صاف انکار کر دیا کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر ہو چکے، اب ان کی مالی امداد جائز نہیں۔ خود کو دولت پر من جانب اللہ نگراں باور کرتے تھے۔ غیر مناسب جگہ کبھی خرچ کے لیے تیار نہ ہوتے، ہم کوئی واقعی مصرف کا پتہ دیتے تو اس کا اہل فرماتے۔ ہو سکے ہمیں بھی انعام سے سرفراز فرماتے کہ تم نے ایک حقیقی مصرف کی نشاندہی کی۔ جب وفات ہوئی تو اسی ظلوم وجہول نے خواب میں دیکھا کہ جنت بریں میں ہیں اور فرما رہے تھے کہ یہاں میرے بہت سے بینک ہیں، ساٹھ اور ستر کے درمیان ذیابیطس میں مبتلا ہو کر بینائی سے معذور ہوئے پھر جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ استاذ وشاگرد کے مخلصانہ تعلق کی یہ زرّین داستان اور پوری تاریخ میں یہ بے نظیر شخصیت ان شاء اللہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

برّد اللہ مضجعہ

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجمعہ ۴ر جمادی الاول ۱۳۷۱ھ ۱ر فروری ۱۹۵۲ء

برادر محترم زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ یہاں امن وعافیت ہے، امید ودعا کہ آپ سب بخیر عافیت ہوں۔

آپ کے گرامی نامہ سے محترمہ والدہ صاحبہ کے خواب کی بشارت مسرّت بخش ہوئی فللّٰہ الحمد، جزاکم اللہ۔ آپ نے اطلاع فرما کر ممنون کیا، امید کہ اب بہن راشدہ سلمہا اور اہلیہ برادر حافظ محمد ازہر شاہ سلمہٗ صحت یاب ہو گئے ہوں گے۔ عافاکم اللہ وحفظکم جمیعاً۔

گذشتہ جمعہ کو بھائی حافظ ازہر شاہ سلمہٗ کے پتے پر سولہ پاؤنڈ کا منی آرڈر بھیجا ہے جو ان شاء اللہ وصول ہو گیا ہوگا، اس میں چار پاؤنڈ بھائی حافظ محمد ازہر شاہ صاحب کے

لیے اور چار پاؤنڈ آپ کے لئے ہے، بقیہ آٹھ پاؤنڈ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہٗ کی خدمت میں ہدیہ پیش فرمادیں، مولانا مدظلہٗ کے علمی مضامین رسالہ دارالعلوم، الفرقان، برہان وغیرہ میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مضامین سے بہت فائدہ بخشا ہے، شکریہ وسلام مسنون وادعیہ خالصہ کے ساتھ یہ مبلغ پیش فرمادیں، مولانا کا پورا پتہ انگریزی میں لکھ بھیجیں ولکم جزیل شکری۔ بھائی ازہر شاہ قیصر سلمہٗ کو یہ عریضہ دے کران سے میرے لئے اس کام کی امداد لیں، مولانا صاحب مدظلہٗ سے ان کے تعلقات ہیں۔

ازیں پیش حضرت والدہ صاحبہ کا عنایت نامہ صادر ہوا تھا، گھر میں سے میری والدہ صاحبہ، والدہ عبداللہ سلّمہٗ اور عزیزہ مریم سلمہا سلام مسنون عرض کرتے ہیں، اب الحمدللہ سب اچھے ہیں۔

بھائی حافظ ازہر شاہ سلّمہٗ، ماموں صاحب، بہن راشدہ سلمہا و مولانا سیّد محمد ادریس صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، بواپسی اپنے تعلیمی حالات کی اطلاع فرمائیے گا۔

والسلام واللہ یسلّمکم

احقر محمد ابن موسیٰ میاں عفا اللہ عنہما

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الثلثاء ۳۰ ذوقعدہ ۱۳۷۲ھ

عزیز محترم! بارک اللہ لکم... وجمع بینکما فی الخیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ودعا کہ اس عریضے کے پہنچنے سے پہلے آپ کی شادی خانہ آبادی بخیر وخوبی وبرکت ہوچکی ہوگی، اللہ جل ذکرہٗ ہر طرح کامیاب وبابرکت فرماوے۔

اللّٰھم اجعلھا قرۃ العیون وراحۃ القلوب وأخرج منکما ذریۃ کثیرۃ مبارکۃ طیبۃ.

گذشتہ ہفتہ میں سولہ پاؤنڈ کا منی آرڈر روانہ ہوا ہے، وصول وقبول فرما کر نوازیں، نصف ولیمہ کے لیے ہے اور نصف دلہن کے لیے ہدیہ شادی مبارک ہے۔ سلام مسنون تہنیت وتبریک کے ساتھ پہنچادیں۔ ولکم جزیل شکری.

محترمہ والدہ صاحبہ، بھائی حافظ محمد ازہر صاحب، ماموں جی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔

والسلام علیکم یبارک فیکم

احقر محمد ابن موسیٰ میاں عفا اللہ عنہما

الاثنین ۴ رجب ۱۳۷۴ھ

مخلص ومحبّ محترم دامت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

محترمہ والدہ صاحبہ سلمہا اور آپ کے گرامی نامہ سے خیر وعافیت معلوم ہوکر اطمینان ہوا۔ فللہ الحمد

آپ حضرات نے عزیزان موسیٰ میاں وآمنہ سلمہا کے ساتھ جو محبت وشفقت فرمائی، اس کے لیے ہم سب شکر گزار ہیں۔ یجزیکم اللہ خیراً ویزید کم فضلہ. الحمد للہ یہاں پر خیر وعافیت ہے۔

"حیاتِ انور" کے پڑھنے سے یہ احساس بڑھ گیا کہ ہنوز حضرتؒ کے مخطوطہ تبرکات مختلف جگہ ناقدری سے بکھرے ہوئے ضائع ہو رہے ہیں، کیا اچھا ہو اگر آپ توجہ فرما کر خصوصاً چھٹیوں کے ایام میں ان کو جمع ومرتب فرما کر ضائع ہونے سے بچالیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی استعداد سے نوازا ہے، آپ پر حق بھی ہے اور علمی مشغلوں سے یہ کام بہت مقدم وبہتر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ "آثار السنن" کا ایک نسخہ حضرتؒ کے پاس تھا، جس پر حوالے اور مضامین تحریر فرمایا کرتے تھے وہ ضرور کہیں گھر میں ہوگا، اسی طرح اور

کتابیں اور مسودے، مضامین، خطوط وغیرہ بھی کتابی دستیاب ہوں گے حضرت
الله کی اپنی بہت سی کتابیں تھیں اور دارالعلوم کے کتب خانے کی کتابیں بھی پاس
تی تھیں، ان پر بھی بہت کچھ لکھا ہوا ملے گا۔ بہتر ہے کہ حضرت مولانا عزالدین
صاحب، مولانا سید محمد ادریس صاحب، مولانا سید احمد رضا سے مشورہ لے کر اس
کام کی طرف فوری توجہ فرمائی جائے واللہ یکون فی العون اگر کتابوں کی فہرست تیار
ہو جائے تو ایک نقل یہاں بھی بھیجیں گا۔

مورخہ ۲۲ رفروری کو آٹھ پاؤنڈ کا منی آرڈر آپ کے لیے ہدیہ روانہ ہوا ہے
وصول وقبول فرما کر نوازیں۔ ولکم الفضل والمنۃ.

محترم بھائی حافظ محمد ازہر شاہ صاحب سلمہ کے لفافوں سے ان کی اپنی حالت اور
آپ کے اخیری مکتوب میں مکرمہ اماں جی صاحبہ سلمہا کی ناسازی طبیعت کے احوال معلوم
ہو کر پریشانی ہوئی۔ امید و دعا اس عریضے کے پہنچنے تک دونوں مخدوموں کی صحت اچھی
ہو گئی ہوگی۔

یہاں سے محترمہ والدہ صاحبہ اہلیہ و مریم سلمہا: اماں جی صاحبہ مخدومہ کی خدمت
میں سلام مسنون لکھواتے ہیں بچوں کے لیے پیار و دعا۔ والسلام

الحمدللہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی یاد بہت تازہ ہے، لیکن ان کی کوئی تصویر
فوٹو میرے پاس نہیں۔

احقر محمد ابن موسیٰ عفا اللہ عنہما

* * *

مولانا حکیم سیّد محفوظ علی صاحبؒ

خاکسار کے ماموں، یعنی حضرت شاہ صاحب مرحوم کے برادر نسبتی، گنگوہ کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے، دیوبند پڑھنے کے لیے آئے تو یتیمی کا دور شروع ہو چکا تھا، بڑی عسرت سے طالب علمی گزاری، طلبہ سے بچی ہوئی روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے لیتے، نمک اور پانی میں تر کرتے اور اسی سے وقت گزارتے، حضرت شاہ صاحب سے دورۂ حدیث پڑھا اور اپنے بہنوئی کے ایسے معتقد کہ ان کے علاوہ کسی کو عالم و فاضل نہ گردانتے، دارالعلوم میں مدرّس ہوئے؛ لیکن تدریس سے مستعفی ہو کر شاہ صاحب سے طب کی کچھ کتابیں پڑھیں، پھر آپ کی وساطت سے ہندوستان کے نامور طبیب حکیم عبدالوہاب نابینا دہلوی کی خدمت میں کچھ سال نسخہ نویسی کی، وراول (مہاراشٹر) پہنچے تو تدریس کے ساتھ مطب بھی شروع کیا، وہاں سے اٹھے تو دیوبند آکر باقاعدہ مطب کا آغاز کیا، نباضی، حذاقت اور اپنے فن پر عبورِ کامل میں بے نظیر تھے، جنون، مالیخولیا، بہت سے امراض کے کامیاب علاج میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا، اپنے فن سے شغل کا یہ عالم تھا کہ ہمہ وقت اسی کا مطالعہ اور اسی کی تدریس میں مصروف رہتے، بہت سے طلبۂ دارالعلوم نے ان سے طب پڑھی جن کا کامیاب مطب ہے، نبض کی بعض اقسام خود ان کی دریافت کردہ تھیں، مشہور و قدیم نسخوں میں ردّ و بدل کر دیتے، پرانی ادویہ تیار کرتے اور ان کا نام اس طرح بدلتے کہ وہ ان کے دواخانے کے سوا کہیں دستیاب نہ ہوتیں، مثلاً جوارش شاہی کا نام جوارش ملوکی رکھ چھوڑا۔ بڑے مہمان نواز، غریب دوست، جوادطبع اور سخاوت پیشہ انسان تھے۔ کھانے کے اس قدر شوقین کہ ہانڈی میں گھی کے سوا پانی نہ ڈالا جاتا، الوان و اقسام کے کھانے پکاتے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے، اگر کوئی

ہوش مند مہمان کھانے کی تعریف کرتا تو بار بار کھانے پر طلب فرماتے، گھر میں کوئی تقریب ہوتی اور شہر کی عورتوں کا اجتماع ہوتا وہ کھاپی کر رخصت ہوتیں تو مرحوم کے لیے اپنی بیویوں سے گفتگو سے ایک نیا موضوع نکل آتا، ہفتوں ایک ایک عورت کا نام لے لے کر دریافت کرتے کہ اس نے کھانے کے بعد کیا تاثر ظاہر کیا۔ غریبوں کو مفت دوا دے ڈالتے، رئیسوں کی جیب کاٹ لیتے، لیکن سارا سرمایہ کھانے ہی کی راہ اڑا ڈالا۔ مزاج اس قدر تیز کہ اردو میں انہیں آگ بگولہ ہی کہا جاسکتا ہے، شاید رہائشی محلے کا کوئی آدمی ہوگا جوان کے دستِ عتاب کا شکار نہ ہوا ہو، دوپہر کو سوتے تو گھر میں کسی بچے کی مجال نہ تھی کہ آواز نکالے، بلاوجہ بھی غیظ وغضب میں ڈوبے رہتے، ہم بچوں نے ایک بار ابتدائی تقریروں کی مشق کی جس میں تعلیم الاسلام مصنفہ مفتی کفایت اللہ کے کچھ اجزاء سنائے گئے، مقررین کا جتھا گھر واپس آیا تو ماموں مرحوم نے ہر ایک کی تواضع پاؤں کے جوتے سے کی، اس عجیب وغریب عزت افزائی کی وجہ آج تک معلوم نہ ہوسکی، ان کے اسی اشتعال؛ بلکہ سیمابی طبیعت کو سامنے رکھ کر ''پارہ قائم النار'' کی ان پر پھبتی کسی تھی۔ دارالعلوم سے خود مستعفی ہوئے، حضرت شاہ صاحب سے استعفیٰ دلوایا، مولانا شبیر احمد عثمانی کے یہاں پہنچے تو انہیں بھی مستعفی کر کے دارالعلوم سے نکال لائے، خاتمہ زندگی پر دارالعلوم نے شعبۂ طب میں خدمات حاصل کیں، چند روز بعد استعفاء دے کر گھر جا بیٹھے، چار شادیاں کیں، بچوں کی ایک کھیپ اپنے پیچھے چھوڑی یعنی دو درجن کے قریب۔ دس سال ہوتے ہیں کہ مرضِ فالج میں مبتلا ہوکر جمعہ کے روز بعمر ۷۰ سال انتقال فرمایا۔ عجیب اتفاق کہ بادل گھر کر اٹھا اور ان کی موت پر آنسو بہاتا ہوا نکل گیا؛ حالاں کہ میت کے دوش پر آنے سے پہلے آفتاب دوشِ فلک پر سوار، تیز شعاعوں کے تازیانے جامد زمین پر برسا رہا تھا، حضرت شاہ صاحب کے قدموں کے نیچے ابدی خواب گاہ ہے ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

***

مولانا حکیم عبدالرشید صاحب

قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پوتے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، حاذق طبیب اور گوشہ نشین دانشور، لباس و پوشاک نفیس، گفتگو نستعلیق۔ ان کی اردو عرب کے صحرا سے اس طرح گذری کہ اردو برائے نام اور عربی کا غلبہ تمام، حافظہ بے نظیر، مضامین مستحضر، بولنے پر آتے تو بے تکان بولے چلے جاتے۔ ناز میں پلے ہوئے، نیازمندی سے بہت دور، مرزا مظہر جان جاناں نے لکھا ہے کہ "نازک مزاجی لازم صاحبزادگیست" مرزا مرحوم کے اس قول کی تصدیق حکیم صاحب کو دیکھ کر کرنا پڑتی ہے، مشہور مقولہ ہے کہ بیوی اور خادم کسی کے معتقد نہیں ہوتے، خاکسار کی جانب سے اس میں صاحبزادوں کا بھی اضافہ کرنا چاہیے؛ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حکیم صاحب کو حضرت شاہ صاحب مرحوم سے بے پناہ عقیدت تھی، خاکسار سے فرمایا کہ میں جب دارالعلوم میں پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحب کو ارادتاً پہروں دیکھتا اور یہ سوچتا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفتار و گفتار، آپ کی نشست و برخاست، قعود و قیام، لباس و پوشاک، اندازِ کلام و گفتگو اس طرح ہوگا۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں حکیم صاحب کا یہ تأثر توثیقی سرٹیفکیٹ ہے۔ حکیم صاحب علم دوست، صاحبِ مطالعہ اور وسعتِ معلومات کے خزانہ تھے، ایک زمانے میں جماعتِ اسلامی سے متاثر رہے اور اس کے کاروبار میں عملی حصہ بھی لیا، پھر نسبتِ حضرت گنگوہیؒ کام آئی تو عالم بیزاری میں جماعت اسلامی سے متعلق

اپنے تأثرات ''مکتوباتِ ثلاثہ'' کی شکل میں پیش فرمائے، جس میں تحریک کے ان جلی، خفی خدوخال کو نمایاں کیا جو عام لوگوں کی نظروں میں نہیں، سیّد ابوالاعلیٰ صاحب ان مضبوط تعقبات کا کوئی معقول وسنجیدہ جواب نہ دے سکے تو ''حکیم گل بنفشہ نویس'' و ''مصروف ہوالشافی'' کی جلی کٹی سنا کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرلیا۔ ایک بار حکیم صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا ممبر منتخب کیا گیا، ہندوستان کے دینی ماحول میں یہ بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن موصوف کی بے نیازیاں، صرف ایک بار شوریٰ میں شرکت فرمائی، پھر مستعفی ہوکر گھر بیٹھ رہے۔ عمومی مشغلہ مطالعہ تھا، تھوڑی دیر کے لیے مطب کرتے اور روزمرّہ کے اخراجات پورے ہونے پر مطب سے اٹھ کر پھر علم و تحقیق کے دریا میں غوّاصی ان کا محبوب شغل تھا۔

برّد اللہ مضجعہٗ

* * *

مولانا ادریس صاحب رحمہ سکروڈھوی

ضلع سہارنپور میں بھگوان پور کے قریب ایک بستی ''سکروڈہ'' نامی ہے، یہ مسلم راجپوت اور سادات کی مشترکہ آبادی ہے، موصوف یہیں کے باشندے تھے۔ دیو بند پڑھنے کے لیے آئے تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پہنچادیا، پھر انہوں نے ایسی جم کر خدمت کی کہ چالیس سال کے طویل عرصے میں کبھی جدا نہیں ہوئے۔ دارالعلوم دیو بند سے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے امتحان دینے کا شوق چرایا تو بلا اطلاع غائب ہو گئے، کچھ عرصے بعد حضرت شاہ صاحب کو معلوم ہوا کہ لاہور میں ہیں، استاذ اپنے شاگرد کی مخلصانہ خدمت سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ ان کے تعاقب وتلاش میں لاہور پہنچے، مولانا ادریس صاحب لاہور پہنچنے کے ساتھ ہی ''اپٹوڈیٹ'' بن گئے، شاہ صاحب نے اپنی پوشاک پہنائی اور پھر دیو بند لے آئے، اس کے بعد فرار کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ دارالعلوم دیو بند میں مدرس رہے اور پھر ڈابھیل میں بھی؛ مگر علم سے واجبی ہی تعلق تھا، تمام تر توجہات تجارت کی طرف تھیں، یوپی کا سامان مثلاً کھڑاؤں، مسواک، کھدر کے تھان کھینچ کر گجرات لے جاتے اور گجرات کی مشہور اشیاء کو یوپی میں درآمد کرتے۔ کھانا پکانے کا خاص ذوق تھا، حضرت شاہ صاحب کی چائے ہمہ وقت تیار رکھتے؛ بلکہ حلوۂ گذر شب دیگ اور طرح طرح کی ہانڈیاں پکاتے، گاجر کا حلوہ موسم سرما میں تیار کرتے، جس کی صورت کسی کو دیکھنا نصیب نہ ہوتی، خود بھی اس میں روزانہ بہ مقدار ایک چمچہ اٹھاتے، نہایت جزرس تھے۔

پان کے شوقین اور خود شاہ صاحب بھی پان کے متوالے، اس لئے دورانِ درس بھی چھالیاں کاٹنے کا شغل رہتا، کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ اس پر عتاب فرماتے کہ ''میرے پاس مدت سے ہے اور کوئی علمی استفادہ نہیں کیا، گاہے گاہے خادم بھی مخدوم سے الجھ جاتا۔ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد بیشتر وقت ڈابھیل میں گذرا۔ فن ریاضی وہیئت میں طبیعت نافذ تھی۔ عمر کا آخری حصہ دہلی کے ''مدرسہ حسین بخش'' میں مدرسی کرتے ہوئے بیتا، یہیں دلّی میں گھنٹہ گھر کے قریب ایک مسجد میں امامت کرتے۔ مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو ان کے داماد مظفر نگر لے آئے، وہیں کی خاک میں آسودۂ خواب ہیں، اولادِ ذکور میں کوئی نہیں، صرف تین لڑکیاں تھیں، سب سے چھوٹی شاہجہان بیگم بعالم شباب رخصت عالم جاودانی ہوئیں، ایک لڑکی بابو محمد ظفر نصیب کے نکاح میں ہیں، تیسری لڑکی مولانا محمد بشیر صاحب کے نکاح میں ہیں جو خود بھی شاہ صاحب کے تلامذہ میں ہیں۔ ان ہی مولانا بشیر احمد صاحب کی لڑکی یعنی مولانا محمد ادریس صاحب کی نواسی، شاہ صاحب کے فرزندِ اکبر مولانا ازہر شاہ قیصر مدیر رسالہ ''دار العلوم'' کے حبالہ عقد میں آئیں۔

***

مولانا محمد اسمٰعیل گارڈیؒ

ڈابھیل گجرات کے باشندے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شاہ صاحب
کے تلمیذ تھے۔ ان کے والد افریقہ پہنچے، معمولی کاروبار سے ابتدا کی، پھر رئیس التجار
ہو گئے۔ مال و دولت کا یہ عالم ہے کہ اس کی صحیح حیثیت خاندان کے افراد کو بھی معلوم
نہیں، ان کا سرمایہ افریقہ، بمبئی اور بہت سے شہروں میں پڑا ہوا ہے۔ اپنی بستی میں مولا
اسماعیل صاحب گارڈی نے ایک ہسپتال عام پبلک کے لیے کھولا جس سے عوام کو طبی
سہولتیں مفت مہیا کی جاتی ہیں اور اس بستی میں بجلی اور پانی کا بھی انتظام کیا، نوساری
میں ایک مسافر خانہ بھی ان ہی کے امداد و تعاون سے چلتا ہے، ڈابھیل کے مدرسے کی تعمی
اور کچھ سال تن تنہا اس کے متکفل رہے، تجارت میں صبح و شام و شب و روز کی مشغولیت
کے باوجود علم تازہ، مضامین مستحضر اور بڑے خوش نویس تھے، مثنوی مولانا روم کے
عاشق اور دلچسپ وعظ کہتے تھے، خاکسار کے پاس کبھی کبھی گرامی نامہ آتا تھا تو نگارش
فاضلانہ و عالمانہ محسوس ہوتی، اب افریقہ کی سرزمین میں محوخواب ہیں۔

اللّٰھم برّد مضجعہٗ

***

حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ

نکلتا ہوا قد، گورا چٹا رنگ، گھنی داڑھی، آنکھوں پر چشمہ، دو پلی جو سرما میں گرم کپڑے کی ہوتی یا پھر بالوں کی بلند دیوار والی، شیروانی زیب تن۔ مرحوم میرٹھ کے مشہور علمی خاندان سے تعلق رکھتے۔ شہر کی قضا، عیدگاہ کی امامت انہیں کے خاندان سے وابستہ ہے، غالباً ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز دہلوی کا اردو ترجمہ ان کے مرحوم والد صاحب یا خاندان کے کسی فرد نے کیا۔ میرٹھ کے مدارس میں تعلیم کے بعد وہ دارالعلوم دیوبند پہنچے، حضرت علامہ کشمیری کے دور میں جو اصلاحی تحریک شروع ہوئی اس سے وابستگی رہی، علامہ مرحوم کے آخر سال کے چند ماہ جو تدریس میں گذرے قاضی جی اس میں شریک تھے، باقاعدہ فراغت حضرت مولانا مدنی مرحوم کے عہد میں ہے؛ لیکن قاضی جی انہیں چند ماہ کی تعلیم کو جو حضرت علامہؒ کے یہاں ہوئی اپنے لیے باعثِ صد افتخار گردانتے۔ اصلاحی تحریک کے دوران ان کے روابط تحریک کے اہم عناصر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ سے ہو گئے جو آخیر تک رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق آغاز سے تھا، فراغت کے بعد مشہور ادبی مجلّہ ''ادبی دنیا'' سے تعلق ہوا، خود میرٹھ سے ''الحرم'' جاری کیا، مختلف علمی مجلّات میں ان کے مضامین ہمیشہ شائع ہوتے، بعض عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا، ندوۃ المصنّفین سے تاریخ ملت شائع ہوئی۔ آخر میں جامعہ ملیہ دہلی کے شعبۂ دینیات سے وابستہ ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن، صائب الرائے تھے اور اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہتے۔ تنک مزاج ہونے کی بناء پر تند خو اور جلد غضبناک ہو جاتے۔ اس میں کچھ دخل ان کی بیماری کا

بھی تھا۔ ایک گروپ نے ان کو استعمال بھی کیا؛ لیکن دارالعلوم پر قبضے کے بعد ان کی رائے بدل گئی تھی، اور صراحتاً اس کا اظہار کرتے کہ قابض گروپ کو نیک نیت سمجھنے میں ان سے غلطی ہوئی۔ مراسلت ہمیشہ رہی اور میں ان کے مجلّہ ''الحرم'' کا مضمون نگار اور معاون رہا۔ دیوبند کی شوریٰ میں بھی نصرت فرماتے، دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد جناب محترم سیّد حامد صاحب سابق وائس چانسلر نے ذاتی طور پر مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے لیے میرے تقرر کی کوشش کی، اس کمیٹی برائے انتخاب کے رکن مولانا وحید الزماں کیرانوی بھی تھے جو میری تقرری کے خلاف تھے؛ لیکن مولانا تقی امینی نے انہیں سمجھایا کہ مولانا! یہ آپ کے مسئلہ کا بہترین حل ہے، اسے ہاتھ سے نہ کھویئے، بلا دیوبند سے تو ہٹے، ورنہ آپ کے لیے ہمیشہ مسئلہ بنا رہے گا۔ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نے اس نکتے کو فوراً سمجھ لیا اور یکا یک بدل گئے۔ انتخاب کے بعد چھ مہینے یونیورسٹی نے میرا انتظار کیا۔ اس زمانے میں جن چند مخلصین سے میں نے مشورہ ضروری سمجھا ان میں قاضی صاحب مرحوم بھی تھے۔ دارالعلوم پر قبضے کے بعد وہ بجھے بجھے رہنے لگے۔ شوریٰ میں تشریف لاتے تو ملاقات کے لیے ضرور وقت نکالتے، میرٹھ کے جلسوں میں میری شرکت ہوتی تو قاضی صاحب سے نیاز کا موقع ملتا، بعض خانگی مسائل بھی ان کی صحت کے لیے گھن کا کام کر رہے تھے۔ مزاجی اعتبار سے محتاط ناشگفتہ، متانت پسند، خاموش طبع بلکہ لیے دیے رہتے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی سے آخر میں قریبی اور گہرا تعلق رہا۔ ان کے ساتھ سعودیہ کا سفر بھی کیا تھا۔ غالباً پچھتّر سے زائد عمر فانی کی منزلیں طے کر کے میرٹھ کے گورستان میں ہمیشہ کے لیے آرام گیر ہو گئے۔ خدا تعالیٰ وہاں کی نعمتوں سے انہیں سرفراز فرمائے، اولاد میں جناب قاضی زین الساجدین صاحب اپنے والدمرحوم کی مضبوط نیابت کر رہے ہیں۔

باسمہٖ تعالیٰ

برادرِ عزیز وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج سامی بخیر!

حضرت مولانا لدھیانوی کا حادثہ ایسا ناگہانی طور پر پیش آیا کہ دل کو اب تک قرار نہیں، میں انجمن حمایت اسلام کی کمیٹی میں شرکت کے لیے ان کے مکان پر ہی مقیم تھا، کمیٹی سے فراغت کے بعد ان کے حسب الحکم دوسرے دن کے لیے جانا ملتوی کر دیا، صبح کو ان کے ساتھ چائے پی، چائے پیتے ہوئے پُرلطف باتیں ہوئیں، پھر اندر تشریف لے گئے اور شاید ۱۰؍ منٹ بعد شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔

گھر میں جا کر دیکھا تو بے حس وحرکت لیٹے ہوئے تھے، دو تین چمچے عرق خمیرہ آمیز کے میں نے اپنے ہاتھوں سے حلق میں ڈالے جو اندر چلے گئے، ہونٹوں پر خفیف سی حرکت نمودار ہوئی اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ سے بڑی محبت تھی، اکثر والہانہ انداز میں ذکر کیا کرتے تھے اور حضرت شاہ صاحب کے تو عاشق تھے، آپ کا مضمون اپنا مضمون کٹوا کر کاتب صاحب کو لکھنے کے لیے دے دیا ہے، ان شاء اللہ رسالہ ۱۵؍ ستمبر کو شائع ہو جائے گا، آپ کی عنایت وکرم گستری کا شکریہ۔

زین العابدین غفرلہٗ

۱۹۵۶/۹/۶ء

باسمہٖ تعالیٰ

برادر مکرم ومحترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج سامی بخیر! مخدومہ ومحترمہ والدہ صاحبہ کی وصال کی خبر سن کر دلی افسوس ہوا، اس میں شک نہیں کہ موصوفہ عرصے سے تکلیفِ شاقہ برداشت کر رہی تھیں اور ان کے لیے موت اس اعتبار سے بھی کہ ان تکالیف سے رستگاری ہوئی زندگی ہی ہے؛ مگر بزرگوں کا سایۂ رحمت بے شمار برکات اپنے اندر رکھتا ہے، آپ کے لیے اور ہمارے لیے اس سے محرومی، بڑی محرومی ہے۔

گذشتہ مجلسِ شوریٰ کے موقع پر میں اور حضرت مولانا منظور احمد نعمانی صاحب بعد

حسرور دولت پر حاضر ہوئے تھے، تاکہ فریضۂ عیادت ادا کیا جاسکے، مگر آپ سے ملاقات شدہ ہوسکی تھی۔

بہرحال میری طرف سے آپ، برادر محترم مولانا ازہر شاہ صاحب اور دیگر اہل خانہ دلی تعزیت قبول فرمائیں اور اپنے غم میں برابر کا شریک تصور فرمائیں، اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرمائے۔

اخبار ''الجمعیۃ'' کی اطلاع میں جو کچھ پڑھا اس سے بے حد افسوس ہوا اور استاذ محترم حضرت خاتم المحدثین علامہ کشمیریؒ کے تدفین کے موقع پر ان حضرات اکابر کے کیرکٹر کی یاد تازہ ہوگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون! تعطیلات کے بعد سے ۱۵ر جولائی تک میرٹھ قیام رہے گا۔ والسلام

زین العابدین

قاضی منزل، قاضی وارہ، میرٹھ

۶۷/۶/۲۸ء

باسمہٖ تعالیٰ

عزیز گرامی! بخیر

نامۂ سامی موصول ہوا، شکرگزار ہوں کہ باوجود قلت وقت کے آپ نے ''الحرم'' کی توسیع اشاعت کے لیے جدوجہد فرمائی، ۲۰ خریداروں کا مشترکہ چندہ بھی مل گیا، میں آج کل رسالے کے سلسلے میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں، ہر ماہ خاصی رقم خسارے کی برداشت کرنا پڑ رہی ہے، بند کرتا ہوں تو اب تک پانچ سات ہزار روپئے جو لگا چکا ہوں ان کی واپسی کی بھی امید ختم ہو جاتی ہے، ان حالات میں جناب کا یہ علمی و عملی تعاون بڑا ہمت افزا ہے۔ دیوبند میں مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کی تشہیر و تعمیم کوئی نئی بات نہیں ہے، مجھ سے ایک مرتبہ حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری مدظلہٗ نے فرمایا کہ وہاں تو ارکانِ شوریٰ کے کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ان کے فیصلے باہر پہنچ جاتے ہیں، ارکانِ شوریٰ کے

علاوہ دیگر اصحاب بھی ان میں کوئی تامل نہیں فرماتے، یہ میرا تجربہ ہے۔

ترمذی شریف شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق جب آپ کو دے دی گئی تو آپ ہی کے پاس رہنی چاہیے، ۱۰ ارشوال کو عاملہ کے سلسلے میں دیوبند حاضری ہوگی اس وقت صحیح صورتِ حال کا علم ہو سکے گا، آپ کے لیے تو ابھی اپنی وہبی و کسبی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے بڑا امیدان ہے۔ میں تو آپ سے قلبی رابطے کی بنا پر وہ دن دیکھنے کا آرزومند ہوں جب آپ اپنے مقدس اور عظیم باپ کے جانشیں ہوں۔

میری رائے میں ابھی آپ کو ''ناظم تعلیمات'' کی حیثیت سے اپنی حیثیت کو مضبوط کرنا چاہیے، یہ واقعہ ہے کہ مختلف حیثیت سے اپنے علم وفضل، فہم ودانش اور تجربے کی بنا پر آپ ہی اس جگہ پر موزوں ترین شخصیت ہیں، اور یہ قائم مقامی کا دم چھلا نکل جانا چاہیے، میں نے اس سلسلے میں اس مرتبہ بھی کوشش کی اور اپنی رائے کا صاف اظہار کر دیا، مگر آپ کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی بعض ارکان نے حالت منتظرہ کو طول دینا مناسب سمجھا، اس منصب پر کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے مخالفین کی تعداد کم سے کم ہو، اس نقطۂ نظر سے بھی آپ کو بعض موقعوں پر ایثار کرنا چاہیے۔

آپ نے گروپ سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے یا دوسروں کا خیال نقل کیا ہے، میری اس سلسلے میں بھی آپ کے لیے رائے یہ ہے کہ آپ کسی گروپ سے تعلق نہ رکھیں، آپ کے لیے اور آپ کے منصب کے لیے یہی مفید ہوگا۔

دیوبند میں: بلکہ اس سے باہر میرے متعلق بھی اس رائے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ میں ''فلاں گروپ'' کا آدمی ہوں، حالاں کہ واقعہ صرف یہ ہے کہ میں بعض موقعوں پر برسرِ اقتدار اصحاب کی رائے کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیتا ہوں، یہ رائے محض ''دارالعلوم'' کے مفاد اور اپنی ذمہ داری کے تقاضے کی بنیاد پر ہوتی ہے؛ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرلیا جاتا ہے کہ میں ان کے مخالف گروپ کا رکن ہوں، پھر دوسرے گروپ کے

اصحاب اس کی تائید وتشہیر کرتے ہیں، اس سے اوّل الذکر جماعت کے خیال میں اور استحکام پیدا ہوجاتا ہے، نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ میری رائے کا وزن کم ہوجاتا ہے اور اسے ذاتی اور گروہی مخالفت پر محمول کیا جانے لگتا ہے اور دارالعلوم کی جو خدمت میں کرنا چاہتا ہوں وہی نہیں کرسکتا۔

آئندہ میں خود ہی اس تجربے کی روشنی میں احتیاط کروں گا۔

ہاں بخاری شریف جلد ثانی کے متعلق بھی آپ نے کچھ لکھا ہے، شوریٰ کی مطبوعہ کارروائی ابھی تک میرے پاس نہیں آئی ہے؛ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے وہ کسی صاحب کو دی جارہی تھی، مداخلت پر یہ طے پایا کہ فی الحال حضرت مفتی صاحب ہی کے نام رکھ دی جائے، اگر وہ تشریف نہ لائے تو دوسرا انتظام کیا جائے گا، خط طویل ہوگیا۔ اب اجازت چاہتا ہوں، میں ان شاء اللہ ۱۳ ر ستمبر کی دوپہر تک پہنچوں گا؛ کیوں کہ "انٹرویو" بھی لینا ہے جو ۱۳ ر ستمبر کو ہے، جدید خریدار اصحاب کے نام پرچے اگلے ماہ بھجوائے جائیں گے ان شاء اللہ؛ کیوں کہ اس ماہ کے بالکل ختم ہوچکے۔ عید مبارک ہو۔

والسلام

زین العابدین

۲ / ۷ / ۱۹۷۸ء

باسمہ تعالیٰ

الاخ الاعز الاکرم، سلمکم اللہ تعالیٰ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کرم نامہ مل گیا تھا؛ مگر دیوبند (جہاں عاملہ میں شرکت کے لیے گیا تھا) سے واپسی پر طبیعت خراب ہوگئی، اب بہتر ہوں، جواب میں تاخیر اسی وجہ سے ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔ مجھے حضرت العلامہ شاہ صاحبؒ سے زیادہ استفادہ کا (مولانا منظور صاحب، مولانا اکبرآبادی جیسے دوستوں کی طرح کہ انہیں حضرت سے مستفیض ہونے کا زیادہ موقع

ملا) موقع نصیب نہ ہوا، تاہم اس تھوڑی سی نسبت کو اپنے لیے دنیا آخرت میں باعث عزت سمجھتا ہوں اور اسی تعلق سے آپ لوگوں کو عزیز رکھتا ہوں، گذشتہ حوادث میں مبتلا ہونے کے باوجود ان پر بے حد متاسف ہوں اور الحمد للہ اپنے بزرگوں کی اولاد سے بے تعلق نہیں ہوں۔

ایامِ فتن کے زخموں کو کس طرح مندمل کیا جائے اور جماعت میں جو تفریق پیدا ہوگئی ہے اسے کس طرح دور کیا جائے، اس کے لیے اپنی سی ہر سعی کے لیے تیار ہوں، اس پر گفتگو کسی وقت بالمشافہ ہی ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ نے یونیورسٹی کے تعلق کے سلسلے میں اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے میں اصولاً متفق ہوں؛ اگرچہ علی گڑھ میں بھی اب دینی رجحانات ناپید نہیں ہیں، تاہم وہاں کی تدریسی سطح مرکزی دینی مدارس سے بہت پست ہے، کہاں سینکڑوں طلبہ کا حلقہ، کہاں پانچ سات ننچ نشیں طالب علم، پھر میری رائے میں آپ کو کم از کم ''ریڈر'' کے درجے پر وہاں جانا چاہیے، یہ غالباً ممکن تھا؛ مگر اب وہاں موجودہ وائس چانسلر جا رہے ہیں یا جا چکے ہیں؛ اس لیے آنے والے صاحب پر منحصر ہے۔ میں کل ایک کمیٹی میں علی گڑھ جا رہا ہوں، واپسی پر آپ کو میاں ڈاکٹر ساجدین صاحب سے مشورہ کر کے مطلع کروں گا، فی الحال آپ اقرار و انکار میں جلدی نہ کریں۔ میں دیوبند میں آپ سے ملنا چاہتا تھا، مگر کمیٹی کی مصروفیت اور خرابیٔ صحت سے مجبور تھا۔ مولانا اسعد صاحب کے وفاق المدارس کے جلسے میں جانا مناسب نہ سمجھا، میں وفاق کا مؤید ہوں؛ مگر اس کی مرکزیت اور اس کا نظم دارالعلوم کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں، معلوم نہیں انھوں نے وہاں کیا فیصلے کیے۔ الجمعیۃ سے کچھ معلوم ہو جاتا تھا وہ غریق رحمت ہوا، خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں، بچوں کو دعاء والسلام۔

زین العابدین

۱۳/ ۳/ ۱۹۸۵ء

٭٭٭

حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ

اصلاً دیوبند کے باشندے تھے، دیوبند کے محلّہ بنام ''دیوان'' میں آبائی مکان تھا، مظاہر علوم سہارنپور سے فراغت حاصل کی، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی اہلیہ کی جانب سے حضرت کے رشتے دار تھے، رنگون میں طویل قیام کے بعد تھانہ بھون مقیم ہوئے اور حضرت کے ایماء پر حدیث سے فقہ حنفی کے مستدلات بطرز مشکوٰۃ ''اعلاء السنن'' کے نام سے کئی جلدوں میں جمع کیے، مسلم لیگ کے شدید حامی تھے، غیر منقسم بنگال میں لیگ کو کامیاب بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا، پاکستان بنا تو ''ٹنڈو اللہ یار'' کے مدرسے میں شیخ الحدیث بنائے گئے، حال ہی میں شیخ ابو غدّہ نے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی اصولِ حدیث میں لکھی ہوئی ''ظفر الامانی'' کو ایڈٹ کر کے آب وتاب سے شائع کیا ہے، مرحوم دیدہ ور محقق اور باکمال علماء میں تھے، غالباً گذشتہ سال پاکستان میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

***

مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھیؒ

تقسیم ہند سے پہلے یعنی ۱۹۴۴ء سے تا ۱۹۴۷ء راقم السطور، مولانا محمد ادریس صاحب کا شاگرد، ان کی علمی مجلسوں کا باریاب؛ بلکہ کچھ عرصے کے لیے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا ہے۔ پست قامت، گٹھا ہوا بدن، آنکھوں پر چشمہ، گاندھی کیپ، چست شیروانی، تنگ مہری کی شلوار، یہ تھا مولانا کا لباس و حلیہ۔ دیوبند سے فراغت حاصل کی اور حضرت شاہ صاحبؒ کے عہد میں دورۂ حدیث میں نمبر اوّل آئے، پنجاب یونیورسٹی سے السنہ شرقیہ کے بعض امتحان دیے تو کامیابی کا ریکارڈ توڑ دیا۔ ذہین و ذکی، مستعد، شب و روز کی محنت میں انہیں ایک جن ہی قرار دیا جاسکتا ہے، ان کا دماغ بلا مبالغہ فولاد کی ایک کھرل تھی جس قدر کوٹتے اس ہاون پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ مدرسہ صدیقیہ میں ابوداؤد وغیرہ کا کام یاب درس دیتے، یہ وہ دور تھا کہ جرمنی اور متحدہ طاقتوں کی جنگ کا آغاز ہوچکا تھا، دسویں پاس دھڑا دھڑ دفتروں میں ملازم رکھے جارہے تھے، پنجاب یونیورسٹی سے اردو فارسی کے امتحان دینے کے بعد صرف انگریزی کی راہیں کھلی تھیں، مولانا ادریس صاحب نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا، شبینہ مدرسہ کھولا جس کا نام ادارۂ شرقیہ تھا، اس کے ساتھ ایک مدرسۃ البنات بھی۔ یہ مولانا کا دورِ عروج تھا جس میں انہوں نے ہزاروں کمائے اور خرچ کر ڈالے، مدرسۃ البنات میں کچھ روز راقم السطور نے بھی کام کیا اور ان کی خاص عنایت سے سبزی منڈی میں ایک ٹیوشن بھی؛ مگر افسوس کہ یہ عروج ”چند دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات“ ثابت ہوا، اپنی آنکھوں سے مولانا کے اس

زوال کو بھی دیکھنا پڑا جس کی کہانی بڑی بھیانک اور تفصیلات زہرہ گداز ہیں، دہلی اجڑ چکی تھی، مجالس درہم برہم ہو چکیں تھیں، سکون ختم ہو چکا تھا اور یہاں کی رونقوں پر موت کا سناٹا طاری تھا، راقم الحروف اور دیوبند آگیا اور اچانک سننے میں آیا کہ مولانا اپنے اہل وعیال کے ساتھ کراچی پہنچ گئے، کراچی میں ان کے شبینہ مدارس کا منصوبہ اس قدر ناکام ہوا جس سے ان کا دماغی توازن و سکون ہل گیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کا سفر ہوا تو وہ اب مولانا یوسف بنوریؒ کی مدرسے میں ایک عربی استاذ کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ملے، یہ مولانا ادریس صاحب نہیں تھے؛ بلکہ ماضی کی ایک مٹی مٹائی تصویر اور پرانے قالب میں کچھ پھیکے رنگوں کی آمیزش، اب ان کی دیدہ دیدۂ عبرت کے لیے سراپائے عبرت ہے۔ دوسری ملاقات جوارِ کعبہ میں ہوئی جب کہ وہ زیارتِ حرمین کے لیے تشریف لائے تھے۔

دلی مرحوم کے واقعات اور ان کی شفقتوں کے لمحات جب یاد آتے ہیں تو سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور شاہ نصیر کے لہجہ میں کہنا پڑتا ہے ؎

خیالِ زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

یہ اپنے ایک شفیق استاذ، مربی محسن وکرم فرما کا ارتجالی تذکرہ تھا، جس کے کچھ اجزاء اشک بار قلم پر اس طرح آئے کہ بیتے ہوئے دنوں اور یادِ ایام کا ایک طویل سلسلہ سامنے آکھڑا ہوا جس کا تصور بھی وحشت ناک ہے۔

ادارہ شرقیہ دہلی
جولائی ۴۳ء

انظر میاں! کسی قیمت پر یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ تم خدانخواستہ اس سال میٹرک میں رہ جاؤ، دنیا کا کوئی عذر میرے نزدیک مسموع نہیں، یہ ظاہر ہے کہ میرے ہاتھ میں

کوئی تعزیری پاور نہیں ہے؛ لیکن خلوص ومحبت کی ایک روحانی اور اخلاقی طاقت میرے پاس ہے، جس سے میں بہت کچھ کام لے سکتا ہوں۔

انظر میاں! مجھے تم سے محبت ہے جیسے انیس سے، اور عقیدت اس پر مستزاد، مگر تم میرے پاس رہ کر دیکھ چکے ہو کہ میری محبت وعقیدت روایتی محبت وعقیدت کی طرح اندھی نہیں، جتنی کسی سے مجھے زیادہ عقیدت ومحبت ہوتی ہے اسی قدر میں اس کے حق میں سخت گیر ہوتا ہوں۔

بہر حال انظر میاں! میں دنیا میں ہر چیز کو قربان کرسکتا ہوں؛ مگر مقاصد زندگی کو نہیں؛ اس لیے کان کھول کر سن لو، تمہیں اس سال امتحان میٹرک میں پاس کرنا ہے اور میں خاموش ہوکر یا روٹھ کر بیٹھ جانے والا انسان نہیں ہوں، نہ خود چین سے بیٹھوں گا، نہ تم کو بیٹھنے دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ انظر میاں دہلی میں جَو اور چنے کی سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہیں؛ مگر یاد رکھو علم وہنر ناز ونعمت کے آغوش میں نہ حاصل ہوا ہے، نہ ہوگا۔

ابھی ایک مہینہ باقی ہے انظر میاں! رمضان ہمیشہ آئیں گے، کھانے پینے کے لطف اور کام ودہن کے مزے ہمیشہ حاصل ہوتے رہیں گے؛ مگر یہ وقت پھر نہ آئے گا، تمہارا دوست صرف وہ ہے جو تمہارے مقاصدِ زندگی میں تمہارے ساتھ تعاون کرتا ہے، یاد رکھو، سوچو اور سمجھو۔ والسلام

احقر محمد ادریس

***

حضرت مولانا عبدالماجد صاحبؒ دریا آبادی

مشہور انشاء پرداز، ادیب طناز، مفسر، مؤرّخ، بزرگ، صحافی، حضرت تھانوی کے
مجاز، تحریکِ خلافت کے مضبوط رکن، رئیس الاحرار محمد علی جوہر کے ہم نشیں، حق گو، ح
پسند، انشاء میں بے مثل، طنز میں لاجواب، چند جملوں میں مقابل حریف کے چھکے چھ
دیتے، ان کا قلم رفیع سودا کی شاعری تھی، بگڑتے تو منانا مشکل، نام ور صحافی ان سے پ
مانگتے۔ حیات اللہ انصاری کے خلاف لکھنا شروع کیا تو اس چاق و چوبند صحافی نے لکھ
کہ آپ کو میرے خلاف جو لکھنا ہے ایک بار لکھ دیجیے، یہ جو آپ زہر کی بوند بوند ٹپکا
ہیں میری برداشت سے باہر ہے۔

اپنے شیخ اوّل حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقش حیات'' پر تبصرہ کیا کہ میں
منتظر تھا کہ علم وشریعت پر حاوی تصنیف قلم مبارک سے تیار ہوگی، یہ تو کتاب السیاستہ
جو آپ کے قلم نے تیار کی۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بعض حامیوں پر بو
تو ایک طوفان تھا جو ادھر ادھر سے نکل گیا۔ پاکستان کے چند روزہ سفر میں شورش کاشمیر
مدیر ''چٹان'' نے پُر تکلف دعوت کی، مرحوم کو اس میں اسراف نظر آیا، اپنے سفرنامے می
تنقید کی، شورش نے جواباً لکھ دیا کہ آپ کے خلاف یہ لکھوں گا، وہ لکھوں گا، جواب
دریا آبادی مرحوم کا قرآن کریم کی ایک آیت تھی ''لَئِنْ بَسَطْتَ اِلَیَّ الخ'' بس ا
جوابِ لاجواب پر ساری شورش ختم ہوگئی۔

اکبر الٰہ آبادی نے دھیرے دھیرے اصلاح شروع کی، جس کی انتہا حضرت

تھانوی علیہ الرحمہ کے دامن تربیت وتجدید سے وابستگی، والہانہ تعلق ونسبت مع اللہ کی سند اجازت تھی، وہ صرف دو شخصیتوں کے ''مرید باصفا'' تھے محمد علی جوہر اور حضرت تھانویؒ۔ سفرنامۂ حجاز، نقوش وتاثرات، تفسیر وغیرہ علمی شاہکار بطور یادگار چھوڑے۔ ذاتی جریدہ پہلے ''سچ'' پھر ''صدق جدید'' دیکھنے میں بدزیب، لیکن ایک دنیا اس کا انتظار کرتی، اور ان کے البیلے انداز، طنز کے چبھتے ہوئے نشتر، قلم کی تلوار اور اس کی کاٹ کے کچھ مزے لیتے تو کچھ تھراتے۔

اس ظلوم وجہول کو شرفِ مراسلت سے بارہا سرفراز فرمایا، ایک بار شرفِ نیاز کے لیے دریا آباد حاضری کی تمنا ظاہر کی تو تحریر فرمایا کہ آپ تکلیف نہ کیجیے، کبھی لکھنؤ آنا ہوا تو لکھیے میں دریا آباد سے لکھنؤ پہنچ کر ملاقات کروں گا، یہ احترام انور شاہ کشمیریؒ سے نسبت کا تھا، ورنہ ''من آنم کہ من دانم''، میرے مراسلے ''صدق جدید'' میں ازراہِ ذرہ نوازی شائع فرماتے۔ ایک مکتوب گرامی نامہ میں نظر سے گزرے گا کہ آپ کی حمایت میں ایک پُرجوش گم نام خط آیا، اس کا قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند دیوبند آئے تو تصویر کسی ظالم نے خاموشی سے لی، جس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تصویر کے پردے میں تھے، اس پر ناراضگی کا ایک مراسلہ ''صدقِ جدید'' میں آیا، لکھا تھا کہ ایک ندوی العلم اور تھانوی الفکر کا مراسلہ، یہ مخدوم ومکرم مولانا عبدالباری علیہ الرحمہ مجاز حضرت تھانویؒ کا تھا۔ طفولیت کی حماقت، جواب اس سیاہ قلم نے لکھا، بس پھر کیا تھا ''صدقِ جدید'' میں رزم کا منظر تازہ ہوگیا، مخالفت اور حمایت میں خطوط چھپنے لگے، اشارہ مکتوبِ گرامی میں اسی کی طرف ہے۔ مولانا کی تفسیر اردو، انگریزی میں بے نظیر ہے۔ مولانا آزاد سے مشہور قلمی معرکہ حظ وکرب یا لذت والم ہوا، آزاد کو ویسے بھی نہ بخشتے، ایک بار سابق صدر جمہوریہ رادھا کرشنن کی تقریر تصوف کی حمایت میں اور مولانا آزاد کی بظاہر مخالفت میں ہوئی، دریا آبادی نے ہر دو تقاریر کا اقتباس شائع کیا، آزاد کی تقریر کا عنوان تھا ''از سرمستی

دستار از سر انداختم انداختم" اور صدر جمہوریہ کے لیے عنوان "غم مخور شیخا کہ من برداشتم، برداشتم" ذرا دیکھیے کہ ایک شعر کے دو ٹکڑے اور صورتِ حال کے لیے قیامت بردوش یہ دریا آبادی کے قلم کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔

خود بوڑھے؛ لیکن قلم سدا نوجوان، مشہور شاعر جوش کو تو سکہ بند ملحد ہی بنا کر چھوڑا، انضباطِ اوقات میں حضرت تھانویؒ کی طرح بے مثل تھے، مرحوم کے چھوٹے چھوٹے شذرے بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے اور ہندو پاک کے بہت سے اخبارات میں نقل ہوتے، یہ شذرے کیا تھے، بس یوں کہہ لیجیے کہ ایک تجربے کار شکاری کی فتراک تھی جس کے تیر کبھی خطا نہ کرتے۔ جنوبی ہند کے ایک اخبار کے مدیر نے مولانا کی مودودی صاحب کی تحریک ودعوت پر تنقید واعتراض دیکھا تو مدیر صاحب مودودی صاحب کی نصرت میں مولانا سے دست گریباں ہو گئے، اپنے لب ولہجہ اور مخصوص انشاء میں اداریہ "مولانا" کے خلاف لکھ مارا جس میں تھا کہ "آپ ہم پر جو چوٹ چلے ہیں" پھر سارا اداریہ اسی رنگ وڈھنگ میں، دریا آبادی کہاں چوکنے والے تھے، ان کی سطر سطر نقل کی اور ہر سطر پر لکھا کہ صل علی، ماشاء اللہ کیا اردو ہے کیسی بلند پایہ انشاء ہے۔

"صوفی نظیر کشمیری" سے خوب چلتی، ایک بار انہوں نے لکھا کہ آپ کو منیۃ المصلی سے تا بخاری شریف پڑھا دوں گا، صبح گاہی تفریح سے اب گیارہ بجے واپس آکر آپ کا شذرہ پڑھا اسی پر یہ جواب مرسل ہے، مولانا نے جواب میں لکھا کہ تفریح سے گیارہ بجے واپسی آپ کی دماغی کیفیت کی بہترین ترجمانی ہے، صوفی صاحب اس پر ایسے بگڑے کہ جوش میں عبا ودستار بھی پھینک دی اور تند وتیز مراسلہ بھیجا، مولانا کا جواب صرف اتنا تھا کہ آپ کو یہ سن کر رنج ہوگا کہ میں نے آپ کا مراسلہ پڑھے بغیر کوڑے کی کنڈی میں ڈال دیا، غرضیکہ بڑے بڑے "شیر افگن" بھی مولانا کے نشتر کی تاب نہ لاتے، کون کس وقت مولانا کے قلم کی تیغ بے نیام سے تڑپے گا، کوئی نہیں بتا سکتا، سمپورنانند سابق وزیر اعلیٰ یوپی، رشی راج ٹنڈن کو تو کبھی نہیں بخشا۔ مولانا آزاد کے سکریٹری ہمایوں کبیر جو بعد میں

مرکزی وزیر بھی ہو گئے، انہوں نے ایک بار اردو کی حمایت میں کوئی بیان دیا، دریا آبادی نے بیان پر عنوان چسپاں کیا ''دیکھیے کبیرا روریا'' ۔ غرضیکہ وہ اردو ادب کے ستون، انشاء میں بے مثال، تیرونشتر میں بے عدیل، بے مثل محقق تھے، ۸۰ سے زائد عمر عزیز گزار کر دریا آبادکی سرزمین میں یہ آسمانِ صحافت کا مریخ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

***

مؤرخہ ۱۴ر مئی ۱۹۵۴ء — ۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ

کرم گستر وعلیکم السلام

آپ کے جوابی کارڈ نے مجھے شرمندہ کیا، آپ کے لیے اس کی مطلق ضرورت نہ تھی، فتح الریان اصل عربی تھی، مصر میں مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے، ایک اردو ترجمہ لاہور سے چالیس سال قبل ۳۳ہجری میں نکلا تھا اور خیال ایسا پڑتا ہے کہ ایک دوسرا مختصر ترجمہ بھی کوئی ۱۵ر سال ہوئے دوگاہ کاکوری سے نکل چکا ہے، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس کا ذکر تصانیف شیخ رحمۃ اللہ کے ذیل میں موجود ہے، بعض لوگوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، ممکن ہے کہ یہ سمجھ کر نہ کیا ہو کہ یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، صرف مواعظ وملفوظات کا مجموعہ ہے، مضمون ومعنی کے اعتبار سے شیخ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے اقوال معلوم ہوتے ہیں، بہرحال مجھ کم علم کو تو اس کے اصلی ہونے میں شبہ وتردد نہیں۔

کتاب ریویو (Review) کے لیے آئی ہوئی ہے۔

''فتوح الغیب'' مستقل تصنیف ہے جس کا ایک ایڈیشن نول کشور لکھنؤ نے شاہ عبدالحق دہلویؒ کی فارسی شرح کے ساتھ شائع کیا ہے۔

والسلام

دعا گو، دعا خواہ

عبدالماجد

۳/ اگست ۱۹۵۶ء

کرم فرما!   وعلیکم السلام

کیا عرض کروں کہ کتنا کم فرصت رہتا ہوں، ہر رسالے اور ہر مقالے کو اوّل تا آخر پڑھنے اور اس پر ذمہ دارانہ رائے دینے کے لیے وقت کہاں سے لاسکتا ہوں، رسائل اور اخبارات کے گڈ کے گڈ کو مجبوراً بہت ہی سرسری نظر سے دیکھنا ہوتا ہے، لکھنے پڑھنے کی صلاحیت تو ہر پڑھے لکھے شخص میں تھوڑی سی کوشش اور تربیت کے بعد پیدا ہو جاتی ہے؛ چہ جائیکہ آپ، جن کو علم و فضل ورثے میں ملا ہے اور جن کا ماحول ہی شروع سے علمی رہا ہے، آپ میں تو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے۔ والسلام

دعا گو و دعا خواہ

عبدالماجد

مؤرخہ ۳/ اکتوبر ۱۹۵۶ء

کرم گستر   وعلیکم السلام

(۱) جزاک اللہ ایسی ہی تحسین استاذ تفسیر ندوہ مولانا محمد ادریس ندوی نگرامی سلمہ نے بھی فرمائی ہے ایک اور درسگاہ کے صدر کا بھی۔

پاکستان کے ایک صاحب کا خط اس کے برعکس بڑی ناگواری کا آیا ہے کہ یہ قرآن کے ساتھ تعلب ہے۔

(۲) آپ کے مکتوب کا بڑا حصہ صدق ۴۷ میں انشاء اللہ نکلے گا، شمارہ ۴۶ میں گنجائش نہ تھی۔

والسلام

دعاء گو و دعاء خواہ

عبدالماجد

مؤرخہ ۱۴؍جون ۱۹۵۷ء

کرم گستر وعلیکم السلام

کینسر بیشک بڑا موذی مرض ہے، اللہ آپ کی والدہ ماجدہ کو شفاء کامل عطا فرمائے، مکتوب کا باقی حصہ انشاء اللہ صدق میں درج ہوگا گنجائش نکلنے پر، ہفتوں اس انتظار میں نکل جاتے ہیں۔

والسلام

دعا گو و دعا خواہ

عبدالماجد

مؤرخہ ۳؍اکتوبر ۱۹۵۷ء

کرم گستر وعلیکم والسلام

تصحیح واقعات آپ کے نام لائے بغیر نمبر ۴۵ میں دی جارہی ہیں بہ مسرت تمام۔ ایک گمنام خط آپ کی حمایت میں بہت ہی تند و تیز و درشت کئی دن ہوئے موصول ہوا تھا۔

والسلام

عبدالماجد

مؤرخہ ۳۰؍جون ۱۹۶۷ء

کرم گستر السلام علیکم

پاکستان کے کسی پرچے میں آپ کے حوالے سے آپ کی والدہ ماجدہ کی خبر علالت کینسر کے مرض میں پڑھی تھی اور بے ساختہ دعائے صحت و عافیت مریضہ کے حق میں اس وقت کردی تھی؛ اب الجمعیۃ میں خبر وفات پڑھ کر دعائے مغفرت مرحومہ کے حق میں کررہا ہوں۔ والدہ کا ظل عاطفت، دنیا کی سب سے بڑی نعمتوں میں ہے، آپ لوگ ذی نصیب تھے کہ والدہ کی خدمت کی سعادت اتنے دن تک آپ کو نصیب رہی۔

ومایلقاها الا ذو حظ عظیم اللّٰھم اغفر لھا وارحمھا۔

والسلام

دعاء گو و دعاء خواہ

عبدالماجد

مؤرخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷ء

مکرم بندہ! وعلیکم والسلام

آپ نے یہ تفسیری نکتہ پیدا کیا، بیشک دلچسپ اور قابل لحاظ ہے۔

بعض لوگ ایسے نکات ولطائف کو مدارِ تفسیر بناتے ہیں، بس یہ زیادتی ہے۔ باقی نکات ولطائفِ علمی میں ان کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ والسلام

دعا گو

عبدالماجد

مؤرخہ یکم مئی ۱۹۶۸ء

برادرم وعلیکم السلام

جی ہاں! آپ مخلصوں کی دعاؤں نے کچھ روز اور اس عالم ناسوت میں مہلت دلا دی ہے، ترجمہ تکمیل الایمان کا منتظر رہوں گا، ''کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا'' کی تفسیر میں مجھے تو سب سے زیادہ دلنشین وہی جَزَآءً وِّفَاقًا کی معلوم ہوتی ہے، یعنی ہر مرحلہ وعمل میں انہیں اصل عمل کے ساتھ ایک خصوصی مشابہت ومناسبت محسوس ہوگی، باقی دوسرے اقوال جو نفی میں ہیں وہ بھی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ والسلام

دعاء گو و دعاء خواہ

عبدالماجد

***

دِگر دانائے راز......

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں صاحب ندویؒ

خاندانی نسبتوں، نسلی وجاہتوں کے مضبوط و دیرپا اثرات کا کون انکار کر سکتا ہے، ...خدا تعالیٰ کا وہ راز ہے جو افراد و ارکان کو شرافت، نجابت، علمی ولولے، اور عملی جدوجہد کی ...سعادتوں سے سرفراز کرتا ہے، یوسف علیہ السلام کے اخوان کو دیکھ لیجیے کہ اپنے معصوم ...بھائی کو آزار و آلام کی تمام گھاٹیوں سے کھینچنے کے باوجود، اور عظمتوں کے پیکر اپنے باپ ...کی دل آزاری، سوز و ساز، تڑپ و بے چینی اور طویل بے قراریوں کا ہر سامان ...مہیا کرنے کے باوصف، آخر کار خاندانِ نبوت کے اجلے نہ سہی، مٹے مٹائے اثرات ...دنیا کے سامنے آئے۔

اپنے تمام جرائم کے استغفار و انابت کا جذبہ جو اخوانِ یوسف میں پیدا ہوا وہ نبوی ...دومانِ عالی سے نسبت کے سوا اور کیا ہے؟ یہ ایسی چیز ہے جس کے مبارک و قابلِ رشک ...اثرات صراطِ مستقیم سے انحراف اور بلند و بالا روایات کو نظر انداز کرنے کے باوجود ...دھندلا سا اثر کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔

مخدوم مکرم علی میاں مرحوم کا نسبی تعلق رائے بریلی کے خاندانِ سادات سے ہے، ...جس میں بہت سی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ فردِ فرید یادرِّ بے بہا حضرت سیّد احمد شہید علیہ الرحمہ ...ہیں، جن کی بلندیٔ عزائم، جرأتِ مومنانہ، جہادی حوصلہ اس تحریک سے نمایاں ہے جس ...کی علم بردار یہی مجاہد شخصیت ہے۔ خاندان ولی اللّٰہی سے رسمی علوم کا استفادہ کم، وہبی ...معارف کا وافر ذخیرہ لے کر یہ مردِ حق آگاہ، ہندوستان کے بیشتر قصبات و دیہات میں

خداپرستی کا صور پھونکتے ہوئے اسرافیلی انداز میں بالاکوٹ کے معرکے میں حریت کوش جیوش، اور اسلامی حکومت کے قیام کے بے اختیار جذبات کی قیادت کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ رہی شکست و فتح، کامیابی و ناکامی یہ تو ہر جدوجہد کا لازمہ ہے، محمد رسول اللہ فداہ ابی و امی معرکۂ بدر میں کفروشرک کی شہ رگ پر تاریخ ساز حملہ کرتے ہیں؛ لیکن اُحد میں قضیہ یکسر بدل جاتا ہے۔ خدا جانے کتنے فاتح اور دنیا کے نام ور جرنیل ہیں جن کے گلوں میں کبھی فتح کے ہار نظر آئے تو گاہے چہروں پر شکست کے آثار۔ مورّخ کا قلم کبھی فتح یابی کے عوامل لکھتا ہے تو کبھی ناکامی کے اسباب؛ لیکن اسے بھول جاتا ہے کہ سودوزیاں، نفع ونقصان ہر تحریک، ہر دعوت، ہر محنت و کاوش کا بدیہی نتیجہ ہے۔ بہرحال خانوادے میں کوئی ایک شخصیت ان خصوصیات کی حامل ہوتی ہے؛ لیکن بدلتا وقت، زمانے کے تقاضے، اگلوں کے کارنامے، ترمیم اور اضافوں کے ساتھ اپنانا اس کی خصوصیت ہوتی ہے؛ اس لیے عبدالمغنی صاحب کی یہ خواہش کہ علی میاں ندوی مرحوم ؒ اس کردار کو اپناتے جو الشہید تغمّدہ اللہ بغفرانہ کا تھا، قلم کی زورا زوری اور فکرونظر کی ناہمواری ہے۔ موجودہ ہندوستان کو دیکھیے اور یہاں کی ہلاکت خیز فضاؤں کو، فرقہ واریت کے سیلابِ بلا اور شکوک وشبہات کے طوفانِ نوح کو کہ طیارہ کا حالیہ اغوا جس پر ہر قابل ذکر مسلم قائد نے پریس میں اور عامۃ المسلمین نے اپنے ناگوار جذبات کا بھرپور مظاہرہ کیا؛ لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود فرقہ وارانہ ذہنیت تاحال مسلمانوں اور اسلام کی جاں بخشی کے لیے تیار نہیں۔ ایسے پُرآشوب ماحول میں کسی خاص کردار کا مطالبہ یا توقع تقاضوں سے بے خبری کی علامت کے سوا اور کیا ہے۔

ہندوستان بدل گیا، حدودِ اربعہ یکسر تبدیل ہوگئے، گردوپیش یکسر بدلا ہوا، اس ماحول میں سیّد احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ کے کردار کا مطالبہ بعنوان دیگر پہاڑ سے سر ٹکرانے کا مطالبہ ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے دارالاسلام، دارالحرب اور ان دونوں کے درمیان دارالامن کے مسائل کھلے ہوئے ہیں، اسلام نے کسی گوشے کو تاریک نہیں

ما، ہر جانب میں واضح اور اجلی ہدایات موجود ہیں۔ غلطی یہیں ہو رہی ہے کہ کوئی ملک کی
ں مفاہمت کا درس دے رہا ہے تو کوئی مدینہ کی کامل غالبیت کا۔

مجلس احرار کے ایک بزرگ راہنما کے پوتے لدھیانہ سے چلے اور میرے لیے
ار کا تحفہ لے کر آئے، مقصد یہ تھا کہ میں بھی نامیاتہ موقع کے تحت شمشیر بدست آپے
ت باہر ہو کر کوئی کارزار گرم کر دوں اور خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے ساتھ اس معصوم ملت
لیے بھی بربادی، تباہی کا بھرپور سامان کر دوں اور خاتمے پر ہزاروں بے گناہوں کی
دوں سے بے سود گنوا کر گوشہ عافیت میں ہمیشہ کے لیے بیٹھ جاؤں۔ تازہ تجربہ
ری مسجد کا ہے کہ پرجوش خطابت، بے ہنگم مظاہرے، بے مقصد کوشش، کبھی دھرنے،
ھی جاؤں، بے منزل سفر اور جب بھٹی گرم ہو گئی تو ہزاروں کو ذبح کرا کر، یتیم بنا کر
اؤں کی قطار تیار کرا کر، کاروبار لٹا کر، یہ قائد کچھ غائب از نظر ہو گئے تو کچھ آج بھی
ی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کام لیتے ہوئے کبھی مراسلے دے رہے ہیں تو کبھی نگارش کے
چھوڑتے ہیں، کسی پارٹی سے معافی کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود انہیں بارگاہ غفار آج
اپنے گناہوں کی توبہ کی توفیق نہیں ہوئی کہ سب سے بڑے مجرم تو یہی ہیں۔ موجودہ
وستان میں احقر کو تو چند کام بنیادی نظر آتے ہیں، اولاً مسلمان کو مسلمان رکھنا، اسلامی
نس پہ جمانا، تعلیم کی راہیں ہموار کرنا، اور آسودہ روزگار کی فراہمی وغیرہ۔ اول
ر کام تو تبلیغ، مدارس وغیرہ انجام دے رہے ہیں۔ تعلیم میں وسعت پھیلاؤ اور ہر طرح
تعلیم کے لیے مسلم تنظیمیں سامنے آئیں، مرکزی نقطۂ کار صرف یہ ہے کہ صاف ذہنیت
سلمانوں کو آگے بڑھا کر کام لے لیا جائے۔ یہ صاف ذہن پورے ہندوستان میں بکھرا
ہے، اسے سمیٹنے، یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فرقہ پرستی اگر شکست
نے کی تو صرف غیر فرقہ وارانہ غیر مسلم ذہنیت سے، کاش کہ اس نکتے کو میری قوم سمجھ
اور اس میں بھی ایسے اعتدال کی ضرورت ہے جو وحید الدین خان صاحب کی قطعی
ہنیت سے بھی دور اور قائدین بابری مسجد کی حماقتوں سے بھی بہت فاصلے پر ہو،

خیر اسے تو جملہ معترضہ سمجھیے۔

مغنی صاحب کا لگے ہاتھ تبلیغی جماعت کے دائرۂ عمل کو ملعون کرنا براہ راست محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۲۳ رسالہ نبوی کردار کے غالب حصے پر غیر محسوس حملہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اپنی حیاتِ طیبہ کا بیشتر حصہ اسی کلمہ طیبہ کی تلقین و تصحیح، نمازوں کی درستگی، عقائد کی صحت اور عبدیت کے آثار کو حاوی کرنے کے لیے صرف فرمایا، غرضیکہ پروفیسر صاحب کی دانش علی میاں کی حیات میں جن نقائص کی دریافت کرتی ہے، انہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ وہ ہی علی میاں کی سیرت و کردار کے اجلے عنوانات ہیں۔

مرحوم اپنی زندگی کے اس مرحلے سے جہاں شعور و آگاہی بڑھ کر کسی شخصیت سے بغلگیر ہوتی ہے، تلاشِ حق میں مضطرب و بے چین نظر آتے ہیں۔ ان کی مثال اس جرعہ نوش کی ہے جس نے ہر میخانہ میں قدم رکھا اور ہر دکانِ معرفت پر دستک دی، غیر منقسم ہندوستان میں حضرت دین پوری سے لے کر مولانا احمد علی لاہوریؒ، شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوریؒ، بھوپال کی معروف شخصیت ننھے میاں، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی؛ ہر گھاٹ پر وہ پہنچے اور ہمیشہ آبِ حیات کی تلاش میں سرگرداں رہے؛ حالاں کہ خاکم بدہن یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا شخصیتوں میں سے بہت سوں کے مقابل علی میاں کا علم وفن بدرجہا فائق تھا۔ جماعتِ اسلامی وغیرہ ایسی تنظیمات سے رابطوں کے بعد تبلیغی جماعت سے ان کی آخری وابستگی جستجو و تلاش کی آخری منزل تھی۔ سیّد احمد شہید علیہ الرحمہ کی تعمیر شخصیت میں اخلاص و احسان انہیں نمایاں نظر آیا، اس سرمدی دولت کے لئے وہ بے قرار رہے۔ کسبی علوم ان کا خاندانی ورثہ تھا اور مجاہدانہ عزائم دومانِ عالی کا فیضان لاریب کہ اپنا علم، اپنی دانش، اپنی انشاء، اپنے قلم کی طاقت اور اپنی معروف خطابت کا پورا اثاثہ انہیں راہوں میں بکھیر دیا۔ انہوں نے سمجھا اور صحیح سمجھا: انسانوں کے گمراہ قافلوں اور ٹھٹھری ہوئی روح کو بیدار کرنا اور ہر بے راہ روی کا قلع قمع کرنا، اس انسانیت کو جگانا ہے جو اسلام کی معراج، صحیح مذاہب کا مرکزی

نقطہ، ہر ظلم و عدوان کا استیصال اور جو معاشرے میں نسیم سحر گاہی کا کام کرتا ہے، یہ ایسی دعوت تھی جس کی مخالفت انسان نما شیطان ہی کر سکتا ہے، اگر وہ اسلام کی دعوت لے کر اٹھتے تو مخالفتوں کا طوفان ان کی راہ روکتا، انہوں نے بڑی ہوش مندی سے مضمون ومعنون کو بدستور محفوظ رکھتے ہوئے اس عنوان کو اختیار کیا جو ہر مرض کا شافی علاج اور ہر درد کی شفا بخش دارو ہے۔

علی میاں اپنے آغاز ہی سے داعی الی اللہ تھے، چناں چہ وہ ڈاکٹر امبیڈکر کو بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے پہنچے، یہ ان کی افتاد و نہاد، ان کی تصانیف اور تصنیف کے لیے منتخب عنوانات سے واضح ہے، تاریخ دعوت و عزیمت بتاتی ہے کہ ان کا خصوصی مزاج دعوت اور اس سنگلاخ وادی میں عزیمت تھا۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو دکھ بھری کائنات کا شافی علاج گردانتے، مولانا نے جتنے موضوع تصنیف و تالیف و تراجم کے لیے انتخاب فرمائے وہ ان کے مزاج و خصوصیات پر اچھی خاصی راہ نمائی دیتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی فطرت کے حامل تھے جو رنگا رنگ اور ہمہ جہت واقع ہوئی تھی۔

''روائع اقبال'' درحقیقت اقبال کی اس شاعرانہ فکر سے گہرے تأثر کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں وہ مسلمانوں کے لیے اس کردار و عمل کی دعوت دیتے جو اسلام کے ابتدائی دور اور اس کی امتیازات سے ہم آہنگ ہے۔ علی میاں نے ایک سو تصانیف کے قریب اپنے فکر و ذہن اور اپنے گوہر بار قلم کا سرمایہ ملت کے لیے چھوڑا۔ دنیا میں درس گاہیں اور ادارے تو بہت سے قائم ہوئے؛ لیکن کسی ادارہ کے لیے اپنے افکار، اپنی جد و جہد اور اپنی کاوشوں کی ایک ایک رمق علی میاں نے ''ندوۃ العلماء'' کو بڑھانے چڑھانے، ترقی واستحکام، تعارف و تشہیر میں صرف کی، اگر ندوہ قدر شناسی کے جذبہ اور مساعی کی جزا دینے کا مزاج رکھتا ہے تو اپنی تاریخ میں مرحوم کا نام سر فہرست رکھے گا اور اس مربی جلیل کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ وہ ندوہ کے بارے میں خصوصی احساسات کے پیکر تھے، جنہیں وہی سمجھ سکتا ہے جسے انسانوں کو پڑھنے کی خاص بصیرت حاصل ہو۔ راقم الحروف

سمجھتا ہے کہ اپنی تعلیم گاہ کے لیے ان کا بے پناہ اخلاص، پاکیزہ اور حسنِ عمل کی جزاء ربّ ذوالمنن نے دنیا میں اس طرح دی کہ بین الاقوامی ایوارڈ ان کے سراغ میں رہتے، اعزازات ان کو تلاش کرتے اور وجاہتیں ان کی قدم بوسی کے لیے بے قرار رہتیں، غالباً ہندو پاک میں کوئی شخصیت ان جہات میں ان کی ہم پلہ نہیں۔

دوسری جانب ان کے پاک باطن، عالی نسبتی، قناعت وتوکل، عبادت وریاضت، استغناء، خدائے وحدہٗ سے عبدیت کا مضبوط رشتہ ان کی قابلِ رشک موت کی صورت میں سامنے آیا، یہاں تک تو فیصلہ ایک عام انسان کرسکتا ہے۔

لیکن قرآن وحدیث کی منصوصات کی روشنی میں آخرت کی نعمتوں کا فیصلہ بھی چنداں دشوار نہیں؛ البتہ اپنے اس تأثر کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ صرف ایک علمی، تاریخی، خانقاہی، صوفیانہ مزاج کے حامل، گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اپنے سارے غم ملت کے لیے قلم وقرطاس کے حوالے کرنے والے تھے، وہ بہت محتاط اور شخصی تحفظ کے خوگر تھے، یہ مزاج وافتاد، یہ طرز وانداز، کم از کم موجودہ ہندوستان کے حالات سے سازگار نہیں؛ اس لئے تنظیمات وتحریکات نے خود تو ان کی کوہ پیکر شخصیت سے بے پناہ فائدے اٹھائے؛ لیکن مرحوم، بلکہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہر دو کو سیاسی بکھیڑوں میں الجھانا ان معصوم شخصیتوں پر ظلم تھا۔ بھلا کہاں یہ پاکیزہ نہاد، علم وآگاہی کے پُرسکون سمندر اور کہاں سیاست کا تلاطم اور ہلاکت خیز تموّج۔ پھر موجودہ سیاست، جس کے چہار جانب سوائے فریب کاری وعیاری کے کوئی چیز نظر نہیں آتی؛ اس لئے مولانا سیّد منت اللہ صاحب رحمانی کی اعلیٰ سیاسی بصیرت جب تک ہم عناں رہی مسلم پرسنل لاء نے کام کیا، باقی دور تاریخی کارناموں سے خالی ہے۔

''راس فینے دہلی'' کی ایک اشاعت میں عشرت علی صدیقی صاحب جیسے کہنہ مشق، اور وسیع معلومات کے حامل صحافی کی یہ نگارش حیرت انگیز ہے کہ علی میاں مرحوم مسلم پرسنل لاء کے بانی تھے، ان کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ مسلم پرسنل لاء کی ابتدائی پخت

وپڑ دارالعلوم دیو بند میں ہوئی اور غالباً ۳ رمیٹنگ یہیں دارالعلوم میں منعقد ہوئیں، مسلم پرسنل لاء کو عوامی اسٹیج بنانے والے صرف مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری ہیں۔

بہرحال علی میاں نے ایک ایسا خلاء چھوڑ دیا جس کا پُر ہونا بظاہر ناممکن ہے، جس دن ان کی میت زیبِ دوش تھی اس کے ساتھ علم وفن، تاریخ وادب، انشاء ونگارش، سلوک ومعرفت، ریاضت وعبادت، دعوت وتحریک بہت کچھ رخصت ہو گئے اور اب صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے ؎

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید ۞ نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سرآمد روزگارے ایں فقیرے ۞ دِگر دانائے راز آید کہ ناید

***

تازہ قلم

مولانا علی میاں ندویؒ

مایہ ناز انشاء پرداز، مؤرّخ، مربی، مرشد، مبلّغ، داعی الی اللہ، مسلم پرسنل لاء کے صدر، ندوۃ العلماء کی نشأۃ ثانیہ کے واحد علم بردار، بین الاقوامی شخصیت، بیشتر سیمیناروں کے صدر نشیں، حضرت رائے پوری علیہ الرحمہ کے ممتاز مجاز، شعر فہم، خصوصاً اقبال مرحوم کی شاعری سے والہانہ عقیدت اور اُن کے افکار سے بے پناہ متاثر، بہت سی کتابوں کے مصنف، عربی تحریر و تقریر پر بے نظیر قدرت، قدیم و جدید کے دل آویز سنگم، سادگی و پرکاری کا مرقع، بلند و بالا نسبتوں کے حامل، سادہ لباس، آنکھوں پر چشمہ، شیروانی زیبِ بدن، سر پر خاص وضع کے بال، بڑے پائچے کا پائجامہ، اکثر سر پر رومال جسے عربوں کی طرح گردن کے چپ و راست میں ڈالتے۔ مرحوم نے اندرون و بیرونِ ملک اتنے سفر کیے کہ انھیں بے تکلف جہانیاں جہاں گشت کہا جاسکتا ہے۔ بہت سے دینی و علمی اداروں کے رکن رکین، شریفانہ روایات کے حامل۔ مرحوم نے اپنے قلم سے حضرت سیّد احمد شہید کی بھولی بسری داستان کو نہ صرف زندہ؛ بلکہ جاوید بنایا، اپنے دودمان عالی کے ہر فرد کی قابل رشک تربیت کی اور افرادِ خاندان کو بھی روشناس کرایا۔

وہ ندوۃ العلماء کے جلیل و عظیم مربی اور اپنی درس گاہ کے لیے خصوصی احساسات رکھتے، جنھیں معلوم کرنا تو در کنار، محسوس کرنے کے لیے بھی گہری بصیرت درکار تھی۔

مستقبل میں اگر ندوے نے قدر شناسی سے کام لیا، تو ندوہ کی جو تاریخ، کردار، بین الاقوامی شہرت، وسیع نظامِ عمل، پُرشکوہ عمارات، توسیع حلقہ، ہر امتیاز کی دستار مرحوم کے زیبِ سر کرنا ہوگی۔ ان کی پوری زندگی قلم کی قوت، فکر کا اثاثہ، عمل کا سرمایہ، روز وشب، لمحہ لمحہ صرف اس درس گاہ کی تعمیر وتشہیر، تربیت وتہذیب میں صرف ہوا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ندوے کے لیے ایسی فعال وجاندار، متحرک ومستعد ٹیم چھوڑی کہ مرحوم کی کمی، کم ازکم اس درس گاہ کو محسوس نہ ہوگی۔

ٹیم نے بھی ان کے ہر لفظ، ہر جملے، ہر بیان اور منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو اردو، عربی، انگریزی میں محفوظ کر دیا، دینی وعلمی اداروں میں یہ کردار کم یاب نہیں، نایاب ہے۔ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مرحوم کے بعد ان کے قلم نے بھی اپنے پورے خانوادے کو تاریخی اثاثہ بنایا؛ لیکن اس جز میں علی میاں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا، جس نے جانشین پیدا کرنے میں بے پناہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہو۔ ان کی زندگی قدر شناسی کی بھرپور تاریخ ہے۔ صدارتیں، ایوارڈ، اسفار، نت نئے پروگرام، پذیرائی، والہانہ استقبال، شہرت، تعارف، حلقے، ہر چیز انھیں میسر آئی اور قدرت کی فیاضیوں سے دامن لبریز ہے۔

مسلم پرسنل لاء کی خوش نصیبی کہ اسے دو صدر ''مرجع انام'' میسر آئے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم اور مرحوم حضرت علی میاں ندوی؛ لیکن راقم الحروف اپنے اس تاثر کو چھپا نہیں سکتا کہ ہر دو بلند شخصیتیں اس دور کی پُرفریب سیاست سے نہ صرف دور؛ بلکہ بہت دور تھیں۔ اوّل الذکر کو مکمل اور مؤخر الذکر کو کچھ مولانا سیّد منت اللہ رحمانی کی رفاقت حاصل ہوئی جو اعلیٰ سیاسی بصیرت، جرأت وبسالت کے پیکر تھے: اس لیے بات فی الجملہ سنبھلی رہی۔ مولانا کی وفات کے ساتھ نہ صرف خلا ہو گیا، بلکہ پرسنل لاء بیٹھ گئی، بلکہ ان کے سامنے مستقبل کے بھیانک سائے اہل نظر کو سوجھنے لگے۔ خاکسار سے مولانا مرحوم کی مراسلت طویل رہی؛ لیکن میری نادانی سے بہت سے خطوط ضائع

ہو گئے۔ شرفِ نیاز بھی بارہا نصیب ہوا۔ ان کی وفات، رمضان المبارک کا آخری عشرہ، جمعہ کا دن، شبِ طاق، قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام، اعتکاف کی راتیں، ہر مومن کے لیے باعث صد رشک ہیں۔ غالباً یہ سیّد احمد شہید کی بلند و مقبول نسبت، مرحوم کے مؤمنانہ اطوار اور بے غرض زندگی کا ثمرۂ خوش رنگ و خوش ذائقہ ہے۔

تغمدہ اللہ بغفرانہ

* * *

محبّ مکرّم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے کئی عنایت نامے ملے، میں اس طرف اتنا مشغول رہا کہ انتظار و تاخیر جواب کی معافی چاہتا ہوں۔ کل ہی پاکستان کے لیے روانگی ہے، لیکن آپ سے شرم آئی، اس لیے یہ دو حرف لکھ رہا ہوں۔ معارف الحدیث کے لیے کئی بار یاددہانی کی، معلوم ہوا کہ آپ کے لیے نکال کر رکھی گئی، غالباً بھیجی گئی ہو یا عنقریب بھیجی جائے گی۔ سیّد صاحب کے سلسلے کے مضامین کا مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا، میرے مضامین کا کوئی مجموعہ اس سے پہلے شائع نہیں ہوا، بعض لوگوں نے الگ الگ رسائل کو جمع کر دیا تھا، واپسی پر ان شاء اللہ مفصل عرض کر سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

والسلام
ابوالحسن علی
۳۰/اپریل ۵۴ء

۲۷/جنوری ۵۵ء، لکھنؤ

محبّ گرامی قدر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسرت نامہ ملا، آپ کی سعادت وخلوص کا واقعی ممنون ہوں کہ میری خاموشی اور کوتاہ قلمی کے باوجود آپ فراموش نہیں کرتے، اور وقتاً فوقتاً یاد فرمالیتے ہیں۔ آپ نے غالب کا جو شعر لکھا ہے اس میں اتنی ترمیم عرض ہے کہ آپ کا اشتیاق مسلّم؛ لیکن مجھے اپنی بیزاری تسلیم نہیں۔

مذکرات، الشرق العربی کا ایک نسخہ دیوبند پہنچ چکا ہے، آپ مولوی فرید الوحیدی اور مولوی سالم ابن مولانا طیب صاحب سے دریافت فرمالیں۔ آپ یقیناً ایک ذاتی نسخے کے مستحق ہیں؛ لیکن اس کے اتنے تھوڑے نسخے میرے پاس آئے، میں چند ہی حضرات کی خدمت میں پیش کرسکا، خود میرے پاس اپنا ذاتی نسخہ بھی نہیں، اس کے باوجود بھی اگر کوئی نسخہ مہیا ہوسکا تو پیش کردوں گا۔ ابھی وعدوں کا ایفاء نہیں ہوا ہے، مجھے نسخوں کی تلاش ہے۔

آخر میں آپ کی پُرخلوص محبت کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آخر میں آپ کی علمی دینی ترقیات کے لیے دعا گو ہوں۔

والسلام
خاکسار ابوالحسن علی

محبِ گرامی زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسرّت نامہ ملا، بے شک میں آپ سے دیوبند کی حاضری کے موقع پر مل نہ سکا، کچھ ایسی رواداری اور پریشانی میں گیا تھا کہ مولانا کے دولت خانے کے علاوہ کسی کی خدمت میں حاضری نہ دے سکا۔ چند گھنٹے قیام رہا، وہ بھی ایک ضرورت سے، امید ہے کہ میری یہ کوتاہی معاف کریں گے۔ واقعی آپ کی یہ سعادت ہے کہ آپ ہمیشہ سبقت کرتے ہیں اور یاد فرماتے ہیں، میں اپنی اس تقصیر کا معترف ہوں؛ لیکن میری پراگندہ

دماغی اور مصروفیتیں میرے لیے سفارشی ہیں۔ امید ہے کہ آپ بالکل بخیر ہوں گے اور اپنے دینی و علمی مشاغل میں سرگرم۔

فقط

خاکسار

ابوالحسن علی

۲۵/ ۱۲/ ۶۴ھ

عزیز گرامی بارک اللہ فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی روز ہوئے مسرّت نامہ ملا تھا، اسی وقت تو خیال تھا کہ جلد از جلد جواب دے دیا جائے گا، پھر ایک سفر پیش آ گیا اور آپ کا مکتوب اِدھر سے اُدھر ہو گیا، اس وقت دارالعلوم کے پتے پر یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائے۔

آپ نے سیّد صاحبؒ سے متعلق اپنے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے، میرے نزدیک وہی صحیح ہے۔ اس کا انکار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عصبیتِ جاہلیہ میں مبتلا ہوں اور حقیقت شناسی کے بجائے صوبہ پرستی اور اس سے آگے بڑھ کر ضلع پرستی کے بیمار ہیں۔ اس میں کیا استبعاد ہے کہ شاگرد استاذ سے بڑھ جائے۔ مولانا شبلیؒ بلا شبہ ایک نئے اسلوب کے مالک تھے اور وہ اسلوب علمی و تاریخی مضامین کے لیے اب تک موزوں و مطبوع ہے۔ وہ فارسی ذوق میں سیّد صاحب سے بمراحل آگے تھے، ان کی فارسیت اہلِ زبان سے کسی طرح کم نہیں اور ان کا فارسی کلام ایرانی شعراء کی ٹکر کا ہے، ان کی اردو نثر میں فارسیت کی آمیزش نہایت دل آویز اور بندش نہایت چست ہے، بحیثیت نقادِ ادب کے بھی وہ مجتہدانہ شان رکھتے ہیں اور شعر العجم ابھی تک اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔ ان کی کتابوں میں بڑی زندگی ہے اور پڑھنے والا اُن کے خیالات سے بے حد متاثر ہوتا ہے اور ان کی تقلید کرنے لگتا ہے، یہ سب محاسن ناقابل انکار ہیں؛ لیکن سیّد صاحب کا

مطالعہ مولانا شبلی سے وسیع بھی زیادہ ہے اور گہرا بھی۔ ان کے مسلک میں احتیاط و اعتدال بھی زیادہ ہے، اہل سنت اور سلف کی ترجمانی بھی زیادہ ہے، مولانا شبلی اگر اور زندہ رہتے تو عمر کی پختگی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علمی اثرات سے وہ بھی شاید اسی منزل پر آجاتے اور اس کے مبادی شروع بھی ہو چکے تھے۔ سیّد صاحب خود فرماتے تھے کہ مولانا فرمایا کرتے اگر کبھی علم کلام کا شوق ہو تو ابن تیمیہ کی انگلی پکڑ کر اس کی سیر کرلینا۔ دینی رجحان بھی ان میں شوخ و پختہ ہوتا جا رہا تھا اور سیرت سے شغف بڑھتا جا رہا تھا جس کا اظہار ان کے دونوں مشہور شعروں سے ہوتا ہے۔ ع عجم کی مدح کی الخ۔

سیّد صاحب کو ان سب گوشوں کی تکمیل کا موقع ملا اور وہ اپنے فکر و نظر، مطالعہ اور شخصیت و سیرت کی تکمیل میں مصروف رہے اور ان کی ترقی و ذہنی نشو و نما جاری رہا جو بالکل قدرتی امر ہے۔ مولانا شبلی کی فضیلت اس لحاظ سے مسلّم ہے کہ انھوں نے ایک مکتبِ فکر کا آغاز کیا اور ایک نیا طرزِ تحریر و تصنیف پیدا کیا اور ایک بڑے حلقے میں علمی ذوق اور روح پیدا کردی؛ لیکن سیّد صاحب نے علمی حیثیت سے اس کو اور محکم، مدلل اور دل آویز بنایا، اس کا صحیح فیصلہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دو ابتدائی حصوں اور بقیہ اجزاء کے موازنے سے ہوسکتا ہے میں نے تو بر سبیل تذکرہ یہ بات لکھ دی تھی، ورنہ موازنہ کو مستقل موضوع بنانا ذوقِ سلیم پر بار ہے۔

رہا مولانا آزاد کا معاملہ تو اُن کی ذہانت کا ہمیشہ قائل رہا، اور یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا اصل جوہر ذکاوت ہے۔ مطالعہ و نظر میں کبھی طبیعت نے اُن کا خاص اثر قبول نہیں کیا۔ ہر شخصیت کی ایک کنجی ہوتی ہے جس کے بغیر اس شخصیت کا مقام متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، مولانا آزاد کی شخصیت کی کلید ان کی ذہانت ہے، نہ کہ مطالعہ و وسعتِ نظر اور رسوخ فی العلم۔

آپ کے بعض ساتھیوں اور واقف کاروں سے آپ کی تعریف سنی تھی۔ آپ کے خط نے آپ کی سلامتِ طبع اور ذوق کی تصدیق کی، خدا کرے آپ کو دینی و علمی طور پر اپنے کو ترقی دینے اور نام وَ رباپ کی یادگار بننے کا موقع ملے۔ مولوی ازہر شاہ صاحب کو

سلام کہیے۔

والسلام
ابوالحسن علی

۱۱؍ربیع الاوّل ۷۳ھ
مرکز اصلاح وتبلیغ، کچہری روڈ، لک

رائے بریلی ۲۳؍ربیع الاوّل ۸۷ھ

مکرّمان محترمان مولانا ازہر شاہ صاحب، مولانا انظر شاہ صاحب زید لطفہما

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''قائد'' لکھنؤ میں جناب کی والدہ ماجدہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر قلق اور افسو
ہوا۔ الجنة تحت أقدام الأمهات، آپ کے سر سے ایک نہایت مبارک سایہ اٹھ
حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کی رفیقۂ حیات ہونے کی وجہ سے بھی ہم سب مخل
معتقدین کے لیے رنج وملال کی بات ہے، مگر تسکین کی یہ بات ہے، آپ جیسے فا
لائق وفائق فرزند چھوڑے۔

وما مات من كانت بقاياه مثلكم
شباب تسامى للعلى و كهول

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، جتنی علالت میں انھوں نے
اٹھائی، اتنی ہی راحت وقرب نصیب فرمائے، میری طرف سے دلی تعزیت
فرمایئے۔ والسلام

مخلص
ابوالحسن علی ندوی

***

الٰہی عاقبت محمود گرداں

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ

اس فانی کائنات کو کیا کہیے؟ فنا اس کی تقدیر، ہر چیز کے لیے فنا مقدر۔ باقی رہنے والا صرف ایک، یعنی خدائے دو جہاں، کچھ اور چیزوں کے لیے بقا کی اطلاع، مگر آخر کار ان کے لیے بھی ایک وقت پر فنا، یا جسے ہم اور آپ قیامت کہتے ہیں، اس وقت تک باقی پھر فنا کا سناٹا۔

انبیاء اٹھ گئے، مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس تیرہ و تار دنیا سے اپنا جسد اطہر لے کر رخصت ہوئے، خیر القرون کی صف لپیٹ دی گئی اور اس سے متصل ادوار کے ہزار ہا ہزار علماء پیوندِ خاک، قطار اندر قطار زیر خاک نمناک، بہادر اور جیالے تودۂ زمین کے نیچے۔ جنھوں نے اپنی جنگ جوئی سے بڑے بڑے معرکے سر کیے، ان کا جیالا پن موت کے سامنے عاجز، آہنی پنجے موڑنے والے موت کے پنجے سے خود کو رستگاری نہ دلا سکے، تدبیر ناکام، تدبر فرو ماندہ، سیاسی داؤ پیچ اس ناگزیر مرحلے میں ششدر۔

اپنی ۶۵ رسالہ زندگی میں خدا جانے کتنی نامی گرامی شخصیتوں کو اٹھتے دیکھا، کتنے ایسے جنازے بردوش نظر آئے جن پر بے کسی کے سوا کوئی رونے والا نہ تھا۔

نو خیز کلیوں کا چاک گریباں ہونے سے پہلے ٹوٹ کر گرنا، شگفتہ پھولوں کی شادابی کا مٹنا سب کے سامنے ہے، مکان اجڑ گئے، مکین بچھڑ گئے اور وہی ہوا جو کسی ایسے حوادث سے دوچار ہونے والے نے کہا تھا ؎

جائے کہ بود آں دلستاں با دوستاں در بوستاں
شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ماہی را وطن

مگر آہ! انسانی زندگی کی غفلتیں، نہ چشم عبرت کھلی، نہ پردے غفلت کے اٹھے، وہ آج بھی فانی زندگی پر مبتلائے غرور، اپنی تدبیر پر نازاں، تو اپنے تدبر پر نازش، اپنے قوی ہیکل ہونے پر غرور، تو اپنی چاق و چوبند صحت پر اعتماد، اپنے مال و تموّل پر بھروسہ، اپنے اثر و رسوخ پر بے فکر، نہیں سمجھتا کہ بیماریاں تعاقب میں، ناتوانیاں تجسس میں، فرشتۂ اجل صبا رفتار اور یہ راہوار زندگی پر سبک خرام۔

لیجیے! شبِ منگل ہے، ربیع الآخر کی ۱۷ رویں شب، تاریکیوں میں گم اور اسی تاریخ کی اٹھارہویں شب اس طمطراق سے قدم زن کہ اب اس کی جہاں بانی ہمیشہ کے لیے ہے، یہی فریب جانے والی رات کو تھا اور اسی دھوکے میں آنے والی رات مبتلا، حالاں کہ کہنے والے نے کہا تھا ع

ہاں کھائیو مت فریب ہستی

پونے بارہ بجے کا وقت ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، عموماً غیر ملکی فون شب میں آتے ہیں، خیال گذرا کہ یہ بھی کوئی غیر ملکی فون ہے، رفیق رہائش نے دو منٹ بعد زور سے "انا للہ" پڑھا۔ دل دھک سے رہ گیا کہ کسی کے سانحۂ وفات کی اطلاع ہے، یہ غیر ملکی فون نہ تھا؛ بلکہ مجھ سے قریب تر مسجد چھتہ سے حضرت المحترم مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی طاب ثراہ کے حادثۂ وفات کی اطلاع تھی، میں اور میرے جلیس استرجاع کے بعد سرنگوں، سانحہ کی شدت نے دل و دماغ کو معطل کیا، نہ یارائے گفتار، نہ موضوعِ مجلس کارشتہ بدست و بکار، اب ساڑھے بارہ بج چکے تھے، فون براہ راست افریقہ سے آرہا تھا جس سے اس جانکاہ واقعہ کا یقین اور کچھ مزید تفصیلات ملیں۔ ضروری کارروائی تو اسی وقت کی گئی یعنی وقف دارالعلوم میں ایصالِ ثواب و جلسہ تعزیت کے لیے ہدایات، برائے نام اپنے بستر پر آ گیا، کہاں کی نیند، کس کے لیے آسودگی، مرحوم کی تقریباً ۴۰ رسالہ

زندگی جو میرے شعور کے سامنے گذری، گھڑی ہے اور کتاب زندگی کا ایک ایک ورق الٹ الٹ کر مجھے دکھا رہا ہے۔

یہ اس دور کا واقعہ ہے جب دارالعلوم کے اکابر رد مودودیت کی مہم میں مصروف ہیں۔ کسی ایسی شخصیت کی تلاش ہے جو اس تحریک کے پیچ وخم پر مطلع اور رطب و یابس میں فرق و امتیاز کی صلاحیتوں سے دولت بداماں ہو۔ مولانا عبدالصمد رحمانی کا نام آیا اور مدھیہ پردیش کی نامور شخصیت مولانا عابد صاحب وجدی الحسینی کا بھی، لیکن مولانا حامد صاحب القاسمی کی رائے مشاورت سے دیوبند المغفور محمود سے واقف ہوا۔ قاضی صاحب کانپور اور اس کے اطراف میں مفتی صاحب کے ساتھ شریک سفر اور بہت سے جلسوں میں مدعو ہو چکے تھے، مرحوم کی دقیقہ سنجی، فقہی معلومات، تفقہ اور ذہانت کی داستان کو مشاق سے سناتے، انہی کی بلیغ کوششوں کے بعد دارالعلوم مفتی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔

مفتی صاحب دیوبند تشریف فرما ہو کر احاطۂ مسجد میں استاذ محترم حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی سابقہ رہائش گاہ میں فروکش ہو گئے۔ کشیدہ قامت، نہ لحیم وشحیم نہ ضعیف ونزار، گریباں ہر وقت کھلا ہوا، عام لباس ازار اور لمبا کرتہ، موسم سرما میں پائجامہ کا اہتمام، داڑھی گھنی، چشم دوربیں، مردم شناس؛ لیکن مردم آزار نہیں، ارد گرد ذہانتوں کا حصار، کان کھلے ہوئے، ہاتھ مصروف کار، دماغ مشغول، قلب معمور، مگر بولنے میں بہت محتاط، کیا مجال کہ کوئی گرفت میں لے سکے، یا ان کی گرفت سے خود کو چھڑا سکے، سردیوں میں سبز شال اور عبا۔

بعد چندے احاطۂ مسجد سے اٹھے اور چھتہ مسجد میں آبسے کہ روحانیت نے احاطے پر مسجد کو ترجیح دی۔ یہ دور مرحوم کی گمنامی کا تھا، چلتے تو ایک دو طالب علم ساتھ، فرودگاہ پر ایک آدھ طالب علم موجود۔

مجھ سے شناسائی ہو چکی تھی؛ لیکن وہ کم آمیز اور مجھے ضرورت مہمیز، اس لیے سلام و جواب سلام تک بات محدود رہی، پڑوس میں آ رہے تو حق جوار نے احساس خبر گیری دیا۔

عموماً اُن کا رمضان یہیں گذرتا۔ غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے میرا کمسن بچہ احمد خضر غریب خانے سے افطاری لے کر اُن کے یہاں جاتا، مرحوم مسجد کے ایک زاویے میں تشریف رکھتے، شرکائے افطار کا عدد ایک دُو سے زیادہ نہ تھا۔

مرحوم داد و دہش میں کھلے دل کے تھے، مجھے خود اس کا بارہا تجربہ ہوا، کسی ضرورت مند طالب علم کے لیے میں کھانے کی درخواست کرتا یا کسی کے صبح گاہی ناشتے کے لیے، وہ ہمیشہ درخواست قبول فرماتے؛ بلکہ بعض اوقات کچھ ضرورت مندوں کے لیے تعمیر یا رہائش میں مرمت کے لیے بڑے تعاون کی طرف متوجہ کیا، مفتی صاحب نے بلا تأمل ایسی گذارشات کو بھی قبول فرمایا۔

یہ بھی میرے علم میں ہے کہ بہت سے ضرورت مند یتیم بچے، بیوہ عورتیں، روزگار کے تباہ حال، مفتی صاحب کے عطا و نوال سے فائدہ اٹھاتے۔ ان کی اس سخاوت اور فیاضانہ داد و دہش کو دیکھ کر بہت سوں کا خیال ہے کہ مفتی صاحب کو دستِ غیب تھا یا جنات ان کو بڑی رقمیں دیتے، عوامی چرچوں میں ایسے بے بنیاد تخیلات کی بہت گنجائش ہے۔

مفتی صاحب اپنے تفقہ سے خوب خوب کام لیتے؛ چناں چہ ضلع میرٹھ کے قصبہ سٹھلہ میں میرے ایک عزیز دوست اور وہاں کے مدرسے کے مہتمم صوفی اکرام صاحب دیوبندی تردیدِ مودودیت پر مولانا کی تقریر کرانا چاہتے تھے، برائے دعوت میں بحیثیت سفارش کنندہ اور صوفی اکرام صاحب مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچے، گفتگو ہوئی، مرحوم نے درخواست پر نہ ہاں کی نہ ہوں، جو اختصاصی تعلق اس حقیر کو تھا اس کی بنیاد و اعتماد پر میں نے اکرام صاحب سے کہا کہ جائیے! درخواست منظور، مفتی صاحب کو میں لے کر حاضر ہوں گا۔

تاریخ موعود آ گئی، میں حاضر ہوا تو تشریف لے جانے سے مفتی صاحب نے انکار کیا۔ میں نے وعدہ یاد دلایا تو فرمایا میں نے وعدہ کب کیا تھا؟ آپ فرما رہے تھے، میں سن رہا تھا۔ اس انداز کی معقولیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی شرعی قباحت نہ کوئی فقہی نکارت۔

دارالعلوم کا اختلاف ہوا تو مرحوم بدستور دارالعلوم سے وابستہ رہے، مجھے خیال گذرا کہ مفتی صاحب یکسو ہیں یا دوسری جانب کے طرف دار۔ اس لیے ملنا جلنا چھوٹ گیا، زیادہ صحیح یہ ہے کہ ایک حد تک بدگمانی کی دیوار حائل ہوگئی کہ اچانک جلسہ انعامیہ برائے وقف دارالعلوم کے موقع پر ایک لمبا چوڑا کتابوں کا بنڈل تقسیم انعام کے لیے مرحوم کی جانب سے موصول ہوا۔

اللہ اکبر! بڑوں کی بڑی بات، میں اپنے طور پر بدگمان تھا؛ مگر مرحوم کی عظمت یوں نمایاں ہونے والی تھی اور تو اور، وقف دارالعلوم کے طلبہ متعلقہ دارالافتاء مرحوم کے اسباق میں شریک ہونے لگے۔ ذرا اس فراخ دلی پر غور کیجیے کہ وہ اسناد جو اُن طلبہ کے لیے وقف دارالعلوم نے جاری کیں مفتی صاحب کے دستخط سے مزین ہیں۔ پیہم اس طرح کے واقعات حقیر کے لیے تقریب حاضری بن گئے۔

اور وہ ساعت بھی آ پہنچی کہ بے کسوں کو قدیر وقادر نے وقف دارالعلوم کی اپنی عمارت کی بنیاد رکھنے کی سعادت عطا فرمائی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ اس مبارک موقع پر مفتی صاحب سے بڑھ کر بابرکت شخصیت کہاں میسر آئے گی۔ مرحوم اس زمانے میں صاحبِ فراش تھے اور چھتہ مسجد میں فروکش۔ میں حاضر ہوا، سلام وکلام ومزاج پُرسی کے بعد معروضہ پیش خدمت کیا۔ آج تک حیرت ہے کہ ردّ وقدح درکنار، کیسا انکار و استنکاف، اس بڑے آدمی نے پوری بشاشت کے ساتھ سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت قبول فرمائی۔ میں باہر نکلا تو وسوسہ دامن گیر کہ مفتی صاحب نے مجھے پہچانا یا نہیں، خدا جانے کیا سمجھے اور کیا سمجھ کر دعوت قبول کی۔ دوبارہ حاضر ہوا، عرض کیا کہ حضرت! آپ نے مجھے پہچانا بھی؟ جواب تھا کہ آپ کو کون نہیں پہچانتا؛ بلکہ اس ظلوم وجہول کے متعلق چند اشعار فرمائے تھے جو میرے لیے وثیقۂ آخرت ہیں، سنائے تو باور آیا کہ مفتی صاحب نے وعدہ جان پہچان کر فرمایا ہے۔ متعین تاریخ آئی، حضرت برائے سنگِ بنیاد وقف دارالعلوم کی خرید کردہ زمین میں رونق افروز ہوئے، کافی دیر تک اسٹیج پر تشریف فرما ہو کر

اسٹیج پر وضو فرمائی، پھر مسجد اور دار الحدیث کی بنیاد اپنے دستِ مبارک سے رکھی، د
تعمیر کی تکمیل اور بے پناہ دعاؤں سے ہم نیاز مندوں کو نیا حوصلہ بخشا۔ رمضان المب
جب دیوبند میں گذرتا، مسجد چھتہ کی رونقوں کا کیا کہنا، معتکفین کا ہجوم، تراو
جماعت باہر سڑک تک، ذکر اللہ کی مترنم آوازیں، صدائے ''ہو حق'' سے محلہ لبریز،
برکات تو از زمین تا آسماں، ظاہری برکات سے زلہ ربائی اس گنہ گار کے حصے میں بھی
کہ وقتاً فوقتاً انواع واقسام کے کھانوں سے لبریز طباق غریب خانے پر بھیجتے
خصوصی عادت تھی کہ ادھر مجھ خاکسار نے کوئی ہدیہ بھیجا تو هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ
الْاِحْسَانُ پر عامل یہ گرامی شخصیت جو کچھ موجود ہوتا اسی وقت عنایت فرماتے۔

آخری ملاقات اس سفر میں تشریف لے جانے سے پہلے ہوئی، جو حضرت کا آ
سفر ہو گیا۔ سینکڑوں کو خدمت کا موقع ملا، بہت سوں نے نیاز مندیوں کا مظاہرہ کر
سعادتوں سے اپنے دامن بھرے؛ لیکن عزیز مکرم مولوی ابراہیم صاحب افریقی س
اس میدان کے یکہ و یگانہ شہسوار ہیں، جنھوں نے اپنی عاقبت بنائی اور آخرت سا
میں منفرد سلیقے کا مظاہرہ کیا۔

دیوبند عجیب وغریب جگہ ہے، بقول شخصے یہاں کسی کی تلاش میں ہاتھ کو حرکت
جائے تو مولوی پر ہاتھ پڑے گا یا کسی عالم پر۔ جہاں کسی جنس کی اتنی فراوانی ہو اور خر
بدسلیقہ، کسی کی قدر وقیمت لگ جانا عجوبہ ہے۔

میرے علم و یادداشت میں الحاج سیّد عابد حسین صاحبؒ کے بعد مرحوم کی دو
شخصیت ہے جس نے دیوبند پر اپنی عقیدت کی گہری چھاپ لگائی، دیوبندیوں نے ج
رجوع کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا لافانی باب ہے۔

خدا جانے اس حادثے کو نیاز کیش کس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ میرا دل و دماغ
اس تصور سے تھرا رہا ہے کہ کہیں دیوبندیت کا ایک ستون یعنی خانقاہیت اپنے حق
معنوں میں مرحوم کی وفات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے کہ چراغ برابر گل

رہے ہیں اور نیا چراغ روشن دکھائی نہیں دیتا۔

یہ بھی بے تکلف عرض کروں کہ ایک عوامی انتخاب ہے، اس کے لیے تو شخصیتیں ہوں گی اور وہ حقیقی معیار جسے بلند نظری تشکیل کرتی ہے، خلاء اسی معنی میں ہے جس کے پُر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

مغفرت تو ہر مومن کی یقینی ہے، پھر صالحین وقانتین، زہاد وعباد کی تو من جانب اللہ موعود۔ رہا ترقی مراتب آخرت کا معاملہ سو مرحوم اپنے ساتھ نیکیوں کا اتنا ڈھیر لے گئے کہ وہ نیکیاں موجبِ ترقیٔ مراتب اور باعثِ رضا ورضوان ہوں گی۔ ان شاء اللہ

برّد اللہ مضجعہٗ

* * *

حضرت مولانا صدیق صاحب باندویؒ

سادگی کا پیکر، فروتنی کا سبزہ زار، انکسار کا بہتا دریا، تخم نفس کا شجر ثمر بار، زہد فی الدنیا
راغب الی الآخرۃ، متوکل علی اللہ، قانع باللہ، عالم، فاضل، واعظ، حافظ، قاری، مرشد،
عرفانِ رب کا منار، عبادت کی محراب، ریاضت کا منبر، مجاہدے کی مسجد، زہد و اتقا کا
حرم، خورد نوازی میں بے عدیل، بزرگوں کے احترام میں بے مثل، سادہ پوشاک، نہ
ظاہری طمطراق، نہ عصا بدست، نہ عبا در بر، نہ سر پر لمبی دستار، ظاہری ٹیپ ٹاپ سے
مستغنی، عموماً لنگی سر پر، چہار گوشہ ٹوپی دیکھنے میں دیہاتی؛ لیکن باطن منور، روح مزکّی،
قلب منوّر، آنکھیں نیم باز، طبیعت سیمابی، پاؤں مثل پائے آورمیدہ، کیا مجال کسی جگہ
چند منٹ کے لیے سکون پذیر ہوں، ممکن نہ تھا کہ چائے یا کوئی مشروب گوارا ہو، ان کا
آنا جانے کی تمہید، ان کی ملاقات وداع کا پیغام، دروازے میں ہجوم کے ساتھ داخل
لیکن یہ ورود، جرسِ کارواں آمادۂ رحیل، بیٹھک کھولنے کا بھی موقع نہ دیتے، بیٹھنا تو
درکنار، تعویذ کی فرمائش پر کھڑے کھڑے تعمیل فرمائش۔

دعاء کی درخواست پر فی الفور دست بہ دعاء، خاکسار نے اپنی بہتر سالہ زندگی میں
خدا جانے کتنے مشائخ، کتنے بزرگ، کتنے عارف اور کس قدر زاہد و متقی دیکھے، لیکن
تواضع، فروتنی، فنائیت میں "الصدیق" کا مثل نہیں۔ تعارف کی ابتداء یہ ہے کہ میرا
مدرّسی کے ابتدائی ادوار میں تھا، شرح جامی کے سبق میں ایک شخص بے تکلف طلبہ کے
ساتھ آبیٹھا، محسوس ہوا کہ کوئی غریب دیہاتی ہے جو ہر سبق کو بخاری شریف کا درس سمجھ کر

شرکت موجبِ سعادت سمجھتا ہے۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ اپنے معروف مزاج کے مطابق اس نووارد کو ''بزِ اخفش'' نہیں بنایا، ورنہ پاکستان میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے جماعتِ اسلامی کے موجودہ سربراہ قاضی حسین احمد صاحب کو ''بزِ اخفش'' بنانے کی بے پناہ غلطی کر چکا ہوں، بعد میں تعارف ہوا تو لاہور کا مشہور دریا راوی اگر سامنے ہوتا تو یقیناً شرم ساری کے نتیجے میں چھلانگ لگا دیتا۔ طلبۂ درس کی یہ حماقت کہ پہلے سے مطلع نہیں کیا، سبق کے بعد اس نیاز مندی سے ملے، جیسا کہ دیہاتی ہر مولوی کو جنید و بایزید سمجھ کر ملتے ہیں، نام پہلے سن چکا تھا، اس لیے غرقِ آب حیا ہو گیا، پھر تو شرفِ نیاز بارہا نصیب ہوا۔ ایک بار لکھنؤ کے اسٹیشن سے دیوبند کے لیے ریل پر سوار ہو چلا، مولانا کہیں سے لکھنؤ کے اسٹیشن پر وارد ہوئے، میرے متعلق سنا تو سندیلہ کے لڈوؤں کے دو گونے لیے، ڈبے میں تشریف فرما ہوئے، اصرارِ شدید کے باوجود جانے کے لیے تیار نہیں، انجن نے سیٹی دی تو اتر کر سامنے کھڑے ہو گئے، بمنت رخصت ہونے کی درخواست کا جواب یہ تھا ''جب تک ریل روانہ ہو، آپ کو دیکھتا رہوں گا۔'' گاڑی روانہ ہوئی تو اس آزارِ دل آزار سے نجات ملی کہ مخدوم خادم کے لیے اس درجہ تعب برداشت کر رہا تھا۔

اسٹیج پر تشریف فرما ہوتے اور میری اول فول کو ایسے شغف و انہماک سے سنتے کہ کبھی تو نفس سرکش محسوس کرتا کہ ابن جوزی مصروفِ وعظ ہیں، تقریر دل پذیر کی لہریں سامعین اور خود مرحوم کو باطنی تپش میں برودت بہم پہنچا رہی ہیں؛ حالاں کہ یہ سب کچھ مولانا کی معروف خورد نوازی کے منظر تھے۔ یہ بھی دیکھا کہ کانپور کی ایک مسجد میں مرحوم اپنی پشت پر مرچ کی بوری اٹھائے ہوئے دھوپ دینے کے لیے اوپر چھت پر چڑھ رہے ہیں اور شام کو اسی انداز سے اتار رہے ہیں، افریقہ میں کسی نیاز مند نے بیش قیمت دستی گھڑی ہدیہ کی تو مرحوم نے وہیں کسی کو دے کر سبک دوشی حاصل کر لی۔

گنگوہ ضلع سہارن پور کے مدرسہ شریفیہ میں کرسی پر سوار ظلوم وجہول اس زعم میں کہ وقت کا سحبان وائل مصروف خطاب ہے کہ اچانک ایک پرچہ پہنچایا گیا، عام عادت

یہ ہے کہ درمیانِ خطاب موصول تحریر پر توجہ نہ ہو، اس لیے کہ یقیناً کوئی اعتراض
جس کا جواب بجائے خود مہمل ہے، لیکن اس روز اس پرچے کو پڑھ لیا۔ اطلاع حضر
مرحوم کے سانحۂ رحلت کی تھی، کیا عرض کروں، ایک سناٹا نکل گیا اور محسوس ہوا کہ ظلمت
کی شبِ دیجور نورِ معرفت، تنویرِ عرفاں پر سفاکانہ حملے میں بالآخر کامیاب ہوگئی۔ غال
ستر اور پچھتر سال کی عمر مبارک کے درمیان ''صدیق'' مع الصدیقین رفاقت کے
بیک جنبش دنیائے دوں سے رخصت ہوا۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

* * *

مکرم بندہ زید کرمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج بعافیت ہو۔

مولانا سیّد ظہیر الاسلام کی معرفت لفافہ ملا، میں تو اس سے پہلے ہی سے کوشش کر
ہوں، شوریٰ میں شرکت بھی اسی لیے کی تھی، ایک تحریر بھی تفصیل کے ساتھ لکھ کر دی تھ
اس میں بھی درخواست کی تھی اور عرض کیا تھا کہ اگر شوریٰ کے بس کی بات نہ ہو تو پھر مل
کے دوسرے حضرات کے حوالے کر دے، فریقین میں سے صرف ایک کی بات پر ک
رکھنا یہ شوریٰ کے منصب کے خلاف ہے، اس کے بارے میں یہ جواب ملا کہ ہم اس
خلاف نہیں، کوئی بھی کوشش کرے۔

مولانا منت اللہ صاحب کی خدمت میں صرف اسی کام کے لیے سفر کیا؛ مگر پٹنہ پ
معلوم ہوا کہ حضرت مولانا موجود نہیں۔ قاضی مجاہد الاسلام صاحب سے ملا، ان دنوں
کی طبیعت خراب تھی، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، دریافت فرمایا: آخر آپ کیا چاہتے ہیں
میں نے عرض کیا: دار العلوم میں جو حضرات پہلے تھے، وہ سب پھر آجائیں اور حضر
مہتمم صاحب کا جو مقام تھا وہی مقام ان کو دیا جائے۔ فرمایا کہ یہ کام بہت مشکل ہے

اس پر میں نے اُن سے عرض کیا جس کام کے لیے جیسی کوشش ہونی چاہیے، اگر اس طرح کرلی جائے تو وہ کام مشکل نہیں رہتا۔ صلح کے بارے میں اب تک جو گفتگو ہوئی، اس میں ایلچیوں اور سفیروں سے کام لیا گیا، ان حضرات نے پوری بات طرفین تک نہیں پہنچائی۔ صلح کے لیے اس وقت کوشش کرنی چاہیے جب تک صلح نہ ہوجائے۔ انھوں نے وعدہ فرمایا کہ میں کوشش کروں گا۔ مگر دو تین خط لکھے، کیا کر رہے ہیں؟ اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا رہا کہ طبیعت خراب ہے۔

اس میں تنہا مجھ سے بالکل کام نہ چلے گا، نہ میری ایسی حیثیت ہے، اور نہ ایسی صلاحیت ہے، ملک کے مقتدر حضرات اور مشائخ کرام اس طرف اگر متوجہ ہوجائیں جن میں حضرت مولانا منت اللہ صاحب بھی ہوں تو قوی امید ہے کہ مسئلہ حل ہوجائے گا؛ مگر معلوم نہیں کیا مصلحت ہے کہ کسی کو اس کی فکر نہیں ہورہی ہے، ان حضرات کی خاموشی کا جواز نہیں سمجھ میں آرہا ہے۔

جناب سیّد شہاب الدین صاحب نے اس میں کچھ دن دل چسپی لی، اب وہ بھی خاموش ہیں۔ اللہ پاک سے تو روزانہ دعا ہورہی ہے کہ دارالعلوم کو ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے۔ حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کا دارالعلوم میں نہ رہنا یہ دارالعلوم کی موت ہے، خدا کرے سب کے اندر اس کا احساس پیدا ہوجائے، حضرت کے لیے روزانہ دعا ہورہی ہے۔ جناب مفتی شکیل احمد صاحب کے پاس دو خط لکھے کہ حضرت کی خیریت سے جلد مطلع فرمائیں، مگر جواب نہیں آیا۔

آج ہی مولانا محمد سالم صاحب کی خدمت میں عریضہ ارسال کررہا ہوں اور جوابی تار بھی دے رہا ہوں۔

والسلام

از صدیق احمد غفرلہٗ

***

حضرت مولانا سیّد احمد رضا صاحب بجنوریؒ

چھریرا بدن، متناسب الاعضاء، ہمہ وقت متحرک، بذلہ سنج، مجلسی مزاج، نہ اعلیٰ پوشاک، نہ خوش خوراک، جو کچھ میسر آیا پہن لیا، کھالیا، کھانے میں بے حد محتاط۔ علامہ کشمیریؒ کے داماد بھی ہیں، بجنور کے سادات خاندان میں عدم آباد سے منصۂ وجود پر قدم زنی کرنے والا یہ ہونہار ضلع بجنور و مراد آباد کے بعض مدارس میں علم کی تلاش میں سرگردانی کے بعد دیوبند آپہنچا، دارالعلوم کا یہ وہ دور تھا جس کے تاباں و تابناک ہونے پر خود چشم فلک بھی مبتلائے حیرت تھی، فنون میں اساسی شخصیتوں کے ساتھ اہل دل و اہل اللہ کا اجتماع بھی تھا، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن نقشبندیت کا علم اٹھائے ہوئے اتباعِ سنت کا درس اور جلائے باطن کے سبق دے رہے تھے، پیروزہ بختی کہیے یا اس طالب علم کی طلبِ صادق کہ مفتی صاحب جیسے معصوم ولی اللہ کی معیت و رفاقت کی سعادت دامن میں آپڑی، اسی رفاقت نے فکر کو مستقیم، عقائد کو استوار، اعمال کی تطہیر، اور درست زاویۂ نظر کی دولت بخشی، یہی وقت تھا کہ علامہ عثمانیؒ کی درس گاہ دانش و بینش کی تقسیم کر رہی تھی، مولانا رسول خاں صاحب مرحوم فلسفہ و منطق کے جھنڈے بلند کر رہے تھے، علامہ ابراہیم صاحبؒ کلامیات میں نعرۂ ''انا ولا غیری'' لگاتے، حضرت مولانا اعزاز علیؒ فقہ و ادب میں انفرادیت کا اعلان کرتے، مولانا مفتی محمد شفیع المغفور فقاہت کے سربستہ راز کھولتے، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے درس میں کلام اللہ کے اسرار سے نقاب کشائی ہوتی اور علامہ کشمیری کا فیضانِ علم تموّج پذیر تھا، مولانا سیّد احمد رضا صاحب کو علم و عمل کے

ن سمندروں سے سیرابی کی سعادت میسّر آئی، کسب واکتساب اور اخذ وقبول کا سلسلہ چل
ی رہا تھا کہ دار العلوم کے منارۂ فخر وامتیاز کا کلس ٹوٹ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی درس
گاہ کی زینتوں کا باعث بن گیا، دار العلوم کی اس محرومی اور جامعہ ڈابھیل کی خوش نصیبی پر
یدہ ور یہی کہتے ؎

غنی روزِ سیاہ پیر کنعاں را تماشہ کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اس طرح مولانا کو علامہ کشمیری کا دار العلوم اور علامہ کشمیریؒ کے بعد کا دار العلوم دونوں
کو دیکھنے کا موقع ملا۔ فراغت کے بعد علوم جدیدہ کا ذائقہ چکھنے کے لیے کرنال میں کچھ وقت
گزارا اور پھر مولانا بشیر احمد بھٹے مرحوم کی کوششوں سے ڈابھیل جا پہنچے، اس طرح استفادہ
کا وہ سلسلہ جو علامہ کشمیریؒ سے ٹوٹ گیا تھا قدرت کی چارہ سازیوں سے پھر استوار ہو گیا،
رحوم کشمیریؒ کو عمر بھر یہ شکایت رہی کہ "ہمیں کوئی صحیح مخاطب نہیں ملا" مقدمہ بہاول پور
سے جب وہ لوٹے تو قادیانیت کے تابوت کو زیر زمین کرنے سے زیادہ انھیں اس پر
سرّت تھی کہ بہاول پور کی عدالتِ عالیہ کا جج میری بات سمجھتا تھا، اسی دیدہ ور شخصیت کی نظر
ں کسی کی وقعت بڑی سند اور بڑا امتیاز ہے، مولانا احمد رضا صاحب کی رفاقت پر علامہ
رماتے کہ "یہ صاحب اگر پہلے ہم کو میسر آجاتے تو بڑا کام ہو جاتا" شب وروز کی یکجائی چند
سالہ تھی، مگر بعض روشن باطن مسترشدین نے مرشدِ کامل سے چند ساعتی صحبت میں تجلیہ
لن کی سند لے لی تو پھر اس میں استعجاب کیا کہ ایک طالب علم چند سالوں میں اپنے جیب و
ن کو ایک بحر العلوم کی صحبت سے علم کے زرّیں سکوں سے لبریز کر لے۔

علامہ کشمیریؒ کے مسودات کو پڑھنا اور ان کی تبییض کارِ مشکل تھا، اہل سواد اور ذی
ستعداد عالم وفاضل ہی اس مہم کو انجام دیتے، مرحوم نے اس سنگلاخ کو اس خوبی سے عبور
یا کہ بہت جلد علامہ کی نظر میں اعتماد حاصل کر لیا، جامعہ اسلامیہ میں تدریس کے ساتھ
مجلس علمی" کا انصرام وانتظام مولانا احمد رضا صاحب ہی سے متعلق رہا، ان کی جدوجہد

سے اس ادارے نے قلیل عرصے میں ہندوستان کے علمی اداروں میں اپنا مقام بنالیا، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ کشمیریؒ وغیرہ کی تالیفات وتصانیف منظر عام پر آئیں، مولانا مرحوم کی سعی وکاوش سے بخاری کی املائی تقریر مولانا بدرِ عالم صاحب نے ترتیب دی، مولانا یوسف بنوریؒ جیسا جوہر قابل اس دائرۃ المعارف سے وابستہ ہوا، خود مولانا نے علامہ کشمیریؒ مرحوم کی مشکلات القرآن کی تخریج کی، اسی دور میں ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن پر علمی تعاقب کیے اور مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار میں جو جھول نظر آئے اس سے علمی حلقوں کو باخبر رکھا۔

مگر افسوس کہ مجلسِ علمی جیسا پُروقار ادارہ ناقدرشناس افراد کے ہاتھوں میں پہنچ کر اپنا امتیاز کھو بیٹھا اور اب پاکستان میں ایک ''عجائب خانہ'' سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، مولانا ڈابھیل سے اٹھے اور کچھ عرصے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے متعلق ہوئے، یہاں حضرت مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کے مآثر علمیہ کی تسہیل کا اہم کام شروع کیا، حفیدِ نانوتویؒ مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے اس تسہیل کو دیکھ کر آپ کا فوراً تقرر کرلیا؛ لیکن اب دارالعلوم ذی علم افراد کو قبول کرنے کے بجائے انھیں دور تر پھینکنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھا، اس افسوس ناک صورتِ حال نے مولانا کو دل برداشتہ کردیا اور ''خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد'' کے اصول کے مطابق قدرت نے انھیں ایک اور اہم ترین علمی کام میں مشغول کردیا، یہ جلیل کارنامہ حضرت شاہ صاحب کی درسِ بخاری کی تقاریر ہیں، جو مولانا ممدوح نے سالہا سال ان کی درس گاہ میں بیٹھ کر جمع کیں اور انھیں کو بہ لباسِ اردو ترتیب دیا۔ شروحاتِ بخاری کی کمی نہیں، عربی، فارسی، اردو ہر ایک زبان میں اس عظیم کتاب سے متعلق تشریح وتسہیل کا ذخیرہ موجود ہے، لیکن ''انوارالباری'' منفرد حیثیت رکھتی ہے، اس میں حدیث کی بھرپور تشریح کے ساتھ اکابرِ علم کے چھنے چھنائے اقوال زینتِ کتاب ہیں، علامہ کشمیریؒ کے بلند پایہ علوم سے یہ شرح مزین ہے اور بیشتر انھیں کے لب ولہجے میں، اس کی سب سے بڑی خصوصیت

...ریت کی بنیادوں کا استحکام، دفاع عن ابی حنیفہؒ، رجالِ احناف پر ناروا مظالم کی تردید، ...م بخاری علیہ الرحمہ کی حنفیہ سے بدگمانیوں کا ازالہ، حافظ ابن حجر کی زیادتیوں کا ...اقب، چاروں فقہوں میں حنفیت کی ترجیح، قدیم علوم کے دوش بدوش جدید معلومات کا ...ضافہ، اور رائج الوقت مادی افکار و نظریات پر معتدل تبصرہ ہے، غالباً بیس کے قریب ...جارا منظر عام پر آ کر قدر شناس علماء کی تحسین کا انبار اپنی پشت پر رکھتی ہیں، بہت بڑا کام ...ا جو مولانا نے انجام دیا۔

مولانا جہاں گشت بھی تھے، سعودی عربیہ، قاہرہ، استنبول، افریقہ، ہندو پاکستان کے اسفار برابر ہوتے رہے، ایک زمانے میں ان کی صحت نوجوانوں کے لئے موجبِ ...شک تھی۔ مقویات کے ہمیشہ سے عادی رہے، معجون فلاسفہ اور جوارش جالینوس خود بھی ...ستعمال کرتے، دوسروں کو بھی ترغیب دیتے۔ اور لاریب، یونانی طب کی ان ہر دو مایہ ناز ...دویاء کا ان کی صحت و توانائی میں آخیر تک حصہ رہا۔ خدا تعالیٰ نے اولاد بھی خوب دی، ...سب پڑھے لکھے اور برسرِ روزگار، دنیاوی بکھیڑوں میں ابتلاء کے باوجود چوں کہ علم کا ...ہمیشہ غلبہ رہا، اس لیے اہلِ علم سے ملتے تو انہیں غذائے روح میسر آتی، دانشوروں سے ...ملاقات سعادت گردانتے، سلوک و تصوف میں شروع سے نقشبندی تھے۔

صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند، خود کہتے کہ "بالغ ہونے کے بعد نہ کوئی نماز گئی اور نہ ...ی کوئی روزہ" خاتمۂ عمر پر آنکھ کا آپریشن ان کے لیے روح فرسا ثابت ہوا، صحت گرتی گئی، موت سے قریب اور زندگی سے بمراحل دور ہوتے گئے۔ موت قابلِ رشک ہے، رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں جان جانِ آفریں کو سپرد کی، آخر تمنا اپنے استاذ اکبر حضرت علامہ کشمیریؒ کے ساتھ دفن کی تھی؛ بلکہ وصیت بھی کی تھی، مگر افسوس ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ اب اپنے وطنِ مالوف کے خاموش قبرستان کے گوشے میں محو استراحت ہیں۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ.

* * *

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ

ایک نادرۂ روزگار شخصیت

ترکی کے جلاوطن علامہ زاہد الکوثری علم و فضل میں یگانہ، دین و دانش میں یکتائے روزگار تھے، حریت پسندی و دین پروری کے نیک جذبات کی فضا میں ترکی سے جلاوطن کیے گئے، مختلف ممالک میں گھومتے پھرتے قاہرہ کی علمی فضاؤں میں ہمیشہ کے لیے قیام کیا، دورانِ ہجرت یہ الم ناک واقعہ بھی پیش آیا کہ بحری سفر میں شیخ کوثری کا جہاز حادثے کا شکار ہوا اور شیخ موجوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس جانکاہ حادثے نے دماغی قوتوں کو مفلوج کر دیا اور حافظے کو اتنا متاثر کیا کہ علوم سب محو ہو گئے اور شیخ نے بڑا وقت تعطل کا گزارا، مگر قدرت کی چارہ سازیاں کہ بتدریج حافظہ بیدار ہوا اور علامہ نے از سرِ نو علوم حاصل کیے۔ وہ اپنے وقت کے محقق، مبصر اور نابغہ شخصیتوں میں سے تھے، جن کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ جملہ علوم و فنون پر دسترس تھی، رجال پر بڑی گہری نظر، فقہ حنفی سے وابستگی تصلب کی حد تک تھی، اپنی مستحکم حنفیت کے باوجود غیر حنفی حلقوں میں بھی ان کے علم و فضل کا احترام تھا، خطیب بغدادی کی ہفوات کا جواب دیا، امام محمد علیہ الرحمہ کی جامع سوانح حیات قلم بند کی، امام طحاوی پر ان کی علمی کاوشیں تاریخی دستاویز کی حیثیت سے مشہور ہیں، مقالاتِ کوثری پاکستان اور پھر ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں، جو اہلِ علم کی نظر میں خاصے کی چیز ہیں۔ مجلس علمی ڈابھیل نے فیض الباری امالی علامہ کشمیری علیہ الرحمہ و نصب الرایہ زیلعی کی طباعت کے لیے مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا احمد رضا صاحب کو جب قاہرہ بھیجا اور اُن ہر دو کا چند ماہ وہاں مسلسل قیام رہا تو شیخ کوثری کے خوانِ علم

سے زلہ ربائی ان کی تقدیر تھی، ہر دو کا بیان ہے کہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے بعد عبقریت میں اگر کوئی ان کی نظیر تھی تو شیخ کوثریؒ تھے۔

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ المغفور راہنی علامہ کوثری کے بااختصاص شاگرد تھے، ان کے علوم کے امین، ان کے فنون کے ترجمان، سلوک وعرفان سے آراستہ، حقیقی تقویٰ سے مزین اور سرتاپا علمی شخصیت۔ ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش کے متعدد اسفار کیے۔ پاکستان کی جملہ اساسی شخصیتوں سے وابستہ اور ہندوستان کے نام ور علماء سے قریبی تعلق، دیوبند کئی بار تشریف فرما ہوئے، مکہ معظمہ میں شیخ مالکی مرحوم کے دولت کدے پر احقر نے اُن سے سندِ حدیث لی جو میری سعادتوں کا باعث ہے، خود مرحوم نے مجھ سے سند لی جس کا اظہار میرے لیے خجالت ہے، علمائے ہند میں حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کے بعد مولانا عبدالحیؒ مرحوم لکھنوی ان کی عقیدتوں کا مرکز تھے۔ مرحوم نے شیخ کشمیریؒ کی التصریح کو ایڈٹ کیا، آثار السنن پر جو علامہ کشمیریؒ کا مفصل حاشیہ ہے، اس کے قلمی عکس پر شیخ ابو غدہ کا ابتدائیہ ہے جس میں حضرت علامہ کشمیریؒ کے تلامذہ کو جھنجھوڑ کر فرمایا کہ:

''ان حواشی کو ایڈٹ کرنا حضرت علامہ کے تلامذہ کا فریضہ ہے۔''

بار بار اپنے شیخ کوثری کے متعلق فرماتے کہ ''کان الشیخ یوصینا بمطالعة کتب الشیخ أنور'' مولانا فرنگی محلی کی معرکۃ الآراء تصنیف کو بھی ایڈٹ کیا، شیخ ابو غدہ کی نگارشات واضح کرتی ہیں کہ ان کا علم گہرا، ان کی معلومات وسیع، ان کا تبحر ٹکسالی اور ان کا علم وفن مثالی تھا۔ شیخ سعودیہ کی کئی یونیورسٹیوں سے وابستہ رہے، لیکن اپنے جلیل استاذ شیخ کوثری علیہ الرحمہ سے انھیں بھی یہ وراثت ملی کہ غیر حنفی حلقہ ان کے فکر ونظر کو برداشت نہ کرسکا، اس کے باوجود وہ اپنے علم ودانش سے جہانِ علم کو نئے قندیل روشن کرکے بہم پہنچاتے رہے۔ ۷۵ رسال کی عمر میں ناسوتی زندگی کے رشتے ٹوٹ گئے اور اب یہ عالم دین اپنی جلیل علمی خدمات کی جزا کے لیے بحضور رب العالمین پہنچ چکا ہے۔

ان کے متعدد مضامین اور تحریروں سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ وہ تیرہویں، چودھویں صدی کے علمائے دیوبند کی تصانیف وخدمات کو وقیع نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا یہ تاثر محسوس ہوتا کہ محققین علمائے دیوبند اور اکابر دیوبند نے برصغیر میں احیائے دین، اشاعتِ علوم نبوی اور اصلاحِ ملت ہندیہ کے لیے جو عظیم کارنامے انجام دیے ہیں، وہ اپنے اثرات نتائج کے اعتبار سے بہت وقیع، بہت قیمتی اور بہت قابلِ قدر ہیں جن کے تعارف اور تفصیل کی احتیاج ہنوز باقی ہے اور اس میں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں بسنے والے اہلِ علم اور اربابِ نظر کے لیے بڑا اسبق ہے کہ مرکزِ دین اور منبع علوم اسلامیہ حجاز اور شام سے اتنے دور دراز فاصلے پر بسنے والے ان علمائے ذی وقار نے ایسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جو دیارِ عرب کے اہل علم کے لیے بلاشبہ قابلِ رشک ہیں۔

شیخ کے یہاں جگہ جگہ علماء واکابر دیوبند کو بڑے مؤثر اور والہانہ انداز میں خراجِ تحسین ملتا ہے اور کہیں کہیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی صحت اگر اجازت دیتی، ان کے حالات سازگار ہوتے اور ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اپنی عمر کا آخری حصہ علمائے دیوبند کی فقہی اور حدیثی خدمات کو اہل عرب کے سامنے اپنے پُرتاثیر قلم سے خوانِ یغما بنا کر پیش کرتے۔

ہمارے نزدیک ان کے یہ جذبات اور ان کی تحریروں کا یہ بین السطور وابستگانِ سلسلۂ ولی اللہی، رشیدیت وقاسمیت کے لیے نہ صرف سند ہے؛ بلکہ قابل فخر بھی ہے۔ افسوس وقت کی ایسی مغتنم شخصیت بہت جلد ہم سے جدا ہوگئی۔

طاب اللہ ثراہ

* * *

قائداعظم

عربی کے مشہور شاعر متنبیؔ کا ایک مصرعہ ہے ”بضدها تتبين الأشياء“ گزشتہ صفحات میں اس کا بار بار ذکر آیا کہ بچپن ہی سے کانگریسی اخبارات کے مطالعے کے نتیجے میں شعور فکر و ذہن کے جو سانچے ڈھال رہا تھا، وہ طبعی طور پر کانگریس، اس کے قائدین، اس کی تحریکات کی جانب مڑتے چلے جاتے، مسلم لیگ اور اس کے قائد مسٹر محمد علی جناح کا نام اگرچہ اخبارات میں آنے لگا تھا، لیکن کانگریس نواز اخبار اُن کے ذکر و فکر کو قصداً دباتے۔ اس وقت تک مسلم لیگ کے اخبارات منظر عام پر نہیں آئے تھے، صرف مولانا مظہرالدین شیرکوٹی کا ”الامان“ مسلم لیگ کے افکار کا ترجمان تھا، ”انجام“، ”جنگ“، ”وحدت“، ”منشور“ لاہور کے اخبارات میں ”انقلاب“ انگریزی ”ڈان“ یہ اس وقت کے اخبارات ہیں، جب مسلم لیگ سینہ ٹھونک کر کانگریس کے مقابلے میں آچکی تھی، ابتداء میں تو مسلم لیگ اور اس کی سیاسی دل چسپیاں کانگریس کے حدودِ اربعہ کے مقابلے میں صفر کا درجہ رکھتی تھیں؛ چوں کہ کانگریس نواز اخبارات ہمیشہ مسٹر جناح کو اس انداز سے پیش کرتے کہ وہ انگریزوں کا دم چھلا اور ہندوستان میں جنگِ آزادی کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والے ٹوڈی ہیں، دوسری جانب مسلم لیگ اور اس کے طول و عرض میں نہ کوئی حرارت نظر آتی، نہ سیاسی سرگرمیاں؛ بلکہ یہ پارٹی نقطۂ انجماد پر پہنچی ہوئی تھی، مستزاد یہ کہ جب کانگریس کے حلقوں میں انگریز دشمنی کی ہلچل ہوتی تو مسٹر جناح کا کوئی ایسا بیان آجاتا جو انگریزوں کے مفاد میں ہوتا اور کانگریس کی پشت کے لیے خوف ناک چھرا، اگرچہ میرے بچپن میں دیوبند کی قصباتی زندگی میں سیدؔ محتشم شہید جو قصبہ کی امیر کبیر

شخصیت تھی، لیگی تھے اور جب وہ دیوبند میونسپل بورڈ میں چیئرمین منتخب ہوئے تو ان کی کوششوں سے نواب محمد اسماعیل خاں میرٹھی، مولانا مظہرالدین شیرکوٹی، سردار عبدالرب نشتؔر دیوبند آئے، جلسہ ہوا، تہنیت نامے پیش کیے گئے، مگر سچی بات یہ ہے کہ ان کے پروگرام میں ہم بچوں کی شرکت نفرت کے بھرپور جذبات کے ساتھ ہوئی، مولانا مظہرالدین لحیم شحیم گھنی ڈاڑھی جو سینے تک آتی، سفید سلک کی شیروانی، سر پر ترکی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، عبدالرب نشتؔر سر پر پگڑی، گھیر دار شلوار، شیروانی، ہاتھ میں چھڑی اور رہے نواب محمد اسماعیل صاحب تو چوڑی دار پائجامہ، سلک کی شیروانی، سر پر جناح کیپ، پاؤں میں اس زمانے کی اعلیٰ درجے کی سیاہ گرگابی، سب کی وضع قطع دیکھ لی اور آج تک محفوظ بھی ہے، مگر دیکھ کر شگفتگی کہاں، افسردگی و پژمردگی دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، بہر حال مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ اپنایا، اب تحریک میں جان پڑی، مسلمان سمٹ کر اس پارٹی کے قریب جمع ہونے لگے، اور دھڑا دھڑ لیگ نواز اخبار مطلع صحافت پر نمودار ہونے لگے۔ ظفر علی خان کی شاعری جناح صاحب کی تائید اور گاندھی جی کی مخالفت میں آتش بازی کا کام کرنے لگی، اسی زمانے میں ان کی ایک نظم کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں، ایک ساورکر ایک گاندھی ہے
ایک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے، ایک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

حالاں کہ اس سے پہلے یہ قادرالکلام شاعر علامہ اقبال کے رجعت پسند خیالات پر یہ کہہ کر حملہ کر چکا تھا ؎

مانگ کر پنجاب سے رجعت پسندی کی کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

خیر ظفر علی خاں تو زود رنج تھے اور ان کا معاملہ ٹھیک وہ تھا جو محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں مشہور شاعر مرزا محمد رفیع سوداؔ کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ کسی پر بگڑتے، خادم کو پکارتے، ارے غنچے! ذرا لائیو میرا قلم و دوات اور ہجو نامہ فوراً تیار ہو جاتا؛ چناں چہ

جب ظفر علی خاں لیگ میں پہنچے تو اقبال کی موت پر جو مرثیہ کہا اس میں قلب وجگر کی قاشیں بکھیر دیں، ذرا اس شعر کے سوز وحرارت پر توجہ کیجیے

گھر گھر میں یہ ماتم ہے کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گذرنا

بہر حال اب لیگ کو ظفر علی خاں کی پُر جوش شاعری، حسرت موہانی کی پُر خروش نثر، غلام رسول مہر کا متوازن قلم، عبدالمجید سالک کی ظرافت، الطاف حسین ایڈیٹر "ڈان" کی قانونی تحریریں میسر آ گئیں، ادھر آزاد سبحانی، علامہ شبیر احمد عثمانی، داؤد غزنوی، پیر مانکی شریف، پیر ذکوڑی شریف اور سینکڑوں ہزاروں اہلِ علم، اربابِ جبہ ودستار، شعلہ نوا مقرر، لکھاڑ، جو اکھاڑ پچھاڑ کے ماہر تھے، مسلم لیگ کے خیمے میں پہنچ گئے، پنجاب میں میاں افتخار الدین، نواب ممدوٹ میاں، ممتاز دولتانہ، قزلباش؛ سب ہی اڑ اڑ کر مسلم لیگ کے گھنے شجر پر آشیانے بنا رہے تھے، بنگال میں خواجہ ناظم الدین حسن شہید سہروردی، شیر بنگال فضل حق کی جگہ سنبھال رہے تھے، علی گڑھ یونی ورسٹی کے چانسلر سر ضیاء الدین، یوپی کے مشہور لیڈر چودھری خلیق الزماں، کس کس کا نام لیجیے، سب کانگریس، احرار، جمعیۃ العلماء وغیرہ سے ٹوٹتے اور لیگ کے پلیٹ فارم پر جلوہ نما ہوتے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا داؤد غزنوی صوبے کے کانگریس صدر تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کو ان پر بڑا بھروسہ تھا کہ اچانک ایک دن خبر آئی، کہ وہ بھی لیگ میں جا پہنچے، جمعہ کا دن تھا، دہلی کی مسجد فتح پوری مسلمانوں سے لبریز، مولانا داؤد غزنوی کی لیگ میں آنے کے بعد پہلی تقریر ہونے والی تھی، جب وہ میرے قریب سے گذرے: شلوار، شیروانی، سر پر عمامہ، نورانی چہرہ، دیدہ زیب داڑھی، جو مسلمان کل تک ان کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے ان کی بلائیں لے رہے تھے، دہلی کے بعض کرخنداروں کی زبان پر یہ جملہ تھا "اماں یہ تو فرشتہ ہے فرشتہ، جو آسمان سے اتر آیا"۔ قربان جایئے اس ملت کے کبھی آگ، کبھی پانی، گاہے چٹان، تو گاہے تودۂ برف۔ لیاقت علی خان مرحوم کا محمد احمد

کاظمی سے آخری الیکشنی مقابلہ ہوا، کانگریس اور قوم پرور حلقوں نے میرٹھ کمشنری کو اپنی جدو جہد سے رگڑ کر رکھ دیا تھا، مولانا حسین احمد صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، عطاء اللہ شاہ بخاری، جواہر لال، سردار پٹیل، پنڈت گوبند و لبھ پنت بلکہ خود گاندھی جی تک محاذ پر پہنچ چکے تھے، گھیراؤ اتنا سخت تھا کہ لیاقت علی خاں کی کشتی بھنور میں پھنس چکی تھی، اچانک علامہ عثمانی اپنی جادو بیانی کی طاقتوں کا پشتارہ لیے ہوئے میرٹھ پہنچے اور ایک ہی تقریر میں نواب زادہ کی ڈوبتی کشتی کو ساحل پر پہنچا دیا مولانا مدنی مرحوم نے سہارن پور کے جلسے میں کچھ علامہ مرحوم کے متعلق گل افشانی فرمائی، علامہ نے میرٹھ کے جلسے میں جوابی حملہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو تو میرے ایمان میں شبہ ہے، اور بھائی مجھے ان کے تقوے تک میں شبہ نہیں، میں ان کا مقابلہ کہاں کر سکتا ہوں، وہ تو چوٹی کے علماء میں ہیں۔'' مجمع اس طنز کو اوّلاً تو سمجھا نہیں، لیکن جب علامہ نے انگشتِ شہادت کو اپنے سر پر لے جا کر حرکت دیتے ہوئے جھوم کر فرمایا کہ ''بھائی! وہ تو چوٹی کے علماء میں ہیں۔'' تو اب مجمع کی گرفت میں علامہ کی بات آئی، پھر کیا تھا، ہزاروں کا مجمع قہقہوں کی گونج میں علامہ کے بھرپور طنز کی داد دے رہا تھا اور جب علامہ نے گردن کو حرکت دے کر اپنے خصوصی انداز میں کہا، کیا ہی خوب کہا ہے اکبر الہ آبادی نے ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی جا کر آج تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تو پورا مجمع علامہ کی مٹھی میں تھا، گرفت اتنی مضبوط تھی کہ کمشنری کے ووٹ لیاقت علی خاں کی جھولی میں ڈلوا دیے، جب یہ آفتاب و ماہتاب لیگ کو مہیا ہو گئے، تو پھر اس کا طوطی بولنے لگا۔

مسلمانوں کے نشے کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں فراش خانے کے بالکل سامنے چمن ریسٹورنٹ تھا، یہاں چائے بڑی اچھی ملتی، میں بھی پہنچ جاتا، سر پر گاندھی کیپ ہوتی

مجھے دیکھتے ہی اندرون ہوٹل بیٹھے ہوئے نوجوان تقسیم ہند کا نعرہ لگاتے؛ بلکہ غالی مسلمانوں نے تو اس دور میں مسنون سلام چھوڑ دیا تھا، بجائے سلام کے تقسیم ہند کے نعرے کا تبادلہ ہوتا، لیگ کی طاقت میں بھرپور قوت کے انجکشن خود گاندھی جی بھی لگا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مفاہمت کی راہ سے ہندوستان کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل ڈھونڈھ نکالیں، اس مقصد کے لیے بار بار مسٹر جناح سے ملاقات کرتے، حل تو کیا خاک نکلتا؛ مگر مسٹر جناح دیکھتے ہی دیکھتے قائدِ اعظم بن گئے اور ان کی خوش نصیبی کہ ان کو ہر صوبے میں کانگریس کے ٹکر کی شخصیت مل گئی، مثلاً فرنٹیر میں خان برادران کے مقابلے میں سردار اورنگ زیب، سردار عبدالرب نشترؔ، پیر ذکوڑی شریف وغیرہ، پنجاب صوبے میں تو اَن گنت لیڈر کانگریس سے ٹوٹ کر قائد اعظم کے دست و بازو بن گئے، سندھ میں جی ایم سیّد وغیرہ، بنگال میں الحاج خواجہ ناظم الدین حسن شہید سہروردی، تا آں کہ جماعتوں کے مقابل میں پارٹیاں بھی ملتی رہیں، مثلاً کشمیر میں نیشنل کانفرنس کے سامنے مولانا محمد یوسف میر واعظ کی پارٹی۔

اس طرح لیگ ہر سمت میں مضبوط ہوتی چلی گئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ آزاد ہندوستان سے پہلے آخری الیکشن مسلم لیگ نے ننانوے فیصدی اپنے حق میں جیت لیا۔ گاندھی جی نے نواب بھوپال کی وساطت سے واحد نمائندگی کا مسلم لیگ کو پروانہ بھی دے ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد پاکستان کے قیام کی راہ صاف وسیدھی نظر آنے لگی، اس زمانے میں قوم پرور مسلمانوں کی درگت بنی تھی، جا بجا لیگی اُن کا تعاقب کرتے، اہانت آمیز رویہ اختیار کرتے، مولانا آزاد کی اہلیہ کو کلکتہ میں سکون سے دفن نہ ہونے دیا، علی گڑھ اسٹیشن پر موصوف کی درگت بنائی، مولانا حسین احمد صاحبؒ کو آسام کے سفر میں قدم قدم پر ستایا، پنجاب کا سفر ان کے لیے دشوار تر کر دیا، لیگ کی ہوا جو اس شان سے چلی، اسے دیکھ کر بہت سے پتے ٹوٹنے لگے، کچھ ہی جیالے تھے جو اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

بہر حال میں دہلی میں تھا کہ ایک دن قدآدم پوسٹر دہلی کی درودیوار پر چسپاں نظر آئے، جس میں قائداعظم کی دہلی تشریف آوری کی اطلاع کے ساتھ پُرتپاک خیر مقدم کی اپیل تھی، وہ فرنٹیر میل سے دہلی پہنچ رہے تھے، فرنٹیر میل کے وقت پر دہلی اسٹیشن پر بالکل تنہا پہنچا، میرے رفقاء غالی قسم کے کانگریسی تھے، ان کے لیے یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ وہ قائداعظم ایسی تاریخی شخصیت کو ایک بار دیکھ ہی ڈالیں، میں نے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا اور اندر پہنچ گیا، دہلی کا وہ طویل وعریض پلیٹ فارم جس پر فرنٹیر کو رکنا تھا مسلمانوں سے لبریز تھا، تقسیم ہند زندہ باد، پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے۔ نئی دہلی سے آتے ہوئے فرنٹیر کی انجن کی روشنی دکھائی دی، اب تو نوجوان، مسلمان، بوڑھے کودرہے تھے، اچھل رہے تھے، فرنٹیر خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا اور آکر وہ مجمع کے قریب رک گیا، فرسٹ کلاس کا ڈبہ کھلا، آگے قائد ملت تھے، نہایت لحیم وشحیم تا آں کہ گردن کے نیچے کی کھال لٹکی ہوئی، رئیسانہ چہرہ، داڑھی سے بے نیاز، دبیز فریم کا چشمہ، سر پر جناح کیپ، چوڑی دار پائجامہ، شاندار گرگابی، ان کے عقب میں خود قائداعظم بنفس نفیس، کشیدہ قامت، ستا ہوا چہرہ، سر پر جناح کیپ، چوڑی دار پائجامہ، گلے میں آتشیں گلاس پڑا ہوا جس سے وہ چشمے کا کام لیتے اور ان کے پیچھے اُن کی بہن فاطمہ جناح ساڑی میں ملبوس، بھائی بے حد لمبے؛ لیکن یہ خود متوسط القامت، بلکہ مائل بہ پست قامتی، سر پر سفید بال، یہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا کہ فرنگی ٹائپ پر کٹے ہوئے تھے یا چوٹی تھی۔ تینوں کو پھولوں سے لاد دیا گیا، بڑے بڑے قیمتی ہار زیبِ گلو کیے گئے، لیگ کے رضا کار راستہ بنا رہے تھے، قائداعظم مسکراہٹ کے ساتھ داہنے ہاتھ سے سلام کرتے ہوئے نکل گئے۔ بہر حال میں نے دیکھ لیا اور بڑی تاریخی شخصیت کو دیکھا، کچھ بھی ہو وہ گاندھی جی کی طرح مسلم قوم کے واحد لیڈر بن گئے تھے اور سلطنتِ پاکستان کے معمارِ اوّل، خدا جانے دہلی میں وہ کہاں چلے گئے، میں نے اس کا کوئی تجسس بھی نہیں کیا۔

پھر آخری الیکشن ہوا، نتائج آئے تو مسلم لیگ نے دھڑا دھڑ سیٹیں حاصل کیں، دہلی میں ''وکٹری ڈے'' منایا گیا تو اردو پارک میں مسلم لیگ کی طرف سے عظیم جلسے کا اعلان ہوا، یہ جلسہ بعد ظہر ہونے والا تھا، میری اس وقت سکونت ادارہ شرقیہ عقب جامع مسجد میں تھی، اردو پارک وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں، میں بھی جا پہنچا۔ دہلی کے مسلمان اسٹیج کی بلائیں لے رہے تھے۔ قائد اعظم، سردار عبد الرب نشتؔر، قاضی محمد عیسیٰ وغیرہ جلسے کے شرکاء میں تھے، سردار عبد الرب نشتؔر تو منجھے ہوئے مقرر تھے، اگرچہ اس سے تکلیف ہوئی کہ ایک بار دہلی کی شاہ جہانی مسجد میں نشتر اور بیگم مولانا محمد علی مرحوم کی تقریر کا اعلان ہوا، میں نے بھی شرکت کی، بیگم صاحبہ سیاہ برقعے میں ملبوس تھیں اور لاؤڈ اسپیکر پر انھوں نے کھڑے ہو کر برقعے ہی میں سے تقریر کی، احتیاط بھی برتی کہ تقریر کے دوران اپنے ہاتھ بھی برقعے سے باہر نہیں نکلنے دیے، سردار صاحب کی تقریر کا بیشتر حصہ مولانا آزاد پر تنقید کے لیے صرف ہوا اور تنقید میں بھی یہ ابتذال کہ غبارِ خاطر کے ''چڑا چڑیا'' کی کہانی پر بھی نامناسب انداز میں تبصرہ کرتے رہے، تاہم وہ مقرر تھے، اردو پارک کے جلسے میں مقامی لیگی لیڈروں کے بعد نشتؔر صاحب کی تقریر ہوئی، پھر قاضی محمد عیسیٰ کی اور آخر میں قائد اعظم کی، اب بھی وہ اسی لباس میں تھے، جس میں ان کو دہلی اسٹیشن پر پہلی بار دیکھا تھا، اردو اس طرح کی بول رہے تھے ''ہم تُمارا شکریہ ادا کرتا ہے، تُم نے ہمیں جِتا دیا'' وغیرہ۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی انگریز اردو سیکھنے کے بعد الفاظ اردو کے، لیکن بہ لہجۂ انگریزی ادا کرتا ہو۔

یہ جلسہ عصر سے پہلے ختم ہوا تھا، میں واپس ہوا تو دہلی خصوصاً جامع مسجد کا علاقہ اپنی روایتی شان وشوکت سے چہل پہل کے منظر پیش کر رہا تھا، ادارۂ شرقیہ پہنچ کر میں سو گیا، کچھ دیر کے بعد میں جاگا تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جامع مسجد کے علاقے میں کرفیو لگ گیا، سوائے مسلح پولیس کے اور کوئی نظر نہ آتا تھا، دکانیں بند ہو چکی تھیں، ہوٹل کے دروازے مقفل، سڑکوں پر سناٹا، فضائیں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں اور کتوں کی

باہمی جنگ اس غم آلود ماحول کو اور الم ناک و وحشت خیز بنا رہی تھی، ادارے میں میرے ساتھ ایک کہنہ عمر کے بھوپالی سیّد صاحب مقیم تھے، ان سے تڑپ کر پوچھا کہ یہ کیا ہوگیا؟ بولے کہ ہندو مسلم فساد دہلی میں شروع ہو چکا ہے، پھر تو یہ فساد کی آگ تمام ہندوستان میں پھیل گئی، میں بھی سر پر پاؤں رکھ کر دہلی سے دیوبند بھاگا، ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوا، ہندوستان کے پہلے گورنر لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پاکستان کے قائداعظم۔ اور ایک دن اچانک ریڈیو پاکستان؛ بلکہ دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے قائداعظم کے سانحۂ وفات کی کرب ناک اطلاع نشر ہوئی، ۱۹۶۵ء میں میں نے پاکستان کا سفر کیا، تو کراچی میں ان کے مرقد پر بھی پہنچ گیا، سفید سنگِ مرمر کا مرقد ہے جس پر پولیس کا پہرہ اور کچھ مسلمان مصروفِ قرآن خوانی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قائداعظم بڑے خوش نصیب تھے، انھوں نے مسلم قوم کی خود سے روایتی بے زاری کا منظر نہیں دیکھا، ایسا حادثہ پیش آنے سے پہلے ہی وہ رخصت ہوگئے، اور بڑے پُرتپاک انداز میں وہ ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈال گئے جو کٹ کٹا کر اب ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے، ان کی سیاست کا لوہا بھی مانا گیا اور بڑے بڑے سیاسی رستموں کو انھوں نے پچھاڑا بھی، زندگی میں ان کے عقائد، خانگی زندگی، ذاتی زندگی پر موافق و مخالف خوب تبصرے ہوتے؛ لیکن موت نے ان حکایات پر پردہ ڈال دیا۔ اب تو ہندوستان میں جو گاندھی جی کی حیثیت ہے وہی پاکستان میں قائداعظم کی ہے اور اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہوگی کہ مسلمان اُن کی لحد پر قرآن خوانی کو کارِ ثواب سمجھتا ہے، یہ منظر دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے: وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ، خدا جانے اللہ کو ان کی کیا ادا پسند آئی کہ ان کے لیے ایصالِ ثواب کے اَن گنت دروازے کھول دیے کہ ھو الفتاح۔

***

گاندھی جی

غالباً ۱۹۳۷ء ہے، بڑے بھائی ازہر شاہ صاحب کو صحافی بننے کا شوق چرایا ہوا ہے، ''تیج'' اخبار روزانہ خریدا جاتا اور اسی اخبار کا ہفت وار ایڈیشن تیج ویکلی کے نام سے خرید رہے ہیں، اس اخبار کی پالیسی انگریزی سامراج کے خلاف ہے، ویکلی میں اندر کے پورے صفحے پر تصاویر ہوتیں، پرانی بھی اور تازہ بھی، کانگریسی لیڈروں کی تصاویر ہر ہفتے آتیں اور ہندوستان کی دوسری مشہور شخصیتوں کی بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ کانگریس کی پالیسیوں سے ذہنی وفکری وابستگی اسی اخبار کی دین ہے، ابتدا تو تصاویر کے دیکھنے سے ہوئی اور تصویر کے شوق میں پھر اخبار کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء تک تو یہ حال تھا کہ جب کانگریس نے اپنی مشہور تحریک ''ہندوستان چھوڑو'' کا بمبئی سے آغاز کیا ہے اور پورا ملک تحریک کے ہچکولے لینے لگا، ریلوے لائنوں کو اکھاڑنا، اسٹیشنوں اور ڈاک خانوں کو جلانا، سرکاری عمارتوں پر حملہ، یہ سب چیزیں مسلسل آنے لگیں تو اب تیج اور تیج ویکلی سے آگے بڑھ کر ''ملاپ''، ''پرتاپ'' وغیرہ اور لاہور کے دوسرے اخبارات کا بشوق وذوق مطالعہ شروع ہو گیا، اس زمانے میں سامراج نواز پارٹیوں اور اس کے قائدین کے بیانات اگر کانگریس تحریک کے خلاف آجاتے تو پڑھ کر دماغ کھول اٹھتا۔

گاندھی جی اب ہندوستان کی سیاسیات میں آخری شخصیت تھے، ان کی مہاتمائی، مخصوص طور وطریق کی زندگی، صبح کی پرارتھنا، اُن کی اہلیہ کستوربا گاندھی سے اُن کے تعلقات کی نوعیت، پھر اخبارات میں اُن کی پوتیوں کے تذکرے، مشہور انگریز عورت ''میرا'' بہن کا ان کے ساتھ معتقدانہ تعلق، بارڈولی، احمد آباد اور واردھا میں ان کے آشرم، ان آشرموں کی داستانیں، گاندھی کی بکری کے قصے، بکری کودی جانے والی

غذاؤں کی تفصیل، تھرڈ ڈبہ میں ان کا سفر، پوری بوگی کا ریزرویشن، بکری کی رفاقت اور سب سے عجیب وغریب ان کی تصویر کہ بدن کا اکثر حصہ برہنہ، سر گھٹا ہوا، آنکھوں پر چشمہ جو عموماً ناک کے آخری حصے پر رہتا، کھدر کی دھوتی جو صرف گھٹنوں تک ہوتی، ان کا چرخا اور سوت کاتتے ہوئے اخبارات میں آئے دن ان کی تصاویر، کبھی وائسرائے سے ملنے دلی آرہے ہیں، کبھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان کے دیگر مقامات پر جاتے ہیں، پھر ان کی عدم تشدد کی پالیسی پر استقامت کہ تحریک چلائی اور ذرا تشدد نے راہ پائی تو انھوں نے تحریک کو فوراً واپس لے لیا اور کسی بھی کانگریسی کے اس غلطی کے کفارے کے طور پر ان کے مرن برت، محدود مدت کے اور لمبے لمبے بھی، کبھی نو نو برت، جس میں وہ سارے دن کسی سے بات نہ کرتے، جس کو جو سوال کرنا ہو وہ سلیٹ پر لکھ کر دے دے، گاندھی جی سلیٹ پر ہی جواب دیتے۔

اس محیر العقول زندگی نے ایسا اُن سے متأثر کر دیا کہ دیکھنے کے لیے طبیعت بے چین رہتی، اگرچہ میں دہلی ۱۹۴۰ء میں پہنچ چکا تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ جب گاندھی جی دہلی آتے تو بیشتر نظام الدین اولیاء اسٹیشن پر خاموشی سے اتر جاتے، یہ اہتمام اس لیے تھا کہ وہ استقبالیہ تقریبات کو تضییع اوقات کا ایک حصہ سمجھتے۔ مسٹر جناح سے ان کی طویل ملاقاتوں کا دور شروع ہوا، اگرچہ ان ملاقاتوں کا نتیجہ صفر رہا؛ تاہم مدتوں اخبارات میں اس کا چرچہ رہا، پھر شملہ کانفرنس، اس کے بعد وزارتی مشن کی ہندوستان میں آمد، گاندھی جی کا دہلی میں قیام اور تمام کانگریسی قائدین کی ان کے زیر قیادت ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کی جدوجہد، روزانہ شام کو گاندھی گراؤنڈ میں اُن کی پرارتھنا، اب ان کو قریب سے دیکھنے کا وقت آ گیا، یہ پرارتھنا عصر اور مغرب کے درمیان ہوتی، دہلی میں گلابی سردی پڑ رہی تھی، میں عصر سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے گاندھی گراؤنڈ پہنچ گیا، خیال تھا کہ اسٹیج کے قریب ہی بیٹھنے اور گاندھی جی کو دیکھنے کا موقع ملے گا، لیکن اتنے پہلے

پہنچنے کے باوجود اسٹیج کا قرب وجوار، سینکڑوں گزوں تک گاندھی جی کے معتقدین اور ان کے درشن کے شائقین سے بھر چکا تھا؛ بلکہ گاندھی جی کے آنے کے وقت تک تو گاندھی گراؤنڈ انسانی سروں کا ایک سمندر نظر آتا، گاندھی جی اپنے پروگراموں کو منٹوں کی رعایت سے پورا کرتے، مجمع اس راستے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے گاندھی جی کی کار آنے والی تھی کہ اچانک دو تین کاریں رکیں، ایک کار کا دروازہ کھلا، تین چھوٹے چھوٹے گاؤ تکیے لا کر ایک پیچھے، ایک دائیں اور ایک بائیں لگا دیے گئے، پھر دوسری کار کا دروازہ کھلا تو اس سے پہلے میرا بہن اتریں، پھر گاندھی کی دو پوتیاں سوشیلا نائر، چند اور گاندھی جی کے قریبی افراد، اب گاندھی جی اترے، پاؤں میں چپل، اور ہو بہو وہی مرقع جو عام طور پر ان کی تصاویر میں نظر آتا، ایک ہاتھ ایک پوتی کے کاندھے پر اور دوسرا دوسری کے، اس شان سے وہ سیڑھیوں کو بڑے تمکنت اور وقار کے انداز میں طے کرتے ہوئے اس اسٹیج پر پہنچ گئے جو سطح زمین سے کئی گز بلند تھا۔ ان کو دیکھ کر عبدالمجید سالک کا وہ شعر یاد آ گیا جو اس ظریف شاعر نے گاندھی جی اور ان کے مشہور چیلے اچاریہ ونوبا بھاوے سے متعلق کہا تھا ؂

گاندھی از گجرات، ونو بھاوے از دکن
ننگ پاؤں، ننگ سر ننگ بدن

جسم پر کہیں بال کا نام ونشان نہ تھا، البتہ سینے پر کچھ بال نظر آئے اور چوں کہ روزانہ مالش کے عادی تھے، اس لیے سورج کی ڈوبتی کرنوں میں اُن کا بدن چمکیلا نظر آتا، لگی بندھی زندگی کی بنا پر بڑھاپے کا کوئی اثر ان کے جسم وجثے پر نہ تھا، پرارتھنا شروع ہو گئی، قرآن مجید کی وہ سورتیں جن میں توحید کا مضمون آیا ہے اوّلاً پڑھی گئیں، پھر باقی مذاہب کی کتابوں کے توحیدی اشلوک، بعد میں گاندھی جی کا محبوب بھجن ''ہرے رام ہرے رام تپتے ساون سیتا رام، سب پر دیا کرو بھگوان''، اس سے فراغت پر چھوٹا لاؤڈ اسپیکر گاندھی جی کے سامنے کر دیا گیا، یہ تقریر ایک دو منٹ کی تھی اور عجیب وغریب،

نہ خطابت، نہ سحر البیانی، نہ واعظانہ انداز، نہ خطیبانہ طمطراق، صرف اتنا کہا اور وہ بھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں:

''میں ابھی پرارتھنا میں آ رہا تھا، آپ نے جو بھگدڑ مچائی تو ہمارا ایک والینٹرز زخمی ہو گیا، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ میں ڈسپلن کا نام ونشان نہیں، جب ڈسپلن ہی نہیں ہوگا تو آجادی (آزادی) کیسے ملے گی۔''

تقریر ختم ہو گئی اور گاندھی جی اسی شان وشوکت کے ساتھ واپس ہو گئے، یہ ہندوستانی مہاتما عجیب وغریب انسان تھا، جوش ملسیانی نے اُن کی موت پر کہا تھا ؂

کام تیروں سے لیا اس نے، نہ تیغِ تیز سے
اس نہتے نے حکومت چھین لی انگریز سے

اور یہ واقعہ بھی ہے۔ اخبار الجمعیۃ کے شہرۂ آفاق ایڈیٹر مرحوم فارقلیط نے گاندھی جی کی موت پر جو سرخیاں اخبار میں جمائی تھیں، انھوں نے پورے ملک میں آگ لگا دی تھی، ایک دن تو اخبار کی سرخی یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر سولی پر چڑھے، اس اخبار نے اس زمانے میں سردار پٹیل کے خلاف وہ آگ برسائی کہ آں جہانی پٹیل کی وزارتِ داخلہ نے اخبار ''الجمعیۃ'' کو چھ ماہ کے لیے بند کر دیا، تمام دنیا کے اخبارات؛ بلکہ عالمی نامِ وَر لیڈروں نے گاندھی جی کی موت پر ماتم کیا، مگر میری نظر سے ''پیر سابرمتی'' کے نام سے گاندھی جی کے ایک سکریٹری کی ایک طویل کتاب نظر سے گذری ہے، جس میں مہاتما گاندھی کی زندگی، پالیسی، فکر اور تحریکات پر کافی تنقید ہے؛ تاہم گاندھی جی اپنی زندگی میں ایک صداقت پسند لیڈر رہے، جب بہار میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو گاندھی جی دہلی میں مقیم تھے، جے پرکاش نارائن اور آچاریہ کرپلانی بہار سے جو اِن کو اطلاعات بھیج رہے تھے، وہ مسلم فرقے کے خلاف اشتعال انگیز وگمراہ کن تھیں، گاندھی جی نے ان اطلاعات کی تصدیق کے لیے اپنے ذاتی ایلچی کی حیثیت سے سابق صدر جمہوریہ راجندر پرشاد کو بھیجا جو اس وقت کانگریس کے ایک نمایاں لیڈر کی حیثیت رکھتے،

اس ایلچی نے بھی جے پرکاش اور کرپلانی کی ہی ہاں میں ہاں ملائی تو گاندھی جی نے تصدیق واقعات کی کوئی اور راہ نکالی تو معلوم ہوا کہ مسلم فرقے کی زیادتیوں کی خبریں سراسر بے بنیاد ہیں۔ گاندھی جی نے اس شام کی پرارتھنا میں صاف صاف کہا کہ:

"راجن بابو بڑے آدمی ہیں، انھیں مجھ تک گلط (غلط) بات نہیں پہنچانی چاہیے تھی۔"

اگرچہ گاندھی جی کی جان گوڈسے نے انھیں مسلم نواز سمجھ کر لی ہے؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑے سچے محبِّ وطن اور اپنی قوم کے مہا لیڈر تھے، البتہ اپنی طبعی صداقت پسندی کی بنا پر دوسرے فرقوں کی واقعی شکایات و مصائب پر اُن کی نظر رہتی اور وہ فراخ حوصلگی سے دوسروں کی پریشانیوں کو تسلیم کرتے اور مسائل کا حل ڈھونڈتے۔

آزاد ہندوستان میں جب زبردست فسادات شروع ہو گئے تو گاندھی جی دلّی میں مقیم ہو گئے اور جب دلّی کو انھوں نے اجڑتے ہوئے دیکھا تو اچانک ایک روز مرن برت کا اعلان کر دیا، اس اعلان نے پورے ملک میں آگ لگا دی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جواہر لال، پٹیل وغیرہ دہلی کی سڑکوں پر مبتلائے جنونِ فرقہ واریت عوام سے گاندھی جی کی جان بچانے کی اپیل کر رہے ہیں۔ سفر میں مسلمانوں کو غیر محفوظ ہونے کی بنا پر ریل گاڑیوں میں ان کے ڈبے مخصوص کر دیے گئے تھے، گاندھی جی کے اس مرن برت کو کھولنے کی شرائط میں مسلمانوں کے لیے محفوظ سفر، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے عرس کی سہولت، فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے کا خاص مطالبہ تھا۔ یہ برت تین دن میں کھل گیا تھا، مولانا آزاد نے سنگترے کے رس کا گلاس پیش کر کے اس تاریخی برت کو کھلوایا تھا اور اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ سہ روزہ برت نے ملک کی کایا پلٹ کر دی تھی۔

پھر وہ لطیفہ بھی پیش آیا کہ گاندھی جی بختیار کاکی کے عرس میں شرکت کے لیے درگاہ پہنچے تو دونوں پوتیوں کے کاندھوں پر حسبِ دستور ہاتھ تھے، درگاہ کی رسوم و قیود کے

مطابق لڑکیاں اندر داخل نہیں ہوسکتی تھیں، سجادہ صاحب عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے، کہ روکیں تو کس طرح اور جانے دیں تو کیوں کر، مولانا احمد سعید دہلوی بھی ساتھ تھے، جن کی ایسے مواقع پر چھٹی حس جاگ جاتی اور ظرافت کے رنگ میں چٹکیاں بجاتے مشکلات کا حل نکالتے، سجادہ صاحب کی پریشانی پر حسبِ دستور انھوں نے قہقہہ لگایا، بولے کہ:

''یہ لڑکیاں تھوڑی ہیں، یہ تو گاندھی جی کی لکڑیاں ہیں۔''

اس پر خود گاندھی جی نے پُرزور قہقہہ لگایا تو اگلا قدم اندرونِ درگاہ تھا۔

ہندوستان کے اس مہاتما، دنیا کے اس مشہور لیڈر، آزادیٔ ہند کے جنم داتا سے متعلق یہ ہیں میرے تأثرات، جن کی بنیاد مطالعہ ایک دور سے دید ہے۔

* * *

مولانا ابوالکلام آزاد

گاندھی جی کے حالات میں میری اخبار بینی، سیاسی شخصیتوں سے واقفیت ودلچسپی کی داستان آپ نے پڑھی، مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے ان قائدین میں تھے جن کی شہرت وعظمت سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ واقف تھا، ابتدا میں ان کی ایک تصویر اخبار میں عموماً آتی۔
سر پر بالوں کی ٹوپی، آنکھوں پر چشمہ، شیروانی، کاندھے پر چادر، جو سینے پر دونوں جانب پڑی رہتی، اور ہمیشہ مسکراتے ہوئے تصویر نصف جسم کی ہوتی، بہرحال مولانا آزاد سے اس وجہ سے بھی خصوصی تاثر تھا کہ ہمارے دینی مدارس کے حلقوں میں ان کا نام بہت عظمت سے لیا جاتا، ان کی سیاسی بصیرت اور سیاسی الجھنوں کو چٹکیوں میں حل کرنے کی حذاقت کا عام شہرہ تھا۔ میں دہلی میں تھا کہ وزارتی مشن ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے دہلی پہنچا، مولانا آزاد اس وقت کانگریس کے صدر تھے، پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ وہ بھی دہلی پہنچ گئے، مرحوم کا قیام آصف علی کے بنگلہ ''ونڈسر پیلیس نئی دہلی'' میں تھا۔ غالباً یہ آصف علی کو رکنیتِ اسمبلی کی بناء پر الاٹ تھا۔ مولانا آزاد کی زیارت کا شوق جنون کی حد تک پہنچا، ہمارے ایک دوست سیّد انیس الحق جو آج کل سعودی عرب میں ملازم ہیں اور ایک زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے سکریٹری بھی رہے، ان کے چھوٹے بھائی صبیح الحسن بھی مولانا مرحوم کے عشاق میں تھے، وہ مجھے لے کر ''ونڈسر پیلس'' پہنچے، صبیح الحسن نے کانگریس والینٹروں میں اپنا نام درج

کرایا ہوا تھا، اس وقت کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ تھا اور مولانا آزاد کی کرسی پر سے صرف پشت نظر آرہی تھی، اب اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے کہ گھنٹوں کھڑے مولانا آزاد کی پشت کی ہی زیارت کیا کئے، ان کے سر کے بالوں پر تبصرہ، نظر آنے والے شیروانی کے حصے پر مشتاقانہ نظریں، یہ دید تو یہیں ختم ہوگئی۔ جمعہ کا روز تھا اور یہی ''ماہ وسال'' میں اور صبیح الحسن جامع مسجد دہلی میں جمعہ پڑھنے کے بعد پیدل ''ونڈسر پیلس'' کی طرف روانہ ہوگئے۔ طالب علمی کا دور، جیب میں اتنے پیسے کہاں کہ اس دور و دراز جگہ تک کسی سواری سے پہنچیں، عجیب اتفاق جب ہم بنگلے کے احاطہ میں داخل ہوئے تو کار تیار تھی۔ آصف علی کار کے پاس کھڑے ہوئے تھے، اچانک اندر سے مولانا آزاد باہر تشریف لائے۔ چوڑی دار پائجامہ، متوسط القامت، گوراچٹا رنگ، ایرانی طرز کی آنکھیں، صرف ٹھوڑی پر ڈاڑھی اور وہ بھی بہت مختصر، آنکھوں پر چشمہ، اونی کشمیرہ کی شیروانی زیب تن، سر پر بالوں کی ٹوپی، گلے میں حسبِ دستور چادر پڑی ہوئی، ہم دونوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی، آصف علی صاحب نے تیزی سے کار کا دروازہ کھولا، مولانا اندر داخل ہوئے اور یہ جاوہ جا، معلوم ہوا کہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے وائسرائے لاج تشریف لے جارہے ہیں۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اب ہم بچوں کو جو دل سے مولانا پر عاشق تھے اپنی اس خوش قسمتی پر کیا مسرّت ہوئی ہوگی کہ مولانا کو بھرپور دیکھ لیا۔

یہی سال ہے، مسجد فتح پوری دہلی کے طلبہ بیشتر کانگریسی خیال کے ہیں، گھنٹوں کانگریسی قائدین پر ان طلبہ میں بیٹھ کر عاشقانہ تبصرے ہوتے، بالآخر ان ہجوم عشاق نے مولانا آزاد سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ چندہ کیا گیا، ایک چاندی کا سگریٹ کیس خریدا اور ایک قیمتی عطر کی شیشی لی گئی اور قبیل فجر پیدل ''ونڈسر پیلس'' پر پندرہ بیس کی تعداد میں یہ طلبہ پہنچ گئے۔ فجر بعد کا وقت تھا مولانا غسلِ صبح گاہی میں مصروف تھے، ماسٹر تارا سنگھ سکھ لیڈر، ان کے ساتھ پنجاب کے ذمہ دار سکھ و ہندو لیڈر، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، مولانا

حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ بھی ملاقات کے منتظر تھے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کو دیکھ کر میں ٹھٹکا؛ چوں کہ مرحوم کو بزرگانہ شفقت کی وجہ سے میری آوارہ گردیوں پر تنبیہ وسرزنش کا پورا حق تھا؛ چناں چہ ایسا ہی ہوا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مجھے دیکھ کر چلائے کہ کہاں پھر رہے ہو؟ عرض کیا گیا کہ مولانا آزاد کی زیارت مقصد ہے، مرحوم لدھیانوی میرے والد مرحوم کی عالی نسبت کی بناء پر میرے لیے زیبا نہیں سمجھتے تھے کہ یوں لیڈروں کے بنگلوں کے چکر لگاؤں اور ان کی زیارت کے لیے سڑکیں ناپتا پھروں، انہوں نے مجھ کو طلبہ سے جدا کر لیا اور جیسے ہی ملاقات شروع ہوئی میرا تعارف بڑے وقیع الفاظ میں اپنی عادت کے مطابق مولانا آزاد سے کرایا۔ مرحوم آزاد میرے والد ماجد مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے بخوبی واقف تھے، جمیعۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی میں والد مرحوم کے ساتھ شریک ہو چکے تھے؛ بلکہ کلکتہ میں جب انہوں نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی تو وہاں صدر مدرّس کی حیثیت سے میرے والد مرحوم کو لے جانا چاہتے تھے۔ تاہم میں نوخیز بچہ تھا، مولانا آزاد ایک بزرگانہ التفات کے سوا اور کیا کر سکتے تھے، یہ ملاقات کھڑے کھڑے ہوئی، فتحپوری کے تمام طلبہ کو بھی ملاقات کا موقع مل گیا۔ اس وقت کا یہ تاثر اب بھی ذہن پر قائم ہے کہ پنجاب کے یہ سیاسی زعماء اور بلند قامت شخصیتیں مولانا آزاد سے کس درجہ مرعوب تھیں، اس پر یقین کیجیے کہ ماسٹر تارا سنگھ، ڈاکٹر گوپی چند ر بھارگو وغیرہ دور کھڑے ہوئے مولانا آزاد کی ایک نظر کرم کے منتظر اور انہیں اس کی ہمت نہیں تھی کہ اپنے متعین وقت سے پہلے مولانا آزاد کے قریب تک پہنچ جائیں۔

ہندوستان آزاد ہوا، فسادات کا نہایت بھیانک سلسلہ اور خون آشام فرقہ واریت کا ننگا بھوت ملک کے ہر گوشے میں شیطانی رقص میں مصروف ہو گیا، دہلی کی صورتِ حال بھی بھیانک سے بھیانک تر ہوتی جاتی تھی، مسلمانوں کے قدم جا بجا اکھڑ رہے تھے اور ہجرت کے نام پر پاکستان راہِ فرار اختیار کر رہے تھے، مسلم لیگ کے بڑے بڑے تناور درخت بشمول قائد اعظم وقائد ملت پاکستان پہنچ چکے تھے، ہندوستان میں مسلم اقلیت یتیم

کی حیثیت سے وقت گزار رہی تھی، ٹھیک ان حالات میں مولانا آزاد کی شاہجہانی جامع مسجد دہلی میں وہ بے مثال تاریخی تقریر ہوئی جو ان کی مخصوص خطابت کا آئینہ دار تھی، جس کی نقل مدتوں مولانا آزاد کے پرستار خصوصاً شورش کاشمیری پاکستان میں بصد فخر و ناز اسی لب و لہجے میں کرتے۔

اس کے بعد لکھنؤ میں آزاد کانفرنس بلائی گئی جس کی صدارت مولانا ابولکلام آزاد نے کی، گاندھی جی کے برت نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی جلتی ہوئی آگ پر پانی کا کام کیا، ادھر اقلیتوں کے قاتل بھی قتل کرتے، اجاڑتے، تباہ کرتے تھک چکے تھے اور زندگی آہستہ آہستہ اعتدال پر آرہی تھی۔ میں دہلی کا قیام ترک کرکے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھا کہ اچانک دارالعلوم میں مولانا ابوالکلام آزاد کا وزیر تعلیم حکومتِ ہند کی حیثیت سے تشریف لانے کا شور ہوا، اب کیا عرض کروں ایک مہینہ پہلے سے دارالعلوم دیوبند کا ذرّہ ذرّہ سراپائے اشتیاق اور مرحوم کے لیے چشم براہ تھا، بڑوں نے اپنی حیثیت کے مطابق تیاریاں شروع کیں اور طلبہ دارالعلوم نے طالب علمانہ انداز کی۔ جوں جوں دن قریب آرہے تھے، رات رات بھر طلبہ استقبالیہ تقریب کی ریہرسل کرتے، بینر تیار کیے جارہے تھے، جھنڈے تیار ہورہے تھے، جھنڈیوں کا اہتمام ہورہا تھا، دارالعلوم میں موجود تمام صوبوں کے طلبہ؛ بلکہ غیر ممالک کے بھی اپنے محبوب قائد کی پذیرائی کے لیے ہمہ تن مصروف، ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ گذارنا مشکل تھا۔ بالآخر وہ دن آپہنچا، آزاد مرحوم دہلی سے رات کو مسوری ایکسپریس کے ایک سیلون میں دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچ گئے، یہ سیلون دیوبند کے اسٹیشن پر گاڑی سے جدا کرکے ایک خاص پلیٹ فارم کے حصے پر کھڑا کردیا گیا جسے حفاظتی پولیس نے چہار جانب سے گھیر لیا، آزاد اپنے سیلون میں مصروفِ خواب اور ہم طلبہ قطار اندر قطار سیلون کے چہار طرف طواف کرتے رہے، پوری رات اسی شغل میں کٹ گئی۔ صبح آٹھ بجے کے قریب اکابر دارالعلوم دیوبند عبا در بر، عمامہ برسر، کاندھوں پر رومالِ فضیلت، بن سنور کر

اسٹیشن پر آہستہ آہستہ پہنچ گئے، ٹھیک وقت متعین پر سیلون کا دروازہ کھلا، مولانا آزاد باہر نکلے، جن کا سب سے پہلے استقبال حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی مرحوم اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند نے کیا، پھر تمام اساتذۂ دارالعلوم سے مصافحہ اور تعارف کی رسم ادا کی گئی، ایک کھلی جیپ میں مولانا آزاد اور ان کے بغل میں مولانا حسین احمد مدنیؒ بیٹھے اور جیپ دارالعلوم کی طرف روانہ ہوئی۔ طلبہ نے استقبال اتنے منظم انداز میں کیا کہ اسٹیشن سے تا دارالعلوم طلبہ کی دورویہ قطار کھڑی ہوئی تھی، مولانا آزاد کی گاڑی گذرتی، کیا مجال کہ استقبال کرنے والوں کی صفوں میں کوئی انتشار ہو، آزاد مرحوم کھلی گاڑی میں بیٹھے ہوئے مونچھوں کو حسبِ عادت مسلسل تاؤ دے رہے تھے، کبھی انگلیاں چٹخاتے، دارالعلوم کے صدر دروازے پر بشمول دیگر افراد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ان کا استقبال کیا اور زینے سے انہیں دارالاہتمام پہنچایا گیا جہاں ناشتے کا انتظام تھا، جس میں انواع واقسام کی چیزیں رکھی گئیں، لیکن مولانا نے دیو بند کے مشہور حلوہ گذر سے دو ایک چمچے اٹھائے اور بس بیشتر افراد تو مولانا آزاد کے غیر معمولی رعب وجلال سے مرعوب رہے؛ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کی پنجابی، طبعی بے تکلفی کسی شخصیت سے مرعوب ہونا نہیں جانتی تھی، اس لیے وہ اپنے خصوصی انداز میں چہکتے رہے، ان کا یہ جملہ آج بھی یاد ہے کہ ''اکابر دارالعلوم دیو بند کی ارواح اس وقت آپ کے گرد گھوم رہی ہیں۔''

یہیں وہ لطیفہ پیش آیا کہ مولانا آزاد نے بیٹھنے سے پہلے اپنی شیروانی اتار کر دارالاہتمام میں موجود ایک چارپائی پر رکھ دی تھی جب وہ اٹھ کر دفاتر کے معائنے کے لیے چلنے لگے تو لدھیانوی رئیس الاحرار نے بڑھ کر شیروانی اٹھائی تو مولانا نے بے تکلف اپنے دونوں ہاتھ شیروانی پہننے کے لیے دراز کردیے اور فرمایا کہ مغربی تہذیب وتمدن میں مہمان کے استقبال کا ایک جزء یہ بھی ہے۔ اہتمام سے نکل کر محافظ خانے میں پہنچے، یہاں دارالعلوم کا ایک سو سالہ ریکارڈ محفوظ ہے، سیّد محبوب رضوی مرحوم نے بڑے سلیقے

سے اس کو سجایا تھا اور بڑے قرینے سے اس کی حیثیت کو مولانا مرحوم کے ذہن میں جمایا، مولانا یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ ''دارالعلوم کی محفوظ تاریخ ہے۔'' محاسبی سے نکل کر سیدھے کتب خانہ میں پہنچے، قدیم و نایاب مخطوطات میں بڑی دلچسپی لی، ایک قلمی نسخے کا تعارف سیّد محبوب صاحب کرانا چاہتے تھے تو مولانا آزاد نے اس قلمی نسخے کی حیثیت اور تاریخی اہمیت پر ایک تقریر کر ڈالی: ''ہاں میرے بھائی! اس کتاب کی تیاری میں کاتبوں کو اتنے قلم اور روشنائی تقسیم کی جاتی، اتنی مدت میں یہ کتاب لکھی گئی، فلاں فلاں شاہی کتب خانوں سے منتقل ہوتی ہوئی یہ کتاب اس طرح دارالعلوم پہنچی، کتاب کی حیثیت یہ ہے اور مصنف علوم میں اس مقام کا مالک ہے۔''

یہ سن کر محبوب رضوی جو اپنی ہمہ دانی سے ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، سر بجیب ہو گئے، آج دارالعلوم کی جانب سے تمام اساتذہ کو حکم تھا کہ اپنی درس گاہوں میں اسباق کا سلسلہ جاری رکھیں، مرحوم آزاد ہر درس گاہ پر ایک ایک دو منٹ رکتے، لیکن جب وہ اس درس گاہ میں پہنچے جہاں قرآن شریف کی تجوید کی مشق کرائی جا رہی تھی، تو خوش الحان و مشاق مجوّد کی پُرسوز تلاوت نے مولانا کے قدم آگے بڑھنے سے روک دیے اور وہ چند منٹ قرآن کو محویت کے ساتھ سنتے رہے؛ بلکہ ان کا تاثر آنسوؤں کی صورت میں رخسار پر بہہ پڑا۔ یہاں سے وہ سیدھے نو درے کی تاریخی عمارت میں پہنچے، جہاں جلسۂ عام کا اہتمام تھا، پورا احاطۂ مولسری سامنے کی چھتیں لبریز تھیں، دفتر اہتمام کی گیلری میں اخبار نویس اور صحافیوں کا اجتماع تھا، جن میں پیش پیش اخبار ''الجمعیۃ'' کے شہرہ آفاق ایڈیٹر فارقلیط مرحوم تھے، مولانا آزاد گاؤ تکیہ سے پشت لگانے کے بجائے اس پر اس انداز سے چڑھ بیٹھے کہ دونوں گھٹنے کھڑے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ ایک ایک گھٹنے پر دراز، مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ مولویوں نے اہلاً و سہلاً مرحباً کے مضمون پر قصیدے پڑھنا شروع کیے تو آزاد نے اپنے انداز میں فرمایا کہ ''ان قصیدوں کا جب رخ میری جانب ہے تو کیا

ضرورت ہے کہ یہ پڑھے جائیں، مجھے دے دیے جائیں، میں مطالعہ کرلوں گا، وہ پروگرام مختصر کرنا چاہتے تھے، ادھر حضرات علماء اس شعر کا واقعی مصداق۔

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان واعظ کی

عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

آزاد مرحوم کی اس تنبیہ پر مولانا قاری محمد طیب صاحب نے استقبالیہ پڑھا جسے مولانا آزاد صبر وسکون سے سنتے رہے جیسے ہی یہ ایڈریس ختم ہوا، ایک دم آزاد اپنی نشست سے اٹھے اور کرسی پر جمتے ہوئے مجمع سے خطاب شروع کردیا۔

''آپ کے اس عظیم الشان ادارے سے میرا تعلق نیا نہیں، بہت پرانا ہے، ابھی جب آپ ایڈریس پڑھ رہے تھے تو میرا ذہن بے اختیار اس دور کی جانب پلٹ رہا تھا جب میں راتوں رات دہلی سے دیوبند مولوی محمود حسن صاحب سے ملاقات کے لیے آتا تھا الخ''۔

مولوی محمود حسن صاحب المعروف بشیخ الہند کے معریٰ نام پر مولویوں کی صفوں میں ایک دوسرے کی جانب اشارے شروع ہوگئے؛ لیکن مرحوم آزاد کی خطابت کا بحر موّاج تلاطم پذیر تھا، وہ اس کو کیا جانیں کہ یہ پرانے مولوی اپنے اساتذہ کے نام لیتے ہوئے فٹوں سے ناپ کر لاحقہ وسابقہ کے عادی ہیں، صحافی اس تقریر پر جھوم رہے تھے، فارقلیط سر دھنتے ہوئے کہتے، کیا پُرشکوہ اردو ہے، کیسی باوقار خطابت ہے، مرحوم مولانا آزاد نے تقریباً ایک گھنٹے کی پُرجوش خطابت میں قدیم علماء کی تاریخ، فخر روزگار شخصیتوں کا تذکرہ، علماء کا واقعی مقام، اکابر دارالعلوم کا تذکرہ، قدیم درس گاہوں کی اہمیت، پرانی تعلیم کا وقار پُرشکوہ انداز میں کیا۔ ان کی بے قرار ذہانت، خدوخال واداؤں سے ٹپک رہی تھی، دورانِ تقریر کبھی چشمہ لگاتے، کبھی بیتابی سے اتار لیتے، گاہے گاہے مونچھوں کو تاؤ دیتے، ان کا سراپا متحرک تھا اور مجمع خطابت کے تموّج آمیز طوفان میں اپنے کو تھامنے کی سکت نہیں پا رہا تھا، تقریر ختم ہوگئی تو مولانا باب الظاہر کی جانب اپنے سیلون کے لیے

روانہ ہو گئے۔ ہم طلبہ بھی دوڑ کر اس جگہ پہنچے، مولانا نے کار میں قدم رکھتے ہی تیزی سے اپنی سگریٹ جلائی، چوں کہ تین چار گھنٹہ کی اس طویل نشست میں دارالعلوم کا احترام سگریٹ نوشی سے مانع رہا، میں ان کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا؛ لیکن دیوبند میں میں نے محسوس کیا کہ ان کی ڈاڑھی قدرے بڑھی ہوئی تھی اور پائجامہ بھی چست ہونے کے بجائے ذرا ڈھیلا ڈھالا تھا، آزاد اپنی پُرجلال شخصیت کے باوجود مولویوں کے فتاویٰ کی تیز رفتاری اور طاقت سے واقف تھے، اس لیے علیٰ وجہ البصیرۃ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی وضع قطع میں یہ جزوی تبدیلی ارادی تھی، نہ کہ غیر ارادی، ظہر بعد وہ دوبارہ دارالعلوم تشریف لائے اور عصر تک یہاں قیام پذیر رہے، عصر کی نماز دارالعلوم کی فوقانی مسجد میں ادا کی، ہم کچھ طلبہ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ مولانا نے بیٹھ کر نماز پڑھی جس کی وجہ معلوم نہیں، چلتے ہوئے دارالعلوم کے کچھ نایاب مخطوطات اپنے ساتھ لے چلے، طلبہ دارالعلوم نے اس موقع پر ضبط ونظم، باقاعدگی اور باوقار استقبال کا وہ بے مثال مظاہرہ کیا، جس پر مولانا آزاد کا تأثر ڈھلے ڈھلائے لفظوں میں سامنے آیا۔

ان چند زیارتوں، ملاقاتوں کے علاوہ اور مجالس میں بھی مولانا آزاد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، یہ تو معلوم ہی ہے کہ سینٹرل گورنمنٹ میں وہ وزیر تعلیم تھے، لیکن ہندوستان کو آزادی دلانے اور پھر اس آزادی کو پائدار و مستحکم کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، جسے احسان فراموش حلقے بھلانا بھی چاہیں گے تو اس کوشش میں کبھی کامیابی نہ ہوں گے۔ سیکولر پالیسی کی ایجاد بھی مولانا ہی کی ہے۔ عرب ممالک سے روابط، ہندوستان کی ہمسایہ سلطنتوں سے دبیز تعلقات ان ہی کی سیاسی بصیرت وحذاقت کا نتیجہ تھے اور تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کی وفات کے بعد وہ آشیانہ جو ہندوستان کی ترقی اور ارتقاء کے لیے مرحوم نے تنکے چن کر بنایا تھا منتشر ہو گیا، ان کی زندگی آج تک بے نقاب نہیں ہو سکی، انہوں نے اپنے چہار جانب ایسے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ کوئی جھانک کر بھی ان کے حقیقی خدوخال نہ دیکھ سکا۔ جو کچھ اپنے متعلق انہوں نے لکھا یا دوسروں

نے، وہ ادھوری کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، ان کے سکریٹری اجمل صاحب یہ کام کرسکتے تھے؛ لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کہ جس شخصیت نے کبھی اپنے آپ کو منظر عام پر نہیں کھڑا کیا دوسرے ہاتھ اس کی نقاب کشائی کریں۔ اپنے خاندان، قبیلے، وطن وغیرہ سے متعلق ان کے بیانات بعض محققین کی رائے میں مشتبہ ہیں، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے بیانات صحیح یا ناقدین کی آراء۔ ایک طنطنہ اور شوکت کی زندگی، ایک دبدبہ اور حشمت کی حیات دماغی فالج کا شکار ہو کر رہ گئی، جب ان کی موت ہوئی تو ان کے جگری دوست جواہر لال نہرو نے اپنا دماغی توازن کھو دیا، میت دوش پر تھی تو جواہر لال آگے آگے روتے ہوئے مجمع سے کہہ رہے تھے کہ ''مولانا آرہے ہیں، مولانا جارہے ہیں''۔

میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ شاہ سعود ہندوستان تشریف فرما ہوئے تو پالم ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے جب مولانا آزاد کی کار آئی ہے تو پنڈت جی وزیر اعظم ہونے کے باوجود دوڑ کر کار تک پہنچے اور کار کا دروازہ کھولنے کی سعادت حاصل کی۔ اب دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد کے سامنے ایک طویل پارک میں سیاست وحذاقت، فراست وبصیرت، علم وفن، انشاء وخطابت کا یہ تاجدار، اس طرح تنہا پڑا سوتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی پوری زندگی تنہائیوں میں گذاری۔

مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان

***

جواہر لال نہرو

عہدِ طفولیت میں چند نام جو کانوں میں گونج رہے تھے ان میں جواہر لال نہرو کا نام سب سے زیادہ واضح اور ان گنت دلچسپیوں کا مرکز تھا، اخبارات آتے تو ان کے صفحہ اوّل پر جواہر لال کے بیانات ہوتے، ان کے پروگرام چھپتے، ان کی تصاویر ہوتیں، اگر یہ کہہ دیا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ جواہر لال دنیا کی وہ خوش نصیب شخصیت ہے جن کی پوری زندگی مصوّر رہے، بچپن سے لے کر تا موت ان کی زندگی کا ہر رخ مصوِر نے محفوظ کر لیا اور ان کے بچپن کے دلکش فوٹو، جوانی دیوانی کی جاذب نظر تصویریں اپنی اہلیہ کملا نہرو کے ساتھ کھڑے ہوئے، نام وَر باپ موتی لال نہرو کے پہلو میں ہندوستان کا وزیر اعظم، انڈین نیشنل کانگریس کا صدر، باغیانہ تحریکات کا لیڈر، عوام کا محبوب قائد، کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن، والنٹیر سپاہی، کمانڈر، مقرر، انشاء پرداز، خوش مزاج باپ، خوش اطوار نانا، خوش خوزعیم، ملک کی شہرت، مشاعروں کی رونق، جلسوں کی حرارت، جواہر لال جی کو جو جی چاہے کہہ لیجیے؛ ہر عنوان ان پر چسپاں، ہر خطاب ان کے لیے زیبا، ہر لقب ان پر چست ہے۔ باپ ہی کے سامنے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہو گئے اور جنگِ آزادی جیت کر ہندوستان کے وزیر اعظم بنے۔ کیا زندگی تھی، ایک طوفان، ایک بگولا، آندھی، تموّج، اٹھتی ہوئی لہر، گھنگھور گھٹا، برستا ہوا بادل، غالباً ہندوستان کا ہر باشندہ ان سے پیار کرتا، ان پر جان چھڑکتا، ہندوستان کی پوری سیاسی صف محبوبیت اور دلنوازی میں جواہر لال نہرو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کانگریس سے اپنی ذہنی وابستگی کے باوجود جواہر لال کو دیکھنے کی تمنائے بے قرار، دل کی گہرائیوں میں مچل نہ رہی ہو، آرزو پوری ہوئی اور عجیب وغریب انداز میں، آزاد ہندوستان سے پہلے الیکشن ہو رہے تھے، اچانک دیوبند میں اعلان ہوا کہ آنے والی صبح میں پنڈت جی دیوبند آرہے ہیں، اسٹیشن روڈ پر جہاں آج کل دیوبند کا نیا ہسپتال ہے، پنڈت جی کی تقریر ہوگی اور انہیں تھیلی نذر کی جائے گی، صبح کا سہانا وقت تھا، گلابی سردی پڑ رہی تھی، ہر شخص اس میدان میں پہنچنے کے لیے بے قرار تھا جہاں جواہر لال آنے والے تھے۔ حد نظر تک انسانوں کا ہجوم، استقبال بھی عجیب وغریب، ہریجن ڈھول بجاتے ہوئے، بالمیکی تاشے بجاتے ہوئے، کوئی باجا بجاتے ہوئے، کوئی راگ الاپتے ہوئے جلسہ گاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بچے، نوجوان، بوڑھے، عورتیں، شاید دیوبند کی پوری آبادی سمٹ کر آگئی ہو؛ چوں کہ پنڈت جی کا دیوبند کا پروگرام بہت مختصر تھا، اس لیے اسٹیج نہیں بنایا گیا، صرف تخت ڈال دیے گئے جس پر سفید کھادی کی چادریں بچھی ہوئی تھیں، عقب میں کانگریس کا ترنگا جھنڈا پورے شکوہ کے ساتھ لہرا رہا تھا، کانگریس کے مقامی پرانے لیڈر اور والینٹروں کی وردیوں میں ملبوس بہت سے رضا کار دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے کہ اچانک ایک کار آ کر رکی، پنڈت جی نے تیزی سے دروازہ کھولا اور سترہ سالہ نوجوان کی طرح بھاگتے دوڑتے مجمع کو چیرتے پھاڑتے اسٹیج پر آپہنچے، پنڈت جی اس وقت عنابی رنگ کے کشمیرہ کی شیروانی، چوڑی دار پائجامہ، پاؤں میں پنجابی سیاہ چپل، سر پر گاندھی کیپ زیب بدن کیے ہوئے تھے، سر پر ترچھی رکھی ہوئی ٹوپی سے کچھ سفید بال ان کی عمر کی پختگی کی خبر دیتے۔ ورنہ کشیدہ قامت، سڈول جسم، جو مسلسل ورزش کا عادی تھا، گورا چٹا رنگ، اس پر ان کی پھرتی، مستعدی بتاتی کہ یہ شاعروں کا پسندیدہ معشوق ابھی شباب کے اسی مرحلے سے گذر رہا ہے جہاں سے اس پر لاکھوں قلوب عاشقانہ اداؤں کے ساتھ قربان کیے جاسکتے ہیں، خصوصاً جب وہ مڑتے تو دیکھنے سے خوب محسوس ہوتا کہ جوانی دیوانی اپنی تمام جلوہ آرائیوں کے ساتھ

پنڈت جی پر کھلی پڑتی ہے، اگر شاعری سے کام لیجیے تو ان کی آنکھیں چشم غزالہ، رخسار آتش کدۂ فارس، ہونٹ غنچۂ ناشگفتہ، گردن صراحئ مے ناب، سینہ ولولوں سے لبریز، بحر موّاج، پیٹ خالی مشکیزہ، انگلیاں لکھنؤ کی ککڑی کے پھول؛ غرضیکہ میر کی غزل، ان کی برہمئ مزاج پر جایئے تو سودا کے تند و تیز شعر، خطابت پنڈت جی کی برائے نام تھی، اس میں کوئی جوہر قابل تعریف نہ تھا، تقریر میں ووٹ کی اپیل کی، روپیوں کی تھیلی تھامی، یہ جا اور وہ جا، مجمع کو راہ راست پر لانے کی ضرورت انہیں پیش نہیں آئی، اسے دھکا دیا، اسے گرایا، کسی سے ٹکرائے، کسی کو جھٹکا دیا اور یہ البیلا معشوق ہجوم عشاق سے نکہت گل، یا بادِ سحر کے جھونکے کی طرح ایک دم نکل گیا۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، وہ آرہے ہیں، یہ جا رہے ہیں

مگر سوختہ دل عاشق انہیں کب چھوڑنے والے تھے، پنڈت جی نے تو گرچہ وہی معاملہ کیا تھا جو کسی نامراد عاشق کے ساتھ اس کے تند خو محبوب نے کیا جس پر تڑپ کر اس مہجور نے کہا تھا۔

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے

لیکن عشاق بھی یہ کہتے ہوئے دوڑ پڑے۔

مجھ سے چھپیں گے وہ بھلا، ایسے کہاں کے ہیں

دیوبند اسٹیشن سے پسنجر ٹرین سے وہ سکنڈ کلاس میں سوار ہوئے، مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا محمد طاہر مرحوم جو دیوبند میں مسلم لیگ کے واحد ذمہ دار تھے، اس ٹرین سے دہلی کا سفر کر رہے تھے، وہ کھڑکی میں بیٹھے ہوئے پنڈت جی کا پُر تپاک وداعیہ دیکھ رہے تھے اور پنڈت جی کو اس کا نہ احساس تھا اور نہ خبر۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی روانہ ہوگئی، یہ تھی روئداد پنڈت جی کے پہلے درشن کی۔

۱۹۴۲ء میں احمد نگر کی طویل اسارت سے وہ رہا ہو کر سیدھے دہلی پہنچے، گاندھی

گراؤنڈ میں شام کو جلسہ کا اعلان تھا، تا حدِ نظر انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، اب گرمی کا زمانہ تھا، میں بھی قاری محمد نعمان صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچ گیا، بڑی اونچائی پر اسٹیج بنایا گیا تھا، اچانک پنڈت جی اسٹیج پر نمودار ہوئے، وہی چپل وہی چوڑی دار پائجامہ، البتہ جواہر کٹ واسکٹ در بر، سر پر گاندھی کیپ، نہ پُر صعوبت اسارت کی تھکن، نہ طویل سفر کا تعب، نہ عوام سے سالہا سال دوری کا شکوہ، نہ فرنگی استبداد کی شکایت؛ بلکہ تقریر کی ابتداء "بدیشی مسافرو! ہندوستان چھوڑ دو" کے مستانہ نعرے سے کی، اس تقریر میں تازہ ولولوں کا شباب، جیتے جاگتے عزائم، انگریز سے جاری لڑائی کے لیے دم خم اور اس راہ کی ان گنت بلاؤں کو سینے سے لگانے کا جذبہ بے اختیار پھوٹا پڑتا تھا؛ مگر ابوالکلام کی خطابت نہ تھی، عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر البیانی نہ تھی، حفظ الرحمٰن کی روانی نہ تھی، اس لیے مجمع خاموش پوری تقریر سنتا رہا، تاہم پنڈت جی کی تقریر تھی، وہ کچھ بھی نہ کہتے، صرف اگر درشن دیتے تو بھی بے تابیاں مضاعف ہوتیں۔ تقریر کے ختم پر پنڈت جی کا جانا قیامت کا نمونہ تھا، نوخیز لڑکیاں ان کے قدم چومنا چاہتی تھیں، پُر شباب سینے ان کی بلائیں لینا چاہتے تھے، والینٹر بار بار زنجیر بنا کر ان کے لیے راستہ تیار کرتے؛ لیکن بے قرار ہجوم چشم زدن میں اس درو بست کو برہم کر دیتا، پنڈت جی اوپر سے رضا کاروں کی بے بسی دیکھ رہے تھے، اچانک ــــ ان کا مزاجی پارہ آخر ڈگری پر پہنچا، دھڑم سے زمین پر کودے، اسے دھکا دیا، اس کے چپت رسید کیا، کسی کا سینہ پکڑ کے پیچھے دھکیل دیا، ہاتھوں سے بھی کام لیا اور لاتوں سے بھی، اور کار میں بیٹھ خدا جانے کدھر نکل گئے۔

شملہ کانفرنس ختم ہو چکی، وزارتی مشن ہندوستان پہنچ چکا، دہلی ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی، غالباً پنڈت جی نہرو خاندان کے کسی فرد، اگر حافظہ صحیح کام کر رہا ہے تو غالباً آر۔ کے۔ نہرو نامی شخص کے بنگلے پر قیام پذیر تھے، صبح ہی صبح ہم فتح پوری کے چند طالب علم اس بنگلے پر پہنچ گئے۔ عجیب منظر دیکھا ہندوستان کی آزادی کا یہ معمار، مستقبل کا وزیر اعظم، جانگیہ پہنے، بنیان جسم پر اور اپنی پنجابی چپل پر خود بیٹھا ہوا پالش

کر رہا تھا، بات چیت تو کیا ہوتی، پنڈت جی اپنے کام میں مصروف رہے اور بچکانہ باتیں سنتے رہے۔

پھر انہیں جمعیۃ علماء کی دی ہوئی اس ٹی پارٹی میں بھی دیکھا جہاں شاہ مسعود والیٔ حجاز مدعو تھے اور اسی حکمراں کے استقبالیہ تقریب منعقدہ پالم ایئرپورٹ پر بھی؛ بلکہ دور اور قریب سے بارہا دیکھنے کا موقع ملا، ان کے بڑھاپے نے ان کی رعنائیوں پر ڈکیتی نہیں ڈالی تھی اور نہ شباب کا وہ رخصتی مرقع تھے، بس صرف اتنا کہ اب سفید سفید بھویں سامنے سے دیکھنے پر بتاتیں کہ یہ ہمالیہ اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ فرنگیوں کے پیہم حملوں سے نبرد آزما ہے۔ گلاب کے پھول سے انہیں خصوصی شغف تھا، ہمیشہ شیروانی کے کاج میں لگائے رکھتے، بچے انہیں چاچا نہرو کہتے اور وہ بھی ان بھتیجوں سے بہت جلد گھل مل جاتے، صنف نازک میں انہیں محبوب کہا جاتا، اور وہ بھی طناز محبوب کی طرح غیظ و غضب کا مصنوعی اظہار کرتے ہوئے اس شعر کا واقعی مصداق بنتے۔

جس کو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا، یاد رہے

بالآخر ان کی علالت کی خبریں آنے لگیں اور پھر آل انڈیا ریڈیو سے ان کی موت کی خبر سن کر دل دھک سے ہو گیا، ارتھی بڑی شان سے اٹھی جس کے وسط میں پنڈت جی کا چہرہ کروڑوں ہندوستانیوں کو زبانِ حال سے وداع کا آخری پیغام دے رہا تھا، اب ولولوں، عزائم، بیتابیوں اور بے چین زندگی کا انجام "شانتی ون" میں ایک تودۂ خاک کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے جس پر آئے دن پھولوں کی بارش ہوتی ہے، پھر پھول مرجھا کر تہہ خاک سے صرف اتنا پیغام لاتے ہیں۔

آگ تھے ابتدا میں ہم بھی میرؔ
اب جو ہیں خاک، انتہاء یہ ہے

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

شعور نے آنکھ کھولی، آگاہی نے انگلی تھامی، گھر گھروندے سے باہر تاک جھانک کی عادت ہوئی تو ابا جی مرحوم کا حلقۂ تلامذہ، معتقدین و منتسبین گرد و پیش میں پڑے جمائے ہوئے نظر آئے، بھلا پھر بخاریؒ مرحوم کا نام نامی کان میں کیوں نہ پڑتا جن کی سحر البیانی خطابت کی جادوگری کے شور سے عالم گونج رہا تھا، تقریر کے حیرت انگیز واقعات کانوں میں پڑنے لگے تو مرحوم کی زیارت کے لیے آنکھوں نے پنجاب، یوپی، دہلی میں ان کی تلاش کی۔ خدا تعالیٰ ہر آرزو پوری کرتا ہے، ایک دن اچانک دارالعلوم میں شور ہوا کہ بخاری تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ وہ آئے اور بڑے طمطراق سے، ہمارے غریب خانے پر کیسے قدم رنجہ نہ ہوتے جب کہ مرحوم نے مدتوں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی جوتیاں سیدھی کرنا سب سے بڑی سعادت سمجھی تھی اور مرحوم علامہ نے اپنے اس شاگرد کو ''امیر شریعت'' بنا کر قادیانیت کے خلاف جرنیل کی حیثیت سے کھڑا کیا تھا، عصر کے بعد کا وقت تھا، پیچھے پیچھے سینکڑوں طلبہ کا ہجوم، آگے آگے مرحوم اس حلیہ وجثہ کے ساتھ۔

گول چہرہ، چشم آہو، گھنی ڈاڑھی، زلفیں جو شانوں تک پہنچتیں، بالوں کی ٹوپی جسے خم دے کر زیب سر کیا تھا، قوی ہیکل، بلکہ اچھا خاصا تن و توش، سرخ قمیص، نصف آستین، تہبند، جس پر بے تکلف یہ مصرعہ چست کیا جا سکتا ہے کہ ؏

خوشا بن میں چمکے بدن گورا گورا

سرخ وسپید، ''سینہ لعنت بر پدر فرنگ'' کہنے کے لیے ابھرا ہوا، ہاتھ میں تلوار، عجیب ہیئت تھی، محبوبیت اس میں ربودگی، کم آمیزی، لیکن لگاوٹ کی ادائیں، بیٹھک میں گھسے آتے تھے، چار پائی کھینچ کر خود ہی بیٹھ گئے، طلبہ کے ہجوم نے گھیر رکھا تھا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مرحوم کے پوتے فریدالوحیدی مقیم جدہ ساتھ، اس معصوم کو شعروشاعری کا ہیضہ اور ہر ایک سے بے تکلف ہونے کا والہانہ شوق، اپنے ٹوٹے پھوٹے شعر سنا رہے تھے تو عطاء اللہ شاہ کب چوکنے والے تھے، غالبؔ دہلوی کی ایک غزل کو تصحیف کر کے سنایا ؎

موت کا ایک دن مقرر ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

وہاں سے اٹھے تو والد مرحوم کے مرقد کی جانب چل دیے، استاذ کی گورِ خاک پر پہنچ کر شاگردانہ سعادتوں کا پیکر بن گئے، پاؤ گھنٹے کے قریب لگ بھگ لپٹ کر خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے، یہاں آموں کا باغ تھا، مجھے چپکے سے ایک درخت کے پیچھے لے گئے، جیب میں سے رقم نکالی اور زبردستی میری جیب میں ڈال دی، اب قصے سنانا شروع کیے، بولے کہ میں نے کچھ پڑھا لکھا نہیں، دارالعلوم، آیا چلا گیا، دوبارہ آیا اور علامہ مرحوم کے سبق میں جا شریک ہوا، یہاں بھی حاضری اتنی تھی کہ شاہ صاحب کمرے سے درس کے لیے چلتے تو میں پیچھے پیچھے، درس گاہ پہنچ کر حضرت شاہ صاحب جوتے اتارتے تو میں نعلین در بغل اندر داخل ہوتا، خاموشی سے جوتے ایک کونے میں رکھتا اور باہر نکل آتا: پھر مجلسِ احباب، سیاسی مسائل پر تبصرے، گل رخوں سے چھیڑ چھاڑ: جب محسوس ہوتا کہ اب سبق ختم ہونے والا ہے تو درس گاہ پہنچ جاتا، نعلین اٹھاتا اور حضرت استاذ کے سامنے رکھ دیتا، مرحوم استاذ اس حسنِ ظن میں کہ میں حاضر باش ہوں اور حاضری کی داستان تم نے سن ہی لی، پھر اسی کفش برداری سے جو کچھ مجھے ملا، مل گیا، مرحوم بخاری اس دلچسپ داستان کو اپنے شگفتہ انداز میں سنا رہے تھے، سناتے سناتے پھر ہمارے گھر پہنچ

گئے، مغرب کی نماز اس مسجد میں ادا کی جس میں ان کے استاذ نے اپنی زندگی کے آخری سال پنج گانہ کی ادائیگی میں گزارے، شب کو دیو بند کی جامع مسجد میں تقریر کا اعلان، دیو بند نے پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھا کہ جامع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی ہے، سامنے کی سڑک پُر ہجوم، چھتوں پر عورتیں اور بچے، بعد عشاء بخاری کی تقریر شروع ہوئی، یہ تقریر نہیں تھی؛ بلکہ جادوگر اپنا جادو جگا رہا تھا، کبھی رلاتا، کبھی ہنساتا، کبھی عبرت خیز واقعات، کبھی لطیف چٹکلے، گاہے شعر پڑھتا، کسی مشہور شاعر کے شعر کو بگاڑ کر مجمع کو سناتا، ''لعنت بر پدر فرنگ'' کا مستانہ نعرہ بلند کرتا اور پھر انگریز عداوت کا وہ مظاہرہ ہوتا کہ معصوم بچوں کے دماغ بھی کھول اٹھتے، لیکن دورانِ تقریر جب تلاوت کلام پاک کرتا تو محسوس ہوتا کہ وحی اتر رہی ہے، الکتاب المبین کی آیات کو سنا کر پھر تقریر کی طرف لوٹتا تو مجمع تڑپ اٹھتا کہ کاش بخاریؒ ساری رات قرآن ہی پڑھتے رہتے، منارۂ مسجد سے مؤذن کی بانگ بلند ہوئی تو عطاء اللہ شاہ مرحوم نے اپنی تقریر ختم کی، مجمع سر دھنتا ہوا منتشر ہو گیا، چھ گھنٹے کی اس لگاتار تقریر میں کیا مجال کہ ایک بھی سننے والا اپنی جگہ سے ہلا ہو، بے حس و حرکت سب شاہ جی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تھی میری پہلی ملاقات۔

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ میں دہلی پہنچ گیا، یہاں پنجاب یونیورسٹی کے فارسی امتحانات شغل تھا، اچانک دہلی کے گاندھی گراؤنڈ میں احرار کانفرنس کا اعلان ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاندھی گراؤنڈ خوب صورت اسٹیج، شامیانوں اور طنابوں سے مزین ہو گیا، ہم طلبہ شام کو تفریح کے لیے نکلے تو اب یہ ایک بہترین تفریح گاہ ہاتھ آئی۔ انعقادِ کانفرنس کی تاریخیں شبِ ہجر سے کم نہ تھیں، ایک دن ختم ہوا تو دوسرے دن کا ختم کرنا اس شعر کا مصداق تھا۔

فرہاد نہ پوچھ سختیٔ ہجر
دن آج، پہاڑ سا کٹا ہے

اللہ اللہ کر کے تاریخِ کانفرنس قریب آ کھڑی ہوئی، احرار ورکر اپنی مخصوص وردی

میں دہلی کی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے اور احرار کے مشہور قائد بھی پنجاب سے کھینچ کر دہلی پہنچ گئے، غالباً اس وقت احرار کے صدر شیخ حسام الدین تھے اور جنرل سکریٹری مظہر علی اظہر جن کی سیاسی زندگی میں قلابازیوں کو دیکھ کر عبدالمجید سالک مرحوم نے ''انقلاب'' کے کالم فکاہات میں ''مولانا ادھر علی ادھر'' لکھنا شروع کر دیا تھا اور ظفر علی نے اپنے مشہور طنزیہ اشعار میں چودھری فضل حق اور ان مرحوم مظہر علی اظہر کے متعلق کہا تھا ؎

دیکھ لو مظہر علی اظہر کو فضل حق کے ساتھ

ایک کھٹمل دوسرا پسو سیاسیات کا

چھوٹے بڑے قائد احرار پہنچ گئے تھے، شاہ صاحبؒ بھی پہنچ گئے، ان کے لیے ایک خصوصی خیمہ لگایا گیا تھا، مغرب کی نماز کے بعد اتفاقاً وہ اپنے خیمے کے سامنے بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے، خیمے میں ابھی تک بجلی نہیں آئی تھی، میں اور میرے ایک رشتے دار مسٹر اقبال صاحب جنہیں شاہ صاحب کی زیارت وملاقات کا بڑا شوق تھا پہنچے، تو شاہ جی بڑے تپاک سے ملے، اتنے میں صاحبزادہ سیّد فیض الحسن سجادہ نشین آلو مہار شریف پہنچ گئے، بڑے دیدہ زیب، نہایت خوبصورت ڈاڑھی، پٹھے بال، کلاہ اور اس پر پگڑی جس کا طرہ نصف ہاتھ کے قریب، ہلکے بادامی رنگ کی سلک کی شیروانی، طویل وعریض شلوار، پنجاب کا مکلف جوتا، بغل میں رول، آتے ہی پنجابی میں شاہ صاحب سے کہا کہ آپ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ شاہ صاحب نے پنجابی ہی میں جواب دیا کہ تمہارے نور سے خیمہ منور ہے، تین دن یہ کانفرنس چلی، آخری نشست میں شاہ صاحب کی تین گھنٹے کی تقریر ہوئی، تقریر کے اختتام پر کانفرنس کے ختم کا بھی اعلان ہوا، مجمع تڑپ اٹھا، اصرار شروع ہوا کہ کانفرنس کے لیے ایک دن اور بڑھا دیا جائے، شاہ صاحب اپنا سونٹا ہاتھ میں لیے ہوئے لنگی پہنے، وہی ہاف آستین کی قمیص، گریبان کھلا ہوا، سر پر ٹوپی ندارد، سر کو ایک خاص ادا سے جھٹکتے تو زلفیں اس طرح چہرے پر بکھر جاتیں جیسے چاند کے اردگرد ہالہ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس طرح کے موقعوں سے

فائدہ اٹھانے میں مہارت رکھتے، وہ ایک دم اٹھ کر آئے، لاؤڈ اسپیکر اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں بولے: ایک دن کانفرنس کا بڑھانا چاہتے ہو؟ تو مجمع بیک آواز بولا: جی ہاں! جی ہاں! رئیس الاحرار نے کہا کہ اتنا روپیہ یہاں جمع کر دو تا کہ کل کی کانفرنس کا خرچ مہیا ہو سکے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس اعلان پر سب سے پہلے حافظ محمد صدیق ملتانی مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خان دہلی پانچ سو کے نوٹ لے کر آگے بڑھے، پھر نوٹوں کی بارش شروع ہوگئی اور بے چارے احراریوں کے لیے یہی فتوحات ان کا روزگار تھا۔ یہ دوسری ملاقات تھی۔

میں لاہور پہنچا، مسلم لیگ کا دورِ شباب ہے، قوم پرور مسلمانوں کو سننے کے لیے کوئی تیار نہیں، اچانک ایک دن اعلان ہوا کہ شاہ جی کی تقریر ہے، میں بھی کشاں کشاں اس میدان میں پہنچ گیا جہاں تقریر ہونے والی تھی، لوگ بے تحاشہ چلے آتے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے حد نظر تک انسانی سروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا؛ لیکن لیگیوں نے بھی شب خون کی پوری تیاری کی تھی، شاہ جی مرحوم آئے تو اب سر پر کپڑے کی گول ٹوپی، عنابی رنگ کی ہاف آستین والی قمیص، ہاتھ میں بجائے تلوار کے سونٹا، اچانک اسٹیج پر نمودار ہوئے تو چہار جانب سے خشت باری؛ تا آنکہ مکانوں کی چھت سے بھی، ایک شور، ایک ہنگامہ، واپس جاؤ کے نعرے؛ لیکن بخاریؒ بڑا نبض شناس، اسٹیج پر جم کر بیٹھ گیا، اب اسے ان کی کرامت کہیے یا خدا تعالیٰ کی حفاظت، ایک بھی اینٹ پتھر بخاریؒ کے جسم کو چھو کر نہ نکلا، حالاں کہ شب کے سناٹے میں خشت باری اڑتی ہوئی چڑیوں کا منظر پیش کر رہی تھی، جب مخالفین کے کس بل نکل گئے، تو مرحوم بخاری کھڑے ہوئے، دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے، آسمان کی طرف نظر کی اور یہ قیامت خیز آواز:

”اے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا، اے مدنی آقا کے مولا، اے زمین و آسمان کے پالنہار، اے چاند کے مالک، اے سورج کے رب، یہ تاروں بھری رات تیرا ہی کرشمہ قدرت ہے، اے بارشوں کے برسانے والے، اے بادلوں کو لانے والے! تو دیکھ رہا

ہے فاطمہ بی بیؓ کے بیٹے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے کے ساتھ تیری دنیا کیا کر رہی ہے۔"

اشارہ اپنے سیّد ہونے کی جانب تھا، شاہ جی نے تڑپ کر لہک کر جو یہ انداز اپنایا، مجمع بے قرار ہو گیا، آنکھیں اشک بار ہو گئیں، چھتوں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں، شاہ جی! خدا کے واسطے ہمیں معاف کر، شاہ جی! تقریر ہوگی، تقریر ہوگی، جادوگر اپنا کام کر چکا تھا، مجمع کو تڑپا کر سونٹا ہاتھ میں تھاما اور اسٹیج سے اترنے کی تیاری؛ لیکن اب کون جانے دیتا، شاہ جی کرسی پر براجمان اور وہی خطابت کا جادو پھر جگا دیا، سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو تقریر کے ختم کرنے کا اعلان، مگر وہی مجمع جو چند گھنٹے پہلے شاہ جی سے الجھ رہا تھا، اب اس پر الجھا کہ تقریر پوری کرنا ہوگی، کشمکش میں بات یہاں آ کر ٹھہری کہ فجر کی نماز یہیں میدان میں پڑھی جائے اور نماز کے بعد تقریر کا دوسرا دور شروع، صفیں سیدھی ہو گئیں، ہزاروں انسانوں نے شاہ جی کی پُر کیف تلاوت میں نزولِ قرآن کا سماں دیکھا، دوگانہ سے فراغت پر دوسرا دور شروع ہوا اور غالباً آٹھ بجے تک چلتا رہا، تقریر کے ختم پر شاہ جی خدا جانے کہاں سے کسی طرف نکل گئے۔ یہ دوسری ملاقات نہیں بلکہ دور سے اسے ایک دید کہیے اور میر تقی میرؔ مرحوم کے اس مصرعہ کا لطف اٹھایئے ع

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے

یہ دہلی ہے، ۱۹۴۷ء کا آغاز، لیگ الیکشن کو سو فیصدی جیت چکی ہے، گاندھی جی نے نواب بھوپال کی وساطت سے مسٹر محمد جناح کو مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے۔ لارڈ، پیتھک لارنس کی قیادت میں وزارتی مشن ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے دہلی آیا ہوا ہے، لیگ کا دور دورہ، جواب میں صرف کانگریس، قوم پرور ہدفِ لعنت، ہدفِ ملامت، آزاد مرحوم علی گڑھ کے طلبہ کے ہاتھوں بدترین منظر دیکھ چکے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے جلسے کا اعلان بلّی ماران میں ہوا، ہم طلبہ بھی پہنچے تو مسٹر عبدالسلام صدر صوبائی مسلم لیگ دہلی اپنی فوج ظفر موج لیے ہوئے آگے بڑھے،

اسٹیج پر قبضہ کرلیا، مجاہد ملت کے سامنے لاؤڈ سپیکر اٹھا کر اسی سے مجاہد ملت کی تواضع شروع کی، مجمع تتر بتر ہو گیا اور خدا جانے مجاہد ملت پر کیا گزری، ایک رات حضرت مولانا محمد حسین احمد صاحب کی تقریر کا اعلان ہوا، مفتی کفایت اللہ مرحوم کی صدارت، مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریر، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی غازیانہ یلغار؛ مگر جب حضرت مولانا مدنی مرحوم کا نمبر آیا تو رات اپنا دم توڑ رہی تھی، حضرت مدنی مرحوم نے کھڑے ہو کر فرمایا: ''نعرۂ تکبیر''۔ تمام مجمع نے جواباً اللہ اکبر کی صدا بلند کی، دوسری آواز تھی ''جمعیۃ علماء ہند''۔ گنے چنے افراد نے زندہ باد کہا، باقی سناٹا، تیسرا نعرہ تھا ''انڈین نیشنل کانگریس'' اس پر جو خشت باری شروع ہوئی تو گویا آسمانی عذاب کی تصویر تھی، مجمع بھاگتے بھاگتے سرمد کے مقبرے اور شاہ کلیم اللہ چشتی کے مرقد تک پہنچ جاتا، مولانا حفظ الرحمٰن کھڑے ہوتے، پھر مجمع کو جمع کرتے، حضرت مدنی سے کہتے کہ تشریف لائیے، یہ بوڑھا جرنیل کھڑا ہوتا اور پھر وہی تین نعرے، اور تینوں پر پہلی ہی تین کیفیتیں، رات نے آخری ہچکی لی، نہ جرنیل کی تقریر ہو سکی اور نہ خود انہوں نے تین نعروں کے سوا کوئی بات کہی۔ ان حالات میں ایک دن اچانک جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے جلسے کا اعلان ہوا جس میں عطاء اللہ شاہ کی تقریر کی اطلاع تھی، اردو پارک میں یہ جلسہ ہوا، اسٹیج پر جمعیۃ علماء کے ذمہ داروں کے ساتھ جواہر لال اور سردار پٹیل وغیرہ تھے، دلی کھینچ کر چلی آئی تھی، ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، کانگریسی، لیگی، احراری، ہر قوم اور ہر جماعت کی نمائندگی تھی، مرحوم بخاری کی تقریر طباشیر صبح کے بکھرنے تک جاری رہی، تقریر کے دوران یہ بھی کہا کہ:

''یہ پٹیل بیٹھے ہیں، مریں گے، جلیں گے، ان کی راکھ دریاؤں میں اور ہواؤں میں اڑا دی جائے گی، پھر نہ ان کی گور، نہ ان کی قبر؛ لیکن میں مروں گا تو ڈھائی گز زمین اس ہندوستان پر قبر کے لیے لوں گا، پھر بتاؤ ہندوستان میرا ہے یا پٹیل کا۔''

اس پر زوردار قہقہہ لگا، پٹیل تو مسکرائے، جواہر لال لوٹ پوٹ ہو گئے، شاہ صاحب

نے جب دیکھا کہ مجمع بندھ گیا ہے تو کہا کہ دہلی والو! تم بھی بڑے چالاک ہو، تقریر میری سنتے ہو، ووٹ جناح کو دیتے ہو' اور پھر طرارے میں آکر پوچھا کہ "بتاؤ ووٹ کس کو دوگے؟" یہ بخاریؒ کی خطابت کا جادو تھا کہ "پورے مجمع سے آواز آئی کہ شاہ صاحب کو، شاہ صاحب کو' ووٹ تو کیا کوئی دیتا؛ لیکن جب قوم پرور منہ چھپائے پھرتے تھے اور لیگیوں کی یلغار نے ان کا ناطقہ بند کر دیا تھا، عطاء اللہ شاہ نے دہلی میں تقریر کی تھی۔ اس بار بھی بخاری سے شرفِ ملاقات حاصل نہ ہوا، تقریر سنی اور دور ہی دور سے ان کا دیدار کیا اور ناسوتی زندگی میں یہ ان کا آخری دیدار تھا۔ پھر بخاریؒ ہندوستان لوٹ کر نہ آیا اور پاکستان کی سرزمین عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے عدیم المثال مقرر کو ہمیشہ کے لیے نگل گئی، کم از کم پچاس سال ہندوستان کی خطابت کے آسمان پر بخاریؒ بدرِ منیر کی طرح چمکا ہے، قادیانیت کے قلعہ کو ہلا کر رکھ دیا، یہ بخاریؒ ہی تھا جس نے قادیان کی دھرتی پر غلام احمد قادیانی علیہ ما علیہ کے اتڑے پتڑے کھولنے کی جرأت کی، بار بار قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں، لیکن "لعنت بر پدر فرنگ" ہمیشہ بھیجتے رہے۔ شہید گنج مسجد کی پوری تحریک لڑی، کشمیر تحریک میں سینکڑوں احرار والنٹر گرفتار کرا دیے۔ پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ سے لے کر تا خانقاہ شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ وابستہ رہے، آخر میں خود مرشد بن گئے تھے، پاکستان بننے کے بعد خاک زارِ ملتان کے ایک جھونپڑے میں غریبانہ زندگی گزار دی، البتہ ان کی علالت کے دوران جنرل ایوب سابق صدر پاکستان نے علاج و معالجہ کی سرکاری طور پر خبر گیری کی، مرحوم بخاری کوئی سیاسی آدمی نہ تھے، نہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانا ان کے بس کی بات تھی، ظفر علی خاں مرحوم نے ایک بار احراری لیڈروں پر تیر و نشتر شعر کی صورت میں چلائے تھے تو بخاریؒ کے متعلق لکھا تھا۔

پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاری کے پٹم
مانگتا پھرتا ہے پھر کیوں کاجل سیاست کا

یہ تو معاصرانہ چشمک اور مرحوم ظفر علی خاں کی سیماب مزاجی کا مظاہرہ ہے؛ لیکن

پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ شاہ جی صرف ایک والنیٹر تھے، وفادار سپاہی، فرض شناس کارکن، سیاسی فکر کی تعمیر اور احرار کی پالیسی چودھری فضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کرتے، شاہ صاحب ان کے دیے خطوط پر تیزی سے دوڑ پڑتے؛ لیکن احراریوں میں خطابت کے سوتے شاہ جی کی خطابت کے سرچشمے سے نکلے ہوئے تھے، میرا خیال ہے کہ ایک دو لیڈروں کو چھوڑ کر احرار کے تمام قائد شاہ صاحب کے نقال تھے، خصوصاً قاضی احسان احمد شجاع آبادی، اس میدان میں سب سے آگے آگے رہے، بہرحال خدائے تعالیٰ اس غیور و جسور سفیرِ اسلام کی بال بال مغفرت فرمائے کہ ان کی خطابت کو دیکھ کر سننے والوں کی زبان پر یہ مصرعہ وارد ہوتا ہے ع

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

***

مولانا ظفر علی خاںؒ

پنجاب میں اباجی مرحوم کے تلامذہ اور معتقدین کا وسیع حلقہ تھا، خود والد مرحوم بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں؛ بلکہ عالم اسلام میں موجود اپنے شاگردوں کے مقابلے میں پنجاب کے منتسبین پر بھروسہ کرتے اور ان کے خلوص ومحبت کے معترف رہتے، وفات سے کچھ عرصہ پہلے والدہ مرحومہ سے انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''میں نے پوری زندگی گھر گرہستی کے فکر سے آزاد گزاری ہے، اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا، بچوں کے لیے کچھ نہ کیا، تم میرے بچوں کو لے کر پنجاب چلی جانا، وہاں میرے متعلقین ان کے لیے ضرور کچھ کردیں گے۔'' ان کا یہ خیال صحیح تھا، والد مرحوم کی وفات کے بعد پنجاب میں ان کے محبین نے کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد ہم پسماندگان کے لیے کوئی ایسا مستقل انتظام کرنا تھا جو ہماری بے سروسامانی کا سروسامان ہو، لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال نے یہ کہہ کر کہ ''شاہ صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کا انتظام نہیں کیا، اس فقیر غیور کی روح کو اس طرح کی تجاویز سے اذیت نہ دی جائے۔'' منصوبہ پس پشت ڈلوادیا تھا، پھر چوں کہ متنبی قادیان کا تعلق پنجاب سے تھا، والد مرحوم اس تحریک کو تہس نہس کرنے کی خصوصی دلچسپی کی بناء پر پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے تھے، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مفتی محمد نعیم، مولانا محمد انوری لائل پوری اور دوسرے بہت سے افراد انہوں نے قادیانیت کے خلاف محاذ پر لا کھڑے کیے تھے۔

سال میں کئی کئی بار وہ پنجاب کے دورے کرتے، قادیانیت کے خلاف کانفرنس اور جلسے کراتے، ظفر علی خان بھی انہیں اشخاص میں تھے، جن کی بھرپور شاعری اور قادر الکلامی سے والد مرحوم نے قادیانیت کے خلاف بہت کام لیا، اس تقریب سے ظفر علی خان کا ''زمین دار'' برابر والد کے نام آتا، بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ہمارے گھر یہ اخبار مسلسل آتا رہا۔

ظفر علی خان جب انگریزی عداوت کا مظاہرہ کرتے اور ان کی اخبار کی ضمانت ضبط کرلی جاتی یا کوئی بڑا بھاری جرمانہ عائد کیا جاتا تو وہ اخبار میں اپیل کرتے یا والد مرحوم کو خط لکھتے تو اباجی متعلقین سے ان کی مالی مدد کراتے، اس اخبار میں دو اشتہار عجیب وغریب سرخیوں کے تھے، ایک تو یہ کہ ''اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا'' اور دوسرے اشتہار کا عنوان تھا ''مراد آباد میں مردہ زندہ ہوگیا''، بچپن کا زمانہ، روزانہ اس اشتہار کو ہم پڑھتے اور اس میں عجیب دل چسپی محسوس ہوتی، یہ دونوں دوائیوں کے اشتہار تھے جن کا تعلق قوت مردمی سے تھا، مگر عنوان اور مضمون کچھ ایسا دلچسپ کہ پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہ ہوتی، خیر یہ طفولیت کا دور تھا، لایعنی مشاغل اس دور میں چنداں بعید بھی نہیں، حیرت تو اس پر ہے کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہوی جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم کے تلامذہ میں تھے اور تفسیر قرآن میں مہارت کامل رکھتے، انہیں والد مرحوم کے زمانے میں ڈابھیل شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلایا گیا، نرالی شان کے بزرگ تھے، لطائف کی ایک داستان ان سے وابستہ ہے، وہ بھی زمیندار کا روزانہ مطالعہ کرتے، ایک بار وہ ڈابھیل میں بیمار ہوئے تو میرے بڑے بھائی ازہر شاہ صاحب کو والد مرحوم نے مامور کیا کہ حضرت کو اخبار سنا آؤ، بھائی نے ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر اخبار کی بڑی بڑی سرخیاں پڑھنا شروع کیں تو حضرت امروہوی بولے کہ ''بچہ بچہ'' وہاں سے پڑھو جہاں رجسٹرڈ ایل نمبر لکھا ہے اور دوسری جانب تار کا پتہ، اخبار کا نام پڑھو، ایڈیٹر کا نام اور ادارۂ تحریر پڑھو، غالباً آٹھ صفحہ کا یہ اخبار مرحوم نے من وعن

پڑھوایا اور اگلے دن بھی یہی کام، بھائی نے جھلا کر اس پر عرض کیا کہ حضرت ایک ہی اخبار ہے، وہی اس کے ایڈیٹر، وہی اس کے مدیر، ان سب تفصیلات کو روزانہ کیوں پڑھا جائے فرمایا ''بچہ بچہ! تمہیں معلوم نہیں، ممکن ہے کہ ان چیزوں میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہو'' تو کیا عجب ہے کہ ''اس کا پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا'' یا ''مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا''، ہمارے شعور میں بھی یہی اندیشہ جاگزیں ہو کہ مضمون بدل گیا ہو اور اسی خیال سے زمیندار کے یہ دونوں اشتہار متواتر پڑھے جاتے ہوں۔ لیکن گمانِ غالب یہ ہے کہ اشتہار کے عنوان کی جاذبیت اور مضمون کی کشش مکرر مطالعہ کی باعث تھی، ذرا شعور آگے بڑھا تو اب زمیندار کا مطالعہ دوسرے رخ سے شروع ہوا۔ خاص طور پر پہلے صفحہ پر ظفر علی خاں مرحوم کی کوئی تازہ نظم بڑی دلچسپیوں کا موجب ہوتی، ان کی پُر گوئی، فی البدیہہ اشعار، جس سے روٹھے اس کے خلاف لکھ مارا، جس سے راضی اس کی شان میں قصیدہ کہہ دیا، ہندوستان میں ہر سیاسی، ملکی و ملّی حادثے پر ان کے افکار، پُر جوش نعتیں، اور گھریلو واقعات پر بھی فوری ایک نظم، مثلاً جیل میں تھے، اختر علی خاں مرحوم کے بیٹے منصور علی خاں یعنی ظفر علی خاں کے پوتے ملنے کے لیے گئے، مولانا نے اس ملاقات پر بھی ایک نظم کہہ ڈالی جو زمیندار میں چھپ گئی ؎

مجھ سے ملنے کے لیے زنداں میں منصور آ گیا
ڈھونڈتی تھیں جس کو نظریں چشم بد دور آ گیا
جان بابا اس سیہ خانہ میں تم کیوں آ گئے
میں تو ہو کر اپنی قسمت سے ہی مجبور آ گیا
اس کا ہنسنا اس کا رونا اس کی شوخی اس کا کھیل
مجھ کو یاد اختر ترے بچپن کا دستور آ گیا

اب یہ عنوانات ایسے جاذب تھے، ہم بچے تو درکنار؛ گھر کی عورتیں بھی دل چسپی سے پڑھتیں، بلکہ بڑی تعداد ظفر علی خاں کے انہیں اشعار کے انتظار میں رہتی، میں نے

اپنے گھر میں دیکھا کہ زمین دار میں ظفر علی خاں کی کوئی تازہ نظم پڑھی جاتی، یا پھر خواجہ حسن نظامی کی تحریریں، زمین دار میں مولوی احمد رضا خاں بریلوی کہ جب انہوں نے ظفر علی خاں پر بھی کفر کا فتویٰ جاری کیا اور ایک ظفر علی خاں ہی کیا، سینکڑوں پر مولانا کفر کے گولے داغ چکے تھے تو ظفر علی خاں نے جوابی حملہ کیا اور اتنا سخت ۔

مانچسٹر کے کفن سازوں سے لایا ہے ادھار

کفر کی انٹی، بریلی کا یہ بڈھا نورباف

ان کی قدرتِ کلام اتنی حیرت انگیز تھی کہ ایک مرتبہ دیوبند آئے، دفترِ اہتمام میں ان کے قیام کا انتظام تھا، کسی نے دارالعلوم سے متعلق مولانا سے کچھ ارشاد فرمانے کی گزارش کی تو جواباً مرحوم نے حقے کی فرمائش کی، حقہ آیا، مولانا نے کش لیا اور اشعار تیار تھے ۔

شاد باش وشادزی اے سرزمین دیوبند

ہند میں تونے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

سخت سے سخت زمین، ردیف اور قافیے میں بھرپور اور پُر اثر شعر ظفر علی خاں ہی کہہ سکتے تھے؛ مگر استقلالِ طبع کی دولت سے محروم تھے، میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ سے ان کی ریشمی رومال کی تحریک میں کسی نے ظفر علی خاں کو بھی شریک کرنے کی سفارش کی تو حضرت بڑے مردم شناس واقع ہوئے تھے فرمایا کہ ”بھائی سب کچھ ہے؛ لیکن ان کا کھونٹا مضبوط نہیں ۔“ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی یہ تبصرہ ظفر علی خاں سے متعلق کہیں نظر سے گزرا ہے ۔

”ظفر علی خاں سے کسی تحریک کی تعمیر کا کام لینا چاہیے اور جب عمارت کھڑی ہوجائے تو انہیں نکال دینا چاہیے، ورنہ خود اس عمارت کو گرانے کا کام انجام دے جائیں گے ۔“

اپنے معاصر اشخاص پر تو ان کے پیہم حملے ہوتے، مثلاً احرار پر بگڑے تو تیر اس طرح برسائے ۔

پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاریؒ(۱) کے پٹم
مانگتا پھرتا ہے پھر کیوں کا جل سیاسیات کا
دخل در معقولات کیوں دیتا ہے یہ بڈھ(۲) مولوی
نکتہ کیا حل کرسکے گا یہ سیاسیات کا
دیکھ لو مظہر علی اظہر کو افضل حق کے ساتھ
ایک کھٹمل دوسرا پسو سیاسیات کا

یا یوپی میں حافظ ابراہیم اور مولوی عبدالسمیع کا الیکشنی مقابلہ ہوا، حافظ جی کانگریس کے ٹکٹ سے لڑرہے تھے اور عبدالسمیع صاحب مسلم لیگ کا نمائندہ بن کر ان کا مقابلہ کررہے تھے اس پر ظفر علی خان کی نظم آگئی ؂

حافظ ابراہیم ادھر ہیں اور ادھر عبدالسمیع
ہر دواری درس ادھر ہے یثربی تعلیم ادھر
ایک طرف گھاگھر میں گنگا جل کی گدلی مستیاں
آبگینوں میں شراب کوثر و تسنیم ادھر

مولوی عبدالسمیع کے ہر الیکشنی جلسے میں یہ نظم پڑھی جانے لگی، مولانا بشیر بھٹہ کٹھوری یوپی میں کانگریس کے الیکشن کے ذمہ دار تھے اور خود ان کا ذاتی پیشہ بھٹہ تھا، ظفر علی خاں ان سے بگڑے تو کہا ؂

اگر مینہ زور سے برسا تو گر جائیں گی دیواریں
کہ اینٹیں کچی رہتی ہیں بشیر احمد کے بھٹے کی

اور پھر اسی ردیف و قافیہ کو اخیر تک نبھاتے چلے گئے، حد تو یہ تھی کہ وہ اپنے چھوٹوں کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہ تھے۔ غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک انہیں کے فیضانِ انشاء سے بہرور تھے اور دونوں زمین دار کے ادارۂ تحریر سے وابستہ، کسی معاملے پر ٹوٹے اور

(۱) مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
(۲) مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ

ٹوٹ کر اپنا ''انقلاب'' اخبار جاری کیا، پالیسی کچھ انگریز نواز اور لیگ سے نفرت کی اختیار کی، غلطی سے ظفر علی خاں سے بھی الجھ گئے ''جائے استاذ خالی ست'' تو مشہور ہی ہے، ہزار غلام رسول کی سنجیدہ نگاری اور مرحوم سالک کی پھکڑ بازیاں؛ لیکن مقابلہ شیر اور بکری کا تھا، مرحوم اس وقت بنگال کے دورے پر تھے، تو وہیں سے جوابی حملہ ایسا خوف ناک کیا۔

مہر و سالک بھی پرستش گائے کی کرنے لگے
سامری ہے انقلاب جان بل گوسالہ ہے
مہر ہے ان کی دوات اور سالک ان کا ہے قلم
ایک اسم ظرف ہے اور ایک اسم آلہ ہے
ان کے سب رشتے بہت ہی خوب ہیں، پر کیا کہیں
التباس، ان کا چچا ہے اور غلامی خالہ ہے
جب اچھالوں گا تو دونوں کے دھویں اڑ جائیں گے
جیب میں میری ترنجِ جادوئے بنگالہ ہے

زود رنجی اور فی البدیہہ منقبت یا مذمت تیار کرنے میں وہ اتنے بڑھ چکے تھے کہ اپنے روحانی مقتدا سے بھی دست و گریباں ہو جاتے، مثلاً والد مرحوم سے ان کے عقیدت مندانہ روابط کی تفصیل میں اوپر سنا آیا ہوں، جب والد مرحوم نے خلیفہ قادیان کو مباہلہ کا چیلنج دیا اور ادھر سے فرار عمل میں آیا تو ظفر علی خاں نے کہا۔

وہ بھاگتے ہیں اس طرح مباہلہ کے نام سے
فرار کفر جس طرح کہ مسجد الحرام سے

اور جب والد مرحوم نے گاندھی جی کی نمک تحریک میں ان کی حمایت میں بیان دیا کہ حدیث میں بھی تین چیزوں پر کسی ٹیکس عائد نہ کرنے کا حکم ہے، پانی، گھاس اور نمک۔ خدا جانے ظفر علی خان کیوں روٹھ گئے، اگلے دن زمیندار کے صفحۂ اوّل پر تھا۔

چھپ گیا اخبار میں فتویٰ یہ انور شاہ کا
پہلے نعرہ اوم کا، زاں بعد الا اللہ کا

تاہم طلاقتِ لسانی میں ظفر علی خاں منفرد شخصیت کے مالک ہیں اور میرا تو یقین ہے کہ جس شان و شوکت کی انہوں نے نعتیں کہیں وہی ان کے لیے باعث نجات ہوں گی۔

یو پی میں مولوی محمد حسن صاحب کا اخبار مدینہ اور لاہور میں زمین دار صحافیوں کی تربیت گاہ رہے ہیں، مولوی مجید حسن تو جوہر قابل کو پکڑتے اور اپنے اخبار کا ایڈیٹر بناتے؛ مگر ظفر علی خاں کی صحافتی ٹکسال میں پکی دھات اور چکا چوند کر دینے والے سکے ڈھل کر نکلتے۔ آج تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ظفر علی خان کی کس سے متعلق کیا رائے تھی، چوں کہ وہ آسمانِ چہارم تک کسی کو پہنچاتے اور دوسرے ہی دن اس کو تحت الثریٰ تک پہنچاتے، مگر اس کا انکار کون کر سکتا ہے کہ تقریباً پچاس سال تک ہندوستان کی تمام ملّی و سیاسی تحریکات میں ظفر علی خان کی شاعری نے آگ لگائی ہے، ان کی شعلہ نوائی سے انگریز تھراتا اور شعلہ بیانی سے فرنگی خیمہ برداروں کی نیند حرام ہوتی، واقعتاً زمین دار اخبار نے ہندوستانی صحافت کو ایک نیا رخ دیا، گڑھے گڑھائے انشاء پرداز، قلم کے دھنی، اور ہر گوشے میں رواں صحافی بہم پہنچاتے رہے، کاش کہ ظفر علی خاں کی حیات اور ان کی سرگرمیوں پر پاکستان کا کوئی دیدہ ور مصنف قلم اٹھائے، لیکن غالباً رکاوٹ یہ ہے کہ ظفر علی خان کبھی لالہ گل، کبھی نسیم سحر، کبھی آگ کا جوالہ تو گاہے نیش عقرب، اسے تڑپا دیا، اسے رلا دیا، کسی کو ہنسا دیا، کوئی جھوم اٹھا، کوئی شدتِ غم سے بادل کی طرح رویا؛ اس لیے ان کے تاثرات و افکار کو سمیٹنا اور سامنے لانا دشوار ہے۔

بہرحال دہلی میں ادارہ شرقیہ کے قریب شفاء الملک حکیم دلبر حسین کا رہائشی مکان تھا، ظفر علی خاں دہلی آتے تو انہیں کے یہاں قیام ہوتا، یہ وہ دور تھا کہ پاکستان ابھی بنا نہیں تھا، مرحوم کے بڑھاپے کی بناء پر ان کا زمین دار اخبار بھی آخری ہچکیاں لے رہا تھا، اختر علی خاں ان کے بیٹے اخبار کو اس طمطراق سے باقی نہیں رکھ سکے جوان کے نام ور

شعلہ خوباپ نے قائم رکھا تھا، اپنی طویل بیماری خصوصاً رعشہ کی بناء پر وہ اب جلسوں اور جلوس کے بھی آدمی نہیں رہے تھے، میں نے بارہا ان کی تصویر دیکھی تھی، تصویر بھی عجیب وغریب، سر پر کلاہ اور اس پر پنجابی طرز کا عمامہ، جسم پر چوغہ جس کے حاشیہ پر کارچوب تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، بار باران کی تصویر دیکھنے کی بناء پر ان کا چہرہ مہرہ اور خدوخال آئینۂ ذہن پر مرتسم تھے، مجھے صبح گاہی تفریح کی بڑے زمانے سے عادت ہے، دہلی میں ایڈورڈ پارک سے باہر کی سڑک جو لال قلعہ کے سامنے سے گزرتی ہے اس پر میں گشت کررہا تھا کہ اچانک ظفر علی خاں نظر آئے۔ اونی چادر اوڑھے، سر پر بالوں کی ٹوپی، علی گڑھ پائجامہ، ہاتھ میں چھڑی، میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا، ان کی نظریں بھی بے اختیار میری جانب اٹھیں اور گھور کر دیکھتے رہے، پھر تقریباً پندرہ بیس روز تک روزانہ صبح مرحوم کی زیارت ہوئی، میں انہیں پہچانتا، لیکن وہ مجھ سے ناواقف تھے۔ جس دور میں ظفر علی خان کو میں نے دیکھا اس وقت وہ ایک گرتی ہوئی عمارت، حسرتوں کا مرقع، تمناؤں کا ڈھیر نظر آئے، لیکن ان کی متحرک دھنسی ہوئی آنکھیں بتاتیں تھیں ع

کہ آثار پدید است شاہانِ عجم را

***

ڈاکٹر محمد اقبالؒ

عرصہ گذرتا ہے کہ مشہور علمی شخصیت مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کی وفات حسرت آیات پر علمی حلقوں، اخبارات و رسائل نے تعزیتی اداروں میں اس کا خصوصی ذکر کیا تھا کہ مولانا شیروانی سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خصوصی مراسم اور مودّت و یگانگت کے دبیز تعلقات تھے اور یہ کہ ''غبارِ خاطر'' و ''کاروانِ خیال'' کے مکاتیب کے مخاطب مولانا حبیب الرحمٰن ہی ہیں۔ ان عامیانہ خیالات کے اظہار میں ایک منفرد صدا مدیر ''برہان'' مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تھی جنھوں نے اپنے تند و تیز لب و لہجے میں لکھنے والوں کی اس روش پر تنقید کرتے ہوئے بتایا تھا کہ مولانا شیروانی خود ایک علمی مقام اور جلیل حیثیت کے انسان تھے، ان کے مفاخر میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا کہ وہ مولانا آزاد کے یارِ غار اور ان کے مکتوب الیہ ہیں، یہ بروقت تنبیہ دل و دماغ کو ایسی بھائی کہ عرصہ گزرنے کے باوجود اس کے ارتسامی نقوش دل و دماغ پر کنداں ہیں۔ ابتدا میں خیال تھا کہ علامہ کشمیریؒ اور ڈاکٹر اقبال کے مراسم و روابط پر مفصل لکھا جائے؛ لیکن مولانا اکبر آبادی کے قلم نے جس تخم کی کاشت کی، اس کے برگ و بار اس عنوان پر کچھ لکھنے سے اب آبی ہیں، بلاشبہ ''ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیریؒ'' ہر دو اپنے دائرۂ علم و عمل میں انفرادی خصوصیات کے مالک ہیں اور دونوں کا تعارف اس قدر وسیع ہے کہ نہ ڈاکٹر اقبال کو اس فخر کی تلاش کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ان کے مراسم تھے اور نہ شاہ صاحبؒ کی سوانح اپنی تکمیل میں ڈاکٹر اقبال سے خصوصی روابط کے عنوان و تفصیلات کی منتظر، یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف اسے مستقل عنوان بنانے کے بجائے اسی طرح ذیلی گفتگو بنا رہا ہے، جیسا کہ حضرت شاہ صاحب کے دوسرے

معاصرین کے سوانحی خدوخال ذیلاً قلم پر آئے۔

ڈاکٹر اقبال ہندوستان کے ان خوش نصیب چیدہ وچنیدہ اشخاص میں ہیں جن کے فکر وفن پر لٹریچر کا انبار ہے اور ''اقبالیات'' کے موضوع پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب اگر کچھ لکھا جاتا ہے تو اس میں ندرت مشکل سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ آپ کے حالات وسوانح، زندگی اور اس کے نشیب وفراز، شاعری اور شعر گوئی، سیاسی فکر ونظر، علم دوستی، علم پژوہی، سیاحت وسفر، علالت ووفات، غرضیکہ کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہیں؛ اس لیے بہتر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ان کے تعلق کی مختصر تاریخ ہی زیر قلم ہو۔

مولانا محمد انوری لائل پوری کی روایت ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاہ صاحبؒ سے سب سے پہلی ملاقات امرتسر میں ہوئی، اس وقت شاہ صاحبؒ کسی کشمیری تاجر کے یہاں مقیم تھے، یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ڈاکٹر صاحب امرتسر میں مقیم تھے یا لاہور سے ملاقات کی غرض سے امرتسر کا سفر کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے، ان کے ہمراہ کچھ ممتاز دانشور اور مشہور اربابِ سیاست بھی تھے، آنے کو تو آگئے، لیکن کلین شیو ہونے کی بنا پر مجوب تشریف فرما ہوئے، ان کے طویل سکوت کو شاہ صاحبؒ ہی نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے ختم کیا:

''ڈاکٹر صاحب میں اور آپ دونوں فکر شکم کے مریض ہیں، مجھے چند لقمے ڈاڑھی کے بغیر میسر نہیں آتے اور آپ کا معاملہ اس کے برعکس ہے، اس لیے مجوب نہ ہوئیے، میں جن چند شعراء کے اشعار اور ان کا کلام پسند کرتا ہوں، ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔''

اس پر ڈاکٹر اقبال نے اپنا کچھ تازہ کلام سنایا؛ لیکن ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی روایت کے بموجب شاہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے تعلق کا آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء سے ہے، لاہور کے ''بریڈلا'' ہال میں جمعیۃ العلماء کی دعوت پر کوئی عظیم سیاسی کانفرنس تھی جس میں ہندوستان کے چند علماء شرکت کررہے تھے، اسی جلسے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ:

''میں نے مولانا انور شاہؒ اور ڈاکٹر اقبال کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا پھر یہ

تعلق برابر بڑھتا اور مستحکم ہوتا رہا جس کا اختتام حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات ہی پر ہوا۔"

سر اقبال جو یائے علم، علم دوست اور متجسس فطرت کے مالک تھے۔ لاہور ادیبوں، انشاء پرداز، اربابِ سیاست اور دانائے روزگار اشخاص کا ہمیشہ سے مخزن رہا؛ لیکن اقبال جس طرح کے اہل علم اور وسیع النظر دانشور کی تلاش میں تھے اس زمانے کا لاہور ایسی ہستیوں سے خالی تھا؛ چناں چہ انہوں نے ایک مکتوب میں مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کو اس قحط الرجال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں، یہاں انجمن، کالج اور فکر منصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں، مگر ان میں اسلامی سیرت کی متاع نہیں دکھتی۔"

اس یاس انگیز صورتِ حال نے ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھا کہ لاہور میں کسی ایسے بالغ النظر و عبقری انسان کا قیام کرایا جائے جو اسلامی فقہ کی اس جدید تشکیل میں صحیح معاون ہو جس کا خاکہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن و فکر میں تھا۔ اس اہم اور جلیل منصب کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت موزوں تر تھی؛ چناں چہ ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر صاحب لاہور میں شاہ صاحبؒ کے مستقل قیام کی تجویز کی پخت و پز کر رہے تھے، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ:

"ایک مرتبہ علامہ سیّد انور شاہ صاحبؒ لاہور تشریف لائے اور تکیہ سادھوال اندرون موچی دروازے میں پیر عبدالغفار شاہ کے یہاں مقیم ہوئے تو ڈاکٹر اقبال نے بعض انجمنوں سے طے کر لیا کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ لاہور میں قیام کے لیے آمادہ ہو جائیں تو بادشاہی مسجد کا خطیب اور اسلامیہ کالج میں شعبۂ اسلامیات کا سربراہ بنایا جائے۔ مختلف انجمنیں اس تجویز کے لئے رضامند بھی ہو گئیں۔"

لیکن ڈاکٹر اقبال کی یہ تجویز و تحریک شاہ صاحبؒ کے لیے قابلِ قبول نہ تھی تاہم عالم اسلام کی دونوں شخصیتوں کے درمیان یہ مخلصانہ روابط برابر بڑھتے رہے اور ڈاکٹر

صاحب حضرت شاہ صاحب کے فن وکمال، علمی جلال کے قدر شناس اور بڑے معترف ہوئے۔ وہ وقت بھی آیا کہ کشمیر کمیٹی جو مہاراجہ کشمیر کے ایماء پر بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کی قیادت میں تشکیل کی گئی اور جس کا ڈاکٹر اقبال کو بھی ایک رکن بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت تک قادیانیت، نبوتِ باطلہ اور اس فرقے کے جعل وفریب پر قریبی واقفیت نہیں رکھتے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کو نہ صرف ''متنبّی قادیان'' کے پُرفریب اقدامِ نبوت کے غلط دعوے اور اس کے کھوکھلے پن پر تفصیل سے مطلع کیا جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا؛ بلکہ متنبّی قادیان کے نظریات وافکار پر بھرپور تنقید کی اور بعض اہم علمی مقالات اس سلسلے میں ان کے علم ریز قلم نے تیار کیے اور بلاشبہ ان کی نگارشات جدید حلقے کو قادیانیت کی سمیت سے واقف کرنے میں کارآمد ثابت ہوئیں۔ مقدمہ بھاولپور میں شرکت کے بعد واپسی پر شاہ صاحب کا چند روز کے لیے لاہور میں قیام ہوا تو آسٹریلیا مسجد میں آپ کے مسلسل مواعظ کا اہتمام کیا گیا، ان مجالس میں ڈاکٹر صاحب بھی باقاعدہ شرکت کرتے، دنیائے اسلام کی ان دونوں شخصیتوں میں پھر اس مخلصانہ یگانگت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار انجمن خدام الدین کے جلسہ میں شرکت کے لیے شاہ صاحبؒ پہنچے اور آپ کے ہمراہ دیو بند کے بعض اکابر علماء بھی تھے، تو ڈاکٹر اقبال نے اپنی قیام گاہ پر ضیافت کا اہتمام کرتے ہوئے یہ دعوتی مکتوب حضرت شاہ صاحبؒ کو روانہ کیا۔

۷۸۶

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ مولانا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسے میں تشریف لائے ہیں اور ایک دوروز قیام فرمائیں گے، میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا کہ اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے یہاں کھانا کھائیں، حضرت کی

وساطت سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ عثمانی، حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے، مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔

اس مکتوب سے واضح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قلب میں شاہ صاحبؒ کی کیا قدر ومنزلت تھی اور وہ خود کو شاہ صاحب کے علم وفضل سے ایک مستفید کی حیثیت دیتے؛ چناں چہ ''مسئلۂ زمان ومکان'' جو ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع تھا اس پر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ڈاکٹر صاحب نے بھرپور استفادہ کیا، جس کی تفصیلات خود ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی قلم بلند کی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ''عراقی'' کا اس موضوع پر معرکۃ الآراء رسالہ ڈاکٹر صاحب کو بہم پہنچایا تھا، بلکہ ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ ''نیوٹن'' نے جو کچھ ''زمان ومکان'' پر لکھا ہے وہ ''عراقی'' کے اسی رسالے سے ماخوذ ہے، خود ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۸ء میں ''اورینٹل کالج'' کے شعبۂ عربی وفارسی کے صدارتی خطبہ میں جو ''حکماء اسلام کے عمیق تر مطالعہ'' کے نام سے دیا گیا تھا لکھتے ہیں کہ:

''یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن میں ''عراقی'' کی تصنیف غایۃ الامکان فی درایۃ المکان'' کی طرف منتقل کر دیتا ہے، مشہور حدیث ''لا تسبو الدھر لان الدھر ھو اللہ'' میں ''دھر'' بمعنی ''Time'' کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق ''مولانا انور شاہ صاحب'' سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں میری خط وکتابت ہوئی، اس مراسلت کے دوران مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطہ کی طرف متوجہ کیا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی۔''

اسی جلسے میں علاوہ مشہور دانشوروں کے مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی بھی شرکت کر رہے تھے، مندوبین کو ڈاکٹر اقبال نے یہ بتا کر حیرت واستعجاب میں ڈال دیا کہ شاہ صاحبؒ نے مجھ کو بتایا کہ ''نیوٹن'' نے ''زمان ومکان'' پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی اپنی

تحقیق نہیں؛ بلکہ علامہ عراقی کے اسی رسالے کا سرقہ ہے۔ علامہ اقبال نے اس انکشاف کو یورپ کے اخبارات میں بھی شائع کرایا، غالباً کسی جگہ اسی تصنیف کے صفحات پر راقم الحروف نے یہ بھی بتایا تھا کہ چند سال پہلے سندھ کے کسی سجادہ نشین بزرگ کے نام ڈاکٹر اقبال کے خطوط شائع ہوئے ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ ''زمان ومکان'' کے مسئلے پر میں نے شاہ صاحب سے استفادہ کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے وہ مشہور چھ خطبات جو انگریزی زبان میں دیے گئے تھے ان میں ''ختم نبوت''، قتل مرتد اور مسئلہ زمان ومکان کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے علامہ کشمیریؒ سے خاص استفادہ کیا۔ بہر حال علامہ کشمیریؒ کا یہ کارنامہ ان کی حیات کا زرّیں باب ہے کہ ڈاکٹر اقبال ایسی جاندار، توانا اور مضبوط شخصیت کو قادیانیت کے خلاف محاذ پر لے آنے کی تمام ترسعی وکاوش حضرت شاہ صاحب نے کی اور یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس طول وعرض کے انسان تھے، ان کو متاثر کرنے کے لیے علامہ کشمیری ہی کی عبقریت وعلمی غزارت کارآمد ہوسکتی تھی، خود ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت سے اپنے تأثر کو ''وادیٔ لولاب'' نامی نظم میں ظاہر کیا ہے۔ کشمیری کے سیاسی مفکر ومبصر مولانا محمد سعید مسعودی نے ایک ملاقات میں مجھ سے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا موصوف سے فرمایا کہ ''میری یہ طویل نظم حضرت شاہ صاحب ہی سے تعلق رکھتی ہے۔'' غرضیکہ سوانح کی تکمیل کے لیے وقت کے دو مشہور عالم، فاضل اور دانشوروں کے گہرے مراسم کی یہ ایک مختصر تفصیل ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں ان تعلقات کی استوار بنیادوں کی تنقیح کچھ اور تفصیلات کا ذریعہ ہو۔

٭٭٭

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا

بوڑھے اور جوان جذبات ہمیشہ سے دست و گریباں رہے، بوڑھے جوانوں کے ساتھ تیز گامی نہیں دکھا سکتے اور جوان بوڑھوں کے ساتھ خراماں نہیں چل سکتے، ان کا سینہ جذبات کا شور انگیز دریا اور ان کا افسردہ جذبات کا مرقد، اور فشردہ ہمتوں کا مقبرہ، جوانوں کا طبقہ شبابی ولولوں کا مرقع۔ قوموں، جماعتوں ہر جگہ حرارت و برودت، آگ اور پانی کا یہ تصادم نظر آئے گا۔ ہندوستان کی مشہور سیاسی پارٹیاں، جوانی اور بڑھاپے کی اس جنگ سے محفوظ نہ رہ سکیں، گاندھی جی اولاً تو خود ہی ٹھنڈے مزاج کے تھے، پھر اہنسا کے فلسفے نے ان کی تمام حرارتوں کو اس طریقے پر گھیر لیا تھا کہ گرم مزاجی و تندئ طبیعت کا کہیں سے مظاہرہ نہ ہوتا، ان کی خاص عادت تھی کہ جو چیز اختیار کرتے ہندوستان کے سوراج کا اس کو سب سے بڑا ذریعہ بتا دیتے، ایک زمانے میں کھدر پوشی کو وہ سوراج کا وسیلہ کہتے، پھر چرخے کو انہوں نے ہندوستان کی آزادی کا سب سے بڑا ذریعہ بتایا اور چل پھر کر وہ اہنسا پر ایسے ٹکے کہ اس سے چمٹ کر رہ گئے، بڑی سی بڑی تحریکات کو صرف اس وجہ سے واپس لے لیتے کہ ان کی سیاسی مرکز ثقل سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر کوئی بے راہ روی اور تشدد کا واقعہ پیش آ گیا، بلکہ اس گناہ کے کفارے میں برت کی خبر آتی، یا مدتوں کے لیے کٹیا نشین ہو جاتے، مگر پوری پارٹی پر ان کی چھاپ اتنی مضبوط تھی اور ان کا دماغ تمام دماغوں پر ایسا مسلط تھا کہ کسی کو مجال دم زدنی نہ تھی، جواہر لال جو جذبات کا پیکر اور سرگرمیوں کا پہاڑ تھے وہ بھی ان کے سیاسی فکر سے مغلوب تھے، مولانا آزاد کا تدبر ششدر رہتا اور پٹیل کا فولادی مزاج گاندھی جی کی سیاسی بھٹی میں پگھلنے لگتا؛ مگر یہ آخر کب تک چلتا، کچھ نوجوان کانگریس میں گھس گئے اور اپنی منشاء کے مطابق اسے

انقلاب کی نئی راہ پر ڈالنا چاہا، مگر گاندھی جی کی مضبوط گرفت کے سامنے ان کی کچھ نہ چلی۔

بلا شبہ چندر بوس نے کانگریس کی صدارت کے لیے گاندھی جی کے براہ راست منتخب نمائندے کو انتخابی مہم میں شکست دے دی، لیکن جب گاندھی کے حوارین نے کنی دبائی تو بنگال کے اس سیماب طبع لیڈر کو ہندوستان ہی چھوڑ دینا پڑا اور اس نے برما، رنگون اور جاپان کے میدان میں اپنے نوجوان ولولوں اور جنگجو یانہ مزاج کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے نوجوان یہ اولوالعزمی تو نہ دکھا سکے، لیکن انہوں نے گاندھی جی سے بغاوت کرتے ہوئے کانگریس ہی میں نوجوانوں کا محاذ قائم کرلیا۔ اس میں جے پرکاش نرائن، اچاریہ نریندر دیو، اجیت پٹھور، رام منوہر لوہیا، ارونا آصف علی اور سینکڑوں ہزاروں بے قرار اشخاص جمع ہو گئے۔ اور سوشلسٹ پارٹی کے نام سے انہوں نے ایک گھروندا تیار کرلیا، ان میں سب سے زیادہ صاف دماغ منوہر لوہیا تھے اور کسی کو خواہ کتنا ہی برا معلوم ہو میرے نقطۂ نظر سے مذہبی تعصب کا آتش فشاں جے پرکاش نرائن تھے۔ جنہوں نے مسائل کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے اور حل کرنے کی راہ اختیار کی، بہار میں عبدالغفور کی وزارت صرف اس وجہ سے برداشت نہ کر سکے کہ یہ بے چارہ عبدالغفور نام کا مسلمان تھا، ان کی وزارت کو ختم کرنا جے پرکاش نرائن نے اپنا سب سے بڑا موقف بنالیا۔ خالص ہندوانہ راج کو ملک میں قائم کرنے کے لیے وہ اتنے آگے بڑھے کہ فوج میں بھی بغاوت پیدا کرنے سے گریز نہیں کیا، اقلیتوں کے مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ان کا موقع لگتا تو کم از کم مسلم اقلیت کے بغلی گھونسہ لگانے سے گریز نہ کرتے۔

البتہ رام منوہر لوہیا کھلے دل اور صاف دماغ کے آدمی تھے اور آج بھی ان کی تربیت گاہ سے تیار ہونے والے قائد اسی رنگ ومشرب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ لوہیا کی سیاست دیر تک جے پرکاش نرائن سے ہم آہنگ نہ رہ سکی، لوہیا بہت جلد ان سے کٹ کر ایک دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے؛ بہر حال اخبارات میں ان نوجوانوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ آتا، پھر آزاد ہندوستان میں بوڑھی کانگریس سے ان کی لڑائیوں اور

جھڑپوں کا بھی چرچا رہتا، الیکشن کی ہماہمی شروع ہوئی اور اچانک ایک دن دیوبند میں اعلان ہوا کہ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا انتخابی جلسہ کو خطاب کرنے کے لیے آرہے ہیں، مقامی پوسٹ آفس کے میدان میں جلسے کا اعلان تھا، میں ابھی دارالعلوم کا طالب علم تھا، لیکن اندھوں میں کانا راجا کے مطابق طلبہ دارالعلوم میں ممتاز سمجھا جاتا، دو چار سیاسی کتابوں کا مطالعہ کرکے گاندھی جی بن بیٹھا تھا اور اخبارات کے مطالعے کے نتیجے میں وزارتِ خارجہ کا خود کو مستحق سمجھتا، ہم جلسے میں جا پہنچے، عجب اتفاق کہ اسی روز تمام اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی مسلمانوں سے عام اپیل ہوئی تھی کہ وہ صرف کانگریس کو ووٹ دیں، صبح کے نو اور دس کے درمیان اچانک لوہیا جی کی کار آکر رکی، کھدر کی سفید دھوتی، سفید کرتا، آنکھوں پر چشمہ، گاندھی کیمپ، جو تھری نائٹ تھری کی تصویر پیش کرتی، کسانوں کا ہجوم تھا اور دیہاتیوں کا جم غفیر، وہ مجمع میں با تمکنت گزرتے ہوئے اسٹیج پر جا پہنچے، لاؤڈ سپیکر کو سنبھال لیا، ہاتھ میں کئی انگریزی اخبارات تھے، تقریر شروع ہوئی تو دیوبند اور دارالعلوم کا وقیع ذکر کرنے کے بعد اچانک ان کے ذہن نے کروٹ لی جسم میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی اور پوری قوت سے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ:

"مولانا حسین احمد صاحب جن کا ہم احترام کرتے ہیں، آزادی کے ایک نڈر سپاہی ہیں؛ مگر ان کو یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ اپنی قوم کو اس کا مشورہ دیں کہ سب کانگریس کی گود میں اپنا ووٹ ڈال دیں، موجودہ ہندوستان میں یہ بات نہیں چلے گی، یہ اپنی قوم کو اندھا بنانا ہے اور اس کی آزادیٔ رائے پر ڈاکہ ڈالنا ہے"۔

بھلا دیوبند کا ماحول، مولانا حسین احمد مدنی جیسے مرشد روحانی کی عقیدت کا گھر، وہیں ان کی رائے پر یہ بے لاگ تبصرہ، پھر وہ بھی طلبۂ دارالعلوم کے سامنے، طلبہ بگڑ گئے، اکھڑ گئے، روٹھ گئے، ایک گجراتی طالب علم جو اردو بھی صحیح بول نہیں سکتا تھا، لوہیا جی سے الجھ گیا، لوہیا جی گرگ باراں دیدہ اس طالب علم کے مرعوب چہرے، لرزتی ہوئی آواز سے سمجھ گئے کہ کتنے پانی میں ہے۔ چلائے کہ مولوی صاحب! اسٹیج پر آکر تقریر کیجئے،

میں آپ کی بات سنوں گا، پھر جواب دوں گا، اس بیچارے کے لیے اسٹیج پر جانا خود کو مقتل میں پہنچانا تھا، غریب ٹھٹک کر رہ گیا، ایک اور طالب علم بول پڑے، یہ پہلے سے بھی گئے گزرے تھے، اب لوہیا جی کو یقین ہو گیا کہ اس ڈار میں کوئی آہوئے تیز رو نہیں۔ جب طلبۂ دارالعلوم کی یہ رسوائی ہونے لگی تو یہ ناداں بھی میدان میں کود گیا۔ وہیں سے جواب الجواب شروع ہو گیا۔ لوہیا جی کا وہی نعرہ تھا کہ اسٹیج پر آکر تقریر کیجیے، اب کیا عرض کروں اپنی اس جرأتِ بے جا پر، میں سیدھا اسٹیج پر پہنچا، لوہیا جی کرسی پر بیٹھ گئے اور لاؤڈ اسپیکر میری طرف بڑھا دیا اور پندرہ منٹ کے لیے دھواں دھار تقریر ہو گئی، تقریر رکنے میں نہیں آتی تھی اور مجمع بھی میرے ساتھ لگ رہا تھا، لوہیا نے پلٹ ماری بولے کہ آپ نے تقریر ہی شروع کر دی، پھر اس لیڈر نے میری باتوں کا جواب دیا؛ لیکن ان کی فراخ حوصلگی کی ادا تو دیکھیے کہ بعد میں میرا ہاتھ تھام لیا، کاندھے پر دستِ شفقت رکھا، بولے کہ ”بیٹا! میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی، جاؤ بھگوان تمہیں بڑا آدمی بنائے۔“

اسی دن شام میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی چائے کی مجلس میں مولوی شوکت خاں صاحب بھٹہ نے یہ ساری تفصیل سنائی تو مرحوم نے ارشاد فرمایا جو میرے لیے ہمیشہ باعث صد نازش رہے گا کہ:

”شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے۔“

اب عمر کے پچپنویں سال میں جب اس واقعے کو قلم بند کرانے کے لیے بیٹھا تو اپنی نادان جرأت پر خود ہی حیرت زدہ ہوتا ہوں، بھلا کہاں میں نادان اور کہاں یہ بلند قامت لیڈر، واقعہ یہ ہے کہ میرا بچپن ان سے ٹکرا گیا، ورنہ شعور کے دور میں یہ الجھاؤ کسی طرح ممکن نہ تھا، لوہیا جی واقعتاً بڑے آدمی تھے اور بین الاقوامی مسائل پر ان کی مبصرانہ نظر تھی، لیکن نہرو خاندان پر جا بجا بلکہ غیر ملائم تنقید نے ان کو اس مرتبے تک پہنچنے دیا جس سے وہ حقیقی مستحق تھے، شاید یہ تنقید کا دروازہ انہوں نے جل بھن کر کھولا تھا، اگر ایسا ہے تو پھر معذور تھے۔

***

اوران کو دیکھا

شیخ حسام الدین احرار کے صدر

خشخشی ڈاڑھی، چشمہ، سر پر گاندھی کیپ، کھدر کا علی گڑھ طرز کا پائجامہ، ماسٹر تاج الدین تان بان، ہلکی سی ڈاڑھی، غالباً خضاب بھی کرتے، گاندھی کیپ سر پر، علی گڑھی پائجامہ جسم کو لچکاتے اور تقریر کرتے۔

مظہر علی اظہر

بالوں کی سر پر ٹوپی، شیروانی جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے، ہاتھ میں اخبارات کا پلندا، خطابت میں وکیلانہ انداز، مدلل تقریر کرنے کے عادی۔

دہلی کی احرار کانفرنس میں تقریر کر رہے تھے، مسلم لیگ اور اس کے تخیلِ پاکستان کے خلاف آگ برسا رہے تھے، جو کچھ کہتے بطور حوالہ اخبار، کتابوں کے صفحات الٹ پلٹ کر سناتے، سامعین کا باشعور طبقہ مظہر علی اظہر کی تقریروں سے متاثر ہوتا، جب کہ تقریر و خطابت کا شائق حلقہ سیّد عطاء اللہ شاہ کی تقریروں پر سر دھنتا۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی

شاہ صاحب کے کامیاب نقال، وہی لنگی، نکلتا ہوا قد، بھرپور جسم، گھنی ڈاڑھی، زلفیں، سر پر گول ٹوپی، خطابت میں شاہ صاحب کی بڑی کامیاب نقل کی تھی، زندہ رہتے تو شاید شاہ صاحب کی پچاس فیصدی جگہ پوری کر دیتے۔

آغا شورش کاشمیری

مولانا ابوالکلام آزاد کے زیادہ معتقد تھے، انہیں کی خطابت کی نقل اتارتے، پاکستان بن جانے کے بعد احرار نے پہلے ''آزاد'' نام سے اخبار نکالا، اس میں لکھتے، پھر اپنا ہفتہ وار ''چٹان'' شروع کیا، یہ بڑا مقبول اور کامیاب اخبار تھا، نثر تو شورش کی جیسی کیسی تھی اس پر ادیب اور صحافی ہی جچا تلا تبصرہ کرسکیں گے؛ لیکن شاعری میں وہ واقعتاً ظفر علی خان کے جانشین کہے جاسکتے ہیں، پاکستان بن جانے کے بعد ایک بار دیوبند بھی آئے، پھر بعد مغرب دار الحدیث تحتانی میں استقبالیہ جلسہ ہوا۔ احقر نے استقبالیہ تقریر کی، جس کی ابتداء اس شعر سے تھی۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ مشتاق گفتگو کرتے

ایک لطیفہ بھی سن لیجیے، شورش نے ایک بار ''چٹان'' میں بگڑ کر مولانا عبدالماجد دریابادی کو سخت سست لکھا؛ بلکہ کھلی تحذیر۔ یہ بوڑھا صحافی جس کا نام عبدالماجد تھا کہاں چوکنے والا تھا، صدق جدید میں صرف اتنا جواب دیا۔ آپ کو اس تند و تیز نگارش کے جواب میں ایک مظلوم بھائی کا وہی جواب ہے جو لاکھوں سال پہلے ایک جفا پیشہ بھائی کو اسی لب ولہجے میں دیا گیا تھا: لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ الخ۔

اشارہ آدم کے دو بیٹوں ہابیل وقابیل کے ناسوتی زندگی میں آخری مکالمے کی جانب تھا، اس چند سطری تحریر پر شورش لاجواب ہوکر رہ گئے، پھر کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مختصر یہ ہے کہ چودھری افضل حق کے سوا احرار کے سب ہی لیڈروں کو دیکھنے کا موقع ملا، بلکہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان کے شب و روز کے مشاغل کو قریب سے دیکھنے کا خوب خوب موقع ہاتھ آیا۔

***

حضرت مولانا شاہ معین الدین صاحبؒ

دوہرا بدن، قوی الجثہ، لحیم وشحیم، مگر پورے سراپا پر زیبائی، سر پر دو پلی ٹوپی، لکھنوی کرتا، علی گڑھی پائجامہ؛ لیکن ٹخنوں سے اوپر، مرعوب کن شخصیت، گھنی داڑھی، غالباً ردولی کے مشہور خانوادۂ معرفت وسلوک کے فردِ فرید تھے۔

دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے رکن رکین، معروف علمی مجلّہ "معارف" کے مدیر شہیر، اعظم گڑھ کے پہلے سفر میں جو وصی الامۃ مولانا وصی اللہ صاحب اعظمی المغفور سے نیاز کے لیے ہوا تھا اور وہیں سے اعظم گڑھ واطراف وجوانب میں مٹر گشتی بھی ہوئی، شاہ صاحب سے دارالمصنّفین میں پہلی اور آخری ملاقات ہوئی، پُرتپاک انداز میں ملے اور بہت جلد گھل مل گئے، مولانا عبدالسلام ندوی جن کی تالیفات کا دل ودماغ پر گہرا اثر تھا مگران پر جذب غالب، بلکہ ع

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

کا مرقع، شاہ صاحب مجھ سے دریافت فرمارہے تھے پروگرام کیا ہے؟ عرض کیا گیا کہ پورہ معروف، اچانک مولانا عبدالسلام ندوی برآمد ہوئے، خاکسار نے تو معاً پہچان لیا، کھڑے کھڑے ان کا سوال تھا کہ یہ پورہ معروف کہاں ہے؟ اس پر شاہ صاحب نے تنبیہ آمیز لہجے میں فرمایا کہ اب آپ کے لیے نقشہ ضلع اعظم گڑھ منگایا جائے، مولانا عبدالسلام سنتے ہی ایک دو ہو گئے، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت شاہ صاحب کا یہ انداز مجھے گراں گزرا، یہیں مولانا مسعود علی ندوی سے بھی ملاقات ہوئی، بڑے ڈیل ڈول کے آدمی، گورا چٹا رنگ، گھنی ڈاڑھی، گریبان کھلا ہوا، یہ دارالمصنّفین کے روحِ رواں تھے، سلسلہ مطبوعات پر باہتمام مولوی مسعودی علی ندوی لکھا ہوتا۔

شام کی چائے میں شاہ صاحب سے جاہلانہ جھڑپ بھی ہوگئی، جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا، ہوا یہ کہ شاہ صاحب فرما رہے تھے کہ ”دیوبند حضرت علامہ کشمیریؒ پر جس قدر چاہے فخر کرے؛ بلاشبہ وہ بحر العلوم بلکہ فخر روزگار شخصیت تھی، مگر اس کے سوا دیوبند نے کسی کو نہیں پیدا کیا۔“ حالاں کہ راقم الحروف کے والد ماجد کے اس اعترافِ کمال کو مجھے خاموش کردینا چاہیے تھا، مگر دوسرے جز پر رگِ دیوبندیت پھڑک اٹھی اور اپنی بساط کے مطابق قیل وقال سے کام لیا، اس ملاقات کے بعد مراسلت کا سلسلہ طویلہ رہا اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کا سانحۂ وفات دار المصنفین کے لیے زلزلہ تھا، سادہ نگار تھے، مگر اسلوب جاندار، انشاء وقیع، نگارش پُروقار، اب تو زمانہ گزرا کہ یہ علمی شخصیت ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگئی۔ تغمدہ اللہ بغفرانہ.

۱۱؍جوان ۱۹۵۵ء

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، اس زحمت کا شکر گزار ہوں، صاحب مقالہ فقہ کی مشہور اور متداول کتابیں تو دیکھ ہی چکے ہوں گے، ہدایہ کا تو انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے، کتاب الاموال ابوعبیدہ سے بہت کم مدد ملے گی، صرف مالی امور کے متعلق مواد مل سکے گا، یہ کتاب میرے یہاں بھی موجود ہے اور آپ کی اطلاع پر بحث اہم ہے، جن صاحب نے فتاویٰ کے متعلق دریافت کیا تھا ان کو میں نے معلومات مطلوبہ لکھ دیے ہیں، جن فتاویٰ کے متعلق وہ لکھیں گے وہ منگالی جائے گی۔

والسلام معین الدین

۱۴؍اگست ۱۹۵۵ء

مکرمی السلام علیکم

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے ایک خاص غرض سے یہ خط لکھنے کی ضرورت پیش آئی کہ ایک صاحب لندن میں اسلامی قانون پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں۔

ان کو اس سلسلے میں اکابر علماء ہند کے فتاویٰ کی ضرورت ہے، اس لیے مہربانی کر کے مطلع فرمائیں کہ دیوبند میں کن کن علماء کے مطبوعہ فتاویٰ مل سکتے ہیں۔ اگر علماء متقدمین کے فتاویٰ بھی مل سکیں تو اور بھی بہتر ہوگا۔ اگر آپ کے علم میں کسی دوسری جگہ سے مل سکیں تو اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ ممنون ہوں گا۔

معین الدین

۲۵/اکتوبر ۱۹۵۵

مکرمی! السلام علیکم

آپ کا خط ملا، تعزیت کے لیے شکر گزار ہوں، حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام جن خوبیوں کے بزرگ تھے اس کا اندازہ وہ لوگ کر ہی نہیں سکتے جن کو انہیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ایسے بے نفس، پاک طینت، شہرت طلبی سے بے نیاز اس زمانے میں ناپید ہیں، ان کو اپنی شخصیت کا احساس ہی نہ تھا، اس حیثیت سے وہ سچے صوفی تھے، ساری عمر بڑی قناعت، سادگی اور شانِ استغنا کے ساتھ ایک گوشے میں گزار دی۔ لیکن آج کی دنیا تو پروپیگنڈے اور اشتہار کی ہے جس سے وہ بالکل ناواقف اور بے نیاز بھی تھے۔ رفقاء سے ان کی وہ قدر نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی موت سے دارالمصنفین کی قدیم بزمِ علمی کی آخری یادگار رخصت ہوگئی، ان کی مغفرت کے لیے دعاء فرمائیں۔

والسلام
معین الدین

۸/نومبر ۱۹۵۵ء

مکرمی! السلام علیکم

میں ڈیڑھ مہینے سے سفر میں تھا، پرسوں واپس آیا تو ڈاک میں آپ کے خطوط ملے، آپ کی اس مخلصانہ ہمدردی کا شکریہ، الحمدللہ دارالمصنفین سیلاب کے اثر سے بالکل محفوظ رہا، آپ کا صرف ایک خط اس سے پہلے ملا تھا، اس کا میں نے جواب دے دیا تھا، مگر

آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کسی خط کا جواب نہیں گیا۔ ممکن ہے آپ نے لکھا ہو اور وہ ڈاک سے ضائع ہو گیا ہو۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں جواب نہ دیتا آپ کے اخلاص و محبت کا نقش ان شاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور اپنی جانب سے کسی فریضے میں کوتاہی نہ ہوگی۔ اپنے بھائی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیجیے گا۔

والسلام
معین الدین

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط اور یادِ رفتگاں موصول ہوئی، جی ہاں آپ کے بھائی صاحب سے بہت سرسری ملاقات ہوئی تھی، اتفاق سے اس وقت مجھ کو بعض ایسے ضروری کام پیش آ گئے تھے کہ تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی جس کا افسوس ہے، ان شاء اللہ پھر کبھی اس کا موقع آئے گا ان کی خدمت میں سلام عرض کر دیجیے گا۔

والسلام
معین الدین

۲۵؍ستمبر ۱۹۵۶ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا، تحفہ سامی موصول ہوا، کس زبان سے اس لطف خاص کا شکریہ ادا کیا جائے، ان مقدس تذکروں کے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، ان شاء اللہ رمضان کے مبارک دنوں میں ان کی تلاوت ہوگی، اس وقت روزے کی وجہ سے مختصر تحریر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر آپ تمبا کو استعمال کرتے ہیں تو آپ کو اس کا اندازہ ہوگا۔

والسلام
احقر معین الدین

۱۱/ اکتوبر ۱۹۵۶ء

مکرمی! السلام علیکم

آپ کا خط ملا، آپ کے جذباتِ اخلاص و محبت کا شکر گزار ہوں، مگر آپ کی جانب سے التفات اور میری جانب سے بے اعتنائی کی شکایت صحیح نہیں ہے، مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے آپ کے کسی خط کا جواب نہ دیا ہو، یہ تو میں معمولی آدمی کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا؛ چہ جائے کہ آپ کے ساتھ، میری جانب سے ان شاء اللہ کبھی کوتاہی نہ پائیں گے اور میرے لائق جو خدمت بھی ہوگی اس میں تقصیر نہ ہوگی۔ یادِ رفتگاں کا یہاں بھی ایک ہی نسخہ ہے، مگر آپ کی خواہش کی تعمیل ضروری ہے اس لیے آج بذریعہ رجسٹری روانہ کردیا گیا ہے۔ رسید سے مطلع کیجیے گا۔

والسلام

معین الدین

مولانا عبیداللہ صاحب کے سفرنامے میں ان کے افکار و نظریات تو نہیں ہیں ممکن ہے بعض واقعات صحیح ہوں جن کا فیصلہ میں نہیں کرسکتا۔

۲۵/ مارچ ۱۹۵۸ء

عزیز محترم! السلام علیکم

آپ کا خط ملا، جن جذبات کا آپ نے اظہار کیا ہے وہ محض آپ کا حسنِ تاثر ہے، ورنہ چند گھنٹوں میں مدارات کیا ہوسکتی تھی، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ آپ کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی، میں نے خود اس مختصر ملاقات میں آپ سے خاص انس محسوس کیا اور اس کا نقش ان شاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا، آپ بلا تکلف جب چاہیں یاد کرسکتے ہیں، اپنے برادر گرامی کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے گا۔

والسلام

معین الدین

مولانا محمد طاہر قاسمیؒ

حافظ محمد احمد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کے حقیقی بھائی، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، حضرت علامہ کشمیریؒ کے تلمیذ تھے، دارالعلوم میں معین مدرس، نیابت اہتمام، نظامتِ کتب خانہ اور آخر میں دارالصنائع کے منتظم اعلیٰ رہے۔ ذکی و ذہین، انشاء پرداز، منجم، سیاسی جوڑ توڑ میں ماہر، استعداد کے مضبوط، شوخ و چنچل طبیعت کے مالک تھے، جود و سخا، مہمان نوازی و سیر چشمی میں فائق، قلب اس قدر صاف کہ ابھی آگ اور ابھی پانی، کینہ و حسد، بغض و عناد سے قلب صاف تھا، ان کی وفات کے بعد راقم الحروف نے خواب میں دیکھا کہ کہتے ہیں ''میری نجات ہوگئی اور قلب کی صفائی، اور سینۂ بے کینہ میرے کام آیا۔'' تدریس پر بیٹھے تو قدوری کے درس میں ہدایہ اوّلین کے مصنف پر اعتراضات کی بھر مار کر ڈالی۔ اہتمام میں پہنچے تو اپنے استاذ مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی درخواست رخصت نامنظور کر کے طلبہ میں ناراضگی کا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ لیگ سے قریب اور کانگریس کے جانی دشمن تھے، جوڑ توڑ میں پوری پوری مہارت رکھتے؛ لیکن تلون مزاجی نے ترقی کے قدم روک دیے۔ قرآن سے بڑا شغف تھا، خاص انداز پر تفسیر لکھ رہے تھے، عقائد میں ''عقائد قاسمی'' ان کا مطبوعہ رسالہ موجود ہے اور کئی تصانیف ان کے قلم سے نکلیں، پچاس سال کی عمر بھی نہ ہونے پائی تھی کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، موت کے وقت اس قدر ہوشیار رہے کہ موجود اقرباء کو سانس کہاں کہاں ہے یا جان کس حصے کی نکل چکی ہے اور کہاں باقی ہے کی مفصل اطلاع دیتے رہے۔ ریڈیو پاکستان کے مشہور قاری محمد طاہر صاحب، مولوی آصف صاحب، شاکر میاں، فاخر میاں ہیں بلکہ کئی بچے پسماندگان میں ہیں۔ مشہور تلامذہ میں انور صابری مرحوم اور مولانا سلطان الحق ناظم کتب خانہ تھے۔ اللھم برّد مضجعہ و اکرم مثواہ۔

مولانا سعید صاحب مسعودیؒ

کشمیر کا مشہور خاندان، جس کے مورثِ اعلیٰ شاہ مسعوی بغدادی دفین نرورہ محلہ سری نگر ہیں۔ اس سلسلے میں سینکڑوں نامی گرامی نام وَر رجال کار پیدا ہوئے۔ علم ومعرفت، دانش وحکمت میں ممتاز، اپنے دائرۂ عمل میں منفرد، حضرت العلامہ مولانا انور شاہ کشمیری بھی اسی خاندان کے درّ یکتا ہیں، شاہ مسعود علیہ الرحمہ کا سلسلۂ نسب ہنوز ہندو پاک، بلکہ بیرون ممالک روشن وتابندہ ہے۔ مولانا سعید مسعودی بھی اسی خاندان کے نمایاں فرد تھے، جوانی میں نکلتا ہوا قد، دوہرا بدن، سرخ وسپید رنگ، سر پر بالوں کی اونچی باڑ کی ٹوپی اور شیروانی، بڑھاپے میں گیسو دراز، استخوان جو گوشت کی تہہ سے بے نیاز، سر پر فقیری کلاہ۔ مولانا مسعودی کی تعلیم کے بارے میں معلوم نہیں؛ البتہ ان سے سنا ہے کہ امرتسر اور لاہور میں عربی، انگریزی، اور السنہ شرقیہ کے کچھ امتحانات دیے تھے، اسی دور میں کسی کشمیری تاجر کے یہاں لاہور میں ان کی ملاقات حضرت علامہ کشمیریؒ سے ہوئی اور موصوف نے انہیں باقاعدہ عربی پڑھنے کا مشورہ دیا، لاہور میں اکثر ادبی، سیاسی، صحافی، خانقاہ نشین اشخاص سے ان کی ملاقات رہی۔ ڈاکٹر اقبال سے بھی دید وشنید اور ان کی خدمت میں حاضری کا تذکرہ کرتے۔

لاہور سے اٹھے تو سری نگر پہنچ کر نیشنل کانفرنس کے مختلف عہدوں پر رہنے کے بعد جنرل سکریٹری ہوگئے اور کسی اخبار یا مجلّہ کے مدیر بھی۔ مطالعہ کے شائق اور وسیع معلومات ہر طرح کی رکھتے، ایک زمانے میں کشمیر کی جانب سے رکنِ پارلیمنٹ بھی منتخب ہوکر دہلی میں طویل قیام رہا۔ بلاشبہ وہ مفکر، مدبر، سیاسی ذہن اور سیاست میں بڑی نادر بصیرت کے حامل تھے، اگر کسی تحریک کی روح، قلب ودماغ کی تعیین ہو تو مسعودی

صاحب، نیشنل کانفرنس کے یہی سب کچھ تھے۔ شیخ عبداللہ تو اسٹیج کے اور عوامی لیڈر تھے، ان کی گرفت عوام پر بھر پور تھی؛ لیکن صحیح معنی میں قیادت کے جوہر سے صرف ''مولانا'' بہرہ ور تھے، لیکن کشمیر کی عام زبان سے واقفیت نہ ہونے کی بناء پر انہیں وہ مقام ومنصب نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

متانت، سلاست، نفاست، عبادت، ہر چیز ان کے حصے میں وافر آئی تھی۔ گفتگو بڑی جاندار اور مؤثر ہوتی، دہلی میں ایک بار میں نے پاکستان کے روز مرّہ انقلابات پر تبصرہ کیا تو مولانا نے جامع اور سیر حاصل بحث ودلائل سے بتایا کہ یہ تو عوامی شعور اور بیدار مغزی کی علامت ہے، شیخ عبداللہ کے ساتھ ان کی وفاداری اٹوٹ تھی، جس زمانے میں شیخ گرفتار تھے، مردولا سارا بھائی اور بہت سے لیڈر بیشتر ان کے یہاں جمع رہتے، دہلی سے تا سرینگر، بلکہ بیرون ہند بھی وہ شیخ کی رہائی براءت، اور صفائی کی پرزور کوشش کررہے تھے۔ یہ جدوجہد، مولانا کی تڑپ، ان کا اخلاص بارہا میں نے خود دیکھا، لیکن شیخ نے آتش چنار وغیرہ میں ان کی وفا کا صلہ تو درکنار، رائج مروّت بھی ان کے ساتھ نہیں برتی۔ مرحوم جودوسخا کے پیکر، صوم وصلوٰۃ کے پابند، دادودہش میں طاق اور بہت سی خوبیوں کے حامل، ان کے شب وروز، مشاغل اور مصروفیات کو دیکھ کر بارہا خیال ہوا کہ قائدین کے زمرے میں جہاں ظلم عام، ظالمانہ انداز بکثرت، مکروفریب بطور شغل، اکھاڑ بچھاڑ عادتِ ثانیہ، لوٹ مار فطرت بن جاتی ہے۔ یہ مردِ مومن، یہ حق آگاہ، یہ ذاکر وشاغل، یہ شریفانہ روایات کا حامل، سیاست کی پُرفریب وادی میں کیسے درآمد ہوئے اور غالباً یہی وجہ ان کی ناکامی کی تھی کہ وہ سیاست میں کوئی عالی مقام حاصل نہیں کرسکے، شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد مرکز کی اہم شخصیتوں نے مولانا کو کشمیر کی وزارتِ عظمیٰ پیش کی؛ لیکن اس کو قبول کرنا ان کے خیال میں ''شیخ'' سے بے وفائی نہیں بلکہ غدر تھا۔ عمر کے آخری دور میں جب وہ مجموعہ استخواں تھے، بال مبارک کے سرقے کے ہولناک حادثے پر کنج عزلت سے نکلے اور پھر ایسے داخل ہوئے کہ ان کا جنازہ زیب دوش بن کر

نکلا، کس قدر سفاک تھا وہ ہاتھ جو اس ۹۰ رسالہ مومن، سچے مسلمان کے سینے پر اٹھا، خود شقاوتوں کا پیکر اور دین و دنیا کی تمام سعادتیں مرحوم کے دامن میں ہمیشہ کے لیے ڈال دیں، کتنے خوش نصیب تھے مولانا کہ عاش مجیداً مات حمیداً کی قابلِ رشک سعادت ان کا نصیب تھی۔

***

۲۸/اگست ۱۹۵۶ء

برادر محترم! السلام علیکم

نوازش نامہ ملا۔ اور موجب مسرّت ہوا، مجھے افسوس ہے کہ سال بھر میں آپ کو ایک چٹھی بھی نہ لکھ سکا۔ پچھلے دنوں میں دہلی گیا تھا اور ارادہ تھا کہ سرہند شریف جاتے ہوئے گذشتہ سال کی طرح دیوبند سے ہوکر جاؤں۔ مگر تنگیٔ وقت نے موقع نہ دیا، فروری کے پہلے ہفتے میں دوبارہ دہلی جانے کا امکان ہے، وہاں پہنچ کر آپ کو اطلاع دوں گا۔ اگر آپ ایک آدھ دن کے لیے تکلیف کر کے مل جائیں تو بہت بہتر رہے گا۔ باقی یہاں ورنو سے ترہگام تک تمام خیریت سے ہیں۔ حضرت والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں مؤدبانہ السلام علیکم عرض کردیں اور دعا کی درخواست کریں۔ فقط والسلام

محمد سعید مسعودی

***

مولانا عبداللہ شاہ صاحبؒ لولابی (کشمیر)

عم محترم، حضرت علامہ کشمیریؒ کے حقیقی بھائی تھے، یہ اس لیے کہ دادا مرحوم نے ہماری حقیقی دادی صاحبہ مرحومہ کی وفات کے بعد دوسری شادی کی، ان سے ایک فرزند بنام محمد شاہ صاحب پیدا ہوئے جو درگ مولہ، کشمیر میں ابھی حیات ہیں۔ والد مرحوم کے بڑے بھائی مولانا یٰسین شاہ صاحب شباب ہی میں ساری دنیا کو چھوڑ کر مسافر آخرت ہو گئے، ایک اور بھائی سلیمان شاہ صاحب مرحوم جو اسکول میں مدرّس تھے، والد مرحوم کے بعد متصلاً جوارِ رحمت الٰہی میں پہنچے، چچا عبداللہ شاہ صاحب نے درسیات کی تکمیل نہیں کی، لیکن کشمیر کے ماحول کے مطابق ابتدائی کتب پڑھیں اور پھر طبابت کو اپنا شغل بنالیا، فارسی میں طاق تھے؛ چناں چہ بے اختیار قلم سے لطیف جملے نکل جاتے، ایک مکتوبِ گرامی میں ضعفِ پیری، نقاہت، مستزاد علالت کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا کہ ''کوہے برکاہے نہادہ اند'' کوہ اور کاہ کا اجتماع زمین وآسمان کا اجتماع ہے، اس طرح ادبی وانشائی جملوں سے ان کے لطیف ذوق کا اظہار ہوتا، نبض دیکھنے کا عجیب انداز تھا، کہنی کے پاس دیکھتے یا ایڑی کے عقب میں۔

بڑے نیک خو، نیک نہاد، دنیاوی بکھیڑوں سے یکسو، گوشہ گیر قسم کے بزرگ تھے، تعویذ میں بڑی تاثیر تھی، مجلس میں طویل نشست کے باوجود ضروری گفتگو کے سوا باقی امور کو لایعنی سمجھتے۔ خاکسار کی یہ سعادت ہے کہ چار چچاؤں، یعنی مرحوم، دوسرے مولانا سیف اللہ شاہ صاحب، تیسرے نظام الدین شاہ صاحب اور چوتھے محترم محمد شاہ صاحب

مدظلہٗ کی دید وزیارت نصیب ہوئی۔ اپنی پھوپھی اور پھوپھی کی صاحبزادی سے بھی نیاز کی سعادت دامن میں رکھتا ہوں۔ اب تو یہ سب پیوندِ خاک ہو گئے، ان کا یہ گرامی نامہ کشمیر میں ہم تینوں بھائیوں (برادرِ اکبر جناب ازہر شاہ صاحب قیصرؒ) جواناں مرگ (اکبر شاہ مرحوم) اور راقم الحروف کی مملوکہ اراضی کے حصول سے متعلق ہے، زمین جو والد مرحوم کو وراثتاً ملی تھی، اس کے علاوہ معتقدین نے سوپور میں ایک مکان، سیب کا ایک وسیع باغ دیا تھا اور ہماری ملکیت تھا، دادا مرحوم کی وصیت تھی کہ سب بھائی زمین کی نگرانی اور ہر سال کی آمدنی مستحقین کو پہنچادیں، جب کبھی شاہ برادران کشمیر آئیں تو ان کا واجبی حصہ ان کو دے دیا جائے۔ مگر یہ وسیع اراضی، اخروٹ وسیب کے باغات، مکان، خرد برد ہو گئے۔ شکوہ اس لیے نہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے اس ضائع شدہ حصہ کا بدل ہی نہیں؛ بلکہ نعم البدل فراواں عطا کیا اور کم از کم حقیر نے تو اپنے واجب حصوں کو ہمیشہ کے لیے معاف بھی کر دیا، نہ اب اس کا ذکر وفکر، نہ کسی سے شکوہ وشکایت۔

چچا عبداللہ شاہ مرحوم نے چوراسی، پچاسی سال کی عمر میں آبائی وطن ہی میں آغوشِ لحد تلاش کرلیا اور اب اپنے والد بزرگوار کے مرقد کے قریب ہمیشہ کے لیے راحت کی نیند لیتے ہیں۔

برّد اللہ مضجعہ

***

از ورنو لولاب، کشمیر

۲۲ / رجب المرجب ۶۸ھ

عزیز القدر محمد انظر سلمہٗ اللہ وعافاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پس از دیرے صحیفہ عزیزہ رسید موجب سرور وانبساط گردید، المنۃ للہ کہ تا حال بہر دو جانبِ عافیت شامل حال ست۔ مبلغ موصوف زائد از عرصہ دہ سال محمد ازہر صاحب فرستادہ می آید، ایدون معلوم گردید کہ دگر عزیزان عافاھم اللہ و سلمھم ازیں امر بے

خبرو بے بہرہ اند، بلکہ مکانِ حضرت قبلہ مرحوم کہ درتارہ زوہ کشمیر موجودہ باابرام والحاج محمد ازہر صاحب درسال گذشتہ فروخت نمودہ، قیمت آں ہم بہمہ وقت ممدوح روانہ نمودہ شدہ ورسیدش موجود بہرحال ایشان رعایت حق مرعی دارند یہ بے روئی باکسے معاملہ نورزند عادل حقیقی بعدل کارپرداز ست۔ عزیزی عبدالعزیز بجائے پدر مرحوم ملازم سکول ست وگر عزیزان عبدالرشید وعبدالمجید در گوجرانوالہ پنجاب گاہے درلاہور اوقات بسر می برند حالت حاضرہ ناگفتہ بہ واللہ ولی الامور۔ عزیزان ایں ناحیہ از اکابر واصاغر بعافیت اند تحیۂ سنیہ ابلاغ می کند۔ در تعلّم وکسب معالی باسلاف نظر فرمودہ پیوستہ کوشند ایں وقت ہم از مغتنمات بشمارند۔

بخدمت حضرات محترمین دام ظلہم سلام مسنون برسد حضرت مولانا مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری اگر ملاقی شوند سلامے عرض دارند۔

والسلام

عبداللہ عفاعنہ

الوداع اے برادرِ بزرگوار
رخصت اے ادیبِ شہیر

مولانا سیّد ازہر شاہ قیصرؒ

بالآخر پینسٹھ سالہ زندگی، آٹھ ماہ کی مسلسل اور تکلیف دہ بیماری کے سامنے مغلوبیت کا آخری مظاہرہ بصورت ''موت'' کرگئی۔ اس منزل سے ہر ایک کو گذرنا ہے اور زندگی کے جلتے ہوئے چراغ آخرکار بجھ کر رہتے ہیں، زمانے نے بارہا دیکھا اور دیکھتا رہے گا کہ صبح کی آمد آمد نے زندگی کے کچھ پھول کھلائے اور شام کے سناٹوں میں یہ گلہائے شگفتہ مرجھا کر شاخ سے گر گئے۔ صبح ہوتی ہے تو آفتاب تابانیوں کے ساتھ پوری کائنات پر تسلط جمالیتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ اب نہ ختم ہونے والی جہاں بانی ہے؛ لیکن شام ہوتے ہوتے یہ مینارۂ نور تاریکیوں کے پردے میں اس طرح گم ہوتا ہے کہ اس کے غلبے واستیلاء کے آثار بھی نہیں ملتے، تاج وتخت کے مالک، سلطنت وحکومت کے فرماں روا جو اپنی عظمتوں کے پھریرے اڑاتے، آج آغوشِ گور میں سوتے ہیں اور جن کے نازک بدن ریشم وحریر کے مہین لباس کو بھی بارِ جسم سمجھتے اب منوں مٹی کے نیچے آسودۂ خواب ہیں۔ علم کی رفعتیں پیوندِ خاک ہوگئیں، کمالات کی بلندیاں عالم کے ہنگاموں سے جدا سناٹوں میں گم ہیں۔ پھر جب یہی ہورہا ہے اور ہوتا رہے گا تو برادرِ بزرگوار کا حادثہ نہ بہ زاری روکا جاسکتا تھا اور نہ بہ زوری اس کے قدموں پر پابندی ممکن تھی۔ مگر موت تک ایک قلبِ حزیں پر یہ صدمہ ہمالیہ کی طرح کھڑا رہے گا کہ یہ چھوٹا بھائی ان کے سانحہ کے وقت سینکڑوں میل دور تھا۔ کاش کہ موت تھوڑا سا انتظار اور کرلیتی، داعئ اجل کچھ ہی

مہلت دیتا، لیکن احکم الحاکمین کا یہ اعلان ہمیشہ فضا میں گونجتا رہے گا کہ "اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ"۔

راقم السطور اس وقت پچپن سال کی عمر سے گذر رہا ہے، اس لیے ہوش وحواس کے عالم میں برادرِ بزرگوار کی پچاس سالہ زندگی میرے سامنے ہے، ان کی زندہ دلی روبرو ہے، مجلس آرائی یاد ہے، ان کے قہقہے کانوں میں گونج رہے ہیں، باتیں حافظے میں اس طرح موجود ہیں کہ نہ میں بھلا سکتا اور نہ وہ فراموش ہو سکتیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے سہارنپور کا پہلا سفر ان کے ساتھ کیا تھا، میں اسے کیسے بھلادوں کہ ان کی انگلی پکڑ کر میں سہارنپور کے کمپنی باغ سے اچھلتا کودتا گزرا تھا، یہ کیسے فراموش ہو کہ شب کے ابتدائی حصے میں ان کا کاروانِ عروسی سہارنپور کی جانب رواں دواں ہے، کیا یہ بھولنا ممکن ہے کہ اس دولہا کا یہ قافلہ عروسی راست سہارنپور کے ڈاک بنگلے میں گزر رہا ہے، اسے حافظے سے کس طرح کھرچ دوں کہ دن کے دس بجے رامپور منہیاران کی ایک کوٹھی میں انھیں دولہا بنایا جارہا ہے، نہیں، نہیں، یہ یادیں موت تک نہیں بھلائی جاسکیں گی۔ یہ ایک ایک منظر سامنے آکر خون کے آنسو رلاتا رہے گا۔ ۶۵ رسال پہلے ایک امام العصرؒ کے گھر میں انھوں نے زندگی کا پہلا سانس لیا اور ٹھیک ۶۵ رسال بعد اسی مولد میں آخری سانس لے کر رخصت ہو گئے۔ رخصت رخصت اے برادرِ بزرگوار، الوداع الوداع اے صحافی نام وَر۔

ذرا اس دنیا کو دیکھیے، اس جاں گداز حادثے پر مجھے دس روز تک مطلع نہیں ہونے دیا، ستم بالائے ستم دن میں دس بجے جب میں ایک جلسے سے مخاطب تھا، وہیں یہ خبر وحشت اثر میرے کانوں میں پڑی۔ تاریخ کا یہ عمل بھی حیرت انگیز ہے کہ پینتالیس سال پہلے ٹھیک دس بجے ان کو دولہا بنا دیکھا تھا اور اب میرے سامنے تصوراتی کائنات میں ایک کفن پوش نیم جان وناتواں جسم ہے۔ دردمند دل سمجھیں گے کہ بھائی کی موت، بڑے بھائی کے سانحہ اور حادثے کے وقت عدم موجودگی، دوسرے ملک میں اس کی اطلاع اور مسافرت کے عالم میں اس خبر کا کانوں میں پڑنا دل ودماغ کے لیے کیا

صاعقہ اور قلب وروح کے لیے کیا حادثہ ہوگا؟

انھیں سینکڑوں شعر یاد تھے اور بے تکلف مجلسوں میں وہ ہر موضوع پر سناتے؛ لیکن آج میں انھیں سناتا ہوں۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ابھی ان کی طفولیت تھی کہ والد مرحوم کے ساتھ کئی اسفار میں رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی، پنجاب سے تا کشمیر، دیوبند سے تا بمبئی وہ اپنے عظیم باپ کے رفیقِ سفر رہے، ڈابھیل کے جامعہ میں حصولِ علم کی منزلیں طے کیں۔ دیوبند میں جناب قاری عبدالحق صاحب اور قاری یامین صاحبؒ سے حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی، خلافت کی تحریک میں بچپن میں حصہ لیا۔ دیوبند کے کئی جلسوں میں تقریریں کیں، کمسنی میں قلم و قرطاس سنبھالا، انجمنیں بنائیں، قلمی رسالے نکالے اور بہت سی منزلوں سے گزرتے ہوئے ایک نام ور صحافی اور ایک مشہور ادیب بن گئے۔ ان کے قلم پر انشاء غالب تھی۔ اسلوب کی شوکت، تعبیر کی ندرت، الفاظ کی حاکمیت، مضمون کی آمد، ذکاوت کی گل کاریاں، ذہانت کی چمن آرائی، فصاحت کے چشمے اور بلاغت کے آبشار نثار ہونے کے لیے تیار رہتے۔ غیر منقسم ہندوستان کے مجلّات، اخبارات وجرائد میں ان کے مضامین ومقالات خوب چھپتے۔ صدیق اکبرؓ وصداقتِ اسلام نامی دو کتابیں اس وقت شائع ہو چکی تھیں، جب کہ عمر کی بیسویں منزل میں بھی قدم نہ رکھا تھا۔ سہارنپور کا اخبار ''صداقت'' یہیں کا اخبار ''غریب'' ان کی قلم کاریوں کی ابتدائی منزل تھی، اخبار ''مدینہ''، ''الامان''، ''وحدت''، ''تیج ویکلی''، ''زمیندار''، ''انقلاب''، ''شہباز''، ''عصر جدید''، ان سب میں قلم کا شباب وبانکپن نکھر کر سامنے آیا۔ پھر بہت سی کتابیں بھی قلم سے نکلیں، عقائد میں ایسا استحکام کہ اس پر رشک آئے، زندہ دلی زندگی کا دوسرا عنوان، احباب کی مجلس صبح و شام کا شغل، قہقہوں کی بھرمار، دلچسپ لطیفوں کا انبار، مشاہیر کی سوانح وواقعات نوکِ

زبان پر رہتے۔ گھر میں کیسا ہی حادثہ پیش آئے، زندگی کے نشیب و فراز کتنے ہی کٹھن ہوں، مگر جب وہ رسالہ ''دارالعلوم'' کے دفتر میں جا پہنچتے تو دامن اس طرح جھٹک لیتے کہ رنج وغم کا غبار بھی باقی نہ رہتا۔ اصابتِ رائے میں منفرد، جچے تلے فیصلے کرنے کے خوگر، اور پھر جس راہ پر چلتے تو بصیرت ہم رکاب رہتی۔

آج ان کا بڑے سے بڑا مخالف اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ تقریباً چالیس سال انھوں نے دارالعلوم کے اس ترجمان کو جو مجلّہ ''دارالعلوم'' کے نام سے منظر عام پر آیا تھا پوری آب و تاب اور آن بان کے ساتھ چلایا؛ حالاں کہ اسی مجلّے کی ادارت پر بہت سے مشہور صحافی، بہت سے معروف قلم کار کام یاب نہ ہوسکے تھے، انھیں والد مرحوم حضرت علامہ سیّد انور شاہ الکشمیریؒ کی ذات سے عشق تھا اور باپ کی ایک ایک چیز کو محفوظ رکھتے اور نگارشات میں کسی بھی عنوان سے محبوب باپ کا ذکر کرجاتے، مجھے یقین ہے کہ یہی عشق ذریعۂ نجات اور وسیلۂ مغفرت ہوگا۔ انھیں خوش قسمتی سے بچپن میں بعض نادرۂ کار شخصیتوں کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان سے قرب اور گہرا تعلق رہا۔ علامہ عثمانیؒ نے ایک دوبار تراویح میں قرآن بھی سنا اور ان کی نگارش پر اصلاح بھی فرمائی، علامہ عثمانیؒ کی وہ تحریک جس کا تعلق اصلاحِ دارالعلوم سے تھا، مرحوم بھائی اس کے خاص رکن تھے، چھوٹوں کے ساتھ معاملہ شفقت و محبت کا تھا، فہیم ہونے کی بنا پر عاقلانہ فہمائش اور مدبرانہ مشورے دیتے۔ ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کا جوہر بے پناہ رکھتے۔ بہت سے نوجوان نثر نگاری میں ان سے مستفید ہیں۔ مراسلت کا سلسلہ بڑا لمبا چوڑا تھا، بہت سی نام ور شخصیتوں سے خط و کتابت رہتی، غیر منقسم ہندوستان کے اکثر ادیب و شعراء زمرۂ احباب میں تھے۔ تقریر اگرچہ ان کا پیشہ نہیں تھا، مگر اس میدان میں بھی عاجز نہ تھے، جب کھڑے ہوتے تو رواں دواں بولتے، محسوس ہوتا کہ الفاظ کا ذخیرہ سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے۔ سفر سے طبیعت بے پناہ کارہ تھی،

مظفرنگر اور سہارنپور کے اسفار بھی انگلینڈ وامریکہ کا سفر سمجھتے۔ کوئی سفر کے لیے کہتا تو پہلے اعذار پیش کرتے۔ ان کے پیش کردہ اعذار کو توڑا جاتا تو تنگ آکر سفر سے اپنا مزاجی عجز صاف صاف کہہ دیتے؛ لیکن اجلاس صد سالہ کے موقع پر بڑی لگن اور مستعدی کے ساتھ دور دراز کے اسفار کیے، باوجودیکہ وہ دارالعلوم کے رسمی فاضل نہ تھے؛ لیکن دارالعلوم سے عشق رکھتے اور اس کی موجودہ جدائی کو اتنا محسوس کیا کہ یہی غم والم جان لیوا بن گیا۔

بہر حال یہ ۶۵ رسالہ زندگی جو اپنی خصوصیات میں یگانہ اور امتیاز میں یکتا تھی، اب گوشۂ لحد میں ہمیشہ کے لیے جاسوئی، خدا تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے، ان کے دامن میں جو حسنات تھے انھیں کو ان کے لیے وسیلۂ نجات بنائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی ہو۔ سوگوار قلم، اشک بار آنکھیں اپنے مرحوم بھائی کے تودۂ خاک پر کھڑے ہو کر ہمیشہ یہ کہتی رہیں گی۔

"الوداع الوداع! اے برادرِ بزرگوار، رخصت رخصت! اے شہسوارِ صحافت"

تغمده الله بغفرانه ورحمه الله تعالیٰ علیه وعلی أبویه

***

آہ! رونقِ بزم جاتا رہا

مولانا مفتی احمد علی سعید صاحبؒ

سفر کے لیے احقر پا بہ رکاب تھا تو مولانا مفتی سیّد احمد علی سعید صاحب موت وحیات کی کشمکش میں تھے، سفر کے دوران بھی ان کی مسلسل خیریت معلوم کی، اگرچہ اطلاعات یہ تھیں کہ مرحوم رو بہ صحت ہیں، لیکن خدا جانے کیوں مجھے اطمینان نہ تھا، سفر سے واپسی ہوئی تو گھر میں داخل ہوتے ہی مفتی صاحب کے سانحۂ ارتحال کی جاں گداز خبر سنی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون

مرحوم ایک تاریخ تھے، ایک دستاویز، ایک شور و ہنگامہ، ایک ایسا انسان جو لمحہ بھر میں گرم اور دوسرے لحظہ میں نسیم سحر، ٹھیٹھ اردو میں کہیے کہ منٹ میں تولہ منٹ میں ماشہ۔ ان کے والد مرحوم مولانا سیّد مبارک علی صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند پرانے بزرگوں کی یادگار، سراپا خیر، قدرت نے ان میں دل آزاری کی صلاحیت ہی نہ رکھی تھی، کم آمیز، کم گو، کم سخن، میرے بڑے بھائی مرحوم جناب ازہر شاہ قیصر سے مفتی صاحب مرحوم کا دوستانہ تعلق تھا؛ لیکن پچاس سال سے زائد میرے شعور میں مرحوم کی پوری زندگی ہے، ان کی مصروفیات، مشاغل، دلچسپیوں پر اطلاعِ تام، دارالعلوم کے انقلاب کے بعد وہ بھی اس قافلے میں شریک تھے، جو حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے اردگرد جمع ہوا۔ وقف دارالعلوم کے یومِ تاسیس سے ہم سفر، وقف دارالعلوم کے دارالافتاء کے رکن رکین، مرحوم نے ساٹھ سال سے زائد افتاء نویسی کا کام انجام دیا، اپنے فن میں دسترس، فقہی معلومات میں پوری دستگاہ رکھتے، فتویٰ میں جو بھی رخ اختیار

کرتے، اسے مدلل ومبرہن کردیتے، اس فن میں ان کے سینکڑوں تلامذہ ہیں۔ مصنف بھی تھے اور سیاسی ذوق کے حامل بھی، خاص مزاج عفوو صفح تھا، بگڑتے تو طوفانِ بلاخیز، سنبھلتے تو مجسمہ شفقت، گرجتے تو موسلا دھار بارش، ابر کرم بن کر چھاتے تو رحمت کی پھوار، تعلقات کی دنیا وسیع تھی، ہر کسی سے مربوط، صحت قابلِ رشک، اسّی سال سے زائد کے ہونے کے باوجود قدوقامت میں دوہرے پن کا نام ونشان نہ تھا، ادھر ایک دوسال سے صحت انحطاط پذیر ہوئی، دیکھتے ہی دیکھتے ایک انجمن لٹ گئی، چراغِ محفل گل ہوا اور اب قیامت تک کے لیے آسودۂ خواب ہیں۔ ان کی موت ہر مومن کے لیے قابل رشک، رمضان المبارک کا آخری عشرہ ۲۷ رویں شب، شبِ جمعرات، وہ سعادتوں سے لبریز اٹھے؛ لیکن بہت سوں کو بے یارومددگار چھوڑ گئے، مغفرت تو ہر مومن کی یقینی ہے، لیکن یہ قابلِ رشک موت ہر مومن کی آرزو۔ جایئے مفتی صاحب! تہہ خاک راحت کی نیند لیجیے، ایک بے تاب زندگی کا کیسا حسین انجام، ایک خواب کی کتنی شیریں تعبیر۔

آج وقف دارالعلوم اس سانحہ پر سوگوار اور دارالافتاء کی مسند ایک ماہرِ فن سے خالی ہے، خدا تعالیٰ اس نقصان کی تلافی فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل۔

برّد اللہ مضجعہٗ

***

تعمیل ارشاد

حضرت مولانا ارشاد احمد صاحبؒ، مبلّغ دارالعلوم دیوبند

واردات عشق کے ہوں یا عام حالات کے، ذائقہ شناس ہی ان سب کیفیات کو جان سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، "صحرائے نجد" کی وحشت سامانیوں کی لذت قیس سے پوچھیے، کوہِ بے ستون کے چیرنے پھاڑنے کا لطف فرہاد ہی بتا سکتا ہے، فلسفے کی موشگافیوں اور اس میں حظ سے رازی ہی آشنا ہے، سلوک وعرفان میں نکتہ آفرینیاں مولائے روم کا حصہ ہے، ان سب چیزوں کو وہی سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں، رہے ہم اور آپ تو حال ہمارا یہ ہے کہ ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا

کیفیات سے واقفیت کی اہمیت شارع نے بھی خوب سمجھی؛ چناں چہ فقر وفاقہ میں کرب و بے چینی کا احساس روزے سے پیدا ہوگیا، عشق کے جنون سامانیوں کی فراہمی حج کے فریضے سے کی گئی، یہ بات اگر سمجھ میں آگئی تو ذرا سوچئے کہ کیا گذری ہوگی ایسے مضمون نگار پر جس نے خونِ جگر سے مضمون لکھا اور طالبِ مضمون نے سالہا سال کے بعد بے تکلف کہہ دیا کہ "مضمون آپ کا ضائع ہوگیا" ستم بالائے ستم؛ بلکہ جرأت و جسارت کی انتہاء کہ دوسرے مضمون کی فرمائش اسی موضوع پر۔

حوادث پیش آتے ہیں، واقعات گذرتے ہیں تو داستانیں یاد آجاتی ہیں، بھولی

بسری کہانیوں کو کسی تذکرے کے بغیر کوئی تازہ کرے تو کیسے کرے؟ پھر خطرہ یہ بھی تو ہے کہ اس تازہ قلم نگارش کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ کہیں وہی بات نہ پیش آجائے جو شاعر نے کہی ہے ؎

میرا سینہ تان کر منت سے کہنا ایک اور
ان کا خالی ہاتھ دکھلانا کہ پیکاں ہو گئے

مگر داد دیجیے عزیز گرامی قدر مولانا قاری ابوالحسن اعظمی کی، کہ تعاقب مضمون نگار کا ایسا کیا کہ رستگاری کی کوئی راہ کھلی نہ چھوڑی۔ خدا غریق رحمت کرے مولانا عثمان صاحب چیئرمین میونسپل بورڈ دیوبند کو کہ ایک بار سلطان جی کے دربار میں، سلطان جی کو آپ سمجھے؟ بزرگوں کے بزرگ، اور دوستوں کے محبّ، محفل کی جان، مجلس کا عطر، روایاتِ اکابر کے محافظ، اسلاف کی داستان کے محاسب، یعنی مولانا سلطان الحق صاحب قاسمیؒ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند ایک ناخواندہ مجرم کو رشوت ستانی کے جرم میں ڈانٹ رہے تھے، ڈپٹ رہے تھے، اس غریب مجرم نے تردید میں بات حلف تک پہنچا دی، چیئرمین بلا کے ذہین ٹھہرے، بولے کہ رشوت لینے کی بھی بہت سی صورتیں ہیں، کسی کو پیسے سے رام کیا جاتا ہے، کوئی مٹھائی سے منقاد ہوتا ہے تو کوئی تعریف ہی سے آمادۂ اطاعت ہو جاتا ہے، تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ چیئرمین مرحوم کی بات سوفی صد صحیح ہے، میری کمزوری یا رشوت بہترین کتاب ہے جو مطالعہ کے لیے میسر آجائے، ادھر قاری صاحب سلّمہٗ کتابوں کے شائق! خدا جانے مراحل مطالعہ بھی طے کرتے ہیں یا نہیں، کتابیں ان کے پاس نایاب ونادر، ہر موضوع سے متعلق، مگر غالباً میری اس کمزوری پر انھیں اطلاع نہیں تھی اور مضمون کے لیے بھاگ دوڑ، خود ہی ان کو سمجھایا کہ کام اگر آپ یہ لینا چاہتے ہیں تو کوئی اچھی کتاب مطالعے کے لیے فراہم کیجیے۔

عام تجزیہ یہی ہے کہ اب تو رشوت لینے والا دینے والے کو دینے کے انداز سمجھا جاتا ہے، دروغ برگردنِ راوی، یا ذخیرۂ صدق دردامن او، آزاد ہندوستان کے سرکاری دفاتر میں

گاندھی جی کی ایک تصویر آویزاں تھی جس میں وہ اپنے پنجے کی مدد سے حاضرین کو شانتی کی تلقین کرتے نظر آتے، کوئی ضرورت مند دفتر میں جا پہنچا، اس بے مغز نے بطور رشوت دو روپے نکال کر بابو جی کے سامنے رکھے، افسر صاحب چمک کر بولے کہ سامنے آویزاں مہاتما گاندھی جی کی تصویر دیکھو، وہ بھی پانچ سے کم نہ لینے کی تنبیہ کر رہے ہیں۔

مولانا ارشاد صاحب مرحوم کی وفات پر غالباً تین سال گذر گئے، اس وقت ان کے سانحے نے ساری داستانِ تعلق تازہ کر دی تھی، اولادِ آدم جن کے باپ نے سب سے پہلا گناہ نسیان ہی کا کیا تھا، نسلیں گذر گئیں؛ بلکہ پشتہا پشت، صدیاں بیت گئیں؛ بلکہ زمانے۔ اپنے باپ کی یہ صحیح اولاد یعنی انسان بھول چوک کے چکر سے آج تک نہ نکل سکا، اور اسے بھی خدائے تعالیٰ کا احسان قرار دیجیے کہ بھولنے والی فطرت سے نوازا، ورنہ تو کہنے والے نے خود کہا تھا "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" مشقتوں سے لبریز زندگی پیش آنے والے صدمات کو نہ بھولتی تو غم والم اس کی زندگی کی عمارت کو زمین کے برابر کر دیتے۔

پھر یہ بھی ہے کہ مولانا ارشاد صاحبؒ سے تعلق اور بے تعلقی دونوں رہے، ماضی کی داستانِ تعلق حال کی بے تعلقی میں کیسے سنائی جائے؛ حالاں کہ موت نے ایک دیوار برائے نام زندہ اور حقیقی مردے کے درمیان کھڑی کر دی، دیواریں تو بہت سی کھڑی کی جاتی ہیں اور انسانی ہاتھ انھیں گرا دیتے ہیں، مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان حائل دیوار کی ٹوٹ پھوٹ بالکل ہی تازہ واقعہ ہے، تاہم خدائے تعالیٰ کی قائم کردہ دیواریں نہ ٹوٹیں، نہ کوئی توڑ سکتا ہے، گویا کہ اب مضمون کی فرمائش اور پرانے تعلقات کی یاد دلا کر بقول شاعر وہی معاملہ ہے ؎

کہتے ہیں لوگ آپ سے مجھ کو ہے اک لگاؤ
یہ واقعہ بھی خوب ہے، تہمت بھی خوب ہے

بہر حال مضمون "تعمیل ارشاد ہے" بھائی ابوالحسن اعظمی کی، اس لیے عنوان بھی

''تعمیل ارشاد'' ہی رکھا۔

میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور مرحوم مولانا ارشاد صاحب کا بھی، مگر میں مبتدی اور وہ منتہی، حفیظ ابن مولانا منظور نعمانی دیوبند میں طالب علمی کرتے، ان کے والد کہتے کہ حفیظ کی دوستی صدیق سے بھی ہے اور ابوجہل سے بھی، مومن سے بھی اور کافر سے بھی، زمرۂ احباب میں موحدین بھی ملیں گے اور مشرکین بھی، باپ سے زیادہ اولاد کی فطرت پر کون واقف ہوگا، بات بالکل صحیح تھی، حفیظ کی دوستی کا ایک سرا مجھ سے جڑا ہوا تھا، اور دوسرا مولانا ارشاد صاحبؒ سے اور شاید حفیظ اب اس انکشاف کو پسند نہ کریں تو دست بستہ معافی کے ساتھ یہ بھی سن لیجیے کہ اس دور میں حفیظ مولانا ارشاد صاحبؒ کی چائے سازی کے مہتمم تھے، یوں تو نفاست مرحوم کی زندگی کا عنوان تھا، لیکن چائے نوشی میں ان کا ذوق اتنا پاکیزہ، ایسا ستھرا اور اس قدر صاف وشفاف تھا کہ لذت کام ودہن بھلا نہیں پاتے، وہ اس زمانے میں گرین ڈبے کی چائے پیتے جو گراں قیمت تھی، پھر حفیظ کی چابک دستیاں اور چائے بنانے میں مہارت، اس چائے کو ''شراب الصالحین'' کہہ لیجیے اور وہ بھی کئی آتشہ۔ کشاں کشاں وہ مجھے مولانا ارشاد صاحب کے حجرے میں لے پہنچے، مرحوم کی تنک مزاجی، بلکہ حدتِ طبع اکھاڑنے کے لیے کافی تھی، لیکن حفیظ اکھڑے ہوؤں کو جمانے میں ماہر تھے، پھر چائے کی ایک پیالی جس کی لذتوں کا ابھی ذکر ہوا، جمانا کیا؛ بلکہ جامد کردینے والی تھی۔

مرحوم دارالعلوم سے فارغ ہوکر حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب مرحوم کی توجہ وعنایت سے دارالعلوم کے شعبۂ تبلیغ میں مبلغ کی حیثیت سے مامور ہوگئے، اب انھیں ضرورت پیش آئی کہ وعظ کی متداول کتابوں کا مطالعہ کریں، بڑی ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے عربی میں ''نزہۃ المجالس'' وغیرہ مجھ سے سنتے اور مضامین محفوظ کرتے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بلند پایہ مبلغ ہوگئے جن کے مواعظ سے عام وخاص دلچسپی لیتے۔

جنوبی ہند کا مشہور شہر بنگلور بریلویت کے آہنی پنجے میں جکڑا ہوا تھا، دو چار برائے

نام دیوبندی متوجہ ہوئے اور دارالعلوم سے مبلغ کی فرمائش کی، مولانا عزیز احمد صاحب (مرحوم) فیض آبادی جو اپنے ابتدائی دور میں بنگلور رہ چکے تھے، مولانا ارشاد صاحب ان کی معیت میں بنگلور پہنچے، مرحوم کے مواعظ نے گھٹا آلود فضا کو ایسا صاف کیا کہ ایک ماہ سے زائد ابر رحمت جم کر برسا اور دیوبندیت کے شفاف پانی سے جنوبی ہند کے در و دیوار دھلتے چلے گئے، پہنچے تھے تو لال مسجد میں قیام ہوا، لیکن پھر شہر کے متمول اور دین دار تاجر عبدالقادر صاحب امیر جان اپنے شاندار بنگلے پر لے گئے اور سنا ہے کہ جب مولانا بنگلور سے واپس آرہے تھے تو امیر جان بچوں کی طرح بغل گیر ہو کر بلک بلک کر روئے۔

بنگلور کو فتح کر کے مدراس میں بھی فتح مندی کے جھنڈے گاڑ دیے، یہ واقعہ ہے کہ اکابر دارالعلوم کے لیے جنوبی ہند کے دروازے مولانا ارشاد صاحب ہی نے کھولے، پھر پورے ہندوستان میں ان کے دل پذیر مواعظ دیوبندیت کے نغمے الاپتے رہے۔

صوفیاء کے یہاں جب کسی فریضۂ اسلام کی ادائیگی کی عادت طبیعتِ ثانیہ بن جائے تو اس کو نسبت کہتے ہیں، اس کا اثر دوسرے کو بھی متاثر کرتا ہے، لاریب کہ تلاوتِ قرآن اور اہتمام جماعت مرحوم کو بدرجۂ نسبت حاصل تھا، سینکڑوں کو انھوں نے نہ صرف جماعت کا پابند، بلکہ شب بیدار اور تہجد گذار بنا دیا، مدراس کے مشہور تاجر عبدالباسط صاحب جو اپنی ابتداء میں قبور کے خوب طواف کرتے، ایسے پکے دیوبندی ہوئے اور پابندِ صوم وصلوٰۃ کہ جب بڑھاپے میں مسجد جانے سے معذور ہو گئے تو اپنے ہی بنگلے کے ایک گوشے میں مسجد تعمیر کر لی تاکہ جماعت کا اہتمام رہے۔

مولانا ارشاد صاحبؒ کو جماعت کا شغف ایسا تھا کہ بڑے بڑوں کو سرزنش میں باک نہ ہوتا، ایک بار حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ بنگلور میں مقیم ہوئے، فرودگاہ سے مسجد کافی فاصلے پر تھی، نماز کا وقت آیا تو حضرت قبلہ نے ضعف پیری اور بعدِ مسافت کا عذر بنا کر بنگلے پر ہی نماز پڑھنے کا اہتمام کیا، اس وقت مولانا ارشاد صاحب کی بے تابی دیدنی تھی، حاکم ومحکوم، آقا وملازم کا فرقِ مراتب دور جا پڑا اور ان کا

یہ قال در حقیقت غلبۂ حال تھا۔

نفاست مزاج، لکھنویت کو چھوتی پوشاک، رہائش، اکل وشرب، نشست و برخاست سب چیزوں میں نفیس ذوق تھا، سفر بھی فرسٹ کلاس میں کرتے۔

چند برس پہلے ذیابطیس کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے، دیکھتے ہی دیکھتے آتشیں رخسار روئی کے گالے نظر آئے، جسم ست ہوگیا تھا، ناتوانی ولاغری ایسی شدید حملہ آور ہوئی کہ عصرین کے مابین روح نے خود کو قفس عنصری کی قید سے آزاد کرلیا اور جب روح مائل پرواز تھی تو کوئی ایسی طاقت ور گرفت نہ تھی جو اس کی پرواز میں حائل ہو۔

اب تو اس سانحے پر لیل ونہار کی گردشیں بیت گئیں، اس لیے برادر عزیز مولانا ابوالحسن صاحب اعظمی کی فرمائش بدرجہ فہمائش پر یہ ایک شکستہ تحریر بحالت خستگی پیش ہے۔

***

بے مہر محبوبہ

(بسوز وساز بر فراق والدۂ مرتّب)

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتی اگر استوار ہوتا

انسان کی زندگی میں بہت سے خوشی کے موقعے آتے ہیں اور ایسے ہی رنج والم
ے؛ لیکن شادی کا تصور بھی عجیب خوش کن ہے، جاں فزا، راحت رساں، جب شباب
س آدمی قدم رکھتا ہے اور گھر کے بڑے اس کی شادی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں،
کیسی جان میں جان آتی ہے، ان کی سرگوشیوں کو سنتا ہے اور سنی اَن سنی کی کیفیت اپنے
ظاہر کرتا ہے؛ لیکن دل میں آرزوئیں کروٹیں لیتی ہیں، تمنائیں مچلتی ہیں اور بے
بیاں بڑھتی ہیں ؎

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے

گنی ہوتی ہے تو اور بھی مسرتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے، شادی کی تاریخ طے ہوتی تو پھر
یا ہی کہنا، پھر ایک ایک دن پہاڑ کی طرح گذرتا ہے، راتیں اختر شماری میں۔ خدا خدا
رکے وہ دن آجاتا ہے جب عروسی کا لباس زیب بدن ہوتا ہے، ایک سہما سہما سا خوف
دامن گیر کہ نکاح کی مجلس میں ایجاب وقبول کا مرحلہ کس طرح طے ہوگا، یہ تصور بھی
ں گسل، باحیا اور حساس لوگوں کے لیے ہے، پھر کیا ہوتا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔

بہت زمانہ ہوا ایک لطیفہ اخبارات میں نظر سے گذرا تھا، حسبِ حال، مطابق واقع وہ یہ کہ کسی گھر میں شادی ہو رہی تھی، تقریب کے ہنگامے، شادی کے چرچے، مسرّتوں کی بارش، فرحتوں کا جہانِ نو، لڑکی کی رخصتی کا وقت آ گیا، ماں رو رہی تھی، باپ آنسو بہا رہا تھا، بہنیں بے قرار تھیں اور سب ہی رشتے دار و اقرباء حسبِ مراتب اس نالہ وشیون میں شریک تھے، دلہن کا ننھا منھا بھائی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک دولہے کو اندر بلایا گیا تو وہ اور اس کے ساتھی ہنستے ہوئے داخل ہوئے، ننھے بھائی نے اپنے باپ سے پوچھا کہ ابا یہ کیا معاملہ ہے، ہم سب تو رو رہے ہیں اور دولہا بھائی ہنس رہے ہیں۔ گرگ باراں دیدہ باپ نے جواب دیا کہ "بیٹا! ہمارا آج ہی کا دن رونے کا ہے، یہ دولہا میاں تو عمر بھر روئیں گے۔"

واقعہ یہ ہے کہ بعض شادیاں بجائے خانہ آبادی کے خانہ بربادی کی تمہید ہوتی ہیں اور خصوصاً اس دور میں جہیز کے ہنگاموں نے تو لڑکیوں کے لیے ہلاکت کا ایسا سامان پیدا کر دیا، جیسے مذبح میں بھیڑ بکریاں بے دریغ ذبح کی جاتی ہیں، بات تعصّب کی نہیں؛ لیکن چودہ سو برس پہلے صحرائے عرب سے جو ایک روحانی آواز بلند ہوئی تھی، اس کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی، لیکن کچھ نے عمل کیا کچھ نے سنی ان سنی کر دی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ "اس نکاح میں سب سے زیادہ برکت ہوگی، جس میں اخراجات کا بوجھ کم سے کم خود پر ڈالا گیا ہو، افسوس تو یہ ہے کہ اس نبی جلیل کے امتی بھی اب جہیز کی لعنت میں گرفتار ہوتے چلے جاتے ہیں، بہرحال! یہ باتیں بلا ارداہ قلم پر آ گئیں۔

میں بھی بچے سے جوان ہوا اور اب جوانی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہوں، سر پر شفیق سایہ صرف والدہ مرحومہ کا تھا اور آگے پیچھے نکاح شادی کے معاملات طے کرنے والا کوئی نہ تھا، مطالعہ کا پرانا رسیا ہوں، چند موضوعات کو چھوڑ کر جس طرح کی کتاب مل جائے، دیکھ ڈالتا ہوں، عمل کی توفیق نہ ہوئی اور نہ ہونے کی امید، کسی کتاب کے مطالعے کے دوران شیکسپیئر کا یہ مقولہ نظر سے گذرا کہ "شادی انسانی زندگی میں کھلنے

والا ایک نیا دروازہ ہے جس میں سوچ سمجھ کر داخل ہونا چاہیے، پھر میں اپنے اس تجربے کو غلط نہیں کہہ سکتا کہ خاندانی، قومی مناسبتیں اچھل کر سامنے آتی ہیں، سوتمنا یہی تھی کہ کسی بڑے باپ کی بیٹی سے شادی ہواور ماضی چوں کہ لشٹم پشٹم گذرا تھا، مستقبل کی تعمیر کے سنہرے خواب دیکھتا اور اپنی عقل کے مطابق یہ فیصلہ کرتا کہ شاید سسرالی رشتے ہی آنے والی زندگی میں بہترین مددگار ثابت ہوں، پھر میں ایسا سکہ تھا جس کا چلن تو ختم ہو گیا تھا؛ لیکن بہر حال چاندی کھری تھی یعنی والد مرحوم علامہ انور شاہ کشمیریؒ مرحوم کی نسبتِ عالی، ادھر طالب علمی ایک امتیاز کے ساتھ گذری تھی اور طالب علمی ہی سے مقرر بھی ہو گیا تھا اور لکھنے پڑھنے کا الٹا سیدھا قرینہ بھی آ گیا تھا، مضامین چھپنا کیا بات، بعض ماہناموں کی ادارت بھی کرتا، دیوبند میں بھی بڑے گھرانے تھے، معزز خاندان تھے، باحیثیت خانوادے تھے؛ بلکہ بعض باوقار گھروں سے پیش کش بھی ہوئی، لیکن والدہ مرحومہ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کچھ بڑے گھرانوں کا تجربہ کر چکی تھیں اور اب آ کر وہ یہاں رکی تھیں کہ کسی غریب بچی سے میری شادی کی جائے۔

گویا کہ اُن کے تلخ تجربات اور آئندہ کے لیے اقدام کا تختۂ مشق میں ہی بننے والا تھا، بڑی کشمکش رہی، میری والدہ مرحومہ شفقتوں کی ہمالہ بھی تھیں اور مزاج کی جرنیل بھی، نوازنے پر آتیں تو اپنا سب کچھ لٹا دیں، بگڑتیں تو منائیں نہ منیں، میں دارالعلوم میں مدرّس ہو چکا تھا؛ لیکن اُن کے جلال سے ہمیشہ مرعوب رہا، پھر الحمدللہ دینی تعلیم نے ماں باپ کا احترام بھی دل ودماغ میں جاں گزیں کر دیا تھا، انھوں نے بجنور میں ایسی لڑکی تلاش کر نکالی جو غریب، نانِ شبینہ کی محتاج اور وقت گذاری کے لیے دوسروں کی دست نگر، میں بڑا گھبرایا، تھرایا، لیکن والدہ مرحومہ کے عصائے موسوی نے ادھر ادھر نہیں ہونے دیا، بے تکلف عرض ہے کہ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے اسی موضوع پر انھوں نے مجھ سے گفتگو کی تو میں نے دیوبند کے ایک بہت ہی باحیثیت گھر کی نشان دہی کی، خشمگیں ہستی خشم ناک ہو گئی، بے تکلف لکڑی لی اور اس وقت تک جس کمر پر دستِ

شفقت پھرتا تھا، لکڑی بجتی رہی، تاوقتیکہ اپنی پسندیدہ جگہ کے لیے مجھ سے زبردستی تائید نہیں لے لی۔

بجنور میں میری ہمشیرہ کی شادی ہوئی ہے اور میرے بہنوئی کی یہ میری مخطوبہ حقیقی بھتیجی تھی، بہن کی وجہ سے بجنور آمد ورفت رہتی۔ ایک دن عورتوں کی جانب سے تقریر کا مطالبہ ہوا، تقریر ہوئی تو یہ مخطوبہ جواب مرحومہ ہے سامنے آ کھڑی ہوئی، رشتہ دیا گیا، طے ہو گیا، شادی کا بھی وقت قریب آ گیا؛ لیکن کبھی میں اپنے مستقبل کو سوچتا تو جی چاہتا کہ صاف صاف انکار کر دوں، کبھی اس معصوم اور مسکین لڑکی کا خیال آتا تو مقتل میں اپنے پاؤں سے جانے کی ہمت پیدا ہو جاتی، اسی شش وپنج میں وقت گذر رہا تھا کہ بہن کی شدید علالت کی بجنور سے اطلاع آئی، برسات کا زمانہ تھا، بھاگم بھاگ میں کیسے کپڑے لتّے کا ہوش اور پھر والدہ مرحومہ کی بے قراری، جو کپڑے پہن رکھے تھے، ان ہی میں والدہ کے ساتھ نکل گیا، بجنور تک دل بلیوں اچھلتا رہا کہ دیکھیے بہن کیسی ہوں؟ نا سوتی زندگی میں ملاقات ہو گی یا نہیں، الحمد للہ! بس اسٹینڈ پر پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ داخل ہسپتال ہیں اور بچہ بعافیت پیدا ہو گیا، بجنور میں موسلا دھار بارش تھی، میں پاؤں میں پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا جس کی وجہ سے کیچڑ اڑ اڑ کر میری پشت تک پہنچا، پائجامہ لت پت جب والدہ مرحومہ کو بہن کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو انھیں اپنا پرانا منصوبہ یاد آ گیا۔

غریب بچی بیوہ کی لڑکی، نہ کوئی آگے، نہ پیچھے، انھیں بروقت شادی سے کیا انکار ہوتا؛ چناں چہ قبیل عصر میں سو کر اٹھا تو مجھے بتایا گیا کہ آج ہی بعد مغرب نکاح ہے، نہ صرف نکاح بلکہ رخصتی بھی ہے، اللہ اللہ کیا شان کی شادی تھی، نہ ڈھول، نہ تاشے، نہ راگ، نہ باجے، نہ بارات، نہ باراتی، نہ رشتے دار، نہ احباب، سر پر سہرے کا کیا سوال اور گلے میں ہار کہاں سے آتے، یہاں دھلی ہوئی پوشاک بھی میسر نہ تھی، بس والدہ مرحومہ کی یہ کوشش کہ گھیر گھار کر کسی طرح شادی کر دی جائے کہ یہ قیدی کہیں جیل کی اونچی دیواروں کو پھاند کر فرار نہ ہو جائے، مغرب کے بعد دس پانچ آدمیوں کے اجتماع میں نکاح ہو گیا، بھرپور

زندگی کا فیصلہ ایک ہی لمحے میں، مستقبل کی تمام عمارت چشم زدن میں کھڑی ہوگئی، کبھی اپنے آلودہ کپڑوں کو دیکھتا، کبھی شادی کا خوش کن تصور آتا، کبھی یہ روح فرسا خیال کہ پوری زندگی برباد ہوگئی، کبھی یہ یقین کہ ضعیف والدہ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور دینی جذبے کے تحت، خدا تعالیٰ ضائع نہیں ہونے دے گا، شب کے گیارہ بجے ہیں اور اب شبِ عروسی وہ غریب میری بہن کے کپڑے پہنے ہوئے جو اس کے جسم کے مطابق بھی نہ تھے، غربت کی ماری لڑکی، چھریرا بدن، دبلی پتلی، میری بہن کشمیری النسل، قوی ہیکل، نکلتا ہوا قد، بھاری بھر کم تن توش، بیچاری اس غریب بچی پر لباس ایسا محسوس ہوتا جیسے کہ بانس پر کسی نے الٹے سیدھے بے ہنگم انداز میں کم خواب و اطلس کے تھان لپیٹ دیے ہوں۔

میرے جسم پر غلیظ کپڑے، اس کی بے قرینہ پوشاک، بہر حال رات جوں توں گذر گئی، یہ تھی ہماری شبِ زفاف اور یہ تھی میری بے مزہ شادی، والدہ مرحومہ صورتِ حال کو بھانپ گئیں، اور اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ ہر طرح اس مرحومہ کی خوبیاں میرے ذہن نشیں کریں، میری سرد مہری سے جو مرحومہ کو غم ہوتا تو اس کی دل جوئی میں لگ جاتیں، مجھے افسردہ پاتیں تو پھر مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتیں، خوب یاد ہے کہ جب ہم بجنور سے دس پانچ دن کے بعد چلے تو ایک سیٹ پر والدہ بیچ میں مرحومہ کنارے میں، والدہ مرحومہ اس سے بولیں کہ اب بجنور چھوٹ رہا ہے، اپنے وطن کی سڑکیں اور باغات دیکھ لے، کبھی دو چار جملے خوش کن مجھ سے کہتیں، مگر یہاں ایسی ٹھنڈک تھی جس میں حرارت پیدا ہونے کا کوئی سوال نہ تھا، اس غریب کو کوئی گھر لے جانے والا بھی نہ تھا۔ نہ چوتھی نہ بھوڑا کوئی بھی دنیاوی رسم نہ ہونے پائی، صرف ایک بھائی تھا جس نے بڑی جدو جہد کے بعد چار پانچ بیگہ زمین بہم کی تھی، زمیندارانہ رقابتوں نے اسے جہاں آباد میں بہنے والی گنگا ہی میں ڈبو دیا۔ بیوہ ماں اور دو بہنیں رو پیٹ کر صبر کر بیٹھیں۔ اب ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا، وہ سراپائے وفا، میں مجسم بے مہری و بے وفائی، اس کی جانب سے بھرپور خدمت، میری جانب سے کنارہ کشی، اس میں حیا کا اس قدر مادّہ کہ کبھی کسی

کے سامنے میری چارپائی پر نہیں بیٹھی، اور نہ کسی کی موجودگی میں کبھی مجھ سے بات کی، کبھی کبھی تخلیہ میں مجھ سے پوچھ لیا کرتی تھی کہ کیا آپ کو مجھ سے تعلق نہیں؟ اس کا جواب میں صرف ٹالنے کی حد تک دیتا، بیس سال کے قریب اس سے رفاقت رہی، بچے پیدا ہوئے، گھر بھی بنا، اثاثۃ البیت بھی ہوا اور اس غریب کی برکات کو میں نے مشاہد کر لیا جس کے یہاں سے مجھے شادی کا ایک جوڑا تو کیا نصیب ہوتا، اس کے گھر پر ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھایا، پھر الحمدللہ میں نے دوسرے غریبوں کو جوڑے پر جوڑے دیے، خدا تعالیٰ کے فضل سے گھر بھی متوسط درجے کا بن گیا اور ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں جو درمیانہ درجے کے گھرانے میں مطلوب ہو اور میرے پاس موجود نہ ہو، وہ میری آنکھ بھی بدلے ہوئے دیکھتی تو سہم جاتی، بچوں پر میں بگڑتا تو وہ سب بچوں کو لے کر ایک کمرے میں چھپ جاتی، غرضیکہ اس نے شرافت و انسانیت میں ایک باوفا بیوی کی حیثیت سے مہر و وفا کا ہر جگہ مظاہرہ کیا، چند سال پہلے رات کو میں عشاء کی نماز کے لیے وضو کر رہا تھا، بچے سب سو گئے تھے تو وہ مجھے اچانک اپنا ایک بھیانک خواب سنانے لگی خواب یہ تھا۔

"ہمارے گھر میں آگ لگی اور پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔"

میں اس خواب کو سن کر سہم گیا، تعبیر واضح تھی؛ لیکن میں نے تعبیر نہیں بیان کی، وہ میری خاموشی سے گھبرائی اور بار بار سوال کرتی رہی، تو میں نے ٹالنے کے لیے کہا کہ کچھ نہیں، ریاح کا غلبہ ہے، اس لیے تو اس طرح کے خواب دیکھتی ہے، مگر میرے سکوت سے اس کا ماتھا ٹھنک گیا، یہ شبِ جمعرات تھی، جمعرات کو میں میرٹھ ایک جلسے میں شرکت کے لیے چلا گیا، جمعہ کو واپس ہوا، پانچ چھ روز پہلے اس کے ولادت ہوئی تھی اور وہ زچگی میں تھی، جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو بڑی بچی عائشہ جس کی عمر اس وقت سات آٹھ سال کی تھی، زار و قطار روتی ہوئی ملی، اور پوچھنے پر بتایا کہ اپی کی طبیعت بہت خراب ہے، میں سیدھا کمرے میں اس کی چارپائی کے پاس پہنچا، تو اس پر غشی کی کیفیت تھی، دماغی سرسام کا شدید حملہ تھا، میں نے جا کر آواز دی تو عجیب بات ہے کہ اس نے آواز کا

ادراک کرلیا، اور اپنے بے چین ہاتھ سے اپنے دماغ کی طرف اشارہ دیا، وہ بتارہی تھی کہ میرا دماغ معطل اور مفلوج ہے، بیس سال کی رفاقت کی سردمہری کا تودۂ برف اب آناً فاناً پگھل رہا تھا، معلوم ہوا کہ بیماری سے پہلے اور میرے میرٹھ رخصت ہونے کے بعد اس نے بڑی بچی سے کسی کام کے لیے کہا تھا، بچپن کی نادانیاں اس بچی نے صاف انکار کردیا، تو وہ بولی کہ عائشہ! اب گھر کی ذمہ داری تجھے ہی سنبھالنا ہوگی، یہ موت کا وہ ادراک تھا جو ہر مومن کو وقت سے پہلے ہوجاتا ہے، علاج ومعالجے میں کوئی کمی نہیں کی گئی، بیماری کی نزاکت کی بنا پر میں نے اس کی والدہ اور بہن کو بجنور سے فوراً بلا لیا تھا؛ بلکہ اپنی بہن اور بہنوئی کو بھی، ہفتے کا دن گذر گیا تھا، شبِ اتوار کا آغاز تھا، میں وہیں بیٹھا ہوا عشاء کے لیے وضو کررہا تھا جہاں بیٹھ کر اس کا بھیانک خواب سنا تھا، اچانک اس کے جسم میں ایک اضطرابی تشنج پیدا ہوا، بہن یہ دیکھ کر چلائیں کہ یہ کیا ہوا، میں چارپائی کے قریب پہنچا تو وہ اس دنیائے دوں کو چھوڑ چکی تھی، قدرِ نعمت بعدِ زوال، اب آنکھوں میں اندھیرا تھا، دنیا تاریک تھی، گھر اجڑ چکا تھا، زندگی برباد ہوچکی تھی۔

پانچ بچیاں اور دو بچے وہ بطور امانت میرے پاس چھوڑ کر بڑی تیزی سے راہِ آخرت پر گامزن ہوگئی، کسی بچے کی محبت، اپنے مخدوم شوہر کا تعلق، اپنی بیوہ ماں کی تڑپ اور اپنی بے قرار بہن کی بیتابیاں اسے سفرِ آخرت سے نہ روک سکیں، اسی وجہ سے میں نے ان سطور کا عنوان ''بے مہر محبوبہ'' رکھا، اتوار کی صبح کو آغوشِ لحد میں اسے سلا دیا گیا، جس کے ساتھ میری عافیت، میری راحت، میری خوشی، میری مسرّتیں ہمیشہ کے لیے سوگئیں، پیر کے دن صبح کو بعد فجر میں اس کی قبر پر پہنچا تو طلبہ کھڑے ہوئے تھے، یہ وہی وقت تھا کہ میں صبح گاہی تفریح سے لوٹتا اور وہ میرے لیے ناشتہ تیار کرکے بیٹھتی، اب میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا، غم واندوہ کا جو طوفان میرے اندر تلاطم پذیر تھا، وہ اچانک آنکھوں کی راہ سے اچھل پڑا، میں نے زار وقطار روتے ہوئے اس سے کہا کہ تو یہاں سوتی ہے، میرے ناشتے کا کون اہتمام کرے گا؟ تو یہاں خوابِ گراں میں مصروف

ہے، تیرے بچوں کی خبر گیری کون کرے گا؟ اس کی روح نے جواب دیا جسے میں نے صاف صاف سنا۔

خیال خوابِ راحت ہے علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں مومن، میرا شانہ ہلاتا ہے

اب موت کی دیوار میرے اور اس کے درمیان حائل ہے، برائے نام زندہ ہوں، لیکن عہد ہے کہ اس ناسوتی زندگی کے بعد جب اس سے دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی تو ضرور اس سے کہوں گا کہ او بے مہر محبوبہ! تو تو قبل وقت ہی چلی آئی، لیکن میرا معاملہ یہ ہے ۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

اس کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، جس کی احسن الجزاء خدا تعالیٰ ہی دے گا، مگر سب سے بڑا اس کا احسان یہ ہے کہ جب میری والدہ مرحومہ کینسر میں مبتلا ہوئیں، تو اس نے ان کی حقیقی بیٹیوں سے بڑھ کر خدمت کی، جس دن صبح کو والدہ کا انتقال ہوگا اس رات میں انھوں نے مجھ سے عہد لیا کہ تیری بیوی نے میری خدمت اولاد سے زیادہ کی ہے، تو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا، اب صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ حشر میں والدہ کے سوال پر وہ میری شکایت کا دفتر نہ کھولے ورنہ تو وہی بات ہوگی ۔

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

فرحمها الله تعالیٰ رحمة واسعة و نور الله مرقدها إلی یوم یبعثون

***

دیو بند کی چند مثالی خواتین

دادی بو

اہلیہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ، دولت مند باپ کی نورِ نظر؛ بلکہ دیو بند کے ایک متمول زمین دار کی لڑکی تھیں، نام وَر باپ نے جہیز خوب دیا، پہلی شب میں حضرت نے فرمایا کہ میں کون ہوں اور تم کون؟ میری سنوگی یا اپنی منواؤ گی؟ بے تکلف عرض کیا کہ میں تو آپ کی کنیز ہوں، اپنی منوانے کا کیا سوال، فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنا تمام زیور اتار کر ہمیں دے دو۔ بلا تأمل حکم کی تعمیل کی، صبح کو یہ سب زیور اور جہیز دار العلوم کے سرمایہ میں شریک کر دیا گیا، باپ نے دوبارہ دیا، پھر یہی معاملہ کیا، مہمان نواز اس درجہ کہ حضرت نانوتویؒ فرماتے کہ ہماری میزبانی تو احمد کی ماں کی مرہونِ منت ہے، احمد صاحبزادے کا نام جو دار العلوم کے مہتمم اور دولتِ آصفیہ حیدر آباد میں عدالت میں مفتی اعظم کے عہدے پر فائز، عام وخاص کی زبان پر مرحومہ ''دادی بو'' کے نام سے معروف تھیں، ایک غیر مسلم لڑکی کی پرورش کی، جس کا نام پیرو تھا، اس کی ناز برداری میں اس درجہ بڑھیں کہ وہ روبرو مقابلہ کرتی، صوم وصلاۃ کی بے پناہ پابند، حضرت گنگوہیؒ سے مرشدانہ تعلق، بڑی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد پوتا قاری محمد طیب پیدا ہوئے، جب گڈلیوں چلنے لگے تو ایک دن تیل کا بھرا ہوا کنستر گرا دیا، دادی بو نے اس شوخی پر مٹھائی تقسیم کی، اب قیامت تک کے لیے خواب گاہ اپنے عظیم شوہر کے ساتھ حاصل کی جس

میں خوابِ راحت کے مزے لیتی ہیں۔

اماں عائشہ

صاحبزادی حضرت نانوتویؒ، دیوبند کی ایک شخصیت مولوی نورالحسن صاحب سے شادی ہوئی، حضرت نانوتوی نے اچانک عصر کی نماز کے بعد نکاح کر دیا، طویل العمر تھیں، لب ولہجہ دیہاتی، جملہ تکلفات سے بے نیاز، ہر سال نانوتہ کا سفر بہلی میں ہوتا، کچھ بچے ساتھ ہوتے، راستے میں کوئی گاؤں آتا تو دریافت فرماتیں کہ کون سا ملک ہے؟ عابدہ وزاہدہ، قانتہ اور عفیفہ، صابرہ وشاکرہ، غرضیکہ اپنے مقدس باپ کی نسبت سے دامنِ سعادت لبریز تھا، طویل عمر پائی، وفات کے بعد گورستانِ قاسمی میں سپردِ خاک کی گئیں، دس بارہ سال کے بعد قریب میں ایک قبر تیار کی جارہی تھی کہ اچانک مرحومہ کی لحد کھل گئی، سب نے یہ منظر دیکھا کہ کفن تک میلا نہ ہوا تھا، بلکہ کفن کی خوشبو بھی بدستور تھی، جسم اتنا تر وتازہ کہ گویا ابھی دفن کی گئیں، یہ یقیناً اپنے بے مثال باپ کی نسبت کا اثر تھا، عرفِ عام میں اماں عائشہ سے شہرت رکھتیں۔

باقر خانی والا مولوی

یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اہلیہ تھیں، جب حضرت موصوف بہ نیت جہاد لیکن بعنوانِ ہجرت دیوبند سے رخصت ہونے لگے تو ایک ہجوم دروازے پر تھا، اندرونِ خانہ اہلیہ صاحبِ فراش اور بچیاں مصروفِ گریہ وبکا، بڑی مشکل سے اندر تشریف لائے تو صاحبزادیوں نے قدم تھام لیے کہ ”بابا! ہمیں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو؟“ اہلیہ نے دامن پکڑ کیا کہ میں نے تو زندگی اس آرزو میں گذاری کہ آپ کے ہاتھوں کفن دفن ہو اور آپ نمازِ جنازہ پڑھائیں۔ گھر چیخ وپکار سے پھٹا جاتا اور صاحبِ فراش اہلیہ کے یہ دل گداز جملے دلوں کو شق کرتے، خود حضرت کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، لیکن ضبط سے کام لیا اور یہ کہتے ہوئے مہاجر رخصت ہوا کہ ”جس حال میں چھوڑ رہے ہیں، اسی میں آکر پالیں گے۔“ فراقِ شوہر میں دیوانہ ہوگئیں، نمازیں پڑھتیں اور

پاکستان میرا جانا ہوا تو ان کی بہن سے ملاقات ہوئی، جدید ماحول کے باوجود اور پھر پاکستان؛ لیکن یہ بی بی اب بھی اپنے پرانے طرز پر تھیں، جب ہندوستان چھوڑا تھا تب میں بچہ تھا، پاکستان میں ملاقات پر بھی سر سے تا پاؤں چادر اوڑھے ہوئے آئیں اور اپنے لب و لہجے میں میری بلائیں لیتیں، اب تو علم نہیں کہ زندہ ہیں یا انسان کے آخری مستقر کی مکین، ایسی پاک نہاد بیبیاں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں، دعا یہی ہے کہ زمانہ الٹی زقند لگائے اور ہم اسی گرد و پیش میں پہنچ جائیں جہاں نیکی کا غلبہ تھا اور شر ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملتا، لیکن حسرت سے کہنا پڑتا ہے کہ ”خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا“۔

شاہ صاحبنی

میمونہ خاتون نام، سیّد یعقوب علی صاحب والد کا نام، وطن ”گنگوہ“، ضلع سہارنپور، شادی سے پہلے رہائش بھوپال، وہاں والد ریاستی کسی عہدے پر تھے، ایک ہمشیرہ بنام محمودہ خاتون، ساڈھورہ ضلع انبالہ چھاؤنی میں شادی ہوئی اور جواں مرگی کے حادثے سے دو چار ہوئیں، بڑے بھائی کا نام حافظ ظفر علی تھا، دوسرے بھائی حکیم سیّد محفوظ علی صاحب علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد، طبیبِ حاذق، پہلے دار العلوم میں مدرّس، پھر ہمیشہ کے لیے طبابت کو ذریعۂ معاش بنالیا، دیوبند میں والد مرحوم کے قیام کے لیے جو تدابیر اختیار کی گئیں، ان میں ایک یہ تھی کہ علامہ کو شادی پر مجبور کیا گیا، استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا حکم تھا، تعمیل کرنا پڑی، والد مرحوم کی شرط تھی کہ لڑکی سادات میں سے غریب اور بیوہ ہو، حافظ شریف احمد صاحب گنگوہی پیر جی کے نام سے مشہور تھے اور دار العلوم کے شعبۂ حفظ کے نامی گرامی استاذ، ان کی تحریک پر والدہ مرحومہ علامہ کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں، یہ بیوہ تو نہیں تھیں، مگر سیّد خاندان سے اور نہایت ہی شکستہ حال؛ چوں کہ والدین کا سایہ سر سے بچپن میں اٹھ گیا تھا، شادی کے وقت عمر ۲۰/سال سے زائد نہ ہوگی، جب کہ حضرت علامہ ۴۵/ یا چالیس کے تھے، مرحوم علامہ کو کتاب سے فرصت نہ تھی، اس لیے التفات کم حاصل ہوا، جو شوہر کا بیوی کے

لیے ہوتا ہے۔ خود سناتیں ہیں کہ بھوپال سے شادی ہوکر جب دیوبند آرہی تھی تو دہلی اسٹیشن کے مسافر خانے میں اچانک علامہ تشریف لائے اور اپنی خصوصی نشست پر بیٹھ کر فرمایا کہ ''میں مفلوک الحال اور غریب الوطن ہوں، میرے پاس دینے کے لیے بھی کچھ نہیں، استاذ کے حکم پر مقہوراً یہ صورت اختیار کی ہے۔'' اس اظہارِ واقعہ پر ہمیشہ کے لیے صابر ہوگئیں، ایک بار کسی معمولی آرائش پر تنبیہ فرمائی، پھر عمر بھر کے لیے اس سے بھی بے نیازی برتی، بڑی جواد و کریم تھیں، کھلا پلا کر خوش ہوتیں، غریب بچوں کی شادی کا خصوصی شوق تھا، خدا جانے کہ کتنی بچیوں کی شادیاں کرائیں، ان کے شوہروں سے داماد کا سا معاملہ کرتیں، بہت سی بیوہ عورتوں اور یتیم بچیوں کی پرورش کی، داد و دہش اس درجے کی تھی کہ دنیا سے اٹھیں تو مقروض تھیں، ادائیگی کی سعادت اس حقیر کو نصیب ہوئی، حیوانات کے حق میں تو سراپا رحم تھیں، کسی جانور کی تکلیف برداشت نہ کرتیں، غریب طلبہ کو چھپ چھپا کر دیتیں، انھیں اپنی اولاد سمجھتیں، موذی مرض کینسر میں مبتلا ہوئیں، ۶۵ر کے لگ بھگ وفات پا کر اپنے نام وَر شوہر کے ساتھ ابدی نیند سوتی ہیں۔

فرحمها الله رحمة واسعة

هزار قافلهٔ شوق می کشد شب گیر
که بار عیش کشاید به خطهٔ کشمیر

حضرت شاہ صاحب مرحوم کا آبائی وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی و کشش، جاذبیت و دلکشی، شادابی و شادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے۔ جس کی پُر حسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہتِ گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب و ہوا کی خوش گواری، مناظر کا حسن قدیم زمانے سے سیاحوں کے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ بادشاہوں نے یہاں پر بارِ عیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیاء اس کے جمالِ دل افروز میں پا گرفتہ۔ یہ وہی کشمیر ہے جس کی مدح وثنا میں فارسی شاعری کے طناز و نغز گو عرفی شیرازی نے یہ کہہ کر وادی کے صحت افزا، خوش گوار ماحول کو مستند کر دیا۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است بابال و پر آید

یہ وہی کشمیر ہے جس نے حضرت سیّد علی ہمدانی اور میر سیّد کرمانی کے قدم روک لیے، یہ وہی کشمیر ہے جس کے لالہ زاروں سے پنڈت جواہر لال نہرو کا خاندان، ڈاکٹر محمد

اقبال، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور خدا جانے علم و فن اور دانش و بینش کے ترشے ہوئے کتنے نگینے انگشتریٔ کمال پر اس طرح جمائے گئے جس سے کمال نے فروغ حاصل کیا۔ ہندوستان کا سپرو خاندان، کنزرو، کچلو، نہرو اسی وادی کے وہ گل و لالہ ہیں جو صدیوں سے ہندوستان کی زندگی کی بہار، اس کے پھولوں کا حسن اور برگِ گل کی نظافت بنے ہوئے، اگر وطن کی خصوصیات ابنائے وطن پر مرتب ہوتی ہیں تو اہلِ کشمیر میں وہ خوبیاں اور رعنائیاں بہ قوت موجود ہوں گی جن سے اس حسین وادی کی فضائیں معمور ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کشمیر کے اکثر و بیشتر خاندان دوسرے ممالک سے آکر یہاں مقیم ہوئے اور ہمیشہ یہیں کے ہو رہے۔ خود حضرت شاہ صاحب کے آباء بغداد سے اٹھے، لاہور و ملتان ہوتے ہوئے وادیٔ لولاب، مظفر آباد اور ریاست کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ پھر اس خانوادے کی کچھ شاخیں ہندوستان میں دیوبند اور پاکستان میں لاہور، ملتان وغیرہ میں منتقل ہو گئیں۔ مناسب ہے کہ اس سوانحی خاکے میں مرحوم کے وطن مالوف کے متعلق کچھ تفصیلات تحریر کر دی جائیں۔ ہندوستان کے شمالی سرحدی حصے پر جہاں یہ وادی موجود ہے وہیں سوویت یونین (روس) تبت اور چین کی سرحدیں اس کے حسن کو چھونے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ وادی تیرہ اضلاع میں تقسیم ہے، اسلامی عہدِ عروج کے مشہور خلیفہ ولید کے زمانے میں جب کابل اور ترکستان مقبوضاتِ اسلامی میں شریک ہوئے تو مجاہدین کی نگاہوں نے دور سے کشمیر کے حسن و جمال کو جھانک کر دیکھا اور نصر بن سیار سب سے پہلا وہ شخص ہے جس نے اپنے گھوڑوں کو گلگت اور کاشغر کے میدانوں تک پہنچا دیا؛ لیکن حسینۂ کشمیر سے ہم آغوشی کی سعادت اس فاتح اوّل کی تقدیر میں نہیں تھی۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا معمار و مؤسس عرب کے ریگ زاروں سے ایک آندھی کی طرح اٹھا، سندھ کو روندتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوا۔ یہاں کے دریاؤں کی موجوں نے اسے ملتان میں پہنچا دیا۔ وہی ملتان جس کے متعلق کسی ظریف نے کہا ہے ؎

چہار چیز است تحفۂ ملتاں
گرد و گرما، گدا و گورستاں

ملتان کے خشک علاقے اور یہاں کی بادِ سموم نے محمد بن قاسم کے قلب و دماغ میں کسی شاداب مرغزار کی جستجو پیدا کی تو ہندوستان کے طول و عرض نے وادیٔ کشمیر کو آرزوؤں کے مطابق اس کے سامنے پیش کیا۔ اس سپہ سالار نے اپنی ظفر موج فوجوں کو وادی کے دروازے پر لا کھڑا کیا؛ لیکن تاریخ کی ستم رانیاں محمد بن قاسم جس نے سندھ سے لے کر تا ملتان فتح مندی کے پھریرے اڑائے تھے، اپنی انفرادیت کا بار، انقلابِ زمانہ سے چور چور کمر پر اٹھائے ہوئے جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ گیا۔ پھر حصارِ غزنوی سے وہ جیالا انسان چلا، جسے تاریخ محمود غزنوی کے نام سے جانتی ہے اور اس کے حادثۂ رحلت پر فرخی شاعر نے یہ کہہ کر تڑپا دیا تھا۔ ع

شہرِ غزنی نہ ہمانست کہ دیدم پیشیں

جس کے عہد میں فردوسی شاعر کا تخلیقی کارنامہ یعنی ''شاہ نامہ'' کائناتِ شاعری میں فاتح کی حیثیت سے علم و ادب کی بہت سی آبادیوں کو آج تک اپنا باج گذار کیے ہوئے ہے؛ لیکن محمود غزنوی کی ترک تازیاں بھی اس حسن و جمال کی وادی کو پوری طرح مسخر نہ کر سکیں، تا آں کہ تیرھویں صدی عیسوی میں شاہ میرؔ نے وادیٔ کشمیر پر کامیاب حملہ کیا اور کوٹہ رانی کے خاندان کو نظر بند کر کے دو سو سال تک وادی کو اپنے زیرِ نگیں رکھا، پھر پندرھویں صدی عیسوی میں سکندر مرزا، زین العابدین، حیدر شاہ، فتح شاہ، مرزا حیدر، قاضی خاں اور بہت سے سلاطین اس وادی پر حکومت کرتے رہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں احمد شاہ درّانی کشمیر میں داخل ہوا اور وادی اس خاندان کے زیرِ سلطنت علاقوں میں شریک ہوگئی، ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آخری افغان گورنر جبار خاں کو شکست دے کر کشمیر کو سکھوں کا مقبوضہ علاقہ بنا لیا۔

پھر عالمی سیاست کا شاطر یعنی فرنگی اقتدارِ کشمیر کی طرف متوجہ ہوا اور سہراؤں کے

مقام پر سکھوں کی بچی کھچی طاقت کو توڑتا ہوا کشمیر تک جا پہنچا۔ انگریز کے لیے کشمیر پر اقتدار اس لیے ضروری تھا کہ یہی وادی دنیا کی دو بڑی حکومتوں کے لیے ایک بہترین دروازہ ہے جس سے گزر کر یہ دونوں حکومتیں برطانوی زیر اقتدار علاقہ یعنی ہندوستان میں بہ آسانی پہنچ سکتی تھیں؛ لیکن انگریز شہنشاہی مزاج سے زیادہ سیاسی شعبدہ بازیوں میں مشہور قوم ہے، وہ خرید و فروخت سے ریاستی حدود میں بھی باز نہ رہی، اور کشمیر کو کل پچھتر لاکھ روپے کے عوض فروخت کر ڈالا، حقیقی انتداب انگریز کا تھا اور برائے نام راج گلاب سنگھ کا۔

۱۸۴۶ء میں ایک معاہدے کے تحت کشمیر پر مہاراجہ گلاب سنگھ کے زیر نگیں ڈوگرہ راج کا بھرپور تسلط ہو گیا۔ یہ ریاست اپنی شدید فلاکت، جہالت اور عوام کی شعوری ناپختگی کی بنا پر غلامی کی طویل زندگی گذارتی رہی، کچھ نوجوان کشمیر سے باہر نکلے اور ہندوستان میں آزادی کی اس تڑپ کا براہ راست مطالعہ کیا جو عام ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانوی ڈپلومیسی کے خلاف موجزن تھی۔ یہ حرّیت کے جذبات لے کر کشمیر پہنچے؛ لیکن انھیں کام کرنے کی راہ اور کوئی واضح نصب العین نظر نہیں آتا تھا، خس و خاشاک جمع ہو جاتا ہے تو ایک چنگاری بھی اسے آتش فشاں بنانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ طویل استبداد اور ڈوگرا شاہی کی غیر منصفانہ پالیسی نے جو متشددانہ آمریت کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی تھی کشمیری عوام کے ذہنوں میں اتھل پتھل پیدا کر دی تھی، اتفاقاً ایک خاص موقع پر ایک نوجوان نے اپنے آتشیں جذبات کو اگل دیا۔ ڈوگرا شاہی اس خانساماں کے خلاف حرکت میں آ گئی۔ دوسری جانب وہ تلاطم جو ابھی تک دماغ میں بند تھا سیلاب بن کر کشمیر کے طول و عرض میں اچھلنے لگا۔ مولانا محمد سعید مسعودی، شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، مرزا افضل بیگ، میر قاسم، محی الدین، میر صادق اور دوسرے پُرجوش نوجوان ولولۂ قیادت کے ساتھ سامنے آئے اور راج شاہی سے کشمیر میں براہِ راست تصادم کا آغاز ہو گیا۔ نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی جس کے لیڈر شیخ عبداللہ موجودہ وزیر اعلیٰ کشمیر، تحریک کا دماغ

مولانا محمد سعید مسعودی اور دوسرے ارکان تحریک کے اعضاء تھے۔

بہ تدریج نیشنل کانفرنس کے تعلقات انڈین نیشنل کانگریس سے پیدا ہوئے اور آں جہانی جواہر لال نہرو نے اپنے وطنی تعلق کی بنا پر کشمیر کی تحریکِ آزادی کو استحکام دیا۔ وہ وقت بھی آیا کہ جواہر لال کے لیے کشمیر کے دروازے بند کر دیے گئے اور وہ قانون شکنی کرتے ہوئے حدودِ کشمیر میں درانہ گھس گئے، جب کہ ڈوگرا شاہی فوج کی سنگینوں سے جواہر لال نہرو کا چہرہ بھی لہولہان ہو گیا۔ اس دوران نیشنل کانفرنس کو معطل کرنے کے لیے مسلم مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ شیخ اور ان کی پارٹی کے افراد بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس نے برطانیہ سے براہ راست "ہندوستان چھوڑ دو" کا مطالبہ کیا تو نیشنل کانفرنس نے بھی اسی لب و لہجے میں ڈوگرا شاہی سے "کشمیر چھوڑ دو" کا مطالبہ کر دیا۔

ہندوستان آزاد ہوا، نقشۂ عالم پر دو نئی سلطنتیں ہندو پاکستان کے نام سے ابھر آئیں۔ حالات کی سنگینی نے ڈوگرہ راج کو بھی کشمیر آزاد کرنے کے لیے مجبور کیا۔ عوامی حکومت بہ قیادت شیخ عبداللہ سامنے آئی اور پھر بخشی غلام محمد، میر قاسم، میر صادق وغیرہ کی وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں اور اب کہ یہ سطور زیر قلم ہیں تو کشمیر میں شیخ عبداللہ کی وزارتِ اعلیٰ قائم ہے۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم کا تعلق کشمیر کی اس وادیٔ لولاب سے ہے جس کے قدرتی حسین مناظر کی تعریف میں حکیم مشرق اقبال نے ایک طویل نظم کہی ہے، تحصیل ہندواڑہ ضلع بارہ مولہ کے ایک موضع "ورنو" میں ان کے والد مرحوم کا سکونتی مکان ہے، اس قریہ تک پہنچنے کے لیے "کپواڑہ" سے اب براہ بس سفر کرنا پڑتا ہے؛ جب کہ عوامی وزارتوں سے پہلے گھوڑوں پر سفر کیا جاتا۔ ورنو کے قریب سوگام ہے جو چنار کے درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک نہایت حسین بستی ہے، کپواڑہ سے ایک مواج دریا ورنو کی طویل القامت پہاڑیوں سے گذرتا ہوا تا حدِ نظر وسیع میدانوں کے سینے پر موج زن ہے۔ اسی دریا کے کنارے پر "دودواں" ہے جہاں حضرت شاہ صاحب کی ننیہال ہے؛ بلکہ اسی چند مکانوں پر مشتمل بستی

میں ۱۲۹۸ھ میں حضرت شاہ صاحب کی پیدائش ہوئی۔

ورنو اخروٹ کے درختوں، بہتے ہوئے چشموں، سرسبز و شاداب پہاڑوں، اچھلتے ہوئے دریا سے گھری ہوئی ایسی بستی ہے جس طرح صحن چمن میں کوئی خاص شجر قدرتی پھولوں سے لدا ہوا ہو۔ کشمیر کی عام آبادی بھیڑوں اور بکریوں کے گلے کی مالک اور پہاڑوں پر آباد قوم ہے۔ رات کے سہانے منظر میں زیر فلک کھڑے ہوئے تو پہاڑی سلسلہ میں موجود مکانات میں جلتے ہوئے چراغ چاند اور تاروں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں اخروٹ، سیب، زرد آلو، شفتالو، بادام، رس بھری، بگو گوشہ اور اسی قبیل کے خوش ذائقہ پھل موجود ہیں۔ زعفران کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور شالی (چاول) سے لبریز وادی، فردوس کا منظر پیش کرتی ہے، اون سے تیار شدہ شالیں اور اونی قالین اور اس صنعت میں کشمیریوں کی چابک دستیاں مشہورِ عالم ہیں۔ لیکن جہالت کی وجہ سے یہ وادی بدعات و محدثات کی گرفت میں ہے، حالاں کہ یہ وادی اپنی قدیم تاریخ میں اہلِ کمال اور دانشوروں کا مرکز رہی ہے، یہاں جو پہنچا اس نے یہاں کے حسن میں اپنا دامنِ دل اس طرح الجھا ہوا پایا کہ مدتوں کے لیے پابہ زنجیر ہوگیا۔ فیضی اکبر بادشاہ کے ساتھ پہنچا تو حسنِ کشمیری نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ عرفی کے چشم ہوش نے وادی کے مسحور کن حسن پر ایک لاثانی قصیدہ کہہ ڈالا۔ شاہ جہانی عہد کا ملک الشعراء حکیم ہمدانی کشمیر میں آیا تو سالہا سال یہاں سے نکلنے کا نام نہ لیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''بادشاہ نامہ'' کی یہیں تسوید کی۔ عہد جہانگیر میں حیدر ملک بن حسن نے کشمیر کی تاریخ لکھی۔ البیرونی ہندوستان وارد ہوا تو اس کے قلم نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا کہ کشمیر میں سائنس و فلسفے کی بڑی بڑی درس گاہیں رہی ہیں۔

یوں تو پوری وادی صناعِ قدرت کا ایک دل آویز نمونہ اور دستِ خالق کا تیار کردہ گلدستہ ہے؛ لیکن پھر بھی قدرتی مناظر میں ''گلمرگ، پہلگام، چشمۂ شاہی، ڈل جھیل، خاص سری نگر میں شالیمار، نسیم باغ، نشاط باغ'' اور بہت سے مناظر سیاحوں کو

دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ مقدس مقامات میں خانقاہِ معلیٰ، خانقاہ شاہ ہمدانی، مقبرۂ سلطان زین العابدین، مسجد مدن، خانقاہ بابا شیخ مسعود نروری (مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ صاحب مرحوم) مقبرۂ حضرت بڈ شاہ، حضرت بل، زیارت مخدوم شاہ وغیرہ ہیں۔

مشہور شہروں میں سری نگر، اسلام آباد، قاضی کنڈ، بارہ مولا، کپواڑہ، سوپور اور کشمیر کا حسین ترین حصہ وادیٔ لولاب ہے، جس کے سبز پوش سلسلۂ کوہسار پر اودے اودے بادل اکثر موجود اور اس کی زمین پر بہتے ہوئے دریا اور رواں دواں چشمے ہیں، وادی کا کچھ علاقہ پاکستان کے قبضے میں ہے۔

****

وفیات
ماہنامہ
محدثِ عصر

ریحانۃ الاسلام

حضرت مولانا ابرارالحق صاحبؒ ہردوئی☆

کون ہے جو دنیا میں رہنے کے لیے آیا؟ کہ یہ دنیا خود ہی عدم سے وجود آشنا ہوئی اور بالآخر ایک بار پھر عدم سے بغل گیر ہو جائے گی، دنیا میں کسی کے لیے بقا و دوام مقدر ہوتا تو لاریب النبی الأمی القرشی سیدنا و سید الانبیاء حضور ختم المرسلین اس کے سب سے زیادہ سزاوار تھے کہ آپ ہی کے لیے دنیا بسائی اور سجائی گئی۔ تصور

☆محی السنہ حضرت مولانا ابرارالحق صاحبؒ ابن حضرت مولانا محمود الحق رحمۃ اللہ علیہ۔ وطن اصلی: مقام پلول نواح دہلی۔ ولادت: ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء مقام ہردوئی میں ہوئی۔

سلسلۂ نسب شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے جا ملتا ہے، اسی لیے آپ ''حقی'' نسبت لگاتے تھے۔
ابتدائی تعلیم ہردوئی میں ہی حاصل کی، ۱۳۵۰ھ میں جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۶ھ میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔

فراغت کے کچھ دن بعد مظاہر علوم ہی میں بحیثیت معین مدرّس تدریسی خدمت انجام دی، پھر اپنے پیر و مرشد حضرت تھانویؒ کے ایماء پر جامع العلوم کانپور چلے گئے، یہاں دو سال رہے، پھر دو سال مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں تدریسی خدمت انجام دی۔

۱۳۶۲ء میں ہردوئی میں ''اشرف المدارس'' اور ۱۳۷۰ میں ''مجلس دعوۃ الحق'' قائم فرما کر ایک مربوط و مستحکم نظام کے ذریعہ مدارس و مکاتب قائم فرما کر اصلاح عقائد اور اصلاح منکرات کا عظیم الشان فریضہ انجام دیا اور تزکیۂ نفوس کے ذریعہ ہزارہا قلوب کو نورِ معرفت سے منور فرمایا۔ صرف بائیس سال ہی کی عمر تھی کہ مرشد کامل حضرت تھانویؒ نے آپ کو اجازتِ خلافت مرحمت فرما دی تھی۔

۹ر ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۸ر مئی ۲۰۰۵ء میں آپ کا انتقال ہوا اور ہردوئی میں ہی مدفون ہوئے۔

کیجئے رعب وجلال کے پیکرِ عظیم سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ باور کرنے کو قطعی طور پر تیار نہیں کہ آقائے نامدار، تاجدارِ کائنات ارض وسماء بھی موت کی آغوش میں جاسکتے ہیں، مگر صداقت یہ تھی کہ آپ دنیائے فانی کو الوداع کہہ کر اپنے رب قادر وقدیر کے حضور پہنچ چکے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تنبیہ پر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تنبہ ہوا۔

اس دنیا میں نہ اولوالعزم رسل رہے، نہ اصحابِ عزیمت اولیاء، نہ جبال العلوم علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور نہ زہّاد وعباد، نہ ہی جلال وجبروت کے مالک شاہانِ عالم، پھر حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی بھلا کیوں کر داغ مفارقت دے کر نہ جاتے، گئے اور خود تو بڑی دھوم دھام سے، مگر درجنوں، سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، انسانوں کو نہیں، کروڑوں بندگانِ خدا کو سراپا گریہ وماتم بنا کر، حضرت مولانا کی ابتدائی زندگی کی مشکلات وپریشانیاں کم ہی لوگوں کے علم میں ہوں گی، لوگ تو ان کی آخری زندگی کی مقبولیت ومرجعیت ہی کو دیکھ رہے تھے، لیکن یہ حقیر فقیر مولانا کو بہت دنوں سے جانتا پہچانتا ہے، نہ تنگی وپریشانی میں اپنے مشن سے ایک لمحہ غافل ہوئے اور نہ ہی آسائش وراحت میں اس سے ادنیٰ درجہ کی بے اعتنائی گوارہ فرمائی۔ حدیث شریف میں اس عمل کو خیر الاعمال کی سند عطا ہوئی ہے، جو تسلسل واستمرار سے جاری رہے۔ لاریب مولانا نے اپنے مرشد حکیم ودانا کی ہدایت پر مجلس دعوۃ الحق اور پھر اشرف المدارس کے ذریعے جس مشن کو سنبھالا اسے حالات کی مخالفت ومساعدت اور وسائل کی تنگی وفراخی ہر دو حال میں پورے عزم، حوصلے، جذبے وولولے کے ساتھ جاری رکھا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کو محدثِ شہیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ نے ''ریحانۃ الھند'' کے گراں قدر خطاب سے سرفراز کیا تھا، اس ہیچ میچ سیہ کار کی نظر میں حضرت مولانا ابرار الحق صاحب بجا طور پر اس عصر میں ''ریحانۃ الاسلام'' تھے، کوتاہ اندیش اور کوتاہ بیں لوگ ممکن ہے اس کی بابت

تردید وتردد کے شکار ہوں، مگر ہے کوئی جو مرشد تھانوی جیسا حکیم الامت اور مولانا ابرار الحق صاحب جیسا اس حکیم الامت کا ساختہ و پرداختہ پیش کرے، جس کو محض ۲۲ رسالہ عمر میں مرشد تھانویؒ نے خرقۂ خلافت سے نوازا، جس کے یہاں بیعت ہونے کے لیے بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے، چہ جائے کہ خلافت واجازت۔ ربّ کریم ورحیم کی ذات سے قوی امید ہے کہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب پر اس کی رحمت کی بارشیں نازل ہو رہی ہوں گی، خدا کرے ان کی قبر تا ابد نور سے منور اور ان کی ذات سے جاری ہونے والا فیض ہمیشہ باقی رہے۔ آمین

(جلد ر ۴، شمارہ ر ۱۲، بابت ماہ جون ۲۰۰۵)

○○○

حضرت مولانا مفتی سیّد عبدالرحیم صاحب لاجپوری☆

بعض مصنفین کی شہرت اپنی تصنیف وتالیف سے ہوتی ہے اور وہی ان کا سب سے بڑا تعارف، ایک زمانہ تھا کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا ذکر ہوتا تو ان کی شناخت یہ تھی کہ ''تعلیم الاسلام'' والے مفتی صاحب، مرحوم مولانا سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری بھی ''فتاویٰ رحیمیہ'' سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ فتاویٰ عالمگیری حیثیت اختیار کر گیا۔ انگریزی وغیرہ میں اس کے ترجمہ بھی ہوئے۔ مرحوم بڑے ٹھوس انداز میں جواب دیتے۔ بعض اوقات ان کا جواب ایک رسالہ کی شکل اختیار کرتا۔ دلائل، تفقہ، شواہد، متداول فتاویٰ کے حوالے اور موضوع سے قریب بہت سے

☆ حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری: آپ کی ولادت ماہ شوال المکرم ۱۳۲۱ھ مطابق ۳ر دسمبر ۱۹۰۲ء محلہ موٹھوار ضلع نوساری، صوبہ گجرات میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم دارالعلوم اشرفیہ میں حاصل کی۔ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں مدرسہ محمودیہ (جواب جامعہ حسینیہ کے نام سے مشہور ہے) میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں سند فضیلت حاصل کی۔

اسی دوران حضرت علامہ کشمیریؒ کی ایماء پر راندیر میں مدرس عربی کی حیثیت سے تدریسی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی۔ چناں چہ آپ نے مختلف کتابوں کا درس دیا، فقہ فتاویٰ سے آپ کو خصوصی شغف تھا۔ اس فن میں آپ درک کامل رکھتے تھے جس پر آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ''فتاویٰ رحیمیہ'' جو دس جلدوں میں ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے بین ثبوت ہے اور علماء وارباب فتاویٰ کے یہاں مستند اور معتبر مأخذ کی حیثیت سے مقبول ہے۔

۲ ر رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ میں آپ نے اس دار فانی سے دار بقا کی طرف رخت سفر باندھا اور راندیر کے مشہور قبرستان میں جاکر فروکش ہوئے۔

واقعات جس سے حقیقت چھن کر سامنے آتی، فتویٰ نویسی میں وہ معیار قائم کیا جو احتیاط اور تفقہ پر مبنی ہے، نہ بلاوجہ کی شدت نہ مرعوب مداہنت، بارہا راندیر میں ان سے ملاقات ہوئی اور ہر زیارت نے سعادتوں میں اضافہ کیا، کشیدہ قامت، گورے چٹے، صاف ستھرا لباس، نفاست ونظافت کا پیکر، آنے جانے والے سے حسب مراتب معاملہ کرتے، والد مرحوم علامہ کشمیریؒ نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کے بعد راندیر میں طویل قیام کیا، اس کا مقصد یہاں کے پرانے کتب خانوں سے استفادہ تھا، مفتی صاحب مرحوم کے اکابر نے شاہ صاحب کے اس قیام کو غنیمت سمجھ کر ''نورالانوار'' اور ''شرح وقایہ'' کے اسباق علامہ کشمیریؒ سے متعلق کئے گویا کہ ابتدائی تعلیم ایک محقق عصر سے حاصل کی، جس سال ان کی فراغت ہوئی تقسیم اسناد کے جلسہ میں حضرت علامہ کشمیریؒ بھی تشریف فرما تھے، راندیر میں مرحوم کا بیشتر وقت گزرا، یہیں ان کا مرکز دارالافتاء تھا اور قریب کی ایک مسجد میں امامت وخطابت کی ذمہ داری، گجرات کے باشندوں نے جو غیر ممالک میں مقیم ہیں اپنی روایتی خبر گیری کا مظاہرہ کیا، صالح، متقی، وپاکیزہ خصائل کا پیکر تھے، ہر ملاقات پر عطر کا تحفہ ضرور عنایت فرماتے، آخری ملاقات دو ایک سال پہلے ہوئی، اب صاحب فراش تھے لیکن ملاقات کا وہی انداز مشفقانہ، گفتگو کا وہی طرز، عمر طبعی پائی اور راندیر ہی کی زمین کو اپنی مدفن بنایا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

(جلد:۱، شمارہ:۸، بابت ماہ مارچ ۲۰۰۲ء)

حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ دیوبندی☆

حضرت شیخ الحدیث مولانا نعیم صاحب مرحوم "امریکہ" کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے آسودہ ہو گئے۔ مرحوم اصلاً دیوبندی تھے اور دیوبندیت جدید نہیں بلکہ قدیم، رگ رگ میں پیوست، کیا لباس، کیا رفتار، کیا گفتار، عقائد قدیم دیوبند کے موجزن سمندر کی آبشار، فکر دیوبند کے سانچے میں ڈھلا ہوا، خشک مزاجی کی تہ میں شادابی، یبوست میں

☆ آپ کی ولادت مولانا حکیم محمد منعم صاحب دیوبندی کے گھر ۷ رذی الحجہ ۱۳۳۷ء مطابق ۱۹۱۹ھ میں ہوئی۔

قاعدہ بغدادی سے لے کر دورۂ حدیث شریف تک کی مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی ،اور ۱۳۶۳ھ میں سند فضیلت حاصل کی۔

۱۳۶۳ء ہی میں فراغت کے بعد مدرسہ فیضان القرآن بنجاران سہارن پور یوپی میں بحیثیت ناظم آپ کا تقرر ہوا۔لیکن اگلے ہی سال ۱۳۶۴ء میں آپ بحیثیت صدر مدرس مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی بھاولپور پاکستان چلے گئے۔

تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۶۶ھ میں دیوبند واپس آئے اور دارالعلوم دیوبند میں مدرس عربی کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا، اس دوران آپ سے مختلف انتظامی امور بھی متعلق رہے اور درجہ علیا تک کی کتابیں بھی۔ اختلاف دارالعلوم کے وقت آپ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے ساتھ تھے، قیام وقف دارالعلوم کے بعد تاحیات یہیں بخاری شریف جلد ثانی کا درس دیتے رہے اور یہاں بھی مختلف انتظامی ذمہ داریاں آپ نے بحسن خوبی انجام دیں۔

عمر کے آخری حصہ میں آپ مع اہل خانہ امریکہ میں مقیم ہو گئے تھے لیکن بخاری شریف کے درس کے لیے دیوبند آتے اور مکمل کرا کر واپس چلے جاتے۔

بالآخر ۲۰۰۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور امریکہ ہی میں آسودہ خواب ہوئے۔

لطافت، انداز میں شرافت، ادا ادا میں نزاکت، آپ ان کی زبان ایک تقریر سے فی الفور سمجھ جائیں گے، صدام نے کویت پر حملہ کیا تو ''وقف'' کے غم واندوہ کے مظاہرہ میں فرمایا ؏

''خدا جانے کیا مسکوٹ ہوئی کہ نتیجہ حملہ نکلا''

سرزمین دیوبند میں تدفین کی تمنا امریکہ کی زمین نے ہمیشہ کے لیے ضم کردی اور بزرگان دیوبند کے پہلو میں آسودہ ہونے کی آرزو، امریکہ کے طوفانوں اور تیز رفتار آندھیوں کے سامنے سپر انداز ہوگئی۔ خدا تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اہل خاندان، خانوادہ سے باہر بھی بہت سے غم آگیں، شریک دلسوزی، مرحوم کے لیے حریص فردوس بریں پائیں گے۔

(جلد/۷، شمارہ/۳، بابت ماہ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

○○○

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ ☆

"محدثِ عصر" پریس میں جانے کے لیے تیار تھا کہ برادر عزیز الاعز مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب کے سانحۂ وفات کی خبر پہونچی، یہ خبر وحشت اثر، نہ صرف کسی ایک گھرانے، ایک صوبے یا ایک ادارہ کی بربادیوں کی اطلاع تھی، بلکہ ملّی سانحہ ہے، جس کا زخم رستا رہے گا۔ ایک خلا ہے جسے پُر کرنے کے لیے تگ ودو کی جائے گی۔ کامیابی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

☆ حضرت مولانا مجاہدالاسلام صاحب قاسمی رحمہ اللہ تعالیٰ: گاؤں جالے، ضلع دربھنگہ، صوبہ بہار میں حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں رہ کر حاصل کی، اس کے بعد "دملہ" پھر مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھر دارالعلوم مئو (یوپی) میں حاصل کی۔

۱۹۵۱ میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد جامعہ رحمانیہ مونگیر سے عملی زندگی کا آغاز فرمایا۔

۱۹۶۲ میں امارتِ شرعیہ میں بحیثیت ناظم وقاضی تقرر ہوا، یہیں سے آپ کے روشن باب کا آغاز ہوتا ہے، چناں چہ آپ نے امارت شرعیہ کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کو متحرک وفعال بنایا اور ۱۹۹۹ء میں نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ مقرر ہوئے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام اور اس کو ترقی دینے میں بھی آپ کی خدمات قابل قدر رہی ہیں جس کے آپ ۲۰۰۰ء میں صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۸۹ء میں آپ نے اسلامک فقہ اکیڈمی ہند قائم فرمائی اور ۱۹۹۲ء میں آل انڈیا ملّی کونسل۔ آپ کی ملّی ودینی خدمات کا دائرہ انتہائی وسیع اور ہمہ گیر رہا ہے، الحاصل بہت سے مناصب پر فائز رہ کر امت کی خدمات انجام دی اور ورثے میں علمی وتحقیقی بہت سی کتابیں چھوڑیں۔

بالآخر ۴راپریل ۲۰۰۲ء میں مالک حقیقی سے جاملے اور سسرالی گاؤں مہدولی، ضلع دربھنگہ، صوبہ بہار میں مدفون ہوئے۔

میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو چکا تھا، کہ قاضی صاحب دارالعلوم میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ان کی طالب علمی از اوّل تا آخر میری نظروں میں گھومتی ہے، فلاکت کے شکار، ناداری کے آہنی پنجے میں، پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل، ایک لنگی اور معروف طالب علمانہ دراز کرتا، موسم سرما آتا اور دیوبند کی قہرمانی سردی، ایک معمولی بھاگلپوری چادر، جو اُن کے نصف اعلیٰ کے لئے بھی ناکافی ہوتی، مگر واقعی طالب علم تھے، پڑھنے میں ممتاز، صلاحیتوں میں طاق، بے حد خوش خط، ہر سال امتیازی نمبرات سے کامیاب، دورۂ حدیث میں اوّل نمبر رہے۔ میرے برادر اکبر قیصر صاحب مرحوم کو مردم شناسی کا ملکۂ تام اور تربیت کا بہترین جوہر حاصل تھا۔ خدا جانے قاضی صاحب رسالہ دارالعلوم کے دفتر تک کیسے پہنچ گئے اور انہوں نے حسبِ معمول قاضی صاحب کی تربیت شروع کردی، پہلے کچھ کتابیں تبصرے کے لیے دیں، پھر مضمون نگاری کا سلیقہ وقرینہ القاء کیا، یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ برادر اکبر مرحوم نے کچھ مضامین مرحوم کے مجھے بھی دیکھنے کے لیے دیے۔ میں اس زمانے میں دارالعلوم کے صدر دروازے کے حجرے میں فروکش تھا، اس تقریب سے قاضی صاحب کی آمد ورفت شروع ہوئی، جو ہر قابل تھا، بہت جلد ان کی صلاحیتیں اجاگر ہو کر سامنے آئیں۔ مولانا سید منت اللہ رحمانی المغفور دارالعلوم کے واقعی افاضل کو اپنے جامعہ رحمانی میں درآمد کرنے میں عقاب نگاہ تھے۔ چناں چہ قاضی صاحب کو لے اڑے اور جامعہ رحمانی میں ان کی کامیاب تدریس کے چرچے پہنچنے لگے، نہ اس پر حیرت ہوئی اور نہ تعجب کہ وہ ہر طرح اس کے مستحق تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ امارتِ شرعیہ کے شعبۂ قضاء میں منتقل کردیئے گئے اور دیکھتے دیکھتے قاضی القضاۃ کے منصب عالی تک پہنچے۔ امیر شریعت مرحوم دارالعلوم کی شوریٰ میں تشریف لاتے تو عموماً قاضی صاحب رفیق سفر، دارالعلوم میں داخلی سیاست کا بھی ایک چھوٹا موٹا اکھاڑہ ہمیشہ رہا، امیر شریعتؒ ہمہ گیر شخصیت کے مالک اور مرجعِ خاص وعام۔ ادھر قاضی صاحبؒ ان کے مزاج شناس، سیاسی داؤں پیچ کو سمجھنے میں فہیم، اکھاڑ پچھاڑ کی سیاست کے رموز سے واقف،

بہتوں کو تو امیر شریعتؒ تک پہنچے نہ دیتے، جواب امیر شریعت کے مزاج کا آئینہ دار ہوتا، مسلم پرسنل لاء بورڈ نابود سے بود ہو چکا تھا، اب بیشتر اس کے اسٹیج بعہد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم وحضرت علی میاں علیہ الرحمہ، امیر شریعت جنرل سکریٹری رہے اور بہت کامیاب، بارہا دیکھا کہ اراکین کے غیظ وغضب، ان کے پُر جوش نعروں اور ہنگامہ خیز مطالبوں پر امیر شریعت مرحوم قاضی صاحب کو جوابدہی کے لیے کھڑا کرتے اور قاضی صاحب اپنی نرم وگرم مدلل گفتگو سے کبھی جلتی ہوئی آگ پر پانی ڈالتے تو اٹھتی ہوئی آندھی کو روکتے، امڈتے ہوئے طوفان کے مقابلے میں آتے اور یہ بھی خوب جانتے کہ کون کہاں سے بول رہا ہے، اس کی چیخ وپکار کے پس پردہ کون معشوق پائے کوب ہے، اس لیے حسبِ مرض نسخہ تجویز کرتے اور شافی پرہیز، بھوپال کی ایک نامی گرامی شخصیت اصلاحِ معاشرہ کا اہم عنوان مسلم پرسنل لاء سے چھیننا چاہتی، آج تک یاد ہے کہ دہلی کی میٹنگ میں یہ ایک گوشے سے سرحدی انداز میں بھرپور یلغار کر رہے تھے، قاضی صاحب خوب سمجھتے کہ ان کے حدود اربعہ کیا ہیں اور ان کا نفس ناطقہ کون! دو چار ہی منٹ میں ان کی شورشِ کو خاکستر کر دیا اور اس طرح کے واقعات ان کی زندگی میں کم نہیں۔

بہرحال! صدارت، نظامت اور قاضی کی رزانت، مسلم پرسنل لاء کو کھینچتی رہی اور چشم اعداء سے اس گھروندے کو بخوبی بچایا، آدمی کو بھی خوب پہچانتے اور ہر ایک کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ ہوتا، ان کی صدارت کے فوراً بعد بنگلور میں بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا، قاضی صاحب صبح گاہی ناشتے میں مصروف، ملاقات کے لیے حاضر ہوا، تو خدام مجھ سے ناواقف، مجھے بے نیل مرام واپس کیا اور وہی غالب والی بات پیش آئی۔ ؏

یاد تھیں جتنی دعائیں صَرف درباں ہو گئیں

قاضی صاحب کو معلوم ہوا، مجھے اندر بلایا پھر ان خدام کو جو جھاڑ بتائی وہ صورِ اسرافیل سے کم نہ تھی، بلکہ قیامت خیزی میں اس سے بڑھ کر، مجھ سے خاص طور سے فرمایا کہ آپ کو اس موضوع پر تقریر کرنا ہے اور بہ اصرار، آخری دور علالتوں سے لبریز اور قاضی

صاحب مجموعۂ امراض، مجھے ایک ذاتی کام کے لیے ان سے ملنا ضروری تھا، فون پر وقت طے ہوا اور میں بعد مغرب رہائش پر پہنچا، صاحبِ فراش اور بستر پر نیم دراز، میں نے چاہا کہ اسی حالت میں مصافحہ کرلوں، مجھے روکا اور خدام کو حکم دیا کہ مجھے کھڑا کرو، حرفِ مطلب بیچ میں آیا تو یہ کہتے ہوئے کہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ میرے ان سے تعلقات ہیں، فون اٹھایا اور گل برگہ فون کیا اور یہ فرمایا کہ یہ مخدوم ابن مخدوم عالم تشریف فرما ہیں، اگر ان کا کام نہیں ہوا تو پورے بورڈ کو آپ کے پیچھے لگا دیا جائے گا۔ مخاطب بھی ذی ہوش تھے، کشتی کو بھنور میں دیکھا تو اپنی مشکلات کا ذکر شروع کر دیا، قاضی صاحب نے فرمایا کہ سب کچھ کر دیا جائے گا۔ مگر شاہ صاحب کا کام ضروری ہے۔ پھر والد مرحوم کے بے کراں علوم پر گفتگو شروع کی، میں نے کچھ ابا جی کے لطائفِ علمیہ ذکر کئے، تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سر دھنتے اور زبان پر سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے، ارے شاہ صاحب! یہ علمی امانت کیوں چھپائے بیٹھے ہیں، اسے آشکارا کیجئے، حضرت شاہ صاحب کے افادات کو مجھے دیجئے کہ میں ان کی طباعت کا انتظام کروں۔ میرے دل ودماغ کی زمین پر میرے سب سے پہلے استاذ جو حضرت شاہ مرحوم کے باختصاص شاگرد تھے، نے عقیدت کی تخم کاری کی، جو خدا کا شکر ہے کہ اب بڑھ کر شجر بارآور ہے۔ رات کافی گزر چکی تھی، میں ان کے آرام کے خیال سے گفتگو ناتمام چھوڑ آیا، اس فانی عالم میں یہ مرحوم سے آخری ملاقات تھی۔ سینکڑوں قضاء کے فیصلے کئے، تین درجن کے قریب اپنے پیچھے تصانیف چھوڑیں، عصر حاضر کے الجھے ہوئے مسائل کا حل تلاش کیا، فکر وفقہ کی سینکڑوں راہیں کھولیں، محتاط تھے اس لیے دونوں پہلو دکھا دیتے، اپنا قطعی فیصلہ سنانے سے گریز ہوتا۔ اس کے باوجود قدیم حلقہ بھڑک اٹھا، لیکن قاضی صاحبؒ ع

خموشی گفتگو ہے اور بے زبانی ہے زباں میری

کا مرقع۔

آہ! اب یہ ممتاز دانشور، یہ مفکر، یہ فہیم، یہ فہم وذکاء کی قندیل، یہ ذہانت ورزانت کا

پیکر، بہار کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا، لیکن ع

رفتید ولے نہ از دلِ ما

یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ نہ وہ ملت فروش تھے، نہ ضمیر فروش، انہوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کا وقار بڑھایا، اس اہم اور مضبوط اسٹیج کو نہ اقتدار کی چشم وابرو پر اپنے موقف سے ہٹنے دیا اور نہ شخصی مفادات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا۔ وہ تو مغفور ہیں انشاء اللہ! لیکن مسلم پرسنل لاء کے لیے دعائیں اور ان کے صحیح جانشین کا انتخاب ملت کی بڑی ضرورت ہے، لاریب ع

دوانہ مرگیا آخر کو، ویرانے پہ کیا گذری

فرحمۂ اللہ رحمۃً واسعۃً

(جلد ۱، شمارہ ۹، بابت ماہ اپریل ۲۰۰۲ء)

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی صاحبؒ ☆

سال گذشتہ دوشوال المکرم ۲۶ءکو صاحب زادہ محترم، خلف الرشید، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے لخت جگر، ثمرۃ الفواد، مولانا اسعد صاحب اپنے رہائشی مکان پر گرے، جس سے دماغ میں چوٹ آئی، وہ بہت پہلے سے ہی مریض بلکہ مجموعہ امراض تھے، مزید یہ تکلیف جانکاہ، معاً انہیں دہلی کے مشہور ہسپتال ''اپولو'' میں داخل کیا گیا اور معالجہ کی تمام سہولتوں کے باوجود تقدیر الٰہی کو کوئی دوا روک سکی، نہ کوئی

☆ حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی صاحبؒ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر ہیں۔

۶ر ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۷ر اپریل ۱۹۲۸ء میں اس دنیائے دنی میں قدم رنجہ ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا قاری محمد اصغر صاحبؒ کی زیر نگرانی حاصل۔

اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم میں داخل ہوکر ۱۹۴۹ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم ہی میں تدریسی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۹۶۲ء تک یہ خدمت انجام دی۔

۱۹۵۶ء میں جمعیۃ العلماء دیوبند کے نائب صدر کی حیثیت سے سرگرم رہے اور مختلف مرحلوں میں ضلعی، صوبائی پھر مرکزی جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہ کر ملی خدمات انجام دیتے رہے۔ جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے وابستہ رہ کر آپ نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۹۴ء تک مختلف مرحلوں میں کانگریس پارٹی کے ٹکٹ سے آپ راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے۔ اس طرح مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ سیوہاروی کے بعد سیاسی میدان میں ملی سیادت کے تعلق سے جو خلا پیدا ہوا تھا کسی حد تک اسے پُر کرنے کی آپ نے کوشش کی اور ارکان حکومت کے ایوان میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و زیادتی اور ان کے حقوق کی آواز بلند کرتے رہے۔

۷ر محرم الحرام ۱۴۲۷ھ مطابق ۶ر فروری ۲۰۰۶ء بروز پیر آپ کا انتقال ہوا اور مزار قاسمی دیوبند میں مدفون ہوئے۔

دارو، نہ حاذق ڈاکٹر نہ ڈاکٹری کے مؤثر معالجے۔

ان کے والد مرحوم مرشد کامل، سپاہی، مجاہد، نڈر انسان، سخی، بلکہ ابر سخا، کریم، کرم نفسی کے پیکر مولانا اسعد صاحب مرحوم نے اپنی ان آبائی روایات کو بڑی حد تک نبھایا، وہ جمعیۃ العلماء کے صدر نشین رہے، دارالعلوم دیو بند کے قائد، مسلم فنڈ دیو بند کے بانی اور بہت سی ملّی وملکی تحریکات کے معمار و شریک تھے، خانقاہ مدنی ان کے انفاس سے گرم، ہندوستانی سیاست میں ان کے آتشیں نفوس سے تپتا ہوا ماحول، مستعد، فعال، دوڑ دھوپ، جدو جہد ان کا امتیاز، لاریب وہ وسیع الحوصلہ وفراخ دل تھے، انہوں نے بڑے سے بڑے مجرم کو بھی معاف کرنے میں تأمل نہ کیا جس کا مظاہرہ خاتمۂ عمر تک بھی ہوتا رہا، کون ایسا ہے جس کی تمام زندگی اختلاف کے زد میں نہ ہو۔ چناں چہ مرحوم کی بھی سیاسی مصروفیات پر اشکالات بھی رہے اور بے چینیاں بھی، تاہم وہ ہر مخالفت کو برداشت کرتے، مصلحت شناسی ان کا عنصر غالب تھا، اپنے نامور باپ کے ہر گوشے میں جانشینی کی اور کافی حد تک اس کا حق ادا کیا، خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کاملہ فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق، یہ خاکسار جوان کے عظیم باپ کا ادنیٰ شاگرد ہے، ان کے خاندان کے غم میں برابر شریک ہے اور حقیقتہً یہ غم صرف کسی ایک خاندان کا نہیں بلکہ ملت کا جاں سوز حادثہ ہے، معہد الانور میں مرحوم کے لیے ایصال ثواب ودعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا اور جلسہ تعزیت کا انعقاد بھی، جس میں راقم الحروف کے ساتھ تمام اساتذہ واراکین ادارہ نے شرکت کی، ان کی وفات حسرت آیات پر یہی کہا جاسکتا ہے۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنون جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

فرحمه الله رحمة واسعة

(جلد ۵، شمارہ ۶، بابت ماہ جنوری ۲۰۰۶)

OOO

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ☆

پچھلے دنوں ہمارے قیمتی علمی سرمایہ پر موت کے حملوں نے ایک اور قیمتی جان لے لی، مولانا عبداللہ عباس ندوی المرحوم کے نام وکام سے پرانی واقفیت تھی اور حضرت علی میاںؒ کے حادثۂ رحلت کے بعد ندوۃ العلماء کی انتظامیہ میں جن شخصیتوں نے افق شہرت سے طلوع کیا، اس میں مولانا مرحوم کی ستودہ صفات شخصیت بھی شریک رہی، چند ماہ پہلے عصر اور مغرب کے مابین باہر سے اطلاع ملی کہ مولانا عباس صاحب ندوی تشریف فرما ہیں، خیال یہی تھا کہ تام جھام خدام کی لمبی چوڑی قطار اور نقیبوں کی ''با ادب با ملاحظہ ہشیار باش'' کی دہشت خیز آوازیں گونج رہی ہوں گی۔ لیکن دیکھنے پر تمام تخیلات غلط ثابت ہوئے، دوپلی ٹوپی، سادہ لباس و پوشاک، تواضع و فروتنی کا پیکر زیبا تھا۔

اپنی گفتگو، اپنے انداز، اپنے طور وطریق سے یہ تاثر دے گئے کہ وہی پرانی درس گاہوں کی یادگار، قدامت کے شاہ کار اور آثار قدیمہ میں شمار کئے جانے والے عجوبہ روزگار ہیں، یہ پہلی ملاقات تھی اور آخری، حقیر تو مسلسل بکواس کرتا رہا اور جس کا

☆ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ: ولادت ۱۹۳۵ء اور وطن پھلواری شریف، پٹنہ بہار ہے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی پھر وہیں ادب عربی کے استاذ مقرر ہو گئے، اس کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے سعودی عرب چلے گئے اور تین سال یہاں رہے، پھر انگلینڈ میں تین سال مقیم رہ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

پی، ایچ، ڈی کرنے کے بعد جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں بحیثیت استاذ مقرر ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، رابطہ اسلامی سے بھی بحیثیت مدیر منظمات اور مشیر اعزازی مربوط رہے۔ آپ نے اردو، عربی اور انگریزی میں بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں جیسے: تعلیم لغۃ القرآن (عربی، انگریزی) قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی وانگریزی) تفہیم المنطق اور ردائے رحمت وغیرہ۔

ماہ جنوری ۲۰۰۶ء میں انتقال ہوا اور مکۃ المکرمۃ ہی میں تدفین ہوئی۔

غالب عنصر اول فول تھا، مولانا خاموشی اور عالمانہ وقار سے اس ہرزہ سرائی کو برداشت کرتے رہے، رخصت ہوتے ہوئے حقیر نے اپنی تصانیف پیش کیں، مولانا رخصت ہو گئے، ندوۃ العلماء کی مجالس میں میری تصنیف لالہ وگل کا ایسا وقیع وشاداب تذکرہ فرمایا کہ برادر عزیز مولانا برہان الدین انار اللہ اسمہ نے گرامی نامہ سے نہ صرف مولانا کے تاثرات کی حوصلہ افزا خبر دی، بلکہ اشتیاق کے ساتھ خود بھی اس تصنیف کا مطالبہ فرمایا، میرے تساہل پر تذکیر، ایک روز یہ دلدوز خبر کہ مولانا ندوی مرحوم جوارِ رحمت میں جا پہنچے گویا کہ ؏

ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی

مولانا ندوی مرحوم علمی شخصیت اشاعتِ علم کے لیے سراپا حرکت اور ندوۃ العلماء کی ہمہ جہت خدمت کے لیے مستعد رہتے، خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ندوۃ العلماء کی صف میں اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اعجاز قدرت کا مظاہرہ فرمائے۔ آمین

(جلد/۵، شمارہ/۶، بابت ماہ جنوری ۲۰۰۶ء)

حضرت مولانا اکبرعلی صاحب سلہٹی

زندگی انسان کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر کچھ چہچہایا، کوئی دم میں اڑ گیا

فانی زندگی جلوۂ صد رنگ کی حامل اور اپنے پیچھے غموں واندوہ، رنج والم کی عبرت خیز داستان چھوڑنے والی ہے، یہ غافل انسان کیا سوچتا ہے، کیا سمجھتا ہے، اس کا وہی حال ہے ؎

دُنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام برا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

پھر بھی اس فانی کائنات میں بعض ایسی برگزیدہ شخصیتوں کا بھی سانحہ پیش آتا ہے جن کی حیاتِ ناسوتی کا ہر لمحہ دوسروں کے لئے درسِ ہدایت اور سبق عبرت خیز تھا۔

حضرت مولانا اکبر علی صاحب سلہٹی المعروف ''بامام صاحب'' ان ہی نفوس قدسیہ میں سے تھے کہ بظاہر مجموعہ استخواں لیکن ہر نفس آتشیں، دیکھنے میں مرزا پھویا، لیکن بباطن شعلۂ جوالا، تقریباً تیس سال گذرتے ہیں کہ سلہٹ میں پہلی ملاقات اور سنت چودھریؒ کے دسترخوان کرم پر شرفِ ہم طعامی، کچھ بزرگوں کے واقعات زیر گفتگو آئے تو موصوف نے زور سے نعرہ لگایا، میں گھبرایا لیکن چند ہی لحظات میں صورتِ حال کو بھانپ لیا کہ مولانا اپنے آتش دان سینے سے وقفے وقفے سے انگارے پھینکتے ہیں اور یہ

سلسلہ تھانویت کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کوئی ”آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد“ کا منظر اور ”کچھ عمر روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں“ کا نظارہ۔

مولانا کی پوری زندگی دیوار گریہ کا مرقعہ اور گریۂ یعقوب کا تسلسل تھا ”من حیث لا یحتسب“ ملتا اور بے دریغ لٹاتے، آخر عمر میں شادی خانہ آبادی کا مکرر شوق پورا کیا، دو تین سال پہلے بنگلہ دیش حاضری پر مجھ سے فرمایا کہ ”غریب خانے پر چلو“ اندر سے بچی گود میں لئے ہوئے آئے، منظر دیدنی تھا، خود سیاہ فام تابرنگ حجر اسود، یہ بچی شگوفہ ابیض، میں سراپائے حیرت کہ کالوں میں یہ گوری چٹی کہاں سے آئی۔ خود فرمایا کہ ہم اسے کسی کو دکھاتے نہیں کہ نظر بد نہ لگ جائے، آپ سے دعاء لینی تھی اس لئے سامنے لائے، آہ! کہ یہ مقدس اور پاکیزہ زندگی اب عالم جاودانی کی مکین ہے، مغفرت تو انشاء اللہ یقینی ہے، حصول فردوس اعلیٰ کی دعائیں برزبان ہیں۔

(جلد/۶، شمارہ/۶،۷، بابت ماہ جنوری وفروری ۲۰۰۷ء

○○○

مولانا رضاء الکریم چاٹگامی

مولانا رضاء الکریم چاٹگامی بنگلہ دیشی، یہ میرے رفیق درس تو نہیں، لیکن طالب علمی کا زمانہ ایک ہے، درجات ان کے آگے تھے اور میرے متوسط، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے خصوصی شاگرد، مستعد باستعداد، لائق سراپائے لیاقت، امہاتِ کتب کا تکرار کراتے اور میری آنکھ نے سوڈیڑھ سو مستفیدین کا ہجوم کسی کے تکرار میں نہیں دیکھا بجز مولانا رضاء الکریم صاحبؒ کے، بنگلہ دیش کے مشہور شیخ طریقت ''حافظ جی حضور'' کے مسترشد ومجاز تھے۔ حالیہ بنگلہ دیش کے سفر میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم کی درسی تقریروں پر جس کے مرحوم جامع ومرتب تھے باصرار مجھ سے تقریظ لکھوائی، یہ ان سے آخری ملاقات تھی، سانحہ وفات پیش آیا تو اخی فی اللہ مولانا ابوجعفر سابق استاذ جامعہ امام انور دیوبند کی کرم فرمائی کہ اسی وقت حادثۂ جانکاہ کی اطلاع دی، ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا سلسلہ غیر منقطع رہا، خدا تعالیٰ بزرگِ اکبر وعزیز اصغر ہر دو کو اپنی خصوصی رضاء اور کبریائی کے مقام کا ذائقہ شناس بنائے ہر دو بزرگ اپنے امتیازی مقام خالی کر گئے، بظاہر بقول غالبؔ

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پر صلا میرے بعد

اس جاں گسل واقعہ پر آواز یہی نکلتی ہے جو حسرتوں میں ڈوبی ہوئی اور حقیقتوں کا اعتراف ہے۔

اللہ بس باقی ہوس۔

(جلد/۶، شمارہ/۶، ۷، بابت ماہ جنوری وفروی ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا عاشق الٰہیؒ صاحب بلند شہری☆

ہندو پاک کے ممتاز عالم، بلند شہر (یو۔ پی) کے باشندے، پاکستان کی راہ سے آخر کار مقدس ترین مقام مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً، جا آباد ہوئے اور زندگی کا بڑا حصہ اسی سرزمین پاک پر گزرا، مرحوم قدیم طرز کے عالم تھے اور اپنے فکر و قلم کے اعتبار سے بھی متقدمین کے انداز کے حامل، اتباع سنت کا نمایاں تھا، جس سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں لیکن فقہ میں بھی قدیم تصریحات کو بہ شدت اپناتے، سرمو اس سے انحراف گوارہ نہیں تھا، طبعاً کریم، شریف النفس، فیاض، جود و سخا کے عادی، سب سے بڑھ کر مستغنی، اور توکل علی اللہ میں پختہ کار، عجیب بات ہے کہ مرحوم سے شفاہی ملاقات کی سعادت کبھی

☆ حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحبؒ بلند شہری: ۱۳۴۳ھ میں جناب محمد صدیقی صاحب کے گھر پیدا ہوئے آپ کا وطن اصلی موضع بسی، ڈاکخانہ کبراسی ضلع بلند شہر یوپی ہے۔

ابتدائی تعلیم عالاتے ہی میں حاصل کی، کچھ عرصہ بعد مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں رہے اور اس کے بعد ۱۳۶۰ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہو کر ۱۳۶۳ھ میں دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے، فراغت کے کچھ دن بعد مدرسہ آثار اولیٰ بنانہ ضلع گوڑ اس میں بحیثیت مدرس خدمت انجام دی، ۱۳۸۴ میں پاکستان چلے گئے اور دارالعلوم کراچی میں تقریباً بارہ سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔

۱۳۹۶ھ میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع فرمایا۔ چناں چہ آپ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تقریباً ایک سو تین کتابیں ہیں۔ جن میں ''مجانی الآثار من شرح معانی الآثار تفسیر انوار البیان، زاد الطالبین، انعام الباری فی شرح اشعار البخاری'' جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔

۱۲ ررمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۸ رنومبر ۲۰۰۱ء کو راہی ملک عدم ہوئے اور مدینہ منورہ ہی میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر مبارک سے متصل تدفین عمل میں آئی۔

نصیب نہیں ہوئی، البتہ دار العلوم کے قضیہ غیر مرضیہ میں، جب ساؤتھ افریقہ کا وفد مسئلہ دار العلوم پر گفتگو کے لئے دیو بند پہونچا تو خاکسار کی تمام مفاہمت و مصالحت کی کوششیں اگرچہ ناکام رہیں، لیکن مرحوم کو اس کی تفصیلی رپورٹ بھائی پاڈیا مرحوم نے گوش گزار کیں اور میری مخلصانہ کوششوں کی تفصیل بھی، جس پر مرحوم کا پہلا اور آخری مکتوب گرامی بنام احقر موصول ہوا، مضمون میری مساعی کی داد، مزید کوششوں کی دردمندانہ اپیل تھی، جس کا جواب احقر نے مفصل دیا، کثیر التصانیف تھے اور ہر تصنیف پر از معلومات اور ان کے مزاج کی آئینہ دار۔ خدا تعالیٰ فردوس اعلیٰ میں مع الصالحین وصدیقین بلکہ مع العاشقین بلند تر مقام عطا فرمائے۔

(جلد:۱، شمارہ:۸، بابت ماہ مارچ ۲۰۰۲ء)

○○○

مولانا سیّد جلیل میاں حسین صاحبؒ دیوبندی☆

لیجئے! میرے ہم درس، یار غار، ظریف الطبع، بذلہ سنج، ہمہ جہت، ہمہ رنگ——، اچانک موت کی آغوش میں ابدی نیند سو گئے، یہ تھے محترم ومکرم مولانا سید جلیل میاں صاحب، حضرت المحترم میاں اصغر حسین قدس سرہ کے پوتے، الحاج سید بلال صاحب المغفور کے صاحبزادے۔ دیوبند کے نیک نام، بزرگ اطوار، معصوم وسادہ لوح، حضرت میاں جی منّے شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے گراں قدر خانوادے کے فرد فرید۔

غالباً ۱۳۵۷ء میں شعبۂ فارسی میں مرحوم جلیل صاحب میرے شریک درس رہے لڑکپن وبچپن طالب علمانہ انداز کے حامل، چھتہ کی مسجد میں باہر کی جانب کنواں تھا، شعبۂ فارسی سے جو اس وقت احاطہ مولسری میں واقع تھا ایک گلی اس کنوے تک جانکلتی، گرمی کا زمانہ وقت شام (ٹونو نامی قریشی) سر پر ایک کچھالی ٹوکرے میں لیے ہوئے، اسی کنویں کی من پر آبیٹھتا، دو آنے سے تا آٹھ آنے لذیذ وخوش ذائقہ قلفی، بار مصارف کبھی مجھ پر پڑتا اور کبھی میاں صاحب مرحوم کے دوش تنومند پر۔

یہ ایک آدھ دن کا شغل نہیں، بلکہ تا آمد موسم سرما جب تک ٹونو اس قلفی کی کھپت

مولانا سید میاں جلیل حسین صاحبؒ: محدث دارالعلوم حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پوتے اور حضرت حاجی سید بلال احمد صاحب علیہ الرحمہ کے صاحب زادے، اپنے اکابر کی نسبتوں کے امین اور خانقاہ اویسیہ دیوبند کے وارث۔

دیوبند کے معروف ومحترم ''میاں'' خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی سے انتہا تک کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد ہی سے خانقاہ اویسیہ کے نظام کو سنبھالا اور سینکڑوں تشنگان حق کو ذات باری سے ملایا۔

۱۸ر دسمبر ۲۰۰۶ء میں انتقال ہوا اور مسجد بلال دیوبند سے متصل قبرستان میں تدفین ہوئی۔

خریداروں میں دیکھتا، لے کر پہنچتا اور دو خریدار روز آنہ اس قلفی کو خریدتے، پھر ہماری اور میاں صاحب کی راہیں جدا ہو گئیں، میں انگریزی اور غیر منقسم پنجاب یونیورسٹی سے فارسی، اردو امتحان دینے کے لیے دہلی پہنچ گیا۔ میاں صاحب دارالعلوم دیوبند میں برابر پڑھتے رہے۔

اب ملاقات برسرراہ ہے اور وہ بھی گاہے گاہے۔

میرے ماموں زاد بھائی حکیم محمود علی مرحوم کی شادی، میاں صاحب کی حقیقی ہمشیرہ سے ہوئی، تقریب خانہ آبادی کی ابتدا میں برابر ملاقات، لیکن تسلسل پھر بھی قائم نہ ہو سکا، وہ دارالعلوم دیوبند میں سفیر رہے اور آخر میں کتب خانہ میں محرر، پھر انہوں نے خانقاہ سنبھالی اور اس حقیر نے مے خانہ علم وکمال کی ساقی گیری۔

۲۸ رسال دارالعلوم میں پڑھایا اور چوبیسواں سال وقف دارالعلوم میں، مشغلہ معلم الصبیانی بیتنے کو آتا ہے، دارالعلوم کے مشہور اختلافات کے زمانہ میں "کج دار و مریز" (یعنی گلاس کو الٹا کر دو لیکن پانی گرنے نہ پائے)۔

اس حکمت عملی پر میاں صاحب اور ان کا پورا خاندان رواں دواں رہا، کبھی ہمارے جلسہ میں شریک اور گاہے حریف کی محفلوں میں سامان رونق اور دست بدعاء۔ بات تو لمبی ہو جائے گی، تاہم وفات سے تین یوم پہلے خاکسار کے ذاتی ادارہ "معہد الانور" کے اساتذہ وکارکنان نے صدارتی ایوارڈ کے سلسلہ میں مجھے استقبالیہ دیا، میاں جلیل صاحب مرحوم استقبالیہ کے صدر، یہ غالباً تین چار سال کے بعد ملاقات تھی۔

اب دیکھا تو مجموعہ استخواں، بینائی بھی اپنا کام بڑھاپے کی وجہ سے کم کر چکی تھی، تاآں کہ اپنے بچپن کے ساتھی کو بھی نہیں پہچانا۔

مولانا ابراہیم بستوی نے میرا تعارف کرایا، تو اپنے خاص انداز میں مختصر گفتگو کی، لڑکپن کی اداؤں کے بجائے بڑھاپے کا وقار، خانقاہ میں مسند نشین ہونے کا رکھ رکھاؤ، کسے معلوم تھا کہ اس ناسوتی زندگی میں مرحوم سے یہ آخری ملاقات ہے، پیر کے دن صبح نماز فجر تلاوت قرآن میں مشغول تھا کہ جامع مسجد کے اعلان نے دل کو ہلا دیا، یہ میاں

صاحب کی رحلت کی اندوہ ناک خبر تھی، فی الفور دولت خانہ پر حاضری دی، جو اس وقت غم کدہ بنا ہوا تھا، دیکھا، تو چار پائی پر بے حس وحرکت جسم ناتواں راحت کی نیند لیتا ہے، گویا کہ وہی بات ع

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

موت سرہانے کھڑی ہوئی، آنے جانے والوں کو یہ نصیحت وعبرت سے لبریز پیغام دے رہی تھی ع

آدمی بلبلہ ہے پانی کا

بلبلہ ٹوٹا اور اپنی اصل میں جا ملا۔ لیجئے لگے ہاتھوں ''انا الحق'' کا دشوار مسئلہ بھی حل۔ ظرافت ان کا امتیاز تھا، بذلہ سنجی شعار، ان آخری دنوں میں بھی کبھی رگ ظرافت پھڑکتی تو ایک نامور بیمار کے متعلق کہتے کہ ''ہم دنوں مریض، دیکھو بازی کون مارے؟'' اور واقعتاً وہ بہت سے مواقع پر بازی مار چکے تھے، یہاں بھی بازی مارنے سے نہ چوکے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

(جلد: ۵، شمارہ: ۳، ۴، ۵، بابت ماہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء)

جناب مولانا سیّد احمد ہاشمیؒ صاحب ☆

میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس کار معلم الصبیانی انجام دے رہا تھا کہ غازی پور کا یہ نوجوان احاطہ دفتر دارلعلوم میں مقیم ہوا، نہ دید نہ شنید، اور سچی بات یہ ہے کہ وہ جب تک جمعیۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ ہوکر دہلی مقیم نہیں ہوئے اس وقت تک انؒ سے نہ تعارف تھا اور نہ اس کی شخصی صلاحیتوں کی اطلاع، کبھی کبھار دفتر جمعیۃ العلماء، عبدالنبی میں آمنا سامنا مع سلام ودعاء ہوجاتا۔ اور بس...... جمعیۃ العلماء کے دور نظامت پر ان کی جلیل خدمات سامنے آئیں اور محسوس ہوا کہ سلیقہ قرینہ کے ساتھ سیاسی تدبر سے بھی

☆ جناب مولانا سیّد احمد ہاشمی ابن سیّد محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ: کی ولادت باسعادت ۷/شوال ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۷/جنوری ۱۹۳۲ء ہے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ دینیہ غازی پور میں حاصل کی۔ بعدازاں ۱۹۴۸ء میں شہر میں ایک ایسا بھیانک سیلاب آیا کہ جس کی وجہ سے شہر میں بہت سے مکانات بہہ گئے، جن میں ان کے خاندان والوں کے مکانات بھی تھے۔ آپ کے بڑے بھائی سیّد حافظ محمد نے خاندان کے ساتھ انہیں بھی کلکتہ آجانے کو کہا، جہاں وہ تجارت کرتے تھے۔ متوسط اور اعلیٰ تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ میں حاصل کی۔

۱۹۵۵ء میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی اور ۱۹۵۷ء - ۱۹۷۴ء کے عرصے میں کلکتے میں ہی قیام رہا، اس دوران انجمن ندائے اسلام کے مدرسے میں تدریس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور صحافی میدانوں میں سرگرم عمل رہے۔ نیز ''ارمغان'' ''کندن'' نام کے ہفت روزے نکالے اور صوبہ بنگال کی جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۹۷۴ء میں راجیہ سبھا (ایوان بالا) کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۹۰ء میں دہلی کی اسلامی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔

بالآخر یک شنبہ ۱۷/شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ مطابق ۴/نومبر ۲۰۰۱ء کو وفات واقع ہوئی اور ۱۸/شعبان کی درمیانی شب میں دہلی دروازہ کے قبرستان میں غازی عبدالرشید کی قبر کے قریب تدفین عمل میں آئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

خالی نہیں، دارالعلوم کے واقعات شروع ہوئے تو یہیں کے مہمان خانہ میں ان سے ایک طویل ملاقات ہوئی اور میں نے حقائق مع شواہد پیش کیے لیکن مرحوم نے بھرپور سکوت اختیار کیا جو اس کی کھلی علامت تھی کہ ان کا ذہن ایک جانب میں کام کررہا ہے اور اس اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ دارالعلوم کے کیمپ کے قیام کے وہ بڑے ذمہ دار تھے لیکن قدرناشناس حلقہ سے انہیں ان کی وقیع خدمات کی داد تو کیا ملتی، عہدۂ نظامت سے بھی معزول کردیئے گئے اب ان سے ملاقاتیں زیادہ ہونے لگیں، ملّی ومذہبی اجتماعات میں وہ بہ اہتمام شرکت کے عادی تھے، جو ان پر بیتی تھی اس سے متعلق حرفِ شکایت یا مضمونِ غیبت ان کی زبان پر نہیں تھا، جاں گسل بیماریوں کا ہجوم آخرکار اپنی یلغار میں کامیاب رہا اب وہ دہلی کے گورستان میں ابدی نیند سوتے ہیں، خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کاملہ فرمائے۔

(جلد:۱، شمارہ:۸، بابت ماہ مارچ ۲۰۰۲ء)

○○○

جناب مولانا فقیہ الدین صاحبؒ ☆

عجیب وغریب شخصیت، عنایات وشفقتوں، گرم گفتاری بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کی حد تک پہونچ جانے والی محیر العقول ہستی۔ میں دہلی میں طالب علمی کرتا یہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہے، مدرسہ امینیہ میں مولوی سید محمد میاں ابن حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری مرحوم، خود برباد لیکن دوسروں کو آباد کرنے کا جذبہ وافر، اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو تخریب کی راہ پر ڈال دیا اور دوسروں کی تعمیر میں سرگرم، یہ مولوی محمد میاں دیوبند بھی رہ چکے تھے اور برادر اکبر مولانا ازہر شاہ قیصر صاحب کے حلقہ احباب میں تھے، میں دہلی پہنچا تو غربت وناداری میں جن چند افراد کو صرف اس لیے منتخب کیا کہ وہاں ایک چائے کی

☆ استاذ القراء قاری ضیاء الدین صاحب الٰہ آبادی کے پوتے اور قاری عصام الدین صاحبؒ کے صاحب زادے حضرت مولانا مفتی فقیہ الدین صاحب: آپ کا وطنی تعلق قصبہ نارا ضلع الٰہ آباد سے تھا اور تاریخ ولادت ۱۹۲۲ء ہے۔

حفظ وقرأت سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد شعبۂ افتاء میں رہ کر فتویٰ نویسی کی مشق کی۔

فراغت کے بعد دہلی گئے اور پھر وہیں کی خاک کا پیوند بنے۔ آپ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کے اس سرگرم گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جس نے ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد مسلمانوں کو خصوصاً دلی والوں کی تعمیر وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جمعیۃ العلماء کے سرگرم کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کانگریس پارٹی سے بھی وابستہ رہے، کئی مرتبہ میونسپلٹی کارپوریشن کے ممبر اور وقف بورڈ مساجد کمیٹی کے چیرمین بھی رہے۔ آخر عمر میں سیاسی سرگرمیوں سے یکسو ہر کر مدرسہ عبدالرب میں درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے تھے۔

۱۶ رفروری ۲۰۰۲ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا اور دہلی ہی میں تدفین ہوئی۔

پیالی گرم گرم مل جائے ان میں مولوی محمد میاں مرحوم بھی تھے۔ان مرحوم کا کھانا پینا مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب کے ساتھ تھا اور اسی فقیہ اعظم کی زیر نگرانی تعلیمی شغف، لیکن۔ شمشیر نیک زآہن بد چوں کند کسے۔

خدارا اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ مولوی محمد میاں مروج آوارہ گردی کا شکار تھے، ایسا ہرگز نہیں، ہاں پڑھنے پڑھانے کی دنیا سے اتنے دور تھے کہ اس وادی نمناک کے قریب سے گزرنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ ہر وقت سیاسی بحثیں، سیاسی گتھیوں کا حل، بزعم خود آنجہانی گاندھی جی، بہ خیال خویش ابوالکلام آزاد، مولوی فقیہ بے چارہ غربت کا مارا، ناداری کا شکار، مولوی محمد میاں کی چائے بناتا، برتن دھوتا، اور مولوی محمد میاں کے سامنے بزاخفش کا کردار ادا کرتا مگر یہ بزاخفشی کام کر گئی گویا کہ گرو گڑ نہ ہوسکا اور چیلا گڑ بن گیا، ۱۹۴۷ء کے بعد دفتر جمعیۃ العلماء کو چند ایسے نوجوانوں کی تلاش ہوئی جو حسبۃً للہ اپنی مصروفیتیں ملی کاموں کے لیے صرف کرسکیں، ان میں مولوی فقیہ الدین صاحب بھی تھے۔اجڑی ہوئی دہلی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، بھاگتے ہوئے لوگوں کو بسایا، افراتفری میں مبتلا لوگوں کے دامن تھامے، دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف مولانا فقیہ الدین ہوگئے بلکہ صوبائی کانگریس کے صدر بھی، الیکشن میں بھی کھڑے ہوئے، میرے ساتھ چاندنی چوک سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ ہندو مسلم سب ان کے قدم لے رہے ہیں۔ اس ہردل عزیزی کو دیکھ کر یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ہار ان کی بے ہنگم زندگی کا نتیجہ تھی دارالعلوم کے قصہ میں ہمارے ہم خیال، ہم نوا، اور دمساز تھے، مرحوم کو ایڈھاک کمیٹی کی رکنیت کے ختم ہونے کا بڑا افسوس تھا، جب ملتے تو گفتگو کا آغاز اس رکنیت سے کرتے اور اپنی اہمیت کو جتاتے اور ہماری بربادیوں کو ان کی سرپرستی قبول نہ کرنے کا نتیجہ بتلاتے تھے، گرم رفتار و گرم گفتار ہونے کی بناء پر کانگریس کو الوادع کہتے ہوئے جنتا دل کی گود میں جابیٹھے، جب قدیم حلقہ نے کسی قدر شناسی کا مظاہرہ نہ کیا تو جدید یاران مجلس ان کی کیا حوصلہ افزائی کرتے، مدرسہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ کے مہتمم بھی رہے اور بہت سے

ملّی اداروں کے کارکن بھی۔ گفتگو کا ایک خاص انداز تھا۔ اور چوں کہ مرحوم نے میری طالب علمی دیکھی تھی، اور یہ بھی کہ مولوی سید محمد میاں کی فیاضیوں سے چھین جھپٹ میں سب شریک ہم نوالہ وہم پیالہ تھے، اس لیے مجھے ڈانٹ ڈپٹ میں بھی کوئی تامل نہ کرتے، آہ کہ یہ دوستوں کا دوست، یہ بے کسوں کی پناہ گاہ، یہ شکستہ حالوں کا غم گسار اب تہہ خاک سوتا ہے۔ حافظ قرآن تھے اور علی گڑھ کے باسی، خدا تعالیٰ اپنی خصوصی مغفرتوں سے انہیں دولت بداماں فرمائے۔ آمین

(جلد:۱، شمارہ:۸، بابت ماہ مارچ ۲۰۰۲ء)

مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوری☆

بلند عزائم، بلند ہمت، بلند پرواز، قدوقامت کے اعتبار سے بھی بلند و بالا، خوں خوار زمانے سے سینہ ٹھونک کر آمادۂ پیکار، بساطِ کی سیاست سے نا آشنا، بستیز وردزباں، شمشیر بدست، تیور چڑھے ہوئے، بقولہ داغ دہلوی۔ ع

بھوئیں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑے ہیں کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

یہ تھے مولانا عبدالوحید صدیقی، کلاہ کلپاق سر پر، سفید یا ہلکی گلابی شیروانی زیب تن، مشین داڑھی، نکلتا ہوا قد، ہاتھ میں چھڑی، جو عصائے پیری نہیں بلکہ العصاء لمن عصیٰ (اس پر بجے گی جو نافرمانی کرے گا) کھدر پوش، تیز رفتار، جوانی میں لحیم وشحیم لیکن ان کی فربہی ناگوار نہیں بلکہ جاذب و پرکشش، غازی پور سے چلے، دارالعلوم دیوبند کے صدر دروازے پر، داخلے کے طالب تھے، کیا عجز، کہاں کی مسکنت، جو ضرورت

☆ ۱۸۹۷ء میں غازی پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالعزیز صدیقی انسپکٹر آف پولس تھے، لیکن آپ کو عربی تعلیم دلائی۔

چناں چہ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل اور حضرت علامہ کشمیری وعلامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ جیسے سلاطین علم سے اکتساب فیض کیا۔

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں ناظم شعبہ تنظیم وترقی بنائے گئے۔ اور رسالہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے مدیر بھی رہے۔

۱۹۵۱ء میں دارالعلوم سے علاحدہ ہوکر دلی چلے گئے اور اپنا ذاتی اخبار ''نئی دنیا'' نکالا جو آج بھی جاری وساری ہے اور انتہائی مقبول بھی۔

بالآخر ۱۹۱۸ء میں وفات ہوئی اور دہلی ہی میں لودھی ہوٹل کے سامنے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

مند کی ہر ادا سے ٹپکتی ہے، وہ داخلے کو اپنا حق سمجھتے، حق کو وصول کرنے میں ہمیشہ معرکہ آرا رہتے، دار العلوم میں اس وقت علامہ کشمیریؒ کی تحریک اصلاح کا آغاز ہو چکا تھا، علامہ نے فارسی میں اہتمام کی کوتاہیوں کی فہرست تیار کی، مقطع کا بند تھا:

"پس اہتمام شما ناپاک است"

مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نائب مہتمم نے استغاثے کا جواب مرتب کچھ اس طرح کیا کہ ہر جرم کا جواب ضروری سمجھا اگر چہ سخن سازی ہی ہو، آخری جملہ یہ تھا:

"پس تحریر شما ناپاک است"

اگر ترازو کے پلڑے میں دونوں کو تولا جائے ایک جانب علم وفضل ہے، اور واقعی قابل اصلاح چیزوں کی نشاندہی۔ دوسری جانب سے صرف جواب ہے، نہ جواب دینے والے کے حسب حال، نہ مخاطب کے شایانِ شان۔

مولانا عبدالوحید صاحب صدیقی جو ہمیشہ مظلوم کے ساتھ رہتے، اور ظالم کی پنجہ شکنی کے لیے مستعد، دیوبند کی اس کشاکش سے خود کو جدا نہ رکھ سکے، آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور یہ کہتے ہوئے معرکے میں گھس گئے، ع

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے دبدبے کا کیا کہنا، شاہی طمطراق، شہنشاہی جلال و جبروت، ہمیشہ دفتر اہتمام، جو ان کی رہائش بھی تھی، سے قدم دب کر گزرتا، لب کشائی ان کی جناب میں گناہ عظیم، کان ہلانا ان کی بارگاہ میں شجر ممنوعہ سے زیادہ ممنوع۔ مدارس میں جب جنگ چھڑتی ہے تو تالیف قلب پر عمل ہوتا ہے، اساتذہ طلبہ وملازمین جن کو کھلا پلا کر، دے دلا کر عہدوں کی پیش کش، منصب پر تقرر، غرضیکہ کردنی ونا کردنی سب کرنی پڑتی ہے، کسی خیر اندیش کی بات سننا گوارا نہیں، مگر یہ پاپڑ بیلنا مرغوب، چناں چہ دفتر اہتمام سے طلبہ کو سوئٹر تقسیم کیے گئے، جن کی قیمت اس زمانے میں چھ آنے تھی۔

صدیقی صاحب نے اہتمام کی ناک کے نیچے اولاً تو طلبہ کو للکارا: ارے او گروہِ

جاہلاں! چھ چھ آنے کے سوئٹر پر ایمان فروشی، لگے ہاتھ اہتمام کو بھی گھسیٹا، اے اربابِ جبہ ودستار! کیا تم ایمان کی قیمت صرف چھ آنہ سمجھے؟ ظاہر ہے کہ اخراج ایسے طاغی پسند کا ضروری تھا، پھر داخلہ اس لیے نہیں کہ راہ راست سے منحرف کسی کو صراط مستقیم پر لایا جارہا ہے، بلکہ اس نقطۂ نظر سے کہ شاید اس نشتر زنی کے بعد مرہم کا یہ مسکن عمل کچھ کارگر ہو، لیکن مرحوم صدیقی کی طغیانی اس حد تک جا چکی تھی، جس پر کوئی بند لگانا بے کار تھا، اسی دوران حزب المجاہدین کی طرف سے ''مہاجر'' نامی اخبار نکلا، جو سچائی کا ترجمان تھا، جواباً طاقت ور گروپ نے ''انصار'' نامی اخبار جاری کیا جس کا واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، صدیقی صاحب ''مہاجر'' کی ادارت سے وابستہ ہو گئے، مرحوم مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حامد الانصاری غازی اور ہمارے صدیقی صاحب ''مہاجر'' کے دائرہ مدیران میں۔ ''انصار'' کے مدیر شہیر مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری اور کچھ چھپے ہوئے رستم، علامہ کشمیریؒ ڈابھیل (گجرات) تشریف لے گئے اور بہت سے ان کے ساتھ بحیثیت استاذ، اب صرف دیوبند میں غازی صاحب اور صدیقی صاحب رہ گئے، اللہ اللہ خیر سلاّ۔

حضرت مولانا مدنیؒ سے ان کا تعلق کیسے قائم ہوا؟ دارالعلوم میں ان کا تقرر ہوا، کس پس منظر میں ہے؟ یہ میرے علم میں نہیں، لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ مولانا مدنی قدس سرہ کا جب اہتمام سے ٹکراؤ ہوا اور جونا گزیر تھا تو صدیقی صاحب اپنے ماضی اور مزاج کے مطابق مرحوم کی صف میں جا شریک ہوئے، میرے بچپن کے شعور نے صرف اتنا محفوظ رکھا کہ دفتر اہتمام جاتے ہوئے چھوٹا سا کمرہ اور اس میں صدیقی صاحب بحیثیت ناظم تنظیم وترقی متمکن۔ ایک دو محرّر، باقی سفراء، مرحوم نے اپنے سلیقہ اور ہنرمندی سے اس شعبے کو دارالعلوم کا جزوِ لاینفک بنا دیا۔ مزاج ان کا کچھ اس طرح سمجھ میں آئے گا کہ سفراء کو ہدایت جاری ہوئی کہ کسی دولت مند کے یہاں بہ انداز فقیرانہ ہرگز نہ جائیں، نہ اس طرز کو اپنائیں ع

اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

بلکہ شیروانی زیب تن، چھڑی ہاتھ میں، دولت مند ہرگز یہ نہ سمجھے کہ کوئی فقیر در آیا، جسے راندہ درگاہ کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ الامیر علی باب الامیر، مولانا خود بھی اس اکڑفوں سے رہتے، صبح کی تیسری ساعت میں بیت الخلاء جانے کا معمول تھا، یہ معمول ہمیشہ دفتر اہتمام کے خصوصی بیت الخلاء میں پورا کیا جاتا، دفتر کا چپراسی شریف نامی پہلے جا کر دروازہ کھولتا، بیت الخلاء کو صاف کرتا، طہارت کے لیے لوٹا بھر کر رکھتا۔ نہ آداب ملازمت کا خیال، نہ رئیس الاہتمام کا کوئی رعب وداب، اسی آن وبان سے آتے جاتے، قناعت پیشہ اس درجہ کہ خاص دوستوں کو معلوم ہوتا کہ آج صدیقی صاحب کے یہاں فاقہ ہے لیکن وہ مجلس احباب میں اس شان سے شریک ہوتے، ایک زوردار ڈکار، داڑھی پر ہاتھ، مونچھوں کو تاؤ، ارشاد ہوتا کہ ''آج کی بریانی لطف دے گئی'' صحیح بات یہ تھی کہ وہ دست سوال کے عادی نہ تھے۔ بلکہ اپنے سلیقے وقابلیت سے دوسروں سے وصول کرتے، میرا دہلی کا پہلا سفر مرحوم کے ساتھ ہوا، مولانا ادریس صاحب میرٹھی ان کے حلقۂ احباب میں تھے، بسلسلۂ علاج آکر تقریباً ایک ماہ ''ادارہ شرقیہ'' میں ٹھہرے، میرا قیام بھی اسی ادارے میں تھا، یہ ادارہ عقب جامع مسجد، کباڑی بازار میں سہ منزلہ میں تھا۔ یہاں مولانا کو دیکھنے سمجھنے کا خوب موقعہ ملا، بحالی صحت پر وہ دیوبند لوٹ آئے اور یہ حقیر بھی ۱۹۴۷ء کے طوفان کے مقابل میں پامردی اپنانے سے عاجز رہا، دارالعلوم میں داخلہ اور فراغت، پھر معلم الصبیانی کا پیشہ، جس پر باون سال گذرتے ہیں، ادھر صدیقی صاحب اخبار ''الجمعیۃ'' کے جنرل منیجر ہوکر دہلی مقیم ہو گئے، یہاں خدایان جمعیۃ سے مولانا کی ٹھناٹھنی ہوگئی، شکست ماننا تو ان کی فطرت نہ تھی، خود مجھ سے ایک ملاقات میں فرمایا کہ ''جمعیۃ کے ناخدا دہلی جامع کے کلس پر براجمان اور مجھے سڑک چھاپ سمجھتے ہیں انہیں اوپر سے نیچے لاؤں گا اور خود پرواز کر کے وسط میں پہنچوں گا جب ہی چین آئے گا'' چند روز کے بعد اخبار ''نئی دنیا'' منظر عام پر خاص شان سے آدھمکا، وقت شناس اور

عصری تقاضوں سے بڑے واقف تھے، سکھوں کی تحریک چل رہی تھی برائے خالصتان، مولانا نے ''نئی دنیا'' کو اس کے لیے وقف کر دیا اور قلم سے ایسی شعلہ باری کی، کہ سکھ اس محاذ پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہوئے، حکومت کے اشک آور گیس کے کنستر خالی اور لگائی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فائر بریگیڈ بے کار نظر آئے، ایک دن یہ بھی دیکھا کہ سرمد شہید کے مزار کے عقب اسٹیج سجا ہوا، سامعین سامنے، مقررین ماسٹر تارا سنگھ، مولانا صدیقی، حافظ شیر علی بہادر بمبئی والے اور سننے والوں میں سکھوں کی تعداد زیادہ، پھر ''ہما'' نکلا، یہ ڈائجسٹ ہے، اور بہت دلچسپ، اس پر جو شعر درج ہے وہ مولانا کے مزاج کا آئینہ دار ہے۔

آخری ملاقات ان کے دولت کدے پر ہوئی، اب بڑھاپا ان کی جوانی چھین رہا تھا، لحیم وشحیم بدن کو جھٹکے دے کر ناتواں کرنے کی کوشش میں مصروف، علامہ کشمیری کی نسبت سے محبت بھی کرتے، تعلق بھی رکھتے، الوداعیہ بڑا پرزور دیا، پھر آخری سفر سفید پوشاک، کل کا تیز رفتار آج دوسروں کے دوش ناتواں پر سوار مگر اس میں بھی طرارہ اور خاموش پیغام۔

جنازہ آگے ہو کر ساتھ والوں سے یہ کہتا ہے
چلے آؤ مرے پیچھے تمہارا رہنما میں ہوں

(جلد:۵، شمارہ:۸، بابت ماہ مارچ ۲۰۰۶ء)

○○○

تذکرہ ہو یا ان کی سادگی و معصومیت کا۔ یہ حضرت علامہ عثمانیؒ چلے آتے ہیں گویا کہ علم کا پہاڑ مصروف حرکت ہے۔ یہ حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ تیزی سے گزر رہے ہیں گویا کہ ''نصرت بالرعب'' کا سراپا، یہ حضرت مدنیؒ ہیں کون کہے گا کہ باشندے تھے ٹانڈہ کے، از سر تا پا عرب کے بدوی۔ کس کا ذکر کیجئے، کسے چھوڑیئے، دیکھئے قلم بہک کر کہاں سے کہاں نکل گیا۔ عذر یہ ہے کہ ؏

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اطباء میں خال محترم مولانا سید محفوظ علی صاحب کی حذاقت کے علم بلند تھے۔ مولانا حکیم صفت احمد صاحب قربان جایئے ان کی سادگی پر۔ ہم بچے کہہ آتے کہ اماں جی نے بلایا ہے نہ یکہ کا مطالبہ، نہ تانگہ کی خواہش، غریب خانہ پر پہنچتے تو بڑا اعزاز یہ تھا کہ پیڑھا دیا جاتا اور حکیم صاحب اسی پر بیٹھ جاتے۔ نباضی کا یہ عالم کی تپ محرقہ کو پہلی ہی منزل پر جا لیتے۔ نسخہ لکھا جاتا تو دوائیاں گن گن کر۔ یہیں حکیم شفیق صاحب مرحوم تھے، دارالعلوم کے پہلے استاذ ملا محمود کے خانوادے سے، چڑچڑا پن ان پر ختم تھا، مطب میں کرسی کہاں؟ ایک جھنگلے پر دراز مریض حالت قیام میں مطب کی چھت ٹوٹ رہی تھی۔ کوئی کڑی چھت سے گرتی تو حکیم صاحب اپنے جھنگلے کو دوسری جانب کھینچ لیتے، جھنگلہ کھینچتے کھینچتے مطب کے ایک کونہ میں پہنچ گیا۔ جب اور جگہ باقی نہ رہی تو خدا تعالیٰ نے ان ہی کو اٹھالیا گویا کہ۔ ؏

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی لاج

سردیوں کا زمانہ تھا، ایک ہندو اپنے بیٹے کو لے کر پہونچا۔ نمبر آیا تو بولا ''حکیم جی! اسے نزلہ ہو رہا ہے'' حکیم صاحب شیر کی طرح دہاڑے کہ میں تو یوں کہوں کہ خدا کرے اس کو نمونیہ ہو جائے۔ جب تیرا یہ بیٹا انگریزوں کا باپ بن رہا ہے کہ اس قیامت کی سردی میں سر کھلا پھر رہا ہے، نزلہ نہیں تو کیا ہوگا، کوئی اس کا علاج نہیں، بس اسے ٹوپہ اڑھا اور سردی سے بچا، یہی علاج ہے۔

اسی ایک واقعہ سے حکیم شفیق صاحب کا انداز مطب واضح ہے۔ مولانا حکیم عبداللطیف صاحب کسی ریاست میں طبیب خاص رہے تھے۔ شیخ الہند کے شاگرد،

علامہ عثمانیؒ صاحب کے رفیق درس، دراز قامت، بھری ہوئی داڑھی، سر پر سفید پگڑی، شرعی پائجامہ، نفاست کے ساتھ نزاکت بھی خوب۔ حکیم صاحب کو جواب دینا بھی گراں تھا۔ ان ہی میں ممدوح جناب حکیم محمد عمرؒ صاحب بھی تھے۔ پہلے تو ان کا حلیہ سنیے، درمیانی قد، از سرتا پا متوسط، ایک کاندھا جھکا ہوا، گھنی داڑھی، سردیوں میں رام پور کی مخملی ٹوپی، موسم گرما میں دو پلی جس میں بیل لگی ہوئی، شیروانی لوازمات میں سے، نہ ہاتھ میں چھڑی نہ آنکھوں میں چشمہ، ہر ٹیپ ٹاپ سے آزاد، صدر چوکی دیوبند میں قدیم رہائش تھی۔ وہاں سے تا دارالعلوم پا پیادہ، آمدورفت اسی شان سے ہوتی، علم بڑا گہرا، طب کی تدریس میں فائق، ہزاروں اشعار نوک برزباں، لطائف وظرائف میں منفرد، حکیم صاحب کے یہاں سکون کا نام ونشان نہ تھا، سکون کے علاقہ پر بھی حرکت نے قبضہ جمایا تھا۔ ذکاوت وذہانت میں امتیاز، جرأت وحوصلہ میں رستم وافراسیاب، کرشن لیلا، رام لیلا دونوں کو دیوبند میں بند کرایا۔ مدتوں قانونی جنگ لڑی، میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے تو چوکیوں پر مامور ملازمین کے لیے بلائے بے درماں، رات کو ایک چپراسی ہاتھ میں لالٹین لیے حکیم صاحب کے ہمراہ، پھر چوکیوں پر چھاپوں کا عمل، بیچارے رات بھر اس تصور سے نہ سوتے کہ خدا جانے حکیم صاحب کب آدھمکیں۔ اس وقت چوکیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چوں کہ سڑکوں پر چراغ ٹمٹماتے، کوئی کوئی بھائلہ روڈ پر، تو کوئی خانقاہ میں، کوئی بستی کے اس کنارے پر، کوئی اس کنارے پر۔ لیکن حکیم صاحب اپنا فرض سمجھتے اور احساس فرض کے تحت یہ کٹھن فرض ادا کرتے۔ سیاست میں غالی لیگی، ادھر دارالعلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا مدنیؒ کانگریس کی محفلوں کے چراغ، ہنگاموں کی رونق۔ مزاج میں اس قدر شدت کہ کفن کھدر کا نہ ہوتا تو نماز جنازہ ان سے پڑھوانا مشکل، نکاح مہر فاطمی پر نہ ہوتا تو نکاح پڑھانے سے انکار، لیگیوں پر حملہ کرنے میں کچھار کے شیر، لیکن حکیم صاحب کی دوراندیشی حملہ کا موقعہ ہی نہیں دیتی۔ حکیم صاحب نباض اعلیٰ درجہ کے تھے اور عموماً اپنے مطب میں استعمال ہونے والی ادویہ خود تیار کرتے۔ الجھے ہوئے

مریض کے بارے میں دیوان حافظ سے فال نکالنے کی عادت تھی۔حافظ شیرازیؒ کی فال کے بڑے قائل تھے اوراس ذیل میں عجیب واقعات سناتے۔کہتے تھے کہ پنجاب کے ایک صاحب میرے پاس آئے جنہوں نے اولاد نہ ہونے کا شکوہ کیا۔نبض سے تو کوئی تشخیص نہ ہوسکی، دیوان حافظ سے رجوع کیا تو فال یہ تھی۔ع

دست ما کوتاہ وخرما برنخیل

میں نے سمجھا کہ قصیر الذکر ہیں۔کھودکرید پر یہی بات نکلی۔اگر کوئی صاحب ذوق مریض پہنچ جاتا تو حکیم صاحب میں خوابیدہ شاعری جاگ جاتی۔بے وقت کی راگنی نہ تھی بلکہ برمحل شعر پڑھتے، باتیں عجیب وغریب تھیں۔ایک دن ایک مریض سے پوچھ رہے تھے کہ اجابت ہوئی یانہیں؟ بولا کہ کچھ، حکیم صاحب نے فرمایا'' گویا کہ حسرت پوری نہیں ہوئی'' صرف ایک بیٹی ہیں اس لیے جائداد خوب بہم پہونچائی، مسجدیں تعمیر کرنے اورواگذار کرانے کا شوق تھا۔اپنی قدیم رہائش کے ساتھ متصل مسجد تعمیر میں جم کر حصہ لیا۔ریلوے اسٹیشن دیوبند کے قریب مسجد کی تعمیر کی، اپنے مزاج پراس درجہ کنٹرول تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ والہانہ تعلق کے باوجود، مطب میں کبھی اس کو موضوع نہیں بنایا۔ اگرچہ عمر کافی دراز ہوئی اور اپنے نام ''عمر'' کا حق ادا کردیا، تاہم اہلیہ کی وفات کے بعد وہ ٹوٹ گئے تھے۔ایک دن بعد مغرب خبر سنی کہ حکیم صاحب نے دنیا سے رخت سفر باندھا۔ میت پرحاضری ہوئی تو متحرک، جاندار، فعال، مستعد، فہم وذکاء کا پیکر، فرشتۂ موت کے قدموں پر، یہ سب ہتھیار رکھ کر غیر مسلح ہوچکا تھا۔

خاکسار یہ پڑھ کر واپس ہوا ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

(جلد:۱، شمارہ:۱۲، بابت ماہ جولائی ۲۰۰۲ء)

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط صاحبؒ دیوبندی☆

کشمیر کے حالیہ سفر میں تھا کہ وہیں برادرِ عزیز مولانا مفتی کفیل الرحمان نشاط کے حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی، دل نے بوجھ محسوس کیا، دماغ ماؤف ہوا، سکوت نے اظہارِ غم کیا، یہ حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب عثمانی کے حفید اور جناب محترم قاری جلیل الرحمان صاحب عثمانی کے نورِ نظر تھے۔ فاضل دارالعلوم اور یہیں پر شعبہ افتاء میں مفتی، ممکنہ حد تک افتاء نویسی میں حق گوئی سے کام لیتے، اگرچہ ارباب حل وعقد بگڑتے، تیور بدلتے، بعض تالیفات کے مترجم اور بعض تصنیفات کے مصنف، اپنے والد گرامی قدر کی وفات کے بعد چھوٹی مسجد امامت کے لیے سنبھالی، خوش الحان تو نہ تھے، جو اس خاندان کا امتیاز ہے، لیکن ان کی نیکی قرأتِ قرآن کو شیریں تر کر دیتی، نیکی پسند، نیک خو، بلکہ صالحین میں شمار، نہ غیبت کرتے نہ سنتے، خلوت کو ہمیشہ جلوت پر ترجیح

☆ دیوبند کے مشہور خاندان ''عثمانی'' کے چشم و چراغ اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی مفتی اوّل دارالعلوم دیوبند کے پوتے حضرت مولانا کفیل الرحمن نشاط صاحبؒ، مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحبؒ کے گھر ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔

مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی اور ۱۹۶۱ء میں سند فضیلت حاصل کی۔

۱۹۷۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم، اے عربی کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد بحیثیت مفتی دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا۔ پوری زندگی اسی منصب جلیل پر فائز رہے۔ آپ نے بہت سی عربی، فارسی کی کتابوں کی شرحیں اور ترجمے بھی کئے ہیں، اس کے علاوہ باقاعدہ تصانیف بھی کئی ہیں۔

آپ اردو شعر وادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے اشعار کا مجموعہ بھی مطبوعہ ہے۔

یکم راگست ۲۰۰۶ء میں رحلت فرمائی اور مزار قاسمی میں مدفون ہوئے۔

رہتی، گھر آتے یا مسجد سے گھر جاتے تو اتنے تیز رفتار کہ محسوس ہوتا کہ کسی کارگل محاذ پر جارہے ہیں، دیوبند عام طور پر ان کی نیکی سے متاثر، بلکہ معتقد تھا، بڑے اچھے اور معنی خیز شعر کہتے، مزاج کا روکھا پن شاعری میں دب گیا تھا، چست اور رواں دواں اشعار کہتے، طنز اس خاندان کا وصف خصوصی ہے وہ کبھی کبھی اشعار میں جھلکتا، بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا کہ مفتی صاحب کا چراغِ زندگی لودے کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہونے والا ہے، علالت میں بھی کسی پر بوجھ نہ بنے اور چند سیکنڈ جان لیوا ہارٹ اٹیک کے سامنے یہ کہتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے ع

آدمی بلبلہ ہے پانی کا

ان سے عقیدت اور ان کی نیکی کا اتنا گہرا اثر کہ دیوبند اور طلبہ دار العلوم وقف ودار العلوم وغیرہ نے کثیر تعداد میں تدفین میں شرکت کی، جنازہ کی اس برات پر مرنے والا دولہا یہ شکوہ نہیں کرسکتا ؎

پھول کیا ڈالو گے تربت پر مری
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

چھوٹی مسجد کا مصلیٰ ایک پاکباز امام کو تلاش کررہا ہے، جس کمرہ میں فروکش تھے وہ اب حسرت کی تصویر ہے، ان کے تمام اہل خاندان سے دلی تعزیت اور موتِ فجاۃ پر دلی صدمے کا اظہار ہے۔

(جلد ر ۵، شمارہ ر ۱۲، بابت ماہ جولائی ۲۰۰۶ء)

مفتی انوار الحق صاحبؒ☆

سابق استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

غنچے تیری زندگی پے دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

دارالعلوم دیو بند کے تہلکہ خیز قضیہ کے زمین وآسمان تیار تھے، فضاؤں میں نئے انقلاب کے نعرے بلند، ایک خاص شخصیت کو مجروح کرنے کیلئے دل بے قرار، ایک اقتدار کی جگہ دوسرے اقتدار کو لانے کے لیے منصوبہ بند سازشیں، مکروفریب کے جال، دسیسہ کاری کے تانے بانے، سب موجود، سب مہیا، ان ہی حالات میں ایک طالب علم

☆مفتی انوار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۵/اپریل ۱۹۶۳ء میں گاؤں منسرا ضلع دربھنگہ صوبہ بہار میں قاضی مقصود عالم صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے ہی کے مدرسہ دارالعلوم نظامیہ منسرا میں حاصل کی۔

اس کے بعد جامعہ مخزن العلوم دلدارنگر ضلع غازی پور (یوپی) میں زیر تعلیم رہے۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۹۸۱ء میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے، ایک سال شعبۂ افتاء میں رہ کر فتویٰ نویسی کی بھی مشق کی، اسی سال دارالعلوم دیوبند کا قضیۂ نامرضیہ رونما ہوا۔ آپ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے ثناخوانوں میں سے تھے، چناں چہ آپ بھی دارالعلوم سے علاحدہ ہو کر وقف دارالعلوم میں آ گئے۔ یہاں مدرس عربی کی حیثیت سے آپ مصروف عمل ہوئے اور ابتدائی کتابوں سے لے کر نسائی شریف تک کا درس دیا، اس دوران دیگر بہت سی اضافی ذمہ داریاں بھی آپ نے یہاں انجام دیں۔

بالآخر یکم اپریل ۲۰۰۴ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے اور مزارِ قاسمی میں مدفون ہوئے۔

دارالعلوم میں داخل ہوا جو سابق میں مدرسہ دینیہ غازی پور میں تلمیذ رہ چکا تھا، جس کا وطن بہار تھا، یہ طالب علم اس آنے والے انقلاب کے نشیب وفراز سے گذرتا ہوا اچانک اس فریق کا شریک وسہیم بن گیا، جس کے اردگرد بے کسی، بے بسی، ناتوانی اور ناطاقتی حصار کئے ہوئے تھی، اس فریق کے ساتھ اس کی موجودگی، نہ عقل کا تقاضہ تھی نہ قرین دانش، دنیا اجڑی، دوسری دنیا آباد ہوئی، بے کسوں نے جامع مسجد کو اپنا آشیانہ بنایا، یہ طالب علم جواَب دارالعلوم دیوبند کا فاضل تھا جامع مسجد میں روزانہ پہنچتا، پریشان حال لوگوں کو غیر محسوس قوت پہنچاتا، فارغ اوقات میں جامع مسجد کے درمیانی در میں بیٹھ جاتا، وقت گذرتا گیا، حالات بھی بدلتے رہے، ایک دن کچھ سہا، کچھ خوف زدہ امید وبیم کی کشمکش میں راقم الحروف سے بولا کہ مجھے کوئی سبق دے دیا جائے، یہ عبوری دور تھا، کچھ ساتھی آسودگی کی تلاش میں جا چکے تھے، کچھ رفقاء بے سروسامانی کے عالم میں حق رفاقت ادا کر رہے تھے، سبق دے دیا گیا۔ ابتدائی کتابوں سے انتہائی اسباق تک پہنچا، جو خدمت اس کے سپرد کی جاتی تندہی سے انجام دیتا، وقف دارالعلوم کے لئے تحصیل زر کی مہم پر روانہ ہوا تو جن علاقوں میں حریفوں کی کوششوں کی بناپر قدم رکھنے کی گنجائش نہ تھی، اس بنجر زمین میں اس نے کاشت کی، اس بے آب وگیاہ علاقے میں بڑی کامیابی سے اس نے فصل کاٹی۔ صحت اچھی، تندرستی میں کوئی اضمحلال نہیں، مصروفیات میں کوئی خلل نہیں، مشغولیات میں کوئی تعطل نہیں، نہ صاحب فراش نہ بستر مرگ پر دراز، لیکن اچانک ۱۰ ارصفر المظفر روز جمعرات مابین العصرین جاں جان آفریں کے سپرد کردی۔

اس جانکاہ حادثے پر سینکڑوں آنکھیں اشکبار، سینوں میں دل تڑپ اٹھے، مگر قدرت کے فیصلوں کا نہ کوئی مقابلہ کرسکا اور نہ کرسکے گا، اگلے روز وقف دارالعلوم میں نمازِ جنازہ، پھر مرقد قاسمی تک سفر سوگواروں کے ہجوم میں، شاگرد، معاصرین، بڑوں اور متعلقین نے اس امانت کو زیر زمین کردیا۔ بیوہ، چار بچے، اعزہ واقارب، شاگرد ورفقاء اس حادثے پر ہمیشہ چشم پرنم اور آنسوؤں سے تردامن رہیں گے، موت مسافرت،

شب جمعۃ المبارک، بلندئ قسمت اور خدا تعالیٰ کی رحمتوں کا کھلا نشان ہے۔ یہ تھے مولانا مفتی انوار الحق صاحب فاضل دار العلوم وقف، دار العلوم کے استاذ قدیم۔

مخلص کارکن، باوفا خادم، وفا شعار رکن، خدا تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق اور مرحوم کو فردوس اعلیٰ میں مع الشہداء والصالحین مقام عطا فرمائے۔ غالب دہلوی نے اپنے خصوصی عزیز کی ناگہانی موت پر قلب وجگر کے چند ٹکڑے بہ صورتِ مرثیہ محفوظ کئے ہیں ان کا ایک شعر مفتی صاحب کے لئے پیش ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

فانا للہ وانا الیہ راجعون

(جلد ۳، شمارہ ۱۰، بابت ماہ مئی ۲۰۰۴ء)

مولانا محمد رضوان صاحبؒ قاسمی ☆

افسوس صد افسوس! واحسرتا! کہ قاسمی برادری کا گوہر شب چراغ، جواں مرگی کا شکار ہو کر بہت سی آرزوؤں وتوقعات کا مزارِ حسرت بن گیا، یہ مولانا رضوان القاسمی تھے جن کی طالب علمی خاکسار کی یاد، مسجد کی امامت سے امام الناس کے جلیل عہدے پر پہنچے، حیدرآباد دکن میں استاذ وامام کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا، ترقی ان کا مزاج، اعتدال ان کی فطرت، علم دوستی ان کی نہاد، پاکیزہ روایات ان کی سرشت، قدم بڑھاتے گئے اور عظیم درس گاہ کی بنیاد ڈالی، اس قدر تیز گام کہ وسائل کی کمی نہ کبھی انہیں زبوں ہمتی میں مبتلا کرتی اور نہ گرد وپیش ان کی علو ہمت پر ضرب لگاتا، ان کا نعرہ تھا ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
جو ہوں آسانیاں تو زندگی دشوار ہو جائے

☆ مولانا رضوان احمد صاحب القاسمی ابن مولانا محمد حبیب الحسن حسینی کا صوبۂ بہار کے ضلع دربھنگہ سے وطنی تعلق تھا، ولادت: ۱۹۴۴ء ہے۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عملی زندگی کا آغاز حیدرآباد میں امامت سے شروع کیا، پھر وہیں کے ہو رہے۔ حیدرآباد ہی میں دار العلوم سبیل السلام کی داغ بیل ڈالی جو آج ایک تناور درخت کی شکل میں آباد اور ہزاروں تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب کر رہا ہے۔ آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، آل انڈیا ملی کونسل، اسلامی فقہ اکیڈمی اور تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند جیسی بہت سی دینی وملی تنظیموں کے رکن رکین رہے اور ان کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے رہے۔

علمی وادبی ذوق بھی اچھا رکھتے تھے، بہت سی کتابیں ورثہ میں چھوڑ گئے، جیسے: چراغِ راہ، اے انسان وقت کی قیمت پہچان اور متاعِ وقت وغیرہ۔

۱۰ نومبر ۲۰۰۴ء میں راہی ملک عدم ہوئے اور حیدرآباد میں ہی تدفین ہوئی۔

مہمان نوازی اور سیر چشمی کوٹ کوٹ کر ان میں بھری تھی۔ علم و دانش کے قدر داں اور اہل علم کے اعزاز و تکریم میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ شاگردانہ سعادت کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا، کوہ پیکر عمارت سینۂ صحراء پر کھڑی کی، تخصص کے بہت سے شعبے کھولے، مستفیدین کو آسودگی دی، اساتذہ کی جیب خاص سے مدد کرتے، کتنے ہی سیمینار کئے اور مسلم پرسنل لاء کے اسٹیج سے اپنی ذہانت و ذکاوت اور قیادت کا جوہر تسلیم کرایا، ایک ماہ کے قریب موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر دار البقاء کی جانب دوڑتے ہوئے گھوڑے کی لگام یہ کہہ کر چھوڑ دی

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

معہد الانور میں وفات حسرت آیات کی دلدوز خبر پہنچی تو فوراً ایصالِ ثواب کا نظم کیا گیا اور بخاری شریف کے افتتاحی سبق دار العلوم وقف میں ایک کار آمد زندگی کے ختتام پر نوحہ خوانی کی۔ خدا تعالیٰ فردوسِ اعلیٰ میں مع الصدیقین والشہداء والصالحین جگہ عنایت فرمائے اور پس ماندگان کو ایسی توفیق ہو کہ وہ مرحوم کے اثاثۂ علمی کی حفاظت، ان کے روایات کا تحفظ اور ان کے کردار کو اپنی زندگی کا جلی عنوان بنائیں۔

(جلد ر ۴، شمارہ ر ۵، ۶، بابت ماہ دسمبر ۲۰۰۴، جنوری ۲۰۰۵ء)

حضرت مولانا یار محمد صاحبؒ پرتاپ گڑھی ☆

معہد الانور (جامعہ امام محمد انور شاہ) کے قدیم وممتاز رکن مولانا محمد صغیر صاحب پرتاپ گڈھی القاسمی کے والد مرحوم مولانا محمد یار صاحب المرحوم والمغفور کا حادثۂ رحلت، اس حلقے کے لیے جان کاہ صدمہ ہے جو مرحوم کے تابناک کارناموں، جلیل خدمات اور شخصیت کے دائرہ وسعت سے واقف ہے، چوں کہ ان کے نیک بخت فرزند مولانا محمد صغیر صاحب کا خود ایک مقالہ اپنے عظیم باپ پر اسی مجلے میں شریک ہے جس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں اس لئے مرحوم کے لیے فردوسِ بریں کی دعاء، پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی توفیق۔ غم حادثہ میں معہد کا ہر کارکن، ہر طالب علم شریک ہے۔

راقم الحروف تو صرف اتنا کہہ سکتا ہے ع

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

(جلد ر ۳، شمارہ ر ۱۰، بابت ماہ مئی ۲۰۰۴ء)

☆ جناب مولانا محمد صغیر صاحب پرتاپ گڑھی استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور دیوبند کے والد محترم مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار صاحبؒ پرتاپگڑھی، والد کا نام ملا محمد عمر اور وطن گاؤں اوگئی پور، سگرا سندر پور بازار، ضلع پرتاپ گڑھ یوپی ہے۔

۱۹۲۴ء میں اس دار فانی میں آنکھیں کھولیں، ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی۔

اس کے بعد مدرسہ مدینۃ العلوم قصبہ نصیر آباد ضلع رائے بریلی، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۰ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد کچھ دن اپنے استاذ، شیخ ومرشد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ کے ایماء پر مدرسہ محمودیہ لکھیم پورکھیری میں تدریسی خدمت انجام دی۔ پھر وطن واپس آگئے اور یہیں مقیم رہ کر امت کے اندر دینی بیداری اور بدعات وخرافات کی بیخ کنی کے حوالے سے مختلف دینی وملی تحریکیں چلائیں، بہت سے مدارس ومراکز قائم فرمائے عام مسلمانوں کے لیے درسِ قرآن وحدیث کا سلسلہ شروع کیا اور ہزاروں مردہ دلوں کو نور معرفت سے منور فرمایا۔

بالآخر ۱۶ر صفر ۱۴۲۵ھ مطابق ۷ر اپریل ۲۰۰۴ء کو اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کیا اور وطن ہی میں قیامت تک کے لیے آسودۂ خواب ہوئے۔

اہلیہ حضرت مولانا سیّد احمد رضا صاحب بجنوری

موت مقدر ہے اور زیست کا آخری باب، ہستی سے تا نیستی سفر، بود سے نابود کی منزلیں، قدرت کے اس منظم و مربوط نظام سے نہ گلو خلاصی نہ رستگاری، ۷۰ سالہ زندگی میں کتنے جنازے اٹھے، کتنوں کی موت کے منظر سامنے ہیں، کوئی علامۂ وقت، کوئی شیخ الزماں، مفسر، محدث، متکلم، جادو بیان مقرر، سحر نگار ادیب، بلند پایہ شاعر، خوش گلو غزل خواں سے لے کر بے کس و بے بس، بے یار و مددگار جنازوں میں بھی شرکت۔

دو سال پہلے مجھ سے بڑی ہمشیرہ، اہلیہ حضرت مولانا سیّد احمد رضا صاحب بجنوری مرحوم کینسر کے جان لیوا مرض میں مبتلا ہوئیں، اجل مسمیٰ میں دیر تھی دو سال کی مہلت اور مل گئی، پھر اس مرض نے خوفناک حملہ کیا، علاج و معالجہ کے لئے حیدرآباد و دہلی کے اسفار کئے، دہلی میں بستر مرگ پر تھیں، تو بار بار حاضری کی سعادت، مزاج پرسی کی دولت، خدا تعالیٰ کی خاص توفیق تھی۔ لندن و بنگلہ دیش بلکہ حرمین کے مقدس سفر سے پہلے بھی دید و شنید میری پیروزہ بختی رہی۔ حرمین میں برابر اطلاعات اضافۂ مرض کی ملتی رہیں۔ بالآخر جام عمر لبریز ہو کر چھلک پڑا، ایک دن قبیل عصر، سانحۂ وفات کی اطلاع صاعقۂ خرمن ہوش و خرد ثابت ہوئی۔ یہ حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کی تیسری اولاد ہیں، ایک بہن اور بھائی ان سے بڑے اور دو بھائی ان سے چھوٹے، چار رخصت ہو گئے، پانچواں یعنی راقم الحروف زندگی سے دور، موت سے قریب، بڑی سلیقہ مند، ذہین و فطین،

مسلسل گفتگو کی عادی، گھر گرہستی میں چاق و چوبند، کفایت شعاری میں ممتاز، اپنے سب بچوں کو اونچی تعلیم دلوائی، اور سب کو برسرروزگار دیکھا، کثیر الاولاد تھیں، لیکن کسی کی تربیت میں ناکام نہ رہیں۔

مجھ خاکسار سے بے پناہ تعلق، بلکہ میرے فترت کے دور کا خاتمہ ان ہی کا مرہونِ منت ہے، بڑی آرزو یہ تھی کہ اپنے نامور باپ کی آغوش میں خواب گاہ پائیں، عزیز مکرم مولوی ارشد رضا القاسمی نے اس آرزو کی تکمیل میں بھر پور مدد دی، میری عدم موجودگی میں حقیر زادہ مولوی احمد خضر شاہ سلّمہٗ اور برادرزادہ مولوی نسیم اختر شاہ سلّمہٗ استاذ وقف دارالعلوم نے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے، جو میری موجودگی میں بھی ممکن نہ تھے۔

اعزہ واقارب، دارالعلوم دیوبند، وقف دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ وطلبہ، دیوبند کے باشندے شریک جنازہ رہے۔ علی الصبح بروز جمعرات ہمشیرہ مرحومہ کا جسد خاکی ہمیشہ کے لئے خدا تعالیٰ کے سپرد کردیا گیا، خدا کرے کہ خاکِ نمناک فردوسِ اعلیٰ کا ایک گوشۂ عافیت ثابت ہو۔

تعزیتی خطوط اور ٹیلی فون کا اب تک سلسلہ ہے۔ ایصالِ ثواب بھی مدارس میں ہوا اور حضرت علامہ کشمیری کی نسبت سے اخبارات نے بھی سانحہ کی خبریں شائع کیں۔ ان سب کے لئے ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

(جلد/ ۲، شمارہ/ ۵-۸، بابت ماہ دسمبر ۰۲ء- مارچ ۰۳ء)

والدہ: الحاج الطاف مارا

وشارم میں برادر عزیز الحاج الطاف مارا کی والدہ محترمہ کا سانحۂ وفات متعلقین کے لئے غم واندوہ کا باعث ہے، مرحومہ صوم وصلوٰۃ کی پابند، اہل تعلق کی رعایت میں سرگرم تھیں، خاتمۂ عمر پر متعدد ایسی بیماریوں نے ان کو گھیر لیا تھا جو موت پر منتج ہوئیں، ان کے داماد برادر عزیز ملک سلیم صاحب بھی ہیں اور بنگلور وشارم میں بھی چونکہ اس گھرانے سے میرا قدیم تعلق ہے، اس لئے ایک پاکباز خاتون کا وصال دلی صدمے کا باعث، سب متعلقین کی خدمت میں مسنون تعزیت پیش کرتے ہوئے مرحومہ کی مغفرت کاملہ اور حصول رضائے رب کی پرخلوص دعائیں وردِ زبان ہیں۔ درسِ بخاری شریف میں مرحومہ کے لئے ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کا اہتمام کیا گیا، معہد الانور میں بھی قرآن خوانی کی گئی جس میں تمام طلبہ اور اراکین نے شرکت کی، خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دعا قبول فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل، صبر پر اجر جزیل ان کے لیے مہیا ہو۔

(جلد/۳، شمارہ/۸/، بابت ماہ مارچ ۲۰۰۴ء)

○○○

حافظ محمد اکرام صاحب دیوبندی

پرانے دوست، رفیقِ درس، شریکِ مجلس، مولوی حافظ محمد اکرام صاحب دیوبندی ۷۶ برس کی عمر میں دنیائے دوں کو چھوڑ کر جنت آشیانی ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

وہ دیوبند کے ایک معروف خاندان سے تعلق رکھتے اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے باختصاص مسترشد تھے، یہ غلط ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے شاگرد تھے۔

عجیب بات ہے کہ مقررین تقریر کرتے ہیں اور صحیح معلومات سے خالی خولی، کوئی انہیں مولانا کا شاگرد بتارہا ہے اور کوئی قاسمی کہنے پر مصر، ہاں انہوں نے کردار و عمل، اخلاص وایثار کی ایک وقیع داستان پیچھے چھوڑی ہے۔ مرحوم نے ان علمائے ربانی کا کردار اپنایا جو گنتی کے چند ہیں اور اپنی جائداد فروخت کر کے ۵۰ سال کے عرصے میں جتنا مشاہرہ مدرسہ سے لیا تھا، سب واپس کر دیا۔ نصف صدی قبل جس زمین پر بیٹھے تھے، اسی زمین میں اپنا مدفن تلاش کیا۔ یہ رسمی علماء کی تاریخ میں ایک نادر واقعہ ہے، بلکہ محیر العقول کارنامہ۔ خدا تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں مع الصدیقین جگہ عنایت فرمائے، اور ان کی تربتِ نمناک بہشت بریں کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہو۔ آمین

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

(جلد ر ۱، شمارہ ر ۶-۷، بابت ماہ جنوری و فروری ۲۰۰۲ء)

جناب مسعود عثمانی صاحبؒ

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

موت کی بھرمار، لاعلاج بیماریوں کی یلغار، اتنی شدید بیماری کہ تنومند مجموعۂ استخواں نظر آتا ہے۔ اس حال میں تیاردار یہ مشورہ دیتے ہیں۔

سانس آہستہ لیجیو بیمار
ٹوٹ نہ جائے کہیں رشتہ زندگانی

گذشتہ مہینہ دیوبند کے لیے زلزلہ ثابت ہوا، نامور صحافی جیتی جاگتی دنیا سے اٹھ کر شہر خموشاں کے باسی ہو گئے، جناب مسعود عثمانی صاحب مرحوم ''قومی آواز روزنامہ'' اور ''ہندوستان ہندی'' کے نامہ نگار تھے، مزاج میں سنک جس نے خودداری کی راہ کھول دی تھی، طویل زلف، معمولی وسادہ پوشاک، نہ کسی سے غرض، نہ کسی سے اظہارِ ضرورت، میں نے بہت سے اخبار نویس دیکھے، بندۂ اغراض، لیکن عثمانی صاحب پندرہ سال سے رات کو شریکِ مجلس رہتے، ان کی زندگی اتار چڑھاؤ سے لبریز تھی مگر یہ کہتے ہوئے دستِ سوال سکیڑ لیا:

آگے کسو کے کیوں کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

کچھ از خود دیا تو کسی نیازمندی کا اظہار، نہ آگے کے لیے توقع، الحاج عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے دودمان عالی میں بحیثیت خویش شریک

ہوئے، گھر کیا تھا ایک جھونپڑا، عام اخبار نویسوں کی طرح رائج ہتھکنڈے اپناتے تو مکان کی تیاری مشکل نہ تھی، مگر اکڑفوں نے کہیں کا نہ چھوڑا، صوم وصلاۃ کے پابند، دینیات اور احادیث کو بڑی دل چسپی سے سنتے، بعارضۂ کینسر ساٹھ سال سے کچھ اوپر کی عمر میں جان جان آفریں کے سپرد کردی، استغفار وانابت کا خاتمۂ عمر پر غلبہ تھا، نہ بچوں کا فکر، نہ بیوہ کا غم، صرف طالبِ نجات ومغفرت، یہ شعر کس قدر حسب حال ہے ؎

مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان
تختے پہ بہر غسل لٹایا اکڑ گئے

ان کے بڑے بیٹے عزیز القدر ماسٹر زعیم عابد صاحب جامعۃ الامام انور میں ہندی، انگریزی اور ریاضی کے استاذ ہیں، ان سے اور اہل خاندان سے دلی تعزیت ادارہ محدث عصر پیش کرتا ہے۔

(جلد/۵، شمارہ/۱۲، بابت ماہ جولائی ۲۰۰۶ء)

ضمیمہ
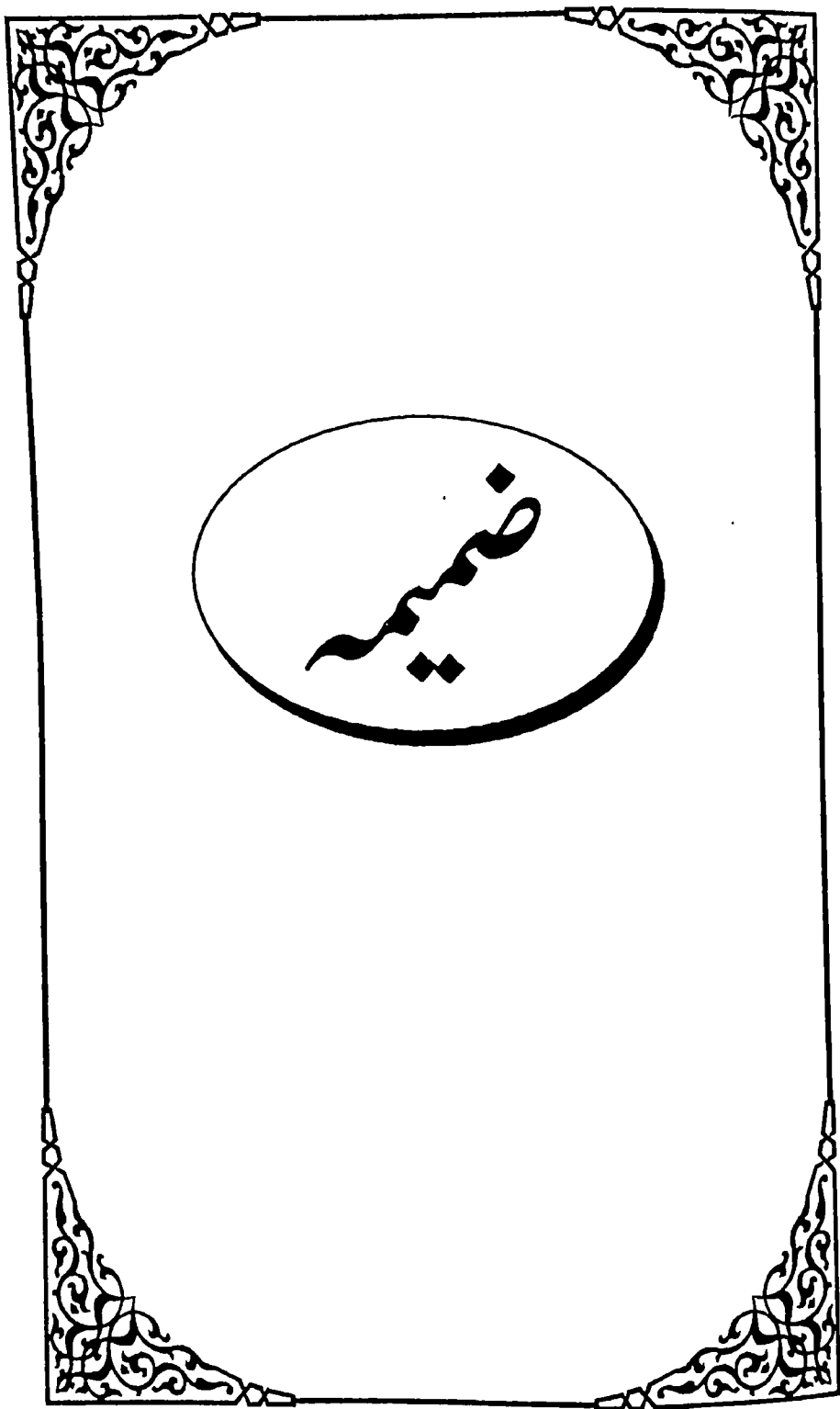
علامہ انور شاہ کشمیریؒ

اور ان کی فقہی خدمات

جتنا آپ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے اس سب کو لیجئے، بلکہ پوری کائناتِ رنگ و بو کو، تحقیق و کاوش کی آخری منزل، جستجو و تلاش کی انتہائی مرحلے پر، گہری تلاش اور حقیقت پر رسائی کے بعد علم و معلومات، چھان بین، نتیجہ سب کا یہ ہی نکلے گا، کہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، اور ہوگا، یعنی ماضی، حال اور استقبال، ہر چیز پر مرکزی کنٹرول، اقتدارِ کامل، ایک ہی واجب الوجود کا ہے۔

کائنات میں سب سے زیادہ جاندار و قوی، متحرک و فعال، ذی ہوش، ذی گوشِ قلب و نظر، ذہن و فکر کی بے پناہ صلاحیتوں پر قابض و متصرف، انسان نہ اپنے ارادہ پر قادر، نہ اپنی مقدرت پر حاوی، جو کچھ کیا اور کر رہا ہے، سب کچھ اسی ماوراء ہستی کی قدرت و مشیت کے تحت، اس کو کہنے والے نے یہ کہہ کر حقیقتوں کو طشت از بام کر دیا تھا، "مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللهُ" جب یہ صداقت و سچائی، حقیقت و واقعہ، مشاہدات و دلائل، واقعات و حوادث کی روشنی میں حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آگئی، تو اب کہنے دیجئے، کہ تدوین حدیث اور پھر قانونِ اسلامی، یعنی فقہ کی جمع و ترتیب، کوئی بخت و اتفاق یا بغیر سوچے سمجھے منصوبے کا ثمرہ نہیں، جو کچھ ہوا، وہ خداوند تعالیٰ کی مشیت تھی، اور ازل میں طے شدہ حقائق کا انکشاف و ظہور، حدیث کے مدوّنِ اوّل امام زہریؒ نے اپنی ایک تالیف میں اشارۃً لکھا کہ منضبط اور جمع ہونے والی وحی کے اقسام میں سے ایک ہی وحی تھی، یعنی وحی متلو، خدا تعالیٰ کا نازل کردہ قرآن، امام الکشمیری درس میں اس جاندار مقولے کو نقل فرما کر بطور اضافہ و تشریح فرماتے "کہ، زہریؒ الامام کی وضاحت سے میں

یہ ہی سمجھا کہ مشیتِ الٰہی میں پہلا مرحلہ، قرآن کریم میں تدوین و ترتیب تھی۔" تفصیلات اہل علم کے خزانۂ معلومات میں مہیّا ہیں، جب یہ مرحلہ پوری کامیابی کے ساتھ طے ہو گیا تو القرآن کی جامع اور ہر طرح منضبط تشریح یعنی سرمایۂ حدیث کی تدوین کا مرحلہ سامنے تھا، طبعی طور پر منزل سفر یہی ہے کہ متن کے بعد اس کی شرح و شروحات سامنے آئیں، اسی لیے الشافعی الامام برّد اللہ مضجعہ بطور ادّعا فرماتے کہ قرآن کے متن یا اس کے اجمال کی مکمل و مدلل تشریح صحیح احادیث ہیں۔

یہ بھی دعویٰ فرماتے کہ، کوئی بھی حدیث صحیح لاؤ، اس کا ماخذ قرآن کریم سے ثابت و متعین کر دوں گا، اور امام ہمامؒ کے اس دعویٰ پر خود انہیں کی جانب سے ہزاروں احادیث کے مآخذ القرآن سے متعین ہو گئے، عقل و ہوش سے بیگانہ، خرد و فرزانگی سے محروم، نکتہ چینوں نے امام بخاریؒ کے اس طرز پر اپنی دانست میں بھاری اعتراض یہ بھی کیا کہ ترجمۃ الباب کے بعد قرآن کی کوئی آیت پھر اس کے بعد مناسب حدیث؟ امام کشمیریؒ اس واہی اعتراض کو نقل فرما کر ارشاد فرماتے "کہ دنیا میں بے ہودہ و بے مصرف نکتہ چینوں کی بھرمار ہے اور بلا وجہ ژاژ خائی کا انبار ہے، بطور لطیفہ زبان پر آتا کہ اہل نظر نے دنیا کے بہت سے نام تجویز کیے ہیں، فرماتے کہ میں دنیا کو "بیت الحمیر" کہتا ہوں یعنی گدھا خانہ، گدھوں کو جب ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے تو کسی اشتعال انگیزی کے بغیر ایک دوسرے پر دولتیاں چلاتے ہیں اور دندان تیز کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ بخاریؒ کے اس احسان کو تسلیم کیا جاتا کہ قرآن کے بڑے حصے کی اپنے اس طرز سے انہوں نے تفسیر کر دی اور اس شاہکار کی قدر شناسی ہوتی کہ احادیث کے ماخذ کی نشاندہی کے ساتھ قرآن و حدیث کا باہمی رشتہ یا قرب و اتصال اور ہر دو میں ترتیب طبعی کو کھول دیا، لیکن فکر و نظر سے محروم طبقے نے بخاریؒ کے اسی اچھوتے انداز کو ہدف ملامت بنالیا۔"

اضافہ اس کا بھی کیجئے کہ القرآن کی تدوین میں جس حزم و احتیاط، ثقاہت و دیانت، اور بے نظیر تدین کی ضرورت تھی خیر القرون ان تمام صفات کا پیکر جمیل تھا اب حدیث کی

ترتیب کا مرحلہ ہے تو مطلوب وسائل پوری قوت سے فراہم کردیئے گئے۔ بے مثال حافظہ، منقطع النظیر یادداشت، امانت ودیانت، احتیاط وثقاہت، شوق وطلب کا ولولۂ کامل، اس راہ کی پُرخار وادیوں کو طے کرنے کے لیے مسلسل اسفار، متواتر جدوجہد، ایک ایک حدیث کو معلوم کرنے کے لیے سیکڑوں میل کے متعب سفر، زہد وقناعت، توکل و استغناء، اہتمام عبادت، نظام تقویٰ، ہر طمع وآز سے علیحدگی، ان کاوشوں کا مرتب مجموعہ، مفصل تاریخ، امت کے ہاتھوں میں ہے جسے اپنوں نے نہیں، غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ خیر خواہ ہی نہیں؛ بلکہ بداندیش بھی سراپا اعتراف ہیں، گویا اسلامی قانون کے دو اہم ماخذ بھرپور انداز میں مہیا ہو گئے، یعنی قرآن وحدیث۔

تیسرا مرحلہ: قانون کے استنباط واستخراج، قوانین کے جمع وانضباط کا ہے، یہاں بھی خدائے قادر وتوانا، فیاض وجواد نے ان اشخاص ورجال کو کھڑا کیا، جن کی نظیر تا قیامت مہیا نہ ہوگی۔

فقہ یعنی اسلامی قانون کے لیے کیا چیزیں مطلوب ہیں، وفورِ علم، معلومات کا قلزم، ذکاوت وذہانت کے ہمالیہ، فہم وتدبر کے دریا، فراست وفطانت کے پہاڑ، روشن ضمیر، روشن دماغ، ظاہر مجلّٰی، باطن مطلیٰ، عبادت وریاضت، زہد وقناعت، توکل واعتماد علی اللہ، استغناء وبے نیازی، شجاعت وبسالت، عزیمت وہمت، اخلاص فی العلم، خلوص فی التعلیم، حسن نیت، ایثار، بے مثل احتیاط، تقویٰ وتورع، طہارتِ قلب ونظافتِ فکر، تخئیل فلک رسا، تخیل فلک پیما، اجتہادی قوت، استنباط کا ملکہ راسخہ، استخراج کی دولت بے بہا، موشگافی اور حدیث وقرآن کے رموز واسرار پرتام اطلاع، ناسخ منسوخ کا علم۔

حدیث کو پرکھنے کی بھرپور صلاحیت، غث وثمین، قوی وکمزور، ضعیف ومرجوح میں امتیاز کی مکمل دستگاہ وغیرہ، اس لیے معروف چار فقہاء، اور غیر معروف کی حیات، علمی کارناموں، سوانح، وتذکروں کو کھنگال ڈالیے، انشاء اللہ حاصلِ مطالعہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مذکورہ سطور میں جن اوصاف وصفات کی تعیین کی گئی ہے، ان سب کا عطر مجموعہ، یہ

بلند و بالا شخصیت ہیں۔ تفصیل کے لیے تو وقت مہیا نہیں، نہ گردو پیش مساعد، تاہم ما فی الضمیر سمجھانے کے لیے کچھ واقعات دلیل و شاہد کی حیثیت سے پیش ہیں۔ سفیان ثوریؒ امیر المومنین فی الحدیث، سید الطائفہ، اور اپنے عہد کے ممتاز ترین فقیہ تھے، فرماتے ہیں کہ "مجھے سب سے زیادہ دشواری نیت کی تصحیح میں پیش آئی"۔

حسن بصریؒ کو کون نہیں جانتا، سیّد التابعین، سیّد المومنین، سیّد الفقہاء؛ غرضیکہ بلند و بالا عنوانات میں سے، کسی کے ساتھ بھی "سیّد" یا "قدوۃ" لگا لیجیے ہر ایک، ایک مردِ مؤمن و خود آگاہ کے قامت زیبا پر استوار ہوگا، انہی کے سانحۂ وفات پر سفیان ثوری نے نمازِ جنازہ و تدفین میں شرکت نہیں کی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب و تنبیہ کی روشنی میں کہ مسلمان جنازہ میں شرکت اور تدفین تک مشایعت اجر عظیم کا موجب ہے سفیان ثوری کا یہ عمل، کتنا عجیب و غریب ہے۔ پوچھنے والے نے پوچھا، تو ثوری کا جواب یہ تھا، کہ برائے شرکت میں اپنی نیت صحیح نہیں کر سکا، کچھ آپ سمجھے، یہ چند سطور جو نیت سے متعلق قلم پر بے اختیار آ گئیں، یہی ذہن نشین کرنے کے لیے ہیں کہ نیت اور حسنِ نیت کیسی مہتم بالشان چیز ہے، اقوال و اعمال کی روح، مقبولیت و مردودیت کی میزان، غور کیجیے، کہ محدثین و فقہاء کی نزہت نیت پر کیا اب بھی کسی اضافے اور تفصیل کی ضرورت باقی رہی۔

عصر حاضر میں جو اجتہاد کا غوغا بپا ہے، قطع نظر ان تفصیلات کے جو ابھی خاکسار پیش کرے گا، نظافت نیت اِن متنورین کو کہاں تک حاصل ہے؟ آیئے! اب اس جانب ابو حنیفہ الامامؒ کی نکتہ سنج طبیعت، نکتہ آفریں نہاد، فقید المثال ذکاوت و ذہانت، بے نظیر فراست و خطابت کے واقعات ایک دو نہیں، بلکہ قدم بقدم مہیا ہیں، یہاں تک کہ انکا پورا تفقہ اس پر شاہد عدل ہے، استاذ الاساتذہ، حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ المعروف بشیخ الہند، طاب ثراہ فرماتے، "کہ جس مسئلے میں الامام الہمام قطعاً منفرد ہوتے ہیں، تا آں کہ ان کے براہِ راست تلامذہ کی بھی تائید و اتفاق میسر نہیں ہوتا مجھے یقین ہوتا ہے، کہ ابو حنیفہؒ ہی کی رائے اصابت و صواب کی جلوہ فرمائی کر رہی ہے، اور یہ ایسی اونچی بات

ہے، جہاں تک امام ہمامؒ ہی کی رسائی ہو سکتی، اہتمام عبادت بلکہ اس میں اشتغال کا یہ عالم تھا، کہ وفات کے بعد کسی نے امام ہمام کی رہائش گاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک ستون تھا، جو چند روز سے نظر نہیں آتا، بتانے والوں نے بتایا کہ ستون نہیں بلکہ عماد الدین "ابو حنیفہؒ الامام تھے" جو شبہائے تار کو طولِ قیام، طویل رکوع، اور دراز سجدوں سے لبریز رکھتے، دیانت کا یہ عالم کہ کپڑے کے ایک تھان کی غلط فروختگی پر سال بھر اس کا اعلان کہ ایسا ناقص تھان نکل گیا، خریدنے والا چکائی ہوئی قیمت واپس لے کر تھان واپس کر سکتا ہے۔ جود وسخا، جس سے انتفاع نہ صرف تلامذہ، ومعاصر علماء کر رہے تھے بلکہ ہر ضرورت منداور ہر سائل کے سوال کی تکمیل اسی امام کے کیسہ ہائے زر کرتے، اقتدار وجلیل مناصب سے گریز کے واقعات تو تاریخی حقائق ہیں، بلکہ امام کی جان بحضور جاں آفریں انہی مناصب کے قبول نہ کرنے کے نتیجے میں پہنچی، سفیان ثوریؒ، امام اعظم مسعر ابن کدام وغیرہ کا واقعہ، جو امام ہمام کے سوانحی تذکروں میں نظر افروز ہوگا، کسی قدر عبرت خیز ہے، اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جرأت وبسالت تاریخ کی امانت ہیں، کہاں تک پیش کیا جائے امام ہمامؒ سے متعلق تفصیل کو، سیّدنا مالک ابن انسؒ کا حظیرۃ القدس سرزمین مدینہ کا احترام کہ برہنہ پا چلتے ہیں، اور قضائے حاجت کے لیے مدینہ سے دور دراز نکل جاتے ہیں، اس دیارِ محبوب کو اس اندیشہ کے پیش نظر نہیں چھوڑتے کہ کہیں موت مدینہ سے باہر امام کی جان نہ لے لے، نکتہ رسی کا یہ عالم کہ امام شبابی دور سے گذر رہے تھے، اور مسجدِ نبوی زادہ اللہ شرفاً تکریماً کے ایک گوشے میں تازہ وارد معلم کی حیثیت میں تھے کہ بستی میں کسی عورت کی میت کو غسل دیتے ہوئے چند عورتوں میں سے ایک نے اپنی متعارف عادت کے مطابق کہا کہ مرنے والی بڑی بدکار تھی، یہ کہنا تھا کہ غسالہ کا ہاتھ مردہ جسم کے عضو مخصوص پر جا چپکا اور ایسا چپکا کہ چھڑانے کے لیے نہ صرف اپنی توانائی کو نچوڑ دیا؛ بلکہ شریکِ غسل عورتوں کی بھی قوتیں جواب دے گئیں۔

مدینہ کے علماء سے، جن میں بزرگ بھی تھے، اور پرانے بھی نکتہ آفریں بھی تھے اور

نکتہ سنج بھی، سر پر پڑی اس مصیبت کا کوئی حل جب نہ ہوسکا، تو مالک الامام ہی حقیقت تک پہنچے، فرمایا کہ میت پر تہمت تراشی کی گئی ہے۔

حدّ قذف جاری کیے بغیر ہاتھ جدا نہ ہوگا، اور اسی تدبیر نے گلوخلاصی کی راہ ہموار کی، حدیث کا وہ احترام کہ کسی محدث کی جمی ہوئی مجلس میں مالکؒ پہنچے، شریکِ مجلس ہونے کے بجائے روانہ ہوگئے، دریافت کرنے پر فرمایا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو کھڑے کھڑے سننا سوئے ادب ہے، جب کہ مجلس میں بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی، امیر وقت نے چاہا کہ مالکؒ قصرِ امارت پہنچ کر حدیث سنادیں، مالکؒ نے صاف انکار کردیا، ان کا وہ طمطراق، وقتِ درس، مجلس کی شرکت وشان اہل علم سے مخفی نہیں۔

اب لیجیے! الشافعی الامامؒ کو، ذہانت کی محراب، فطانت کا منبر، ذکاوت کا صحیفہ، ثقاہت کا وثیقہ، علم کا پیکر زیبا، نکتہ شناسی کا امام، ایک دستِ مبارک میں قاطع سیف، دوسرے میں مخالف کے حملے کو روکنے کے لیے مضبوط ڈھال، المکی القرشی، ان کے ایک بااختصاص شاگرد کا بیان ہے کہ امام ہمام کے ساتھ میں چل رہا تھا، اور ہم سے آگے ایک شخص، میں نے عرض کیا کہ ''امام فرمایئے، اس راہ رو کا پیشہ کیا ہے؟ الشافعیؒ نے اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی، فرمایا کہ بڑھئی ہے یا لوہار، یہ ہی تلمیذ رشید کہتے ہیں کہ میں نے بڑھ کر اس راہ رو سے اس کا پیشہ معلوم کیا تو بتایا کہ پہلے نجاری کرتا تھا اور اب حدّادی۔

الامام الکشمیری کچھ نہیں، پکے حنفی ہونے کے باوجود کبھی الشافعی الامام کو سیّد الاذکیاء فرماتے، تو گاہے ''رئیس الاذکیاء'' انہیں کے فقہ کے مقابل ابوحنیفہؒ الامام کے تفقہ کو ترجیح دینے کا وقت آتا تو بے اختیار زبان مبارک پر آجاتا، کہ ''دنیا میں کوئی ہے، جو الشافعی الامام کو خاموش کرے۔'' استفہام برائے انکار، پھر جوابی تقریر کا آغاز یہ تھا کہ ''میں اپنی بساط کے مطابق گفتگو کرتا ہوں۔''

ذرا حصولِ کمالات کے لیے، الشافعی الامام کی بلندی پروازی دیکھئے، فرمایا کہ سولہ (۱۶) سال سے میں نے سیر شکم ہوکر کھانا نہیں کھایا، حاضرین کے استعجاب پر زبانِ

گھر بار پر آیا" کھانا زیادہ کھانے کے نتیجے میں پیاس لگتی ہے، اور پانی کی وافر مقدار کسل مندی لاتی ہے، جو حصول کمالات میں مانع ہے۔" بایں ہمہ کمالات اپنے استاذ الامام محمد ابن حسن الشیبانی، تلمیذ ابی حنیفہ الامامؒ کے ایسے معتقد تھے کہ ایک سائل کے سوال کا جواب عنایت فرمایا، تو اس الھڑ نے سن کر کہا: دوسرے فقہاء تو یہ کہتے ہیں، امام غضبناک ہو گئے، فرمایا کہ کیا تم نے فقیہ کو دیکھا ہے، یہ بھی ارشاد ہوا، کہ ہاں اگر امام محمدؒ کو دیکھتے تو فقیہ کو دیکھتے، اسلامی علوم وفنون کا کونسا ایسا شعبہ ہے، جس پر الشافعی الامام کی دسترس نہیں، تا آں کہ شعر گوئی کا وہ ملکۂ راسخہ کہ مصرعۂ اول میں یہ فرماتے ہوئے کہ اگر شعر گوئی علماء کے شایانِ شان ہوتی تو "لکنت الیوم اشعر من لبیدٍ" حقیقت آفریں دوسرا مصرعہ امام ہمام کی زبانِ مبارک پر آ گیا، پھر کیا اس واقعہ کو سنانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ امام نے اپنی جانشینی کے وقت وفا شعار خدمت گذار شاگرد پر، ایک مستند شخصیت کو ترجیح دی، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہ وتخویف پر جما جمایا عمل تھا "إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة".

اب سن لیجئے بطلِ جلیل امام نبیل احمد بن حنبلؒ کی عزیمت کی داستان!

پابہ زنجیر، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، نور کا پتلا، از سرتاپا معصومیت، پولیس کے حصار میں کشاں کشاں، دارالسلطنت کی جانب لایا جا رہا ہے، دنیا حیرت زدہ ہے کہ اس قیدی کا ظاہر چیخ چیخ کر اس کی معصومیت کا اعلان کر رہا ہے، نہ یہ قزاق ہے، نہ جیب تراش، نہ غارت گر، نہ کوئی ڈاکو، اس کا چہرہ بشرہ بتلاتا ہے کہ یہ شراب کے قریب کبھی نہیں پھٹکا، نہ کسی بدکاری کا مرتکب، اس کے چہرے پر نور، یہ متشرع، یہ اتباعِ سنت کی چلتی پھرتی تصویر، پھر کون ہے! جس نے اس کو اس انداز میں قید کیا، اور کیا اس کا جرم ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ گرفتار ہونے والے قیدی ایک ایک ہو کر رخصت ہو رہے ہیں، حکومت کے جاہ و جلال کے سامنے، ان کے حوصلے شل ہو گئے، اور ان کی ہمتیں ٹھٹھر گئیں، یہ معصوم قیدی روزے سے ہے، اور دنیاوی جلال و جبروت، شوکت شاہی، اور فرِ خسروی کے سامنے کھڑا

ہوا، دربار لبریز ہے، خود امیر گفتگو شروع کرتا ہے، پہلے ترغیب، پھر ترہیب، گفتگو کچھ اس انداز کی ہے، احمد! قرآن کریم کے بارے میں اپنے موقف کو چھوڑ دو اور وہی کہو جو ہم کہہ رہے ہیں اور تم سے کہلانا چاہتے ہیں، تو تمہیں بڑی عزتوں کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔

ظلمتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ایک خاراشگاف آواز ''قرآن و حدیث سے اپنے نظریے پر دلیل پیش کرو۔'' یہ آواز اُس کی تھی جس کا جسم ناتواں، لیکن سینے میں موجود قلب چٹانوں سے زیادہ مضبوط، اُدھر سے بار بار یہ ہی مطالبہ، اِدھر سے یہ ہی جواب۔

امام کی اس استقامت کا بجز اس کے کیا جواب تھا، کہ وقت کا طاغوت اپنی طغیانی کا مظاہرہ شروع کر دے، اس کی آنکھیں شرربار تھیں، غیظ و غضب کے فوارے چھوٹ رہے تھے، امام کے جسم مبارک سے کرتا نوچ لیا گیا اور تازہ دم جلاد کو بے تحاشہ کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا، اپنے خدا کے اس باوفا کو اپنی جان سے زیادہ یہ خطرہ کہ کہیں کشفِ عورت نہ ہو جائے، اپنے ازار بند کو اپنی گردن میں باندھ لیا، پیٹنے والا پیٹ رہا ہے، اور تازہ سواط برابر بدلے جا رہے ہیں اور اس طرح ظلم و عدوان کی تمام منزلیں طے کر لیں گئیں، مگر امام ہمامؒ کی عزیمت کو شکست نہیں دی جا سکی، دوسری طرف دیکھئے! کئی روز کا مسلسل فاقہ ہے! امام نماز کے لیے باہر تشریف لاتے ہیں، ناتوانیوں کے اس ڈھیر نے چند قدم اپنی قوتِ ارادی سے اٹھائے مگر ضعف نے ایک جھٹکا دیا، اور کائنات کا یہ مقدس ترین انسان لڑکھڑا کر گر گیا، اور قناعت کا یہ پیکر صورتِ واقعہ چھپانے کی تمام کوششوں کے باوجود گرسنگی کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔

دیکھنے والے سمجھ گئے امام احمدؒ کس کشمکش میں مبتلاء ہیں، کسی نے دوڑ کر اپنے گھر سے چند مٹھی آٹا، اہلیۂ مطہرہ تک پہنچایا، اس پاکیزہ نہاد بی بی نے نمک سے گوندھ کر اپنے نورِ نظر کے جلتے ہوئے تنور میں دو چار روٹیاں سینک لیں، امام واپس گھر میں تشریف فرما ہوئے تو یہ ہی سالن سے محروم روٹیاں آپ کے سامنے رکھ دی گئیں، آٹے کی پیش کش سے لے کر نانِ جویں کی تیاری تک کی داستان بی بی سے سن کر فرمایا: ''انہیں سامنے سے

اٹھاؤ، یہ میرے اُس لڑکے کے تنور میں سینک لی گئیں جو سرکاری ملازمت میں ہے۔"
اللہ اکبر! اس تقویٰ کی نظیر تاریخِ عالم پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ ملازمت کسی غیر مسلم حکومت کی نہیں تھی، مسلم حکمراں تھا، اور لختِ جگر اپنے فرائض کی ادائیگی میں مستعد، حاکمانہ جور و استبداد سے قطعاً بے تعلق، مگر احمد کا تقویٰ، ان کا زہد، ان کا توکل ان کی استغنائی ادائیں، اس نانِ خشک کے چند لقمے بھی برداشت کرنے کی روادار نہیں، بظاہر میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں، لیکن ائمہ اربعہ سے متعلق یہ مختصر سوانحی خاکے ہمارے اس منحوس عہد کے ان ادعائی نعروں کا کھوکھلا پن نمایاں کرنے میں کارآمد رہیں گے، کہ اجتہاد واستنباط کو عربی سے معمولی شد بد کی بناء پر سہل ترین سمجھ لیا گیا،" اور بزعمِ خودِ" اسلامی مآخذ سے قوانین کے استنباط کو ھنیا مریئاً گردان لیا گیا۔

جلال سیوطیؒ، جن کے تبحر و وسعتِ معلومات میں قیل وقال کی گنجائش نہیں "تعمق" اور چیز ہے، اربابِ تحقیق ان کی گہرائی و گیرائی کے معترف تو نہیں، تاہم! ان کے فراواں علوم وکمالات کے سب ہی قائل ہیں، اپنی حیاتِ طیبہ کے بعض مراحل میں وہ خود کو "مجتہد" سمجھتے، اتفاقاً جس مجلس میں دعویٰ اجتہاد ہوا، وہیں کسی کے مسئلہ پوچھنے پر سیوطیؒ حل پیش کرنے سے عاجز رہے۔

الامام کشمیری فرماتے، کہ "میرے نزدیک اسلامی علوم وفنون میں سب سے دشوار فقہ ہے۔" یہ بھی زبانِ مبارک پر آتا کہ "میں ہر فن میں اپنی رائے رکھتا ہوں، مگر فقہ میں ابوحنیفہؒ کا مقلد محض ہوں۔" سوال یہ ہے کہ فقہ کیا ہے؟ اہل علم کے مطالعہ میں تعریف فقہ کی تمام تفصیلات موجود ہیں، مگر ابوحنیفہ الامام سے "معرفة النفس الخ" منقول ہے۔ کشمیری الامام اسی منقول تعریف کو راجح قرار دیتے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ مفید اور مضر، یعنی مامورات ومنہیات، یا معروف اور منکر آگے بڑھیے، خیر وشر، نیک وبد، ان سب کا علم یا خدا تعالیٰ کے کلام سے ہوگا، یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے، یہ دونوں بنیادی مآخذ ظاہر وباطن، روح وجسم، عبادات

سے تامعاملات، انسانی زندگی کے ہر شعبے وگوشے، معاشرہ کے ہر نشیب وفراز میں، بھرپور راہنمائی کرتے ہیں، تو حاصل یہ نکلا، کہ فقہ، جو قرآن وحدیث کا عطر مجموعہ ہے، وہ ہی ساری زندگی کی تمام سمتوں، جوانب اور راہوں میں قندیل روشن کرتا ہے، مگر افسوس اس کا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اسی فقہ کو ماننے سے منکر، تقلید، یعنی قانونی جکڑ بندی پر عدم تقلید یعنی لاقانونیت کو ترجیح دیتا ہے، حالاں کہ سامنے کی بات ہے کہ رعایا کی فلاح و بہبود حکومت وحکمراں کے قوانین کی پابندی میں ہے، اور جب فقہاء نے جو کچھ کہا سنا، سب کچھ قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے تو ترکِ تقلید کا کھلا مطلب قانونی جکڑ بندیوں کو توڑ کر شتر بے مہار زندگی گذارنے کا آسان راستہ ہے، غم بالائے غم اس کا ہے کہ مقلدین خود آپس میں الجھ گئے، اور ایک دوسرے کی تردید وتغلیط میں نہ صرف زمین وآسمان کے قلابے ملائے گئے؛ بلکہ طغیانِ عقل کی لرزہ خیز موجوں نے عقل وفرزانگی کے ساحل سے ٹکرا کر نہ صرف ساحلی حد بندیوں کو توڑا، بلکہ ہلاکت خیزی کی داستانِ عبرت اپنے پیچھے چھوڑ دی، کوئی ٹھکانہ ہے اس کا! کہ شوافع نے ایک عوامی اجتماع کیا، اسٹیج پر اربابِ جبہ و دستار تشریف فرما ہوئے۔ حنفی فقہ کی تضحیک کے لیے ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس مسئلہ میں ابوحنیفہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اختلاف ہے، اس چیرہ دستی پر احناف کہاں نچلے بیٹھنے والے تھے، انہوں نے بھی چند دن کے بعد جوابی حملہ کیا، وہ ہی مزین اسٹیج، وہی دستار برسر وعبا در بر، اہل علم کی پرہ بندی، ایک سوال کا جواب یہ تھا، کہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا خدا سے اختلاف ہے "نعوذ باللہ من طغیان العقل و سکراتہ".

اِن جاہلانہ جھگڑوں سے پہلے چاروں ائمہ کے متبعین کس رواداری، کس مسالمت کا مظاہرہ کرتے، برائے عبرت اُسے بھی سن لیجیے۔ مشہور حنفی امام دامغانی، جس گذرگاہ پر تھے اس کے کنارے مسجد تھی، یہاں کے امام شافعی مسلک کے مشہور محقق، ابواسحاق شیرازی تھے، چلتے چلتے دامغانی نے محسوس کیا کہ نماز کا وقت قریب ہے، مسجد میں تشریف لے گئے، ابواسحاق نے ان کو دیکھ کر شافعی موذن کو تنبیہ کی، کہ اذان میں

''ترجیع'' نہ کرنا اور امامت کے لیے دامغانی کو مصلے پر کھڑا کر دیا گیا، اس امام بلند مقام نے بطرزِ شوافع نماز پڑھا دی، اور ہونا بھی یہ چاہیے تھا، اس لیے کہ کون کہتا ہے کہ ابو حنیفہؒ ہی حق پر ہیں، باقی ہر سہ فقہ از اوّل تا آخر باطل، جب تمام قیل وقال کا حاصل صرف راجح و مرجوح کے دائرے میں گھوم رہا ہے تو یہ بلا وجہ کے بلا خیز ہنگامے، امت میں شقاق و انشقاق کے موجب تو ہو سکتے ہیں، ان سے اتفاق و اتحاد کا آبِ حیات مہیا نہیں ہو سکتا۔

الامام الکشمیری قرآن وحدیث کے وافر علوم کے نتیجے میں امت کے باہمی اتحاد کی اہمیت کو سمجھ چکے تھے، اس لیے انہوں نے فقہ میں اجتہادی واتحادی مسلک اختیار کیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ تطبیق بین اقوال الائمہ کی ہر حال میں کوشش فرماتے، اس لیے وہ احناف میں سے کسی ایسے قول کو ترجیح دیتے، جو باقی تینوں ائمہ سے قریب تر ہو، عموماً ان کا ذوق یہی ہے، ان کے اس رجحان کو سمجھنے کے لیے خود ان کی منصوص رائے یہ ہے۔''میری عادت ہے کہ اولاً وہ قول لیتا ہوں جس کی تائید احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے، اس کے بعد وہ قول اختیار کرتا ہوں جو امام طحاویؒ کا مختار ہو، !اور امام طحاوی کو کرخی پر ترجیح دیتا ہوں، اگرچہ امام طحاوی مصر میں اور کرخی بغداد میں رہے؛ لیکن میں جانتا ہوں حدیث میں امام طحاوی بے نظیر ہیں، اور پھر ان کا تفقہ صحیح تر ہے۔''

یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''فقہاء میں سے شمس الائمہ حلوانی کو سرخسیؒ پر ترجیح دیتا ہوں، کیوں کہ شمس الائمہ، مسئلہ مختلف بین الائمہ میں نہایت صحیح قول اختیار کرتے ہیں، میرے نزدیک ہمیشہ ان کا قول مختار ہوتا ہے، یہ بھی کہتا ہوں کہ بعد میں شامیؒ، صاحبِ ہدایہؒ، صاحبِ بدائع، قاضی خان، صدر الائمہ، میرے نزدیک سب برابر ہیں۔''

یوں بھی وہ شامیؒ کے تفقہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز الدہلوی اور متاخرین اکابر میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے تفقہ، کو ترجیح دیتے ان کی خود رائے یہ تھی:

''میرا گمان ہے کہ اسلام کی ابتدائی آخری تین صدی کے بعد سے تفقہ نابود ہے۔''

حدیث فہمی کے لیے تفقہ کو وہ کس قدر ضروری قرار دیتے، مشہور مسئلہ میلاد مروّج

میں قیام جائز ہے یا نہیں؟ حافظ ابن حجرؒ اور جلال الدین سیوطیؒ کا رجحان قیام کی جانب ہے، اور مشہور حدیث "قوموا لسیّدکم" کو حجت بنایا ہے، اس پر فرماتے کہ "یہ حالت ہے علم حدیث کے اجل فاضلین کی، امر متیقن ومشاہد پر ایک امر موہوم وغیر مشاہد کو قیاس کرتے ہیں، میرے نزدیک اس فاش غلطی کی بنیاد تفقہ کا نابود ہونا ہے، میں کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ حدیث کے پہاڑ ہیں، اگر کسی پر گر جائیں، تو اسے ڈھا ہی دیں، لیکن فقہ میں درک نہیں۔"

فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی ضروری قرار دیتے، چنانچہ ہندوستان کے ایک فاضل جن کا گروہ اب ان کو امام کی حیثیت دے رہا ہے اور چاہتا ہے کہ سب ہی ان کو امام تسلیم کرلیں۔

علامہ کشمیریؒ فقہ میں ان کی دستگاہ کے اعتراف کے باوجود حدیث سے انہیں نابلد قرار دیتے، اور یہ بھی فرماتے کہ ان کا صراط مستقیم سے انحراف حدیث سے ناواقفیت ہے۔

خاکسار عرض کرتا ہے کہ اس بلند پایہ رائے کو سن کر بہت سی جبیں پر غیظ وغضب کی شکنیں نمایاں ہوں گی، اور عجب نہیں کہ فرطِ غیظ وغضب میں وہ پھٹ پڑیں، اور اپنے امام کے لیے حدیث دانی کے دلائل وشواہد بہم پہنچانے لگیں، حالاں کہ ان کا یہ سارا غیظ و غضب صرف اس بنا پر ہوگا کہ انہوں نے حدیث کے فن کو سمجھا نہیں، ان کے یہاں حدیث کے تراجم، تشریحات، ضعیف، وقوی کا علم وغیرہ دعویٰ حدیث دانی کے لیے کافی ہے، حالاں کہ فنِ حدیث اس قدر بلند وبالا، ایسا وسیع وعریض اور اس قدر دشوار واقع ہوا ہے، کہ بقول کشمیری الامام "اس علم کے لیے ۸۶ (چھیاسی) علوم بطور وسیلہ مطلوب ہیں۔" راقم السطور نے محاذ آرائی، یا مناظرہ بازی سے، بچنے کے لیے ان "فاضل" کے نام کا اخفاء کیا، اگر یہ چیختے چلاتے ہیں، اور حسبِ عادت سب وشتم کے تیر پھینکتے ہیں، تو میں انہیں معذور قرار دوں گا، چونکہ یہ مسکین نا آشنائے علم، علم حدیث کی حقیقت اور اس کے طول وعرض سے واقف نہیں، بہر حال!

علامہ کشمیریؒ کا خصوصی ذوق یہ تھا کہ وہ فقہ کو حدیث کے تابع رکھتے، اس قضیہ کو منعکس کبھی نہ فرماتے، عموماً فرماتے کہ "حدیث سے فقہ کی طرف آنا چاہیے فقہ سے

حدیث کی طرف نہ جانا چاہیے۔"

جس کا بے غبار مطلب یہ ہے کہ مسئلہ پہلے سے ذہن میں موجود کوئی جزئیہ، پھر اس کی تائید و پشت پناہی کے لیے کسی مناسب حدیث کی تلاش، اسی تگ و دو کو قطعاً غلط قرار دیا ہے۔ حدیث سے مسئلہ نکلے گا، نہ کہ جزئیات و مسائل کے اختراع کے بعد مفید و کار آمد احادیث کی تلاش، فقہ سے متعلق ان کی یہ بنیادی و اساسی رائے، جس عمیق علم حدیث کو چاہتی ہے، خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کو میسر تھا، چنانچہ فرماتے کہ "میرا مطالعہ ونظر بہت سے شراحِ حدیث سے زیادہ ہے، اور حافظ ابن حجرؒ سے بھی تتبع طرق واسانید میں تو کم، لیکن معانی حدیث میں ان سے زیادہ کلام کرسکتا ہوں، پس جن پر کلام کرتا ہوں، ان سے زیادہ جانتا ہوں، یہ بھی فرمایا کہ "ابن حجرؒ کا موضوع معانی حدیث نہیں ہے، اس لیے ہر جگہ ان سے بڑھ جاؤں گا، یہ فرما کر طلبہ کو مخاطب کیا کہ "جاہلین! یہ نرا دعویٰ نہیں ہے۔" فقہ حنفی کے ترجیح کی وجہ ان کی نظر میں یہ ہی تھی کہ "حنفیہ کی اکثر جزئیات احادیث سے نکلیں گی، بخلاف دوسرے مذاہب کے ان کے یہاں تخصیصات زیادہ ہیں، اس لیے فرماتے کہ حنفیہ کا مذہب زیادہ اسفر و روشن ہے۔"

میں نہیں عرض کرسکتا کہ میرا اپنے موضوع سے انحراف کوئی نادانستہ جرم ہے یا مقصد کو سمجھانے کے لیے یہ طول بیانی دراز نفسی ضروری تھی، میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ عرض کرنا ہے، اس کے لیے طویل تمہید ضروری بھی تھی، اور اہم بھی، اب آیئے! فقہ حنفی کے لیے ان کی خصوصی کوششیں سب سے پہلے سنیے، فرماتے "کہ احناف پر امام طحاویؒ کے جتنے احسانات ہیں کسی اور کے نہیں، اور مسائل خلافیہ کی تفہیم کے لیے جس قدر میں نے لکھا، کسی اور نے نہیں لکھا۔" ایک اور موقع پر فرمایا کہ "حنفیت کے استحکام کے لیے جس قدر مسالہ میں نے جمع کر دیا سو سال کے عرصہ میں اتنا کوئی نہیں جمع کرے گا۔" فرمایا کہ "میں نے اس قدر سامان جمع کر دیا ہے کہ اگر سامنے آجائے تو حنفیت کسی اور تائید کی منتظر نہ رہے گی، مگر افسوس کہ میری تنقیحات و مؤیدات کو جمع کرنے کے لیے کوئی صاحبِ

سوادمیسر نہیں آیا۔" مرحوم کی سعی مشکور کو دوزمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے!

اوّلاً تو ان کا درس وتدریس، مجالس اور عوامی تقاریر، مرحوم کی مجالس واہی تباہی چیزوں سے قطعاً خالی تھیں۔ غیبت اور بدگوئی سے شدید نفرت فرماتے، اگر کوئی ناواقف غیبت کا مکروہ دروازہ کھولنا چاہتا تو "حسبنا اللہ و نعم الوکیل" جوان کا ورِدِ زبان تھا پڑھتے ہوئے دوسری جانب متوجہ ہوتے، مجالس میں بیٹھتے ہی فرماتے کہ: "بھائی! پوچھو" اس پر بھی اگر کوئی علمی سوال نہ کرتا، تو خفگی کے ساتھ فرماتے کہ "کیا میں قبرستان میں بیٹھا ہوں" علمی سوالات سے بہت مسرور ہوتے اور ان کے جواب کے لیے مستعد، آخر کے چند سال، جن میں فتنہ قادیانیت کا استیصال ان کا محبوب مشغلہ تھا چھوڑ کر، حیات طیبہ کے ابتدائی سنوات صرف حدیث، قرآن، فقہ، علوم وفنون، کی مشکل کشائی، ان کی غذاء روح تھی، عام تقاریر میں بھی علمی مہمات کو حل فرماتے، ملتان میں ایک بار جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا، کہ "شوکانیؒ کے سپرد ایک موضوع کرو اور مجھے بھی وہی موضوع دو، بغیر مراجعت کتب تالیف کی پابندی عائد ہو، پھر دونوں تالیفات کا موازنہ ہو۔"

اور یہ تو اکثر زبان پر آجاتا ہے "انا اعلم بالشوکانی" یہ بھی فرماتے کہ شوکانی سب کو اپنا مقلد بنانا چاہتا ہے، مگر وہ جیسے ہیں ہم خوب جانتے ہیں، غرضیکہ عوامی مجالس سے لے کر تادرس وتدریس ان کا پسندیدہ موضوع علمی دقائق کو حل کرنا تھا، ظاہر ہے جب مہماتِ کتب حدیث ان کے زیر درس رہیں، تو حنفی مسلک کی تائید وترجیح کو کس بلیغ طریقے پر انجام دیتے۔ ڈابھیل کے آخری سال کے درس میں فرمایا "میں نے اپنی عمر کا تیس سال سے زائد عرصہ یہ دیکھنے میں گزار دیا کہ فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں، سو میں اپنی تیس سالہ کاوش کے بعد مطمئن ہوں کہ جہاں جس درجے کی حدیث دوسروں کے پاس ہے اسی وزن کی احناف کے پاس بھی ہے، اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بنا پر احناف نے مسئلہ کی بنیاد قیاس پر رکھی ہے وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں۔"

حنفیت کے اس استحکام وتائید کا نتیجہ کیا نکلا، مشہور وممتاز شیخ طریقت، حضرت مولانا

عبدالقادر صاحب رائپوریؒ خلیفہ اجل حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ، جنھوں نے بزمانۂ قیامِ دہلی، مدرسہ امینیہ میں علامہ سے اور کتابوں کے علاوہ ترمذی شریف بھی پڑھی تھی، فرماتے کہ ''میں تو غیر مقلد ہوا چاہتا تھا، مگر حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ ترمذی سے مقلد بھی ہوا اور حنفیت میں متصلب بھی، اور یہ کسی ایک شاگرد کا نہیں، بلکہ مشہور عالم، شافعی المسلک کی اساسی شخصیتیں بھی یہی تأثر پیش کرتیں، چناں چہ المنار مجلہ کے مدیر شہیر، اور تفسیر المنار کے مؤلف، علامہ رشید رضا صاحب المصری جب دیوبند تشریف فرما ہوئے، تو استقبالیہ تقریر عربی میں از جانب اہتمام علامہ کشمیریؒ کے سپرد کی گئی، رہائش گاہ سے چلتے ہوئے کسی طالب علم نے علامہ سے عرض کیا کہ مصری علامہ فرمارہے تھے کہ علمائے دیوبند حدیث کو حنفی بنانے میں دسترس رکھتے ہیں، یہ تبصرہ سن کر کشمیری الامام نے فوراً فیصلہ کیا کہ علامہ رشید رضا کی اس غلطی فہمی کو دور کرنا چاہیے، چنانچہ ابتدائی استقبالیہ کلمات ارشاد فرما کر علمائے دیوبند کا مسلک، اُن کا علمی ذوق، حدیث وفقہ میں رابطہ، حنفیت کی اصابت، احناف کے مضبوط دلائل، اس تفصیل، اور بلند پایہ انداز میں ارشاد فرمائے، کہ رشید رضا، جو کرسی پر جلوہ افروز تھے، بار بار کھڑے ہوتے اور فرماتے ''واللہ ما رایت مثل ھذا العالم الجلیل قط'' اور اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ ''اگر حنفیت وہی ہے جو حضرت علامہ کشمیریؒ نے پیش فرمائی تو میں کہتا ہوں کہ کافی وافی اور شافی ہے۔'' مختص تلامذہ کی املائی تقاریر ''العرف الشذی'' ''انوار المحمود''، ''فیض الباری''، ''انوار الباری'' جو بارہا طبع ہوتی رہیں، اور ہو رہی ہیں، کی ایک ایک سطر بتاتی ہے، کہ یہ سارا سرمایہ حنفی مسلک وموقف کو مدلل کرنے کا شاہدِ عدل ہے، خصوصاً العرف الشذی میں اپنے مقاصد کے ثبوت واثبات کے لیے جس کثرت سے وہ کتبی حوالے پیش کرتے ہیں، اس سے ان کا تبحر، وسعت معلومات، دقتِ نظری، اعتدال وانصاف نمایاں ہے، اور ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے، کہ حنفیت کی تائید میں ژرف نگاہی کے مرغزار مہیا کر دیے گئے، انہوں نے بعض مواقع پر حنفیت کے مؤیدات ایسے

نادر و نایاب جمع کیے جو حافظ ابن ہمامؒ، ابن نجیمؒ، اور زیلعیؒ کے بھی ہاتھ نہ لگے تھے، مگر یہ دنیا دار العجائب ہے، جس کے پاس وسائل موجود ہیں وہ حقائق کو توڑنے موڑنے میں چابک دستیاں دکھا سکتا ہے، چناں چہ سب ہی جانتے ہیں کہ قادیانیت کے قلع قمع میں علامہ نے جو کردار پیش کیا وہ تاریخی اور مثالی ہے۔ قادیانیوں کے کفر کا فیصلہ پوری قوت سے انہوں نے کیا، بھاول پور کی عدالت میں جج سے یہ ہی ان کا مطالبہ تھا، اپنے تمام مستعد تلامذہ کو استیصالِ قادیانیت کے محاذ پر لا کھڑا کیا، پنجاب میں مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے آتش بار مقررین سے قادیانیت کو در گور کرنے کی سعی کی، خود عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام لکھی، خاتمۂ عمر پر ''خاتم النبیین'' بزبانِ فارسی قلم بند کی، جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر دقیق علمی دلائل کا انبار لگا دیا، مگر ہو یہ رہا ہے کہ ایک مشہور بزرگ کے کسی فتویٰ پر دستخط جو اُن کی متعارف دستخط بھی نہیں ہے، قادیانیت کی بیخ کنی کی مساعی کا تاجِ زریں انہی بزرگ کے زیب سر کیا جا رہا ہے، فیا اسفیٰ!

حد تو یہ ہے کہ پاکستان سے شائع ہونے والے تحفظ ختم نبوت نامی رسالے کے سرورق پر، بیادگار خطیب العصر عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام نامی اور ان کے ساتھ ایک فہرست موجود ہے لیکن اس معمارِ اوّل کو فراموش کر دیا گیا، جس نے عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس محاذ کے لیے امیر شریعت بنایا تھا، ان چیرہ دستیوں کی داستان کہاں تک سنائی جائے!

تفصیل اب دوسرے زمرے کی پیش کرنا ہے، یعنی حنفیت کی تائید کے لیے ان کے قلمی مسودات، مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ فصل الخطاب، قرأۃ خلف الامام پر ان کی معرکۃ الآراء تالیف ہے، نیل الفرقدین رفعِ یدین کے اختلافی مسئلے پر مسکت ہونے کے ساتھ علم و معلومات سے لبریز ہے، کشف الستر، صلاۃ وتر سے متعلق ہے، یہ وہ تالیف ہے جو ان کے محقق معاصر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ سابق صدر الاہتمام دار العلوم دیو بند کے اس اعتراف کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے، کہ میں نے کئی بار کشف الستر کا من و عن مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ نے اپنی اس تالیف میں کس تحقیق و کاوش،

باریک بینی اور ژرف نگاہی کا منظر پیش کیا ہے، سب سے اہم ذخیرہ آثار السنن مؤلفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیمویؒ پر اُن کا مکمل حاشیہ ہے! مولانا نیمویؒ نے فقہ حنفی کے دلائل اپنی اس تالیف میں ذخیرۂ حدیث سے پیش کیے، جو حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی وساطت سے علامہ کشمیری کو پہنچا، شوقؒ نیموی کی گراں مایہ خدمت کا اعتراف تو ان اشعار سے واضح ہے جو علامہ نے ارتجالاً فرمائے اور اس مسودے کے ساتھ موجود ہیں مولانا شوق سے جو دلائل حدیثی ذخیرے میں رہ گئے تھے۔ کشمیری الامام نے ان کو بصورتِ حواشی درج فرمایا، غالباً ایک ہزار سے زائد کتابوں کے حوالے بقیدِ صفحات وسطور اس مسودہ میں موجود ہیں کہ مطبوعہ کتب کا نام، صفحہ تحریر فرمایا، اور غیر مطبوعہ قلمی کتب کی عبارتیں نقل فرمادیں، جو انہی کے قلم مبارک سے لکھی گئیں، ان کے باختصاص شاگرد، الحاج مولانا محمد میاں سملکیؒ نے تقریباً پچاس سال پہلے لندن میں اس کے چند فوٹو لیے اور ہندوستان کے علمی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ، دنیا کے مشہور کتب خانوں کی علمی امانت بنادیا، مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے چند صفحات میں اس پر ابتدائیہ لکھا، آج اگر اس کے حوالوں کی تخریج کی جائے تو چند جلدوں میں اس کی تکمیل ہوگی، اور فقہ حنفی کا یہ سب سے مضبوط و ناقابل تسخیر قلعہ منظر عام پر آئے گا، مگر اب تو ان کے وہ محقق شاگرد دنیائے دون کو چھوڑ چکے، جو اپنے استاذ کے علوم کے امین، ان کے ذوق سے واقف، اور ان کے علمی وثائق کے ترجمان تھے۔ متاخرین میں کم از کم مجھ بے بضاعت کو تو کوئی ایسی علمی شخصیت نظر نہیں آتی، جو اس علمی خزانے کو افادۂ عام کی راہوں پر ڈال سکے۔

مصیبت بالائے مصیبت علامہ مرحوم نے یہ قیمتی اور علمی اثاثہ غالباً اس تصور کے تحت قلم بند کیا کہ اس سے استفادہ کرنے والا بھی انور شاہ ہوگا، چند سال گذرتے ہیں، مولانا عبدالرحمن میاں سملکی ثم افریقی، ہندوستان، پھر پاکستان پہنچے، اور آثار السنن پر کام کے لیے مولانا مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ مدیر بینات کراچی کی سیادت میں اہل علم کی کمیٹی قائم کی۔ ایک ڈیڑھ سال بعد خاکسار کی کراچی میں مولانا لدھیانوی سے

ملاقات کے دوران جب آثار السنن پر کام کی نوعیت معلوم کرنے کی گفتگو ہوئی تو موصوف نے بتایا کہ ہنوز حضرتِ شاہ صاحب کے پیش کردہ حوالوں کی فہرست بھی مرتب نہیں ہوئی، اور یہ بھی کہا کہ اس خدمت کو وہی انجام دے سکے گا، جو علامہ کے بیکراں علوم کا ذائقہ شناس ہو! آہ!

حضرت علامہ کی پوری زندگی کا یہ حاصل اور مویداتِ حنفیت کا بے بہا سرمایہ ''مردے از غیب بروں آید و کارے کند'' کا منتظر ہے، یہ بھی عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ امام کشمیری نے بسم اللہ کی ''ب'' سے لے کر تا ''تائے تمت''، محققین اور ائمہ فنون سے اختلاف کیا۔ جیسا کہ لکھ بھی آیا ہوں کہ وہ باستثناء فقہ ہر فن پر خود اپنی رائے رکھتے، بطور لطیفہ صورتِ واقعہ سامنے لانے کے لیے عرض ہے، کہ ''الرحمٰن'' ''الرحیم'' میں رحمت سے متعلق اہل علم ان کاوشوں پر مطلع ہیں، کہ ''رحمت'' میں انفعال ہے اور خدا تعالیٰ منفعل نہیں، قاضی بیضاویؒ نے گھبرا کر راہ یہ نکالی، کہ ''رحمت کی نسبت خدا تعالیٰ کی جانب ''مجازی'' قرار دے دی۔ کشمیری علام نے اسے نقل کر کے فرمایا ''میں نے کہا کہ اگر رحمت کی نسبتِ خدا تعالیٰ کی جانب بھی مجازی ہوگی تو پھر حقیقی نسبت کس کی طرف ہوگی۔''

اس سے معلوم ہوگا کہ وہ کسی بھی کوہ پیکر شخصیت کی کاوش کو محض اس کے بھاری بھر کم نام کی وجہ سے قبول نہ فرماتے، تاوقتیکہ خود ان کا فکر و نظر اور علم و فن اسے قبول نہ کرے، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ متقدمین کی علمی کاوشوں پر ان کی تحقیقی نظر تھی، مطبوعات و مخطوطات کا وافر ذخیرہ اپنے دماغ میں انڈیل چکے تھے، اور خداداد حافظے کی بنا پر سب پڑھا لکھا ان کے لیے کف دست تھا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام علمی صفوں کو تھرا دینے والا ہے، لیکن ایک دن سبق میں فرمایا، کہ شیخ کی تمام مطبوعات و مخطوطات میری نظر میں ہیں، افسوس کہ ان کے یہاں مجھے ایک چیز بھی ایسی نہ ملی، جو میں پہلے سے نہ جانتا ہوں، دورانِ مطالعہ اگر مجھے ایک چیز بھی نئی ہاتھ لگ جاتی، تو میں اپنی طویل عرق ریزی کو بیکار نہیں سمجھتا، پھر طبیعت میں اعتدال و انصاف، کھوٹے و کھرے کی تمیز، حقیقی

پھولوں کی واقعی شمیم انگیزیاں اور مصنوعی گلوں کی بے رونقی پہچاننے کی وافر صلاحیتوں سے بہرہ مند ہونے کی بناء پر، جو کچھ فرماتے وہ ٹکسالی ہوتا، اور ہر طرح کافی وشافی، ان کی املائی تقریروں سے ان کے بے کراں علم تک رسائی ممکن نہیں، اگر چہ اصل موضوع سے متعلقہ، تفصیل تو ختم ہوئی، تاہم میں دو چار مثالوں سے فقہی مسائل میں ان کے غور وفکر کا منہاج واضح کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً عورت بغیر محرم کیا سفر حج کر سکتی ہے؟ مسئلہ الجھا ہوا ہے، اور مختلف آراء کا مجموعہ، مولانا مفتی سہول صاحب بھاگلپوری، دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں مفتی کی حیثیت سے تھے، اسی مسئلہ میں علامہ سے رجوع کیا، مفتی صاحب کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ''اپنے لیے پوچھتے ہو! یا فتنہ کے لیے۔'' مطمئن کرنے پر فرمایا کہ ''جب ثقہ عورتیں ساتھ ہوں، اور فتنہ سے امن ہو، تو میرے نزدیک بغیر محرم سفر حج کر سکتی ہے، میں تمام اسفار میں عورت کا سفر فتنہ وعدم فتنہ پر دائر کرتا ہوں۔'' میں کہتا ہوں کہ حنفی مذہب کی بھی یہ ہی تحقیق ہے، اگر چہ کسی نے اس کی صراحت نہیں کی، علماء نے سفر حج کے مسئلے کو ان احادیث کے تحت کر دیا جو عام اسفار کی ممانعت سے تعلق رکھتیں۔

امام بخاریؒ نے بھی ایسا ہی کیا، مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں، امام ترمذیؒ ممانعتِ سفر کی حدیث لا تسافر الخ ''ابواب الرضاع'' میں لائے ہیں، ''کتاب الحج'' میں ذکر نہیں کیا، جب کہ بخاریؒ نے اس حدیث کو ''ابواب سفر'' اور ''کتاب الحج'' دونوں میں ذکر کیا، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ نے اس حدیث ممانعت سفر کو حج کے سفر پر اثر انداز نہیں سمجھا اور غالباً ان محدثین نے بھی جو اس حدیث ممانعت کو تحت ''کتاب الحج'' ذکر کر رہے ہیں، مالکؒ، احمدؒ اور الشافعی الامامؒ نے حج تطوع، اور عام اسفار پر محمول کیا ہے، اس سے میں سمجھتا ہوں کہ امام اعظم کا مسلک بھی یہ ہوا، میں نے احادیث ممانعت سفر بلا محرم کو حج فرض سے غیر متعلق قرار دیا اور ابوابِ حج کے تحت ان احادیث کے ذکر کو بے محل سمجھا، میرے پاس ایسی احادیثِ کثیرہ کا ذخیرہ ہے جن سے میں ثابت کر سکتا ہوں، کہ احادیث ممانعتِ سفر کا تعلق سفر فرض حج سے نہیں ہے، اور مدارِ مسئلہ فتنہ وعدم فتنہ ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابو العاص کو مکہ معظّمہ بھیجا کہ وہ حضرتِ زینبؓ کو کسی کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیں، زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ سفر غیر محرم کے ساتھ ہوا، اور جب کہ مالکؒ و شافعیؒ اور احمدؒ بحالت امن عن الفتنہ ثقہ عورتوں کے ساتھ، سفر حج فرض کی اجازت دیتے ہیں، تو میں یقین کرتا ہوں کہ ابو حنیفہؒ کا بھی یہ مسلک ہوگا، اگرچہ منقول نہیں ہوا۔

مالک نے موطا میں ولتخرج فی جماعة من النساء کے تحت لکھا کہ ''جس عورت نے حج فرض ادا نہ کیا ہو! اور محرم میسر نہ ہو، تو وہ ثقہ عورتوں کے ساتھ حج کر لے، اور خدا کا فرض ترک نہ کرے۔'' امام شافعیؒ کی بھی ایسی وضاحت ہے، اور احمد ابن حنبلؒ کی بھی، اس لیے میں کہتا ہوں کہ سفر حج برائے ادائیگی فرض، سب کے یہاں متفقہ ہے۔

مفتی سہول صاحب نے وعدہ کے باوجود حضرت شیخ الہند سے کشمیری علام کی رائے ظاہر کی تو سکوت فرمایا، ویسے عام طور بھی حضرت شیخ الہند فرماتے کہ ''شاہ صاحب جو کچھ فرماتے ہیں مفید فرماتے ہیں۔'' اور اپنے اس نامور شاگرد کی تحقیقات کو بڑے انہماک سے سنتے، مرد آباد کے ایک سفر میں جس میں حضرت شیخ الہند کے ہمراہ علامہ بھی تھے کسی نے حضرت شیخ الہندؒ سے مسئلۂ تقدیر دریافت فرمایا، فرمایا کہ مولوی انور شاہ صاحب سے پوچھو۔'' حضرت کا اشارہ پا کر، علامہ کشمیریؒ نے شرح و بسط سے مسئلہ واضح کیا، حضرت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی اس گفتگو کو اس محویت سے سن رہے تھے کہ ہیئت تک نہیں بدلی اور بعد میں شرکاء مجلس سے فرمایا کہ ''جو بات شاہ صاحب فرماتے ہیں، مفید فرماتے ہیں۔''

ہاشمی کو زکوٰۃ دینے کا مسئلہ

معرکۃ الآراء اور فقہاء اربعہ میں زیر بحث رہا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بخاری ومسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد بذیل واقعہ حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہ، کہ انہوں نے صدقہ کے ڈھیر سے کھجور اٹھالی اور دہن مبارک میں ڈالی، اِس پر کائنات کے مقدس ترین نانا، صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ، اور علاوہ دوسری احادیث بسلسلہ ممانعت

زیر گفتگو رہیں، عام فقہاء کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ صدقات بشرطیکہ واجبہ ہوں، صدقہ فطر اور کفارات کے درجے میں ہیں، جن کا لینا بنو ہاشم کے لیے جائز نہیں، طحاویؒ نے بحث کرتے ہوئے ابن عباسؓ کی ایک روایت کی روشنی میں، صدقات کو بنو ہاشم پر صرف کرنے کی اباحت پیش کی ہے، امام اعظمؒ کا خیال یہ ہے، کہ جملہ صدقاتِ واجبہ وغیرہ بنو ہاشم کو دیے جاسکتے ہیں، اور یہ بھی ان سے منقول ہے کہ ہاشمی، ہاشمی کو دے سکتا ہے، مگر کچھ اربابِ علم اسے قاضی ابو یوسفؒ کی رائے بتاتے ہیں، لیکن طحاویؒ الامام مصر ہیں کہ یہ رائے ابوحنیفہ الامام کی ہے۔

الامام کشمیری کی بھی یہ ہی رائے ہے مگر ان کے خیال میں بنیاد قطعاً دوسری ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''اگر بنو ہاشم میں سے کوئی غربت و افلاس کی بناء پر بھیک مانگنے پر مجبور ہو، تو سوال کی ذلت سے بچانے کے لیے صدقہ اور زکوٰۃ اس کو دی جاسکتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام احناف کے مقابل جواز کی جانب تو وہ گئے، لیکن بنیاد اپنے طور پر منقح کی، ویسے تو مسائل بکثرت ہیں جس میں علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق و تفتیش پیش کی جاسکتی ہے، جو اس کے شواہد ہیں کہ فقہ میں بھی ان کی بالغ النظری منفرد ہے، لیکن طوالت کا خوف، اور ''شہر مبارک'' کی آمد آمد مزید تفصیل سے عناں گیر ہے، تاہم موضوع سے متعلق جستہ جستہ جو چیزیں پیش کیں ان سے معلوم ہوگا، کہ طحاویؒ الامام کے بعد حنفی فقہ کی تائید میں علامہ مرحوم کی خدمات کس قدر وقیع و پُر وقار ہیں، کیا عجب ہے کہ خدا تعالیٰ اس ناقص تحریر کو مقصد کی تفہیم کے لیے تاریک راہوں میں روشن چراغ کردے۔

''وما ذالک علی اللہ بعزیز''

(سہ ماہی ''فکر اسلامی'' معاصر فقہ اسلامی نمبر، جولائی ۱۹۹۹ء تا جون ۲۰۰۰ء)

○○○

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی

ایک قدسی الاصل

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آہ! وہ قدسی الاصل جس کے نفس قدسی سے تقریباً ساٹھ سال، حدیث وقرآن کے زمزمے بلند رہے اور جس کے دہن مبارک میں حرکت کرنے والی زبان اس طویل عرصے میں قال اللہ وقال الرسول کی مبارک تشریحات وتفسیر سے تر رہی، جس کی ذات گرامی معرفت وطریقت کی درس گاہ تھی اور جس کی محفلِ علم وعرفان میں ملائکۃ اللہ بصد فخر وناز شرکت کرتے تھے، جس کو ابھی ابھی قلم مدظلہ العالی اور دامت برکاتہم کی دعائیں دیتا تھا، آج اشک بار آنکھیں اس کے جسم اطہر کو تودۂ خاک کے نیچے دیکھتی ہیں اور لکھنے والا قلم نور اللہ مرقدہٗ وقدس اللہ سرہٗ العزیز کے ماتمی نوحے اس کے لیے تیار کر رہا ہے یعنی حضرت الاستاذ شیخنا الاکبر سیّد حسین احمد مدنی تغمدہ اللہ بغفرانہ جن کی ذات سے علم وعرفان کی محفل منور و تاباں تھی اور جنھوں نے اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے دنیا کو حریت پسندی وانقلاب آفرینی کا گہرا سبق دیا تھا، خاک دانِ ارضی سے اٹھے اور بچشم زدن صدیقین شہداء وصالحین کی مقدس جماعت میں جا بیٹھے۔

حضرت مرحوم کی زندگی علم وعمل، زہد واتقا، استغناء وتوکل، عفاف وپاک بازی کی ایسی مرتب اور مبسوط کتاب ہے جس کی ہر ہر سطر آنے والوں کے لیے درسِ عمل ہے اور جس کے ابھرے ہوئے نقوش پچھلی نسلوں کے اسوہ نمونہ ہیں، پچیس سال نہیں، نہ

چالیس پچاس برس؛ بلکہ پون صدی تک اپنے خدا کا یہ برگزیدہ بندہ اپنے گھر کی زندگی سے باہر تک، خلوت وجلوت میں، نشست وبرخاست میں، سونے اور جاگنے میں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس مبارک ومسعود سنت کی خاموش تعلیم دیتا رہا۔ اب اس کی مثال مشرق اور مغرب کی وسعتوں، جنوب وشمال کی پہنائیوں میں ڈھونڈھے سے بھی نہ ملے گی ع

اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ان کی زندگی کا نشیب وفراز، پھر ان کے مستقبل کا اٹھان دیکھنے کے بعد بڑی آسانی سے فیصلہ لیا جاسکتا ہے کہ قدرت کے عطا بخش ہاتھ، ان کی تربیت میں برابر مصروف رہے، نیم سحر گاہی کی جھونکے ان کی زندگی کے گیسو کو سنوارنے اور بنانے میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہے۔ وہ اپنی ابتدائی عمر میں عالم اسلام کی عظیم الشان یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لیے وراد ہوئے اور اپنے وقت کے ایک شیخ کامل کے تلمیذ وشاگرد ہی ہونے کی صرف سعادت ان کو میسر نہ آئی؛ بلکہ ان صاحبِ باطن، روشن ضمیر، کہن سال کی تمام توجہات کا مرکز یہی محبوب شاگرد بن گیا۔ دینی تعلیمات سے فراغت کے بعد رمز آشنائے حقیقت ومعرفت حضرت گنگوہی کی روحانی توجہات ان کے شاملِ حال ہوگئیں اور باطنی دولتوں سے دامن مراد بھر کر، عرب کا یہ بانکا نوجوان، دیارِ عرب کے منور علاقوں اور تابناک ریگستانوں میں پہنچ کر امداد الٰہی درس گاہ میں شامل ہوگیا، محمد عربی فداہ روحی کی مسجد مبارک میں سالہا سال علم وعرفان کے موتی لٹائے اور ہر خاص وعام پر علم کی گوہر پاشیاں کیں، حریت پسندی کے رجحانات اور مجاہدانہ زندگی کے درس، مالٹا کی اسارت میں اسی جواں عزم خضر صورت کے لیے، جس کے سامنے تعلیمات نبوی کو حاصل کرنے کے لیے زانوئے ادب طے کیے تھے۔ گویا کہ ہر قسم کی تعلیم کی ابتداء محمود الحسن کی درسگاہ سے ہوئی اور اس کی تکمیل خاموش ہاتھ کرتے رہے۔ اس طرح اپنی ابتدا سے انتہا تک قدم قدم پر تعلیم وتربیت کے جن مواقع سے وہ سرفراز

کیے جاتے رہے، بڑے انسانوں کی تاریخ میں اس کی مثال خال خال ہی ملے گی۔ اس تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں، ان کی ذات میں مختلف علوم وکمالات، متضاد صفات وخوبیوں کی یکجائی کچھ اس طرح ہوگئی تھی کہ لکھنے والا قلم ان کی زندگی کے کسی ایک گوشہ کو متعین نہیں کرسکتا، اگر ان کی حیات پاک کا تجزیہ کیا جائے تو علم وعرفان، عمل واخلاص، شہنشاہی گدائی، تمکنت وانکسار، عالمانہ انداز اور فقیرانہ طور وطریق کے سینکڑوں نقوش اس طرح بھر کر آپ کے سامنے آجائیں گے کہ آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

آپ ہرگز نہیں بتاسکتے کہ ان پر کون سا رنگ غالب تھا اور نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ فقیر منش انسان کون سی افتادِ طبع لے کر پیدا ہوا تھا، ابھی رات کا سناٹا ہے، سفر ہو یہ حضر، لیکن فضاء اس مرد خود آگاہ کے ذکر جہری سے لبریز ہے، شب کا آخری حصہ ہے اور یہ فقیر گوشہ نشین، سر بسجود، صبح کی پو پھٹی تو ہاتھ خدا کے سامنے ہیں اور دردمندامت کا یہ خادم اسلام اور مسلمانوں کے لیے مصروفِ دعا، مسجد کے اونچے مناروں سے مؤذن کی آواز بلند ہوئی تو یہ عابد شب بیدار خدا کے دربار میں صف اولیٰ میں موجود، کلام ربانی سے فراغت ہوئی تو عقیدت مندوں اور مہمانوں کے جم غفیر کے ساتھ چائے کے دسترخوان پر، صبح کے نو بجے ہیں، تو علم کا یہ کوہِ گراں دارالعلوم کے دارالحدیث میں بیٹھ کر بخاری شریف کے درس میں منہمک، دن کے بارہ بجنے کو آئے تو وسیع دسترخوان پر، چہ دشمن چہ دوست، سب کی تواضع کرنے کے لیے یہ سراپا نیاز میزبان، سب کو کھلا رہا ہے، سب کو اٹھا رہا ہے، ظہر کی نماز سے فراغت ہوئی تو انسانوں کا یہ غم گسار ان کی ضرورت سن رہا ہے اور دل سوزی سے ان کی گزارشیں سنی جارہی ہیں۔ عصر سے لے کر مغرب تک واردین اور صادرین سے ملاقات اور ہر ایک کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا جارہا ہے۔ مغرب کے بعد کمرہ میں اندھیرا ہے؛ لیکن اس شیخ وقت کی تلاوت کلام ربانی کے انوار اس کو بقعۂ نور بنائے ہوئے ہیں، بیعت وارشاد کا سلسلہ چلتا ہے، کھانے کی محفل جمتی ہے اور پھر

قال رسول اللّٰہ کی تشریحات مترنم لہجہ میں شروع ہو جاتی ہیں، غرضیکہ ۲۴ ر گھنٹے اور ہر ساعت کے ساٹھ منٹ میں برابر مصروف و مشغول رہنے والا یہ کامل و مکمل انسان کیا تھا ؟ یہ ایک معمہ ہے جس کو مؤرّخ کا قلم ہر پہلو سے کھول کر رکھے گا۔ اور قلم کی تشریحات بتائیں گی کہ وہ اپنے ظاہر و باطن، جسم و روح کے اعتبار سے، ایک مافوق الفطرت ہستی تھی جس کا اب مثل بھی صدیوں میں پیدا نہ ہو سکے گا۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

درسِ حدیث

بخت بیدار کی دولتوں میں سے اس خاکسار کی ایک یہ بھی فیروز بختی و سعادت ہے کہ بخاری شریف و ترمذی شریف کا درس حضرت مرحوم کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر حاصل کرنے کا موقع ملا اور اس طرح کہ حدیث کی درسی تقریریں نہایت بسیط اور بڑی پھیلی ہوئی ہوتی تھیں، مذاہب کا بیان، امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی تحقیق و تنقیح، حدیثی نکات، سند و رجال کی پُر مغز بحثیں، تصوف کے اسرار و رموز، کلام و حکمت کی دقیق باتیں سب کچھ ہی سبق میں زیرِ بحث آجاتا، خصوصاً بخاری کی جلد ثانی میں سیر و مغازی سے متعلق بڑی لمبی چوڑی تقریر فرماتے اور تاریخی واقعات شگفتہ لب و لہجہ میں دلنشیں کر دیتے اور پھر درس کے تمام حصہ کو اس اخلاص کے ساتھ طلبہ کے لیے مفید بنانے کی کوشش کی جاتی کہ جب تک طالب علم مطمئن نہ ہو جاتے تو سبق شروع نہ ہوتا، طلبہ کی دل داری کے لیے ان کے مہمل سوالات پر بھی بڑی بشاشت و انشراح کے ساتھ جواب عنایت فرماتے، تھکے ہوئے دماغوں کو از سرِ نو تازہ کرنے کی خاطر اور ذہنوں کی خشک علمی باتوں کو قبول کرنے کے لیے درمیان میں سنجیدہ مزاح اور شگفتہ تفنن کا موقع بھی آتا، خصوصاً اگر کوئی طالب سوتا اور حضرت کو اطلاع دی جاتی، تو پھر پُر شکوہ لہجہ اور متبسمانہ انداز میں ”اٹھتے جایئے، اور منہ دھو کر آیئے“۔ کی آواز سے تمام درس گاہ زعفران زار بن جاتی۔ سونے والا طلبہ

کے ہجوم سے شرمندہ ہوکر اٹھتا تو ع

ہائے کیا بھری محفل میں رسوائی ہوئی

کے تازیانے اس کا تعاقب کرتے، تین تین گھنٹے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ مسلسل سبق ہوتا، لیکن حضرت کی درس گاہ میں یہ طویل وقت بڑے نشاط و فرحت کے ساتھ ختم ہو جاتا اور طلبہ کے دل و دماغ پر اتنی طویل مشغولیت قطعاً گراں نہ گزرتی، بدشوق طالب علم بھی ان کے درس میں جس ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے اس کو دیکھ کر نظیری کا یہ شعر یاد آتا تھا کہ

''درسِ حدیث'' اگر بودن زمزمۂ محبتی

جمعہ مکتب آورد، طفل گریز پائے را

طلبہ کے ساتھ ان کا معاملہ ایک شفیق باپ کا تھا جو شفقت و محبت کے ساتھ اولاد کی کوتاہیوں پر اصلاح بھی کرتا رہتا ہو، وہ طلبہ کی تمام ضرورتوں کو غور سے سنتے اور پھر ان کے وکیل ہو کر اربابِ مدرسہ کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاتے اور طالب علموں کی تمام خواہشات کو خود بھی پورا کرتے، دوسرے ذمہ داروں کو بھی بار بار اس طرف توجہ دلاتے رہتے، آہ! کہ طلبہ و علماء کا یہ غمگسار اب دنیا سے رخصت ہو گیا۔

نظافت پسندی

لباس اگرچہ نہایت معمولی زیب تن رہتا؛ لیکن صاف اور اجلے کپڑے پہننے کے عادی تھے، عطر بے حد استعمال فرماتے، خوشبو کے عاشق اور گل ریحان کے شیدائی تھے، سبزے سے خاص انس تھا، گھر تو اچھا خاصا چمنستان تھا؛ لیکن دار العلوم کو بھی اپنے اصرار سے ایک خیاباں بنائے ہوئے تھے۔ جب پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے قریب سے گزرتے اور دل آویز روشوں سے چکر لگاتے تو مسرت و ابتہاج ان کے نورانی چہرہ پر چھا پڑتا تھا، گرمیوں میں دو پلی ٹوپی، کھدر کا کرتا جس کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا اور کھدر ہی کا پاجامہ حضرت کی پوشاک تھی، ہاں پاؤں میں جوتا سلیم شاہی یا جے پوری قیمتی سے ہوتا۔

سردیوں میں پاؤں میں جرموق، سر پر عربی رومال اور ان کے چوڑے چکلے جسم پر عبا عجیب بہار دیتی تھی، جب یہ لباس پہن کر سبک گامی فرماتے تو عرب و ہند کی روایات کا حسین امتزاج، ان کی ذات میں نظر آتا اور یہ نیم ہندی و نیم عربی انسان دیکھنے والوں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتا، نظریں اٹھتیں اور ان کے سادہ؛ لیکن پُرعظمت جسم وجثہ پر ٹھہر جاتیں۔

ماکولات ومشروبات

حضرت مرحوم کو پھلوں میں آم سے خاص رغبت تھی اور مٹھائی کا بھی کافی شوق تھا؛ بلکہ بے تکلف احباب و دوستوں سے زبردستی مٹھائی کا مطالبہ فرماتے، دسترخوان نہایت وسیع تھا جس پر دوست و دشمن کی کوئی تمیز نہیں تھی، جس کا جی چاہے کھائے اور جو چاہے شریک ہو جائے، ان کا دولت کدہ صحیح معنوں مین ایک مسافر خانہ تھا جس میں ہر وقت مسافر اترتے رہتے اور پھر لطف یہ تھا کہ نہ بادشاہ کا اہتمام، نہ غریب سے سرسری معاملہ، نہ رؤساء کا امتیاز، نہ غربا سے بے نیازی، سب مل جل کر ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ جاتے اور عربی طریقہ کے مطابق بڑی بڑی پلیٹوں میں کھانا شروع ہو جاتا، حضرت مرحوم بھی مہمانوں کے ساتھ تناول فرماتے اور مہمانوں سے علیحدہ کھانے کی عادت نہ تھی، شام کو زعفرانی چائے کا دور چلتا جس کے جرعے حضرت کی فیض صحبت سے دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتے۔

قدامت پرستی

حضرت مرحوم بڑے قدامت پسند اور قدیم روایات کے زبردست دلدادہ تھے، موجودہ دور کی لغو تجدد پسندیاں ان کو چھو کر بھی نہیں نکلی تھیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان حدود میں بھی لکیر کے فقیر بنے رہتے، جہاں آج قدامت پرستی، دقیانوسی کا دوسرا نام ہے، انہیں جائز حدود تک مناسب جدت، ان کو ہرگز گوارا نہ تھی، ہاں مغرب پرستی اور یورپ نوازی کے خواہ مخواہ جنون میں اپنی تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر دوسروں کے مکتب فکر سے ہر غلط روایت کو قبول کر لینا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ قدامت پرستی اور تجدد نوازی

کی یہ ملی جلی صورت کیسے ناگوار وگراں ہوسکتی ہے۔

امر بالمعروف

ان کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز تھا کہ وہ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں بڑے نڈر واقع ہوئے تھے، یہ ان کا ایک ایسا وصف تھا کہ علماء کی جماعت میں بڑے بڑے ارباب جبہ ودستار ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیا مجال کہ داڑھی منڈا کر کوئی ان کے سامنے آجائے، کس کی جرأت کہ سر پر انگریزی طرز کے بال ہوں اور حضرت شیخ کے روبرو پہنچ جائے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ان کی گرفت سے نہ رؤساء بچ سکتے تھے، نہ ممتاز طبقہ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی اس ادا کے نتیجہ میں ہزار ہا چہروں پر مقطع داڑھیاں نظر آنے لگیں اور ہزار ہا سروں پر سے انگریز پرستی کا بوجھ اتر گیا، معروف کی اشاعت اور منکرات سے اس شدت سے روکنے والا جماعت علماء میں اب کا ہے کو پیدا ہوگا؛ باطل پرست جماعتوں کا مقابلہ جس پامردی سے کرتے اور اس راہ میں ہر سب وشتم، طعنہ وتعریض کو جس خندہ پیشانی سے قبول کرتے، یقیناً اس کے اجر مضاعف سے عالم اخروی میں ان کا دامنِ مراد بھر دیا جائے گا، عمل وہمت کی ایک چٹان تھی، جس نے کبھی تھکنا نہ جانا، عزم وبلند حوصلگی کا ایک کوہِ گراں تھا، جس کو حوادث روزگار اور انقلابِ زمانہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکتے تھے۔

سلوک وتصوف

یوں اگرچہ حضرت مرحوم بڑے جامع تھے، سیاسی سرگرمیوں میں ان کی شہرت اتنی کہ ممتاز رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا، مگر پھر بھی ان پر جو رنگ غالب تھا اور جو مذاق ان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا تھا، وہ ان کی معرفت اور سلوک وتصوف کا ذوق کامل تھا، بلاریب اس آخری صدی میں ہندوستان کے پورے علاقے میں اس شان کا کوئی بزرگ پیدا نہ ہوسکا، جس کی ذات سے سلوک وتصوف کے جابجا چراغ روشن ہوگئے ہوں اور جس کے نفس قدس سے تزکیہ وتطہیر کی سنتیں زندہ ہوگئی ہوں، لاکھوں گمراہوں کو

ان کے حق پرست ہاتھوں پر عقائد کے صحیح کرنے کا موقع ملا اور ہزاروں انسان شریعت کے مقفی سانچے میں ڈھل گئے، اپنے اس خاص رنگ میں اگر چہ تالیفات کا بہت کم ذخیرہ انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا؛ لیکن چلتے بھرتے، جیتے جاگتے افراد کی ایک ایسی بڑی جماعت چھوڑ گئے ہیں جن کی خانقاہوں سے صدیوں تک اسلامی تصوف کا درس بھولے بھٹکے ہوئے لوگوں کو ملتا رہے گا اور علم وعرفاں کی مشعلیں قدم قدم پر جلتی ہوئی ملیں گی۔

وفات حسرت آیات

تقریباً آج سے آٹھ ماہ قبل جب حضرت بالکل تندرست اور تر وتازہ تھے، راقم الحروف کی والدہ محترمہ نے ایک خواب دیکھا جس میں امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا مدنی مرحوم کے ہارٹ فیل ہونے کی دردناک اطلاع سنائی تھی، صبح کو یہ خواب والدہ مدظلہا نے سنایا تھا تو سنتے ہی ماتھا ٹھنکا، پھر جیسے ہی حضرت کے مرض وعلالت کی خبریں کان میں پڑنے لگیں تو دل کی بے قراریاں بڑھتی جاتیں اور ہوش وحواس اڑے جاتے اور دل کی دھڑکنوں کا واقعی یہ حال ہوتا کہ ؂

دل کی دھڑکن کا یہ عالم ہے کہ بامنت دست
پرزے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

آخر کار یہ جامِ غم لبریز ہو گیا اور زہر کا یہ پیالہ منہ کو لگانا ہی پڑا یعنی ان کانوں نے ان کی وفات حسرت آیات کی خبر سنی اور آنکھوں نے شیخ عالم کی میت کو طوعاً وکرہاً دیکھا، جس دار العلوم میں ربع صدی تک ان کی ذات سے قال اللہ وقال الرسول کے زمرے بلند ہو رہے تھے، اسی درس گاہ میں ان کی نعش آخری زیارت کے لیے رکھ دی گئی، تقدس وعظمت ان کی بلائیں لیتے تھے، انوارِ الٰہی جسم اطہر کا احاطہ کیے ہوئے تھے، چہرۂ انور پر وہ مسکراہٹ ومسرت موجود تھی جس کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ مسافر منزل پر پہنچ کر تھکا ہوا نہیں؛ بلکہ اپنی منزل تک پہنچ جانے کی بے پناہ مسرتیں اس کو حاصل ہو رہی ہیں ؂

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ❁ چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

ان کے چہرے پر جو طمانیت وسکون تھا، بشاشت ونشاط کی جو نورانی کیفیات رقصاں تھیں، ایسے انوار اور تجلیات، حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کسی اور میت پر دیکھنے میں نہیں آئیں، جنازہ اٹھا اور اسی دروازہ سے جس سے تیس سال تک وہ حدیث کا درس دینے کے لیے تشریف لاتے تھے، تو دار العلوم کا ذرّہ ذرّہ چیخ کر کہہ رہا تھا ؎

کون اس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے
رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے

اُن کی موت سے شریعت وطریقت کی عظمت مٹ گئی، علم وعرفان کی بزم سونی ہو گئی، سلوک وتصوف کی خانقاہ اجڑ گئی اور عزم واستقلال کے بلند منارے زمین کے برابر ہو گئے، وہ اپنی زندگی میں عمر فاروقؓ سے بڑے مشابہ تھے، دینی امور میں ان کی شدت، ان کا دینی تصلب، حمیتِ اسلامی، غیرتِ مومنانہ، ان کی شخصیت کو فاروق اعظمؓ کی پُرعظمت ہستی سے قریب کر دیتی تھی، اس لیے آج اشکبار قلم کی زبان پر بے اختیار وہی کلمات تھوڑے سے تصرف کے ساتھ لوٹ لوٹ کر آ رہے ہیں، جو علی کرم اللہ وجہہ نے ابن خطابؓ کے غم انگیز حادثۂ موت پر کہے تھے یعنی:

إنّ موت حسین أحمد ثلمة فی الإسلام لا ترتق إلیٰ یوم القیامة.

(فکر انقلاب ''شیخ الاسلام نمبر'' فروری ۲۰۱۳ء)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی
قبول واقبال، عروج وکمال، خدمت وعظمت اور ابتلاء وآزمائش کی

داستانِ حظ وکرب

کس قدر خوش نصیب ہے وہ انسان جسے حسب ونسب کی شرافتیں، گھر کا پاکیزہ ماحول، شریف الطبع والدین، ظاہر وباطن کی تربیت، علم وتعلّم کے لئے یگانۂ روزگار شخصیتیں ملی ہوں، واقعی اس سے بڑھ کر کوئی سعید اور جس کے حصہ میں یہ سب امتیازات ہوں اُس سے بڑھ کر کوئی بخت آور نہیں۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو یہ سب سعادتیں لگے بندھے انداز میں نہیں بلکہ وافر میسّر تھیں، ان کی ددھیال میں حضرت نانوتویؒ کا نام نامی کافی وافی ہے، ننھیال دیوبند کا ایک شریف بلکہ اشرف خانوادہ۔ گھر کا ماحول علمی، تعلیم اور تعلّم کا سلسلہ، فخر روزگار شخصیتوں تک پہونچا تا ہے، روحانی تربیت کے لئے مجدّد وقت سے وابستگی ہے، خود طبعاً شریف، حلم کے پیکر، بزرگانہ اداؤں کا مرقع۔

اب ذرا تفصیل اس اجمال کی سنئے۔ والد مولانا حافظ احمد صاحبؒ مزاج کے خسرو پیدا ہوئے، یہ وہ دور تھا کہ جب نسبتیں سب سے زیادہ بار آور چیز تھیں، پھر ان کی نسبت حضرت نانوتویؒ ایسے فردِ فرید سے، تجویدی لب ولہجہ میں گفتگو کرتے، مکلّف زندگی بلکہ ٹھاٹ باٹ، لب ولہجہ شاہانہ، مگر سینے میں دل برف کی سل، بگڑتے تو جوالہ، سنبھلتے تو برگِ گل۔ طلبہ کے ساتھ تعلق دیدنی وشنیدنی، کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو عیادت کے لئے بار بار اس کی رہائش پر پہونچتے، اگر اس کی موت ہو جاتی تو حجرے کے سامنے

بیٹھ کر تعزیت لیتے، کیا مجال کوئی استاذ اور کارکن حافظ صاحب کو تعزیت نہ پیش کرے۔
مسجد کا بڑا احترام ملحوظ تھا، اوّابین وہیں پر ادا کرتے، ایک روز صحن مسجد میں کسی طالب علم کو ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے پایا، پھر کیا تھا، حافظ صاحب کا غضب ابل پڑا، تادیب کے ساتھ کھانا بند، دو ایک روز کے بعد اُسی طالب علم کے حجرے کے سامنے سے گذر رہے تھے دیکھا کہ وہ پتے کھا رہا ہے، دریافت کرنے پر تفصیل معلوم ہوئی تو خود بھی اس کے ساتھ دیوار گریہ ہو گئے، گھر لے آئے اور ہمیشہ کے لئے وہ دستر خوانِ قاسمی کا خوشہ چین ہو گیا۔
بھولے اتنے کہ انگریزی دوئی اور چوئی میں فرق نہ کرتے، کسی ملازم پر بگڑتے تو فرماتے: تم اپنی اس حرکت پر مباح الدم ہو چکے ہو یا تمہارا یہ جرم گردن زدنی ہے، مہتمم صاحبؒ کی مرحومہ والدہ مرقع حیا، چہرے پر معصومیت، گفتگو معصوم بچوں کی طرح؛ بلکہ محسوس ہوتا کہ بات چیت میں محتاط ہیں، اس کم گفتاری کے نتیجہ میں بہت سے گناہوں سے خود کو بچا لیا تھا۔
سردی میں سبز کاہی شال جس پر چھوٹے پھول ہوتے، گرمیوں کا لباس عموماً ڈھاکہ کی چکن، دوپٹہ بھی اسی کا ہوتا۔ جواں بخت بیٹے کے جب اسفار عالمگیر انداز میں شروع ہو گئے تو کبھی فرماتیں کہ ”طیب! جب خدا تعالیٰ رزق تقسیم کر رہا تھا تو تیرے حصہ کو دنیا میں بکھیر دیا“۔
ہمارے یہاں عموماً تشریف فرما ہوتیں، خصوصاً میرے برادرِ بزرگوار کی شادی جب رامپور ہوئی تو چند روز مسلسل قیام رہا، ایسی نیک بخت بیبیاں کم از کم پون صدی پہلے کی دل آویز یادگار تھیں، نئی نسل کے طمطراق نے تو انہیں آثارِ قدیمہ کی فہرست میں داخل کر دیا۔
بے ہمہ و با ہمہ، اس قدر معصوم کہ ایک قریبی دوست نے سو روپے کا وہ نوٹ جس سے بچے کھیلتے ہیں امانتاً اُن کے پاس رکھوا دیا اور حسب ضرورت وہ اس میں سے لیتا رہا، ایک دن اماں بی اسی روپے کو دے کر کسی خادم سے بازار سے کچھ منگوانے لگیں تو راز کھلا کہ یہ سب جعل و فریب تھا، غرضیکہ نیکی و شرافت، معصومیت و محبوبیت مہتمم

صاحب مرحوم کے حصہ میں طرفین سے آئی۔

شعور نے آنکھ کھولی تو یہ عہد دارالعلوم کا خیر القرون تھا، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی بینائی جاتی رہی تھی، تاہم حیات تھے، بارہا اپنے سینۂ بے کینہ؛ بلکہ معرفت وعرفان کے گنجینہ سے مہتمم صاحبؒ کو مس کیا، شیخ الہندؒ کا دستِ شفقت سر پر رہا، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے ابتدائی استفادہ کیا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے بڑا وقت آپ کی تعلیم کے لئے صرف کیا اور پھر دارالعلوم جو اُس وقت ممتاز شخصیتوں کا کہکشاں تھا ان سے ہر ایک افادہ کے لئے سرگرم، گویا ع

''میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصل بہار پر''

آخر کار اپنے وقت کے محدثِ جلیل، ابن حجر عصر اور ثانی ابن ہمام علامہ کشمیریؒ کے اتھاہ علم سے سیرابی کے لیے مستعد ہو گئے اور جم کر استفادہ کیا۔

جس شب میں علامہ اس خاکدانی ارضی کو چھوڑ رہے تھے عصر تا مغرب اپنی معروف کتاب ''مشاہیر امت'' کے لئے بسلسلۂ ابوالحسن کذاب استفادہ فرماتے رہے۔

روحانی تربیت کے لئے مولانا مفتی محمد شفیع صاحبِ ''معارف القرآن'' کی رفاقت میں سفر شروع ہوا، اوّلاً حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، ان کی وفات کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر نظر جا ٹکی، سادگی یہ برتی کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مدیر اہتمام سے سفارشی خط لکھوایا۔

تھانہ بھون کا یہ فقیر غیور بڑے ضابطے کا انسان تھا، جواب آیا ''کہ اس خاندان کی خدمت میرے لئے سعادت ہے لیکن استفادہ کے لئے مستفید کا عریضہ مطلوب ہے، نہ کہ کسی مخدوم کی سفارش''۔

مہتمم صاحبؒ فرماتے کہ پہلا سفر مفتی شفیع صاحب کے ساتھ رمضان المبارک میں ہوا، خیال یہ تھا کہ صاحب زادہ نوازی کا مظاہرہ ہوگا، لیکن خانقاہ تھانہ بھون میں

چند ساعتی سکون کے بعد اپنے وقت کے حکیم حاذق کا پیغام پہونچا ''چوں کہ آپ استفادہ کے لئے آئے ہیں اس لئے کھانے کا نظم خود فرمایئے، تبرعاً یہ بھی بتاتا ہوں کہ یہاں خانقاہ میں چھ پیسے کے عوض صبح شام کا کھانا میسر ہے جس کی تفصیل کھانے کے علاوہ ایک چراغ، سرسوں کا تیل اور اس میں فتیلہ بھی ہے۔

دیوبند میں مہتمم صاحبؒ کا معمول تراویح کے بعد چائے، بے تکلف احباب بذلہ سنجی وغیرہ تھا، تھانہ بھون میں بھی اسی معمول کو نبھانا چاہا، خلیفہ اعجاز صاحب نے حکیم وقت کے کانوں تک یہ بات پہونچائی فرمایا کہ ''براہ راست تو خطاب نہ کیا جائے؛ لیکن آج اگر یہ حادثہ پیش آئے تو حجرہ کے سامنے باآواز بلند اعلان ہو کہ خانقاہ کا معمول تراویح کے بعد ذکر وفکر ہے، نہ کہ مجلس آرائی''۔

مربی نے انتباہ میں رعایت ملحوظ کی، مستفید کے پاس گوش شنوا تھا، اس لئے اس لطیف تنبیہ پر معمول بدل گیا، مرحوم پر تحمل، حلم، تواضع اور نبوی اخلاق کا ایسا غلبہ تھا کہ ان مواقع پر بھی تہدید ووعید تو درکنار واجبی تنبیہ سے بھی گریز کرتے، جہاں انتباہ نظم وانتظام کا ضروری حصہ ہے، چناں چہ ایک بار دارالعلوم کے ایک اہم شعبہ میں خرد وبرد کا حادثہ پیش آیا، مہتمم صاحب نے کمیٹی تشکیل دی، تحقیقات شروع ہوگئیں، میں اس زمانہ میں ناظم مجلس تعلیمی تھا، میرے زبردست اصرار پر کہ کمیٹیوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا آپ براہ راست محاسبہ فرمائیں، بڑی ردّ وقدح کے بعد تیار ہوئے اور اس شان سے کہ مجرموں کے سامنے خود سب سے بڑے مجرم بن گئے، سر بہ جیب، آنکھیں بند اور نرم وگداز لہجہ، امانت ودیانت کے اہتمام پر ایک دل پذیر وعظ فرمایا، وہ سمجھ رہے تھے کہ مخاطب کے پاس گوش حق نیوش ہے اور یہ وعظ کام کر جائے گا، حالاں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں؟ یا بقول اقبال ع

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردناداں پر کلامِ نرم ونازک بے اثر

عمر بھر میں اس جبریہ کارروائی پر خود غایتِ حیاء سے پسینہ میں شرابور ہو گئے۔

مجرمین سامنے سے ہٹے تو مجھ سے فرمایا کہ "مولوی انظر شاہ! تم نے مجھ سے بہت سخت کام لیا"۔ ہمیشہ فرماتے کہ "بھائی کام ضابطہ سے زیادہ رابطہ سے لینا چاہئے"۔ یہ ٹھیک بھی تھا، لیکن تاوقتیکہ خیر القرون کا ڈوبتا سورج دل ودماغ پر سایہ فگن تھا، پھر جب فضا بدل گئی، خیر اٹھ گئی، شر نے قدم جمالئے، نیکی رخصت ہوئی اور بدی نے اپنی حکومت قائم کرلی تو رابطہ کا اصول ختم ہو کر ضابطہ پر عمل کی ضرورت تھی، مگر سچی بات یہ تھی کہ وہ جس سانچے میں ڈھالے گئے تھے، اس میں گرفت ومواخذہ، احتساب ومحاسبہ راہ نہیں پا سکتا تھا، لاریب کہ پیدا کردہ مشکلات، مسائل اور مصائب کے بہت سے طوفان میں انہوں نے اپنی مزاجی ساخت اور ناخن تدبیر سے رشتۂ کار میں پڑی ہوئی گرہیں کھولیں، لیکن خاتمۂ عمر پر وہ زبانِ حال سے کہتے ؎

بیچارگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

انہیں اپنے بزرگوں سے عشق تھا، وعظ ہو کہ تقریر، مجلس ہو کہ مستفیدین کا حلقہ، ہر جگہ اکابر کا وقیع تذکرہ فرماتے، ہندوستان کی حدوں کو توڑ کر دار العلوم کا تعارف، بزرگوں کی معرفت، ان کے اسی معمول کا دل آویز ثمرہ ہے۔ بہت سے متعارف ہو گئے، بہت سے نامور جاوید بن گئے، کاش! کہ وہ اپنی سوانح جس کے لئے میں نے بہت اصرار کیا، قلمبند فرماتے تو ایک صدی کی داستانِ علم وعمل مرتب شکل میں ملتی، حالاں کہ وہ لکھنے کے سلسلہ میں چابک دست تھے، مجمع ہو یا رزم وبزم، کاغذ اٹھاتے اور لکھنے میں ڈوب جاتے، ریل بھاگ رہی ہو، ہوائی جہاز چھلانگیں لگا رہا ہو مگر ان کے اِس شغل میں کوئی فرق نہ پڑتا۔

پھر خدا جانے وہ اپنی سوانح کی تالیف سے کیوں گریز کرتے رہے، علماء نے لکھا ہے کہ ایمان کھل کر ظاہر پر آجائے تو اسلام ہے، اسلام سرایت کرتے ہوئے باطن پر

ضوفگن ہوتو ایمان ہے، اسی طرح نفاست ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، خود نفیس، پوشاک نفیس، گفتگو نفیس، وعظ نفیس، تحریر نفیس، گویا کہ سراپا نفاست، کھانے میں پسندیدہ امر یہ تھا کہ دستر خوان لگا دیا جائے، انہیں جو چیز پسند ہوگی خود ہی اٹھالیں گے، اگر میزبان زبردستی کھلانا چاہتا تو قدرے ناخوش ہو کر فرماتے کہ ''بھائی کھانے کا تعلق رغبت سے ہے ترغیب سے نہیں''۔

ایک دعوت میں مولانا فخر الحسن صاحب مرحوم بار بار رائتہ اٹھا کر پیش کرتے اور کہتے کہ رائتہ۔ فرمایا کہ جی ہاں رأیتہ، غالباً اس وقت رائتہ مرغوب نہ تھا۔

مجھ پر شفقت کی خاص نظر تھی اور میری گستاخیوں پر مکدر نہ ہوتے، میں کبھی حاضر ہوتا تو فرماتے ''تشریف لایئے مولانا''۔ خود ہی ایک بار فرمایا کہ بھائی تمہیں مولانا کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ جیسے میں سالم کہتا ہوں اسی طرح تمہیں بھی انظر کہوں، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو میری سعادت ہوگی اور آپ کا غایتِ تعلق جو میرے لئے وسیلۂ نجات ہوگا۔ انشاء اللہ

میری گستاخیاں بعض اوقات ان کے تکدر کو فرحت وانبساط میں بدل دیتی تھیں، مدراس کے ایک سفر میں نمازِ فجر کے بعد کسی بات پر ان کی طبیعت قدرے مکدر ہوگئی، ناشتے کے دستر خوان پر تشریف لانے کے بجائے اپنے کمرے میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے، معمولاً تفریح سے لوٹا تو اُن کے کمرہ کے باہر یہ منظر دیکھا کہ مدراس کے بہت سے رئیس التجار سہمے ہوئے کھڑے ہیں، معلوم ہوا کہ حضرت ناشتے کے لئے تشریف نہیں لا رہے ہیں اور تحریری شغل میں منہمک ہیں، میں سیدھا کمرے میں حاضر ہوا تو لکھنے میں مستغرق تھے، میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا ''لگتا ہے آج آپ نے بھوک ہڑتال کر دی۔''، جب نظر اٹھاتے تو چشمہ کے عقب میں داہنا حاجب تن جاتا، نظر میری طرف اٹھا کر فرمایا کہ تمہیں ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے! لہجہ تکلف آمیز تھا، میں نے جرأت پائی تو عرض کیا کہ ویسے تو کوئی نقصان نہیں، البتہ دوسروں کے لئے مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، فرمایا کیوں؟ عرض کیا

آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ فرماتے ہوئے اٹھے کہ بھائی پھر بھی نہیں چھوڑتے۔ دستر خوان پر تشریف فرما ہوئے تو وہی بذلہ سنجی اور نکتہ طرازی، پھر یہ نشست دوپہر تک چلتی رہی۔

دارالعلوم سے آپ کو اس درجہ تعلق تھا کہ میری موجودگی میں ایک صاحب کا تجوید میں تقرر ہوا، کسی نے کان میں چپکے سے کہا کہ امیدوار کا تعلق فلاں گروپ سے ہے، جھنجھلا کر فرمایا "اس سے کیا ہوتا ہے کہ فلاں سے ہے فلاں سے نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ دارالعلوم کے لئے بھی مفید ہیں یا نہیں"۔

غرضیکہ وہ ایک شجر سایہ دار تھے، جس کے گھنے سائے میں دوست دشمن اپنوں اور غیروں نے راحت و آسودگی پائی، اور جب یہ درخت خشک ہونے لگا تو قافلہ آگ لگا کر آگے بڑھ گیا، خاتمۂ عمر پر جس کرب، بے چینی، دل و دماغ کی چبھن، روح اور جسم کی خلش میں ان کو الجھا دیا گیا اگر کوئی ان سے ان کا حال پوچھتا تو وہ کہتے اور اس بیان میں صادق ہوتے:

نہ پوچھ حال مرا، میں وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے، کارواں روانہ ہوا

آخر کار دل کا زخم رستا رہا، جب کوئی بوند باقی نہ رہی تو وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے:

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شور ہائے ذنب قتلتنی ہے

ان کے مرقد کی لوح اگر مجھ سے لکھوائی جاتی تو میں یہ شعر جو صورتِ واقعہ کا بھرپور عکاس ہے لکھتا:

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مظلوم را جز بیگناہی نیست تقصیرے

آہ...... ایک ۸۶ سالہ مقدس زندگی کے ساتھ ظالمانہ کھلواڑ اور ۶۳ سالہ پُرخلوص خدمتِ دارالعلوم کا تلخ تر انعام۔

استاذ محترم

حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ

جاہلیت کا طویل دور گزارنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں پڑھنے کے ارادے سے یہ حقیر دہلی پہونچا، مربی برادر محترم حکیم سیّد اختر حسین صاحب تھے جو میرے خالہ زاد بھائی ہوتے، طبابت ان کا پیشہ، نسلاً بعد نسل ان کے یہاں انگریزی تعلیم چلی آئی، کوئی بھائی ریلوے میں تو کوئی وائسرائے کے دفتر میں۔

دوسری جنگ عظیم چل رہی تھی، پنجاب یونیورسٹی سے اردو فارسی کا امتحان دے کر صرف انگریزی میں اگر میٹرک ہو تو ہاتھوں ہاتھ سرکاری آفس میں ملازمت مل جاتی، اس لئے مرحوم بھائی کا پورا منصوبہ یہی تھا کہ میں بھی جلد از جلد انگریزی میں امتحان دے کر کسی آفس کی کرسی پر جا بیٹھوں، لیکن دلّی میں اس وقت والد مرحوم کے منتسبین بھی بڑی تعداد میں تھے ان سب کی تمنا و آرزو کہ میں والد مرحوم کا علم حاصل کروں، اکثریت چوں کہ ادھر ہی تھی اس لئے میرا مشغلہ دینی تعلیم کا حصول ہی ٹھہرا، مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خاں میں تین سبق متعین ہوئے، مولانا صدیق احمد صاحب نجیب آبادی مرحوم مؤلف ''انوار المحمود'' مولانا ادریس صاحب میرٹھی جو تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہوئے اور مولانا عبد السمیع صاحب سرونجی جو ابھی حیات ہیں اور دہلی میں بود و باش رکھتے ہیں۔ اسی مدرسۂ صدیقیہ میں مرحوم استاذ مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات کا لفظ بھی غلط ہی ہے، اس لفظ سے مساوات کی بو آتی ہے، حالاں کہ مرحوم اس

وقت نامی گرامی استاذ اور میں حقیر واحقر طالب علم، مرحوم کے قہقہے، بود وباش، بول چال، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست سب کچھ عجیب تھا، وہ حضرت والد مرحوم کے شاگرد نہ تھے، اس لئے مجھ پر نظر التفات کم رہتی، جب کہ دوسرے اساتذہ علامہ کشمیری مرحوم کے تلامذہ تھے اور ایک ہیچ میرز کو سر پر بٹھاتے، اس لئے تکلف حائل رہا، خلاء ملاء کی نوبت آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں، حسنِ اتفاق میں منشی فاضل کی تیاری کر رہا تھا اور مرحوم نیز مولانا عبدالسمیع صاحب منشی فاضل کے امتحان دینے کی تیاری میں تھے، میں نے نصاب مسلسل پڑھا اور ان دونوں اربابِ علم نے صرف چند ماہ تیاری کی، مولانا ادریس صاحب میرٹھی نے بڑی دانشمندی سے مجھے مامور کیا کہ مرحوم کی مسجد واقع نئی سڑک دہلی میں تکرارِ کتب میں مشغول ہو جاؤں، یہ عجیب جماعت تین افراد پر مرکب تھی، ایک کمسن اور دو منجھے ہوئے استاذ۔

اس مسجد میں مرحوم امامت کرتے، شبِ براٗت کا حلوہ، عید کا شیر، بقرعید کا گوشت، ان فتوحات میں اب یہ احقر بھی شریک ہو گیا، ۱۹۴۷ء نے دہلی کے سکون کو لوٹ لیا، مجلسیں اکھڑ گئیں، بزم آرائی کی بساط الٹ دی گئی، بہت سوں نے پاکستان کا رخ کیا، بیشتر اپنے وطن کے عافیت کدے میں جا پہنچے، حالات کے تموّج نے مجھے دیوبند پہنچا دیا اور ۱۹۴۸ء سے عربی کی تحصیل ایک بے بضاعت کا شغل بنا، دارالعلوم کے اساتذہ میں مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ مؤلف ''مصباح اللغات'' شریک ہوئے، لیکن بدقسمتی کہ کامیاب نہ ہو سکے، وہ رخصت ہوئے تو ان کی جگہ حضرت مولانا بہاری کی آمد کا شور ہوا، جنہیں حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ کی پشت بانی حاصل تھی، اس وقت دارالعلوم کے داخلی معاملات پر مولانا فخرالحسن صاحب کی گرفت بہت مضبوط تھی اور اندرونی اتار چڑھاؤ عملاً ان کے چشم وابرو کے تابع تھے، وہ طلبہ کے جم غفیر کے حاکم، طلبائی انجمنوں میں دراندازی، طلبہ کے لیڈران کے قبضہ میں اور قائدین ان کی جیب میں، ایسی طاقتور شخصیت کی پاسبانی جس خوش نصیب کو حاصل ہو، فتح مندی کی دستار ظاہر ہے

کہ اسی کے سر پر ہوگی، چناں چہ مولانا بہاری مرحوم تدریس کے ہر دشت وجبل میں فاتح کی حیثیت سے چلتے رہے اور دار العلوم کی رواجی مخالفتوں کی صرصران کے قدموں میں لرزش پیدا نہ کر سکی اور پھر یہ بھی تو نہیں کہ صرف ایک مضبوط شخصیت کی نصرت انہیں حاصل تھی، خود علوم میں ان کی قدرت، منطق میں ان کی دستگاہ، فلسفہ میں ان کی حذاقت ان کے چپ وراست سے ان کی مدد کر رہی تھی، شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کے حکم پر میری شرح تہذیب اور قطبی کے اسباق خارج میں حضرت سے متعلق ہوئے، اب دہلی کا رفیق سبق دار العلوم میں مرحوم کا ایک ادنیٰ شاگرد تھا اور یہی اس کا حقیقی منصب ہے۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں دار العلوم میں میری تدریس کا دور شروع ہوا، دار الاقامہ کی نظامتِ اعلیٰ، نیابت مجلس تعلیمی، پھر نظامت مجلس تعلیمی، آخر کار دار العلوم میں قائم مقام مہتمم۔ ان سب مرحلوں میں استاذ میرے معاون رہے، خدا جانے کتنی مجلسوں میں ان کے ساتھ شرکت رہی، کتنے اجتماعات میں ان کی رفاقت میسر ہوئی، انہیں یہ ناز کہ میں استاذ ہوں مجھے یہ احساس کہ ان کا ایک ادنیٰ تلمیذ ہوں، وہ بھری مجلسوں میں ڈانٹتے، اجتماعات میں سرزنش فرماتے مگر ان کی دلچسپ شخصیت کے نتیجہ میں زہر ہلاہل بھی شیر مادر کی طرح ہنیئاً مریئاً تھا۔

مرحوم کی بعض نادر خصوصیات تھیں، تکبیر اولیٰ کی پابندی، بیشتر وقت مسجد میں گزارنا، کتاب وسنت پر حتی الامکان عمل، تا آں کہ جاں گسل چوٹ جو موت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، نماز کے اہتمام ہی میں پیش آئی، صاف باطن تھے ناراضگی اور رضامندی فوراً ظاہر ہوتی، کسی سے ناراض ہوئے اور وہ سلام کرتا تو چلا کر فرماتے ''واکہ تو مجھے کیوں سلام کرتا ہے''۔

''واکہ'' مرحوم کا تکیۂ کلام تھا جو ''وہ کہ'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے، اس کا ذکر اب بار بار آئے گا اسے محفوظ کر لیجئے، اگر کسی نے اس ناراضگی پر معذرت پیش کر دی تو فوراً

ڈھل جاتے اور مؤمن کی شان یہی ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت پر سہارنپور کی کسی درسگاہ میں شیخ الحدیث ہو گئے، ایک مرتبہ مطالعہ کے دوران الجھے، کتابی مطالعہ سے مشکل حل نہ ہوئی تو پریشان ہو کر سہارنپور کے اسٹیشن کی طرف چلے آئے، اتفاقاً حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سہارنپور سے دیوبند روانہ ہو رہے، اب ایک شاگرد کی استاذ سے گفتگو سنیے۔

واکہ آپ حسین احمد ہیں میں حسین ہوں، آپ بھی شیخ الحدیث ہیں، میں بھی شیخ الحدیث ہوں، آپ بھی بخاری شریف پڑھاتے ہیں میں بھی بخاری شریف پڑھاتا ہوں، البتہ ایک فرق ہے، آپ مسیح ہدایت ہیں، میں مسیح ضلالت ہوں، لیجئے چھٹ پٹ اس سوال کو حل کر دیجئے۔

استاذ نے اس بے تکلف گفتگو پر ایک قہقہہ لگایا اور چٹکیوں میں اشکال کا حل پیش کر دیا۔

طلبہ اپنی عادت کے مطابق وطن سے آتے یا نیا داخلہ لیتے تو مولانا مرحوم کو تحائف پیش کرتے، ان میں گاہ بگاہ مرغ بھی شامل ہوتا جس کے مولانا شوقین تھے اور اس معاملہ میں کچھ زیادہ ردّ وقدح بھی نہ فرماتے اور شاید کچھ طلبہ کی دل شکنی کے خیال سے بھی نرمی برتتے۔ ایک مرتبہ یہ مسئلہ مجلس شوریٰ میں چھڑ گیا، بحیثیت ناظم تعلیمی احقر بھی شریکِ مجلس تھا، یہ بحث چھڑ گئی کہ مولانا طلبہ سے ہدایا لیتے ہیں، اراکین میں بیشتر مولانا کے ہمعصر تھے جو مرحوم کے شمائل وخصائل پر پوری واقفیت رکھتے، لیکن کچھ ممبران موشگافیوں میں خود کو چیف جسٹس سے کم نہ سمجھتے، میں نے ضروری سمجھا کہ مرحوم استاذ کو اس سے مطلع کر دوں تاکہ وہ کسی الجھن میں مبتلا نہ ہوں، کمرے پر حاضری دی تو دیکھا کہ جس چارپائی پر تشریف فرما ہیں اس کے تین پائے میں تین مرغ بطور شاہد ومشہود بندھے ہوئے ہیں، مفروضہ پیش کرنے پر بولے ''واکہ تو انہیں لیجا اور مجھے پکا کر کھلا۔'' اس صورتِ حال پر یہ مصرعہ کتنا منطبق ہے:

تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اس معصوم حکم پر میں مسکرا کر رہ گیا، اپنی تدریس وملازمت کے پورے دور میں وہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب سے وابستہ تھے۔ ایک لمحہ بھی ان کے خیالات میں اتار چڑھاؤ پیدا نہ ہوا، انقلاب کے بعد بعض مجبوریوں کی بناء پر وہ اندر ہی ٹک گئے تھے، لیکن ان کا دل ہمارے ساتھ اٹکا ہوا تھا، وقف دار العلوم میں تشریف لاتے، چائے نوش فرماتے اور ہم نیاز مندوں کو بعض طلبہ کے لئے داخلہ وامداد کا حکم دیتے، ہم بھی ان کے ارشادات کی تعمیل سعادت سمجھتے۔

خاتمۂ عمر پر ضبط کی طاقت کھو بیٹھے، سرِ راہ ملاقات ہو جاتی تو آنسوؤں کی جھڑی بندھ جاتی، یہ بے اختیار گریہ وبکاء چل چلاؤ کی اطلاع دے رہا تھا، میں سفر میں تھا کہ ان کے ضرب کاری لگی، مظفر نگر جس ہسپتال میں داخل تھے، مراجعت پر وہاں حاضری کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے مایوس العلاج قرار دے کر انہیں دیوبند بھیج دیا، اندرونِ دار العلوم میری حاضری اب غیرت کا سوال ہے، والد مرحوم کی غیور طبیعت نے بھی دار العلوم سے جدائی کے بعد وہاں کی حاضری گوارہ نہیں کی، ان کی حیات کی آخری مجلسِ شوریٰ نے قاری صاحب مرحوم کو اپنا وکیل بنا کر یہ عرض کیا کہ دار العلوم کی سرپرستی وبخاری شریف کا درس قبول فرمالیں، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس دن جس کی شب میں علامہ کشمیریؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک فرمایا، عصر کے بعد غریب خانہ پر پہنچے اور دیر تک مجلس شوریٰ کی ایک پیشکش کو قبول کرنے کی استدعا فرماتے رہے مرحوم علامہ کا جواب یہ تھا:

''مولوی صاحب! غیرت قبول نہیں کرتی۔'' مرحوم باپ کی اضطراراً نہ سہی، اختیاری طور پر روش کو وراثت سمجھتا ہوں، اس جملۂ معترضہ کے بعد میرا پھر دیوبند سے سفر ہو گیا اور عدم موجودگی میں حضرت استاذ فانی عالم کی بندشوں کو توڑ کر عالم جاودانی کی طرف سفر فرما گئے، ثقہ روایات سے معلوم ہوا کہ چہرہ پُر انوار، سکون کی لہر، طمانیت کا تموّج،

فوتِ مومن کی علامت تھی، مقبولیت ومحبوبیت کی شہادت ایک غریب الوطن کے جنازے میں ہجوم کی شرکت ہے، سروش غیبی یہ کہہ کر شرکاء کو پیش قدمی پر اکسا رہا تھا ؎

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

وہ اب اپنی آرزو کے مطابق ''مرقدِ قاسمی'' میں تہ خاک سوتے ہیں، فردوس بریں کی ہوائیں اُن کی روح کے لئے سرور افزا، دل آویز خوشبو مشام جاں کو معطر کرتی ہے، اس لئے سننے والے ان کی قبر سے سنتے ہیں ؎

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

○○○

مولانا محمد سعید مسعودیؒ

ایک عظیم اور مدبر ہستی

خدا ہی جانتا ہے کہ عالم رنگ و بو میں کتنے جاذبِ قلب و نظر پھول کھلے اور مرجھا گئے، مگر بعض پھول تو دعوتِ نظارہ بنتے ہیں اور ان کی پژمردگی پر چمن کی رونقیں رختِ سفر باندھتی ہیں، بقول شاعر

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

انگنت نامور اٹھ گئے، بہادروں نے موت کا تلخ گھونٹ حلق سے اتار لیا، مدبر آغوشِ لحد کی خوراک بن گئے، دانشور تہ خاک سوئے ہیں، مگر اس چل چلاؤ میں بعض ایسی شخصیتیں نکل جاتی ہیں جن کے پیچھے پوری ایک تاریخ چلی جاتی ہے اور اُن کی موت ایک مکمل تحریک کی بساط کو لپیٹ دیتی ہے۔

مولانا محمد سعید مسعودی انہیں عہد ساز شخصیتوں میں تھے جن کے حادثے پر کشمیر تحریک کی طویل داستان ختم ہوگئی، وہ میرے والد مرحوم علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور مسعودی خانوادہ میں اجاگر شخصیت کے مالک، اصابتِ فکر اُن کی گھٹی میں تھا۔ الجھی ہوئی سیاسی گتھیوں کو اپنے ناخن تدبیر سے حل کرتے، گفتگو متین، دلائل متوازن، لب و لہجہ شستہ و شگفتہ، فکر ہموار، رائے مستقیم، اپنے مقصد سے قیس و فرہاد کی سی لگن، صلہ رحمی کے خوگر، غریب نواز و غریب پرور، مخاطب کو اپنی گفتگو سے قائل کرنے کے ہتھیار سے لیس، مخاطب کو ہمنوا بنانے کے گُر سے واقف، مہمان نوازی میں سیر چشم۔

کیا کیا ان کی خوبیاں ذکر کیجئے اور بتائیے، میں ان کا نام تو بچپن سے سنتا لیکن شعور

وآگہی میں ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ نیشنل کانفرنس کی جانب سے ہندوستانی پارلیمنٹ میں بحیثیت رکن شریک ہوئے۔

ایک روز ہمارے گھر کے سامنے ایک کار آ کر رکی تو مولانا مسعودی کار سے باہر آئے، ان کے ساتھ کشمیر کے مشہور لیڈر صوفی محمد اکبر بھی تھے۔ سرخ وسپید، درمیانی قد، گھٹا ہوا جسم، چہرے پر داڑھی، سر پر بالوں کی ٹوپی، شیروانی زیب تن۔ پہلی ملاقات میں تأثر یہ ہوا کہ یہ شخص مفکر بھی ہے اور صائب الرائے بھی، قائد بھی ہے اور مخلص بھی۔

میں اُس زمانہ میں بیمار تھا اور بغرض علاج دہلی کے اسفار ہوتے، مولانا ''ساؤتھ اونیو'' کے ایک فلیٹ میں مقیم، ان کے اصرار پر قیام انہیں کے دولت کدے پر ہونے لگا۔ یہاں کی راتوں میں مولانا کی سخنہائے دلنواز کو سننے کا موقع ملا، ان کا پاکیزہ کردار سامنے آیا، ان کا ذوقِ تلاوت وشوقِ عبادت آنکھوں نے دیکھا۔ مولانا اپنی رکنیت کا دور پورا کر کے کشمیر واپس ہو گئے، لیکن جلد واپس آ گئے، اب وہ ٹی بی کے شکار تھے، اس بار بھی ''ساؤتھ اونیو'' میں مقیم، لیکن کسی دوست کی عنایت کے نتیجے میں انہیں یہ فلیٹ ملا تھا۔

وہ کسی دینی درس گاہ کے فاضل نہ تھے، امرتسر کی ایک درس گاہ میں داخل ہوئے، یہیں حضرت علامہ کشمیریؒ سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی، مرحوم علامہ نے انہیں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے اور دیوبند آنے کے لئے متوجہ کیا، لیکن مرحوم اپنی بعض مجبوریوں کی بناء پر چند درجات عربی پڑھنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کے امتحان میں کامیاب ہوئے، انگریزی بے قاعدہ پڑھی، لیکن باقاعدہ پڑھنے والوں کو جب چاہتے شکست دیتے، مطالعہ کے رسیا تھے اور علم وفن کے ہر گوشے پر طالب علمانہ ذوق نے ان کو باخبر کیا تھا۔ تفسیر وحدیث پر بھی نظر غائر رکھتے، ان کی ہنگامہ خیز زندگی کا آغاز لاہور میں اخبار ''زمیندار'' کے حلقۂ ادارت سے وابستگی پر ہوا، یہاں مولانا ظفر علی خاں کی قربت کے ساتھ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے حلقے میں شریک رہے، ڈاکٹر مرحوم کے خیالات کے امین اور ان کے افکار کے شارح تھے۔

اقبال مرحوم کے حوالے سے بارہا بتایا کہ ان کی مشہور نظم ''ضیغم زادہ کشمیر'' اور ''وادیٔ لولاب'' کے پس منظر میں علامہ کشمیریؒ کی شخصیت جلوہ گر ہے۔

کشمیر کی تحریکِ آزادی کی ابتدائی داستان مولانا نے بارہا سنائی جو دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی، نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری رہے، کشمیری سیاست کے اہم ستون؛ بلکہ تحریک کے قلب ودماغ مولانا مسعودی، شیخ صاحب کے متعلق ان کے خیالات عجیب وغریب تھے جنہیں اب سنا کر کسی نئی بحث کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا، البتہ ایک بار میرے کئی سوالات کا جو شیخ صاحب سے متعلق تھے جواب دیتے ہوئے مرحوم نے کہا کہ:

''اگر شیخ عبداللہ سے اخلاص کی نفی کردی جائے تو پھر ان کے پاس کچھ نہیں رہتا۔''

شیخ کی وہ گرفتاری جو کشمیر کی وزارتِ اعلیٰ کے دور میں ہوئی اس کی ذمہ داری مسعودی مرحوم، مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی پر ڈالتے، پھر بخشی غلام محمد کو وزارتِ اعلیٰ کے لئے تیار کرنے کا واحد ذمہ دار رفیع احمد قدوائی کو بتاتے، یہ بھی بتایا کہ جواہر لال، مولانا آزاد اور رفیع صاحب نے اولاً بخشی صاحب کے بجائے انہیں کو وزارتِ اعلیٰ سپرد کرنا چاہی اور اس مقصد کے لئے مرحوم پر بھرپور زور ڈالا گیا؛ لیکن وہ عام حالات میں بھی عہدوں سے گریز کرتے اور اس وقت تو اس قدم کو شیخ سے بے وفائی باور کرتے۔

ان تینوں نے مولانا کو کشمیر بھیجا؛ تاکہ بخشی خود انہیں پر جاسکیں، لیکن ظاہر ہے جو زعماء ثلاثہ سے قفس عز وجاہ میں بند نہ ہوسکا، وہ بخشی صاحب کی دل پذیر تقریروں سے کہاں متاثر ہوتا۔ بخشی صاحب نے مایوس ہوکر کہا کہ ''اچھا مولانا! میں نے تو شیخ کی جدائی گوارہ کی، آپ کی جدائی بھی گوارہ کرلوں گا۔''

مسعودی صاحب بڑے ہوشمند اور ہوشیار تھے، کہتے کہ بخشی کے اس جملے سے میرا ماتھا ٹھنکا کہ اب مجھے گرفتار کرنے کا تہیہ کرلیا، بولے کہ ''بخشی صاحب! اس درجہ مایوس ہونے کی کیا وجہ ہے، ممکن ہے کہ دہلی میں تین بڑوں سے مل کر میں اپنی رائے بدل دوں''۔

بخشی اس جھانسے میں آ گئے اور مولانا کو دہلی روانہ کر دیا، مرحوم تو اپنا ایک موقف طے کر چکے تھے وہ جس طرز کے آدمی تھے وزارت اعلیٰ کی کرسی ایسے پختہ کاروں کو راستے سے ہٹا نہیں سکتی۔

دہلی پہنچ کر انہوں نے .... کی مدد سے ہم خیال لوگوں کا ایک جمگھٹ تیار کر لیا اور شیخ کے مقدمہ کو بلند و بالا سطح پر پہنچا دیا، مگر افسوس کہ شیخ اپنے خصوصی مزاج کی بنا پر مسعودی صاحب کے اس ایثار و اخلاص کی قدر نہ کر سکے۔ ''آتش چنار'' میں مسعودی صاحب کے متعلق شیخ صاحب کے تبصرے مجھ ایسے واقف کار کے لئے تکلیف دہ ہیں۔

بخشی مولانا سے اس درجہ خوف زدہ رہتے کہ جب وہ کشمیر جاتے تو سی آئی ڈی کا ٹڈی دل ان کے پیچھے لگا دیا جاتا، مگر مرحوم کی ہوشمندی و چابک دستی کوئی فرد جرم تیار نہ کرنے دیتی۔

ایک بار بخشی صاحب نے سی آئی ڈی کے افسر اعلیٰ سے رپورٹ طلب کی تو افسر اعلیٰ نے بتایا کہ ''وہ صبح کو اپنی گائے کھول کر اندر سے باہر لاتے ہیں، پھر بکریاں باندھتے ہیں، کھرپی لے کر اپنے پائیں باغ کی پھلواریاں درست کرتے ہیں''۔

بخشی نے اس معصوم رپورٹ پر قہقہہ لگایا اور کہا کہ ''مسعودی اتنا بھولا بھالا نہیں، جتنا تم مجھے سمجھا رہے ہو، میں اس کے حدودِ اربعہ سے خوب واقف ہوں، وہ اس کھرپی سے میری وزارت کی جڑیں کھود رہا ہے''۔

فاروق عبداللہ اور مرحوم میر واعظ مولانا کی تربیت سے پروان چڑھے، میں نے کشمیر میں بارہا اُن کی قیام گاہ پر دیکھا کہ یہ دونوں دوڑ دوڑ کر مولانا کے یہاں پہنچتے اور مرحوم کے مخلصانہ مشورے دونوں کے لئے حاضر۔

میر واعظ کو مذہبی و دینی بساط پر جم جانے کے مشورے دئے، اور فاروق عبداللہ کی وزارت کے وہ قلب و دماغ تھے، یتیموں کی پرورش کا بڑا شوق تھا، مولانا غلام مصطفی مسعودی سابق اسپیکر کشمیر اسمبلی جو ایک ہوائی جہاز کے حادثے میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کے بچوں کی کفالت مولانا کے ذمے تھی، میں نے دہلی میں بارہا دیکھا کہ مسلمان،

ہندو، سکھ نوجوان، کشمیری وغیر کشمیری مولانا کے پاس مسلسل پہنچتے، کوئی کورس کی کتابوں کے لئے تعاون چاہتا، کسی کو فیس برائے شرکتِ امتحان مطلوب ہوتی، کوئی ٹیوشن کی فیس کی ادائیگی میں طالب مدد ہوتا، کوئی ہوسٹل کے اخراجات کے لئے مولانا سے امداد چاہتا، وہ سب کی سنتے، خاموشی سے اندر کے کمرے میں جاتے، داہنے ہاتھ میں کچھ چھپا کر لاتے اور اس خدمت پر خود شکر گزار ہوتے۔

آخری ملاقات کشمیر میں اس سیمینار کے موقع پر ہوئی جو علامہ کشمیریؒ پر ریاستی گورنمنٹ نے کیا، اب دیکھا تو مولانا طول زلف مشت استخواں، کمر کمان، درویش صورت، درویش سیرت پہلے سے تھے۔ میں نے گستاخی کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''مولانا! سیاست کے کوچے میں طویل سفر کے بعد اب سلوک وتصوف کی پگڈنڈیوں پر یہ آہستہ خرام بلکہ مخرام مسافرت کہیں اس لئے تو نہیں ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں

کنجے گرفت وترس خدارا بہانہ ساخت''

مسکرائے اور اپنے اسی محبت آگیں لہجہ میں فرمایا کہ ''آج میرے ڈیرے پر قیام کیجئے۔'' مرحوم فلیٹ اور بنگلہ کو بھی ڈیرہ ہی کہتے۔

ایک بے آزار زندگی، ایک خدادوست انسان، ایک مرقع انسانیت، ایک پیکر دلنواز، ایک بیماری ورنجوری سے نیم جاں پر کس درندہ صفت انسان کے ہاتھ اٹھے، یہ سوچتا ہوں تو میرا دماغ گھوم جاتا ہے۔

سعید سعادتوں کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے، مظلومیت وشہادت، جمعرات کا دن وجمعہ کی تدفین، کاش کہ ایسی موت ہر ایک کو نصیب ہو۔

اس المناک حادثے پر اہل وطن سے سوال ہے ؎

غزالاں مست ہو کچھ تو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

صدر محمد ضیاء الحق کی بزرگوں سے عقیدت

"مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے"

عہدہ اور پھر کسی ملک کی سربراہی و حکمرانی، حاکم کی خلوت، اس کی جلوت سے مختلف باطن ظاہر سے کھلا تضاد لیے ہوئے منظر عام پر آئیں گے، تو سجے سجائے، خلوتوں میں دیکھیے تو بے عملی و بد کرداری کا متعفن ماحول، لیکن اس عام تجربہ سے ہٹ کر کبھی ایسی شخصیات بھی سامنے آتی ہیں جن کا باطن ظاہر سے زیادہ اجلا، خلوت جلوت سے بڑھ کر نکھری ہوئی، قول و عمل میں مطابقت، زندگی کے نشیب و فراز میں یکسانیت، انھیں دیکھ اور پرکھ کر نفرت نہیں، بلکہ محبتوں کا قلوب پر ورود ہوتا ہے۔ تحقیر کے جذبات نہیں، بلکہ ان کی عظمتوں کا یقین قلب و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

سربراہِ پاکستان مرحوم ضیاء الحق انھیں باکردار سربراہوں میں تھے، جن کی شخصی و نجی زندگی مومنانہ صفات کا دل آویز مجموعہ تھا۔ اس ذرۂ بے مقدار کو انھیں قریب سے دیکھنے اور دیر تک اُن کی خوبیوں کے مطالعے کا موقع ملا۔

چند سال قبل راقم کو رمضان المبارک کا عشرۂ آخر حرمین میں گذارنے کی سعادت نصیب ہوئی، عصر کی نماز سے کچھ پہلے صف بستہ زائرین جماعت کا انتظار کر رہے تھے، کہ اچانک سعودی پولیس حرم مدینہ میں بھاگ دوڑ کرنے لگی، اُن کی افراتفری کو دیکھ کر تشویش قدرتی تھی، اتفاقاً مجھ سے قریب ایک پاکستانی زائر بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ تو طنزاً بولے: مولوی ضیاء الحق تشریف لا رہے ہیں۔ اتنے میں مرحوم صدر پہنچ گئے، رفل کا کرتا زیب تن، چھالٹی کا سفید پاجامہ، سر پر کروشیا کی بنی ہوئی

ٹوپی، ہاتھ میں حمائل دلائل الخیرات، مناجاتِ مقبول مصنفہ حضرت تھانویؒ۔

یاد رہے کہ حرمین میں دلائل الخیرات کے قبیل کی کتابیں ممنوع الداخلہ ہیں، غالباً یہ صدر پاکستان کی خصوصی رعایت تھی کہ اُن پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائی، یہ بھی دیکھا کہ اُن کے اکرام میں روضۂ اطہر کا پہلا دروازہ کھول دیا گیا، صدر افطار کے وقت وہاں سے باہر آئے۔

رمضان المبارک کا آخری عشرہ وہ نصف مدینہ منورہ میں اور آدھا مکہ معظمہ میں گذارتے اور اپنی آنکھوں نے دیکھا کہ حرمین کے جس کونے میں حفاظ قرآن پڑھتے ضیاء الحق بڑے ذوق وشوق سے اس کی اقتدا میں نوافل پڑھنے میں لگ جاتے۔

دو چار بار پھر پاکستان کے متعدد سیمیناروں میں انھیں دیر تک قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ وہ مسلکاً پختہ دیوبندی اور بہت پہلے حضرت مولانا محمد حسن امرتسریؒ خلیفہ اجل حضرت حکیم الامتؒ سے روابط قائم کر چکے تھے، اسی لیے ذوقاً جے جمائے تھانویؒ تھے۔

مولانا امرتسریؒ کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ کے دوسرے معروف خلیفہ ڈاکٹر عبدالحئی عثمانی سے تام عقیدت رکھتے، اپنے بچوں کی شادی میں ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا، انھیں سے نکاح پڑھوایا، ایئر پورٹ پر اُن کے استقبال کے لیے خود پہنچے، مجلس نکاح میں ڈاکٹر صاحب کی عائد کردہ شرائط کی پابندی کی، میں نے یہ واقعہ براہِ راست ڈاکٹر صاحب مرحوم سے سنا کہ آخری شادی میں اُن کو مدعو کیا گیا تو شب کو وہ صدر ہاؤس میں استراحت فرما رہے تھے، ایک خادم ڈاکٹر صاحب کا بدن دبانے کی سعادت حاصل کر رہا تھا، اچانک ضیاء الحق تن تنہا کمرے میں داخل ہوئے، ڈاکٹر صاحب کی آنکھ لگ گئی تھی، وہ خادم کے ساتھ بے تکلف صدارتی رکھ رکھاؤ چھوڑ کر اس خدمت میں شریک ہو گئے، کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے، لیکن مرحوم صدر نے انھیں لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا، پھر وہ رات گئے تک جسم دباتے رہے، اس طرح کے واقعات اسلامی تاریخ کے قرونِ اولیٰ میں تو مل سکتے ہیں، لیکن بدبختیوں سے تیرہ وتار

اِس دور میں یہ داستانیں کتنی حیرت انگیز اور عبرت خیز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کراچی میں وفات ہوئی تو مرحوم صدر تدفین میں باقاعدہ نہ صرف شریک رہے، بلکہ گریہ وزاری کے ساتھ شیخ وقت کی میت قبر میں اتارنے کے لیے کود پڑے۔ غالباً گذشتہ سال جب کہ مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی اسلام آباد پہنچے تو ضیا مرحوم اپنی اہلیہ کو لے کر فرودگاہ پر آئے اور میں نے یہی سنا ہے کہ موصوف سے اُن کو بیعت کرایا۔ لاہور میں مدرسہ اشرفیہ سے بالکل قریب مرحوم کی بہن رہتی ہیں، بھانجے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب سے بیعت ہیں، ایک واپڈہ میں معمولی ملازمت پر اور دوسرے روزگار کے لیے چھوٹی موٹی تجارت کا شغل اپنائے ہوئے، یہ ہمشیرہ مولانا امرتسریؒ سے مسترشدانہ تعلق رکھتی ہیں، گویا کہ پورا گھرانہ حضرت تھانویؒ سے وابستہ ہے۔

گذشتہ سال لاہور میں حضرت تھانویؒ پر ایک سیمینار میں ضیا مرحوم صدارت کر رہے تھے، یہ بے بضاعت بھی شریک تھا، صبح ۸ ربجے سے ایک بجے تک بھاری بھر کم مقررین اور گراں قدر مقالات نگار ''التھانوی'' قدس سرہٗ کے علم وعمل، زہد وتقویٰ، تورّع واحتیاط، عرفانِ رب میں اُن کا ممتاز مقام، ان ہی عنوانات پر بولتے رہے، یا سناتے رہے، مجھ ظلوم وجہول کو اس پر کڑھن ہورہی تھی، میں کھڑا ہوا تو عرض کیا کہ حضرت تھانویؒ کے یہ امتیازات اس وجہ سے آج انوکھے معلوم ہورہے ہیں کہ یہ قحط الرجال دور ہے، ورنہ تو خود حضرت کے عصر میں وہ عالم تھے، جن کا لوہا حضرت تھانویؒ بھی مانتے، بلکہ علمی مشکلات میں اُن سے رجوع فرماتے۔

زاہد ایسے تھے کہ اُن کے زہد پر حضرت ابوذر غفاریؓ کے زہد کا شبہ ہوتا، اتقیاء وہ تھے جن کے تقویٰ پر ہزاروں تقوے قربان کیے جاسکتے ہیں، اِس لیے یہ سب کچھ نہیں، وہ درحقیقت چودھویں صدی کے مجدّد تھے۔

مرحوم صدر کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ وہ اپنی صدارتی تقریر میں اِسی کا حوالہ دیتے رہے۔ اس مجلس کے اختتام پر اپنی ہمشیرہ کے یہاں چلے گئے اور پھر نماز باجماعت ادا

کرنے کے لیے پلاسٹک کی معمولی سی چپل پاؤں میں ڈالے ہوئے اپنے قومی لباس میں تنہا مسجد کی طرف چل پڑے، جب کہ سیکورٹی اس صورتِ حال پر چیں بجبیں تھی، ان کے صوم وصلوٰۃ کا اشتغال وانہاک تو خود دیکھا تھا، مگر ثقہ لوگوں نے بتایا کہ تہجد کے بھی باضابطہ پابند تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

مرحوم ضیاء الحق کی زندگی اور اُن کے بلند کردار پر ایک اور واقعہ عکس ریز ہے، ایک بار چند علماء کو صدارتی ہاؤس میں مدعو کیا گیا، اسلامی نظام کے نفاذ کا مسئلہ زیرِ غور تھا، ایک ''مولانا'' دورانِ گفتگو بار بار لکھنوی ڈبیا سے گلوریاں نکالتے اور شغل کرتے، مرحوم صدر نے چٹکی لیتے ہوئے کہا:

''مولانا! پاکستان میں پان کم یاب ہے، اس کی درآمد پر زرِ کثیر صرف ہوتا ہے''۔

''ملا آں باشد کہ چپ نشود'' مولانا صاحب دھڑلے سے بولے کہ ''صدر صاحب! آپ کی انگلیوں میں جو سگریٹ ہے، وہ بھی غیر ملکی اور قیمتی ہے، اس کی درآمد پر پان سے زیادہ مصارف ہوتے ہیں۔''

معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ ضیا مرحوم نے دو انگلیوں کے درمیان دبی ہوئی سگریٹ کو پھینکتے ہوئے کہا: ''مولانا! آج کے بعد آپ سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔'' صدر کی سگریٹ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی، لیکن بے عمل واعظ آج بھی گلوریاں چیر رہے ہیں۔

مرحوم صدر کی چھوٹی بچی جو عام طور پر ماؤف الدماغ سمجھی جاتی ہے، مرحوم ضیاء نہ صرف اس کو چاہتے، بلکہ اس کے مجذوب ہونے کا یقین رکھتے، ایک مجلس میں خود سنا رہے تھے:

''میری یہ بچی اہم معاملات میں مجھے خدائی اشارہ سناتی ہے۔'' چناں چہ پھانسی کے کسی مجرم کی ماں کی جانب سے مراحم خسروانہ کی اپیل مع مسل صدر صاحب کے ہاں پہنچی، سردی شباب پر تھی اور پھر اسلام آباد کی سردی، شب کے ایک بجے مرحوم صدر نے اس مسل کو دیکھنے کے لیے اٹھایا، اچانک لڑکی اپنی خواب گاہ سے باہر آئی، مسل پر ہتھیلی تین دفعہ ماری اور انگلی سے نفی کا اشارہ دیا۔ صدر چونک گئے، اگلے دن، پھر تیسرے دن

بھی یہی معاملہ ہوا، اب صدر کو یقین تھا کہ جسے مجرم بنایا گیا ہے وہ بری الذمہ ہے، لیکن مسل اتنی مضبوط تھی کہ شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی تھی، ضیاء مرحوم نے اپنی ذاتی سی، آئی، ڈی کو تحقیقات سپرد کیں، ابتدائی تحقیق کے بعد سزا یافتہ نوجوان کو صدر کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ صورتاً ایسا معصوم کہ اقدامِ قتل کا اس کے چہرے مہرے یا انداز سے شبہ تک نہ ہوگا، نوجوان سہما ہوا تھا۔ صدر کے دلاسہ دینے پر اس نے سب سے پہلے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر بیان دیا کہ میں اس قتل کے گھناؤنے جرم سے قطعاً بری ہو۔

مزید تحقیقات سے یہ انکشاف سامنے آیا کہ پولیس نے ایک الھڑ رئیس قاتل کو بھاری رشوت لے کر قتل کے الزام سے صاف بچادیا اور اس معصوم غریب نوجوان کو مبتلا کردیا، اس انکشاف پر بے گناہ مجرم نہ صرف بچ گیا، بلکہ صدر کی ذاتی دادودہش سے بہرہ اندوز ہوا اور مجرم بنانے والا عملہ پولیس کیفر کردار کو پہنچا۔

رہ گیا یہ خلجان کہ صدر کی زندگی کے خاتمے پر اس مجذوبہ نے قبل از وقت خطرے کی گھنٹی کیوں نہیں بجائی؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود"

ان کی زندگی میں مخالفین ان پر بے بنیاد الزام لگاتے رہے، کبھی حریف سیاست داں اور کبھی اربابِ جبہ و دستار، تا آں کہ انھیں قادیانی تک مشہور کیا گیا۔ عیاذاباللہ، قلباً یہ مومن از روئے مسلک راسخ العقیدہ، ذوقاً تھانوی، قادیانیت کے ناپاک کوچوں سے کس طرح گذرتا، تاہم اب وہ اس عالم میں پہنچ چکے جہاں اپنے نیک اعمال کی احسن جزاء لینے کے لیے احکم الحاکمین کے حضور میں ہیں۔ اپنے علم و مشاہدہ کے اعتبار سے اس بے غبار زندگی کے اختتام پر یہی کہا جاسکتا ہے ؎

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد
قیس مرحوم کو کریں گے یاد

○○○

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

وہ فریب خوردہ شاہیں

یہ مضمون نہ کسی مرید کا نہ شاگرد کا، نہ محب کا، نہ معتقد کا، مرید کے مندرجات ''پیراں نمی پرند، مریداں پرانند'' کا مظہر ہوتے ہیں، اُسے اپنے شیخ کی سوانح میں جب ایسی ٹھوس چیزیں نہیں ملتیں جو قاری کے دل ودماغ کو متاثر کرسکیں، تو اِدھر اُدھر کے واقعات جمع کرتا ہے یا کرامات کا سہارا لیتا ہے، یہ باولی ہنڈیا جس کا ذائقہ عوام پسند مگر حقیقت شناس کے لیے بڑی بے مزہ اور بے لطف ہوتی ہے، شاگرد کچھ لکھے گا تو استاذ کی واقعی کمزوریوں سے صرفِ نظر، اسی کا نام عام حلقوں میں ''سعادت'' ہے، نکتہ چینی کرے گا تو اس کا نام ''بغاوت'' ہوگا، محبّ قلم اٹھائے گا تو پوری نگارش ''حبک الشیء یعمی و یصم'' کی آئینہ دار ہوگی، اُسے پیکرِ محبوب میں دلنوازی ودلبرائی کے سارے سامان جلوہ افروز نظر آئیں گے، کردار کے کسی سقم پر اس کی نظر نہ ہوگی، اس کی تحریر و تقریر پر کوئی نکتہ چیں ہوگا، تو وہ ''لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید'' کہہ کر معترضین کا منھ نوچ لے گا یا اسے خاموشی سے پڑھ کر اپنے دل کو مطمئن کرے گا۔

یہ نگارش کسی تملق پسند کی بھی نہیں جو زمین وآسمان کے قلابے ملاتا ہے، کسی ضرورت مند کی بھی نہیں جس کے دل میں ڈھیروں اعتراضات، مگر خود کو قیس صحرائی کے روپ میں پیش کرتا ہے، پھر یہ تحریر کس کی ہے؟

مولانا مرحوم کے ایک معاصر، ہم درس، ہم نشیں کی، جو صرف نام کا ''انظر'' نہیں بلکہ اپنے ماخذ سے وافر حصہ لیے ہوئے، جو کسی شخصیت کو دبیز پردوں میں جھانک کر دیکھ لیتا ہے، جس کی نظر چہار جہت پردوں کے آویزاں ہونے کے باوجود اپنے کام سے نہیں

چوکتی، وہ اس خدائی عطیہ یعنی صلاحیتِ مردم شناسی پر بطور تحدیثِ نعمت کہہ سکتا ہے ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے چھپیں گے وہ کہاں، ایسے کہاں کے ہیں

اِس تمہید کے بعد کیا راقم الحروف مطمئن رہے کہ آنے والے مندرجات کو آپ صحیح چوکھٹے میں دیکھنے کی کوشش کریں گے، آپ کی سعادت کو ٹھیس نہیں پہنچے گی، آپ کے جذباتِ محبت زخمی نہ ہوں گے اور آپ کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نہ ابھریں گی؟ اور اگر آپ خفا ہوتے ہیں تو یہاں سے بھی اعلان ہے۔ ع

بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

ہاں تو سنیے! اِک دبلا پتلا، نحیف ونزار، سفید پوش، صاف پوشاک دارالعلوم میں داخل ہوا، مختصر المعانی سے تا جلالین میرا ہم سبق، فراغت میں میرے اور سفید پوش کے درمیان ایک سال کا فرق یعنی میری فراغت ۱۳۷۲ھ میں ان کی ۱۳۷۳ھ میں۔ مشہور ہے کہ ''الناس باللباس'' عام ذہنوں نے اس مقولے کا مطلب پوشاک سے شخصیت کا طمطراق قرار دیا اور اپنا خیال یہ ہے کہ پوشاک کا انتخاب، اندرونی رجحانات و میلانات کا مظہر ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ نظافتِ طبع، نظیف لباس کی طرف لے جاتی ہے، قلب و دماغ کی کثافتیں، غلیظ پوشاک پہنواتی ہیں۔ مرحوم کھدّر پوش تھے لیکن کھردرے نہیں، ہمیشہ صاف ستھرے رہتے، کبھی پراگندہ حال و بال نظر نہ آئے، سنجیدگی و متانت کا پیکر! لیکن اندرون، جوش وخروش سے لبریز، باہر سے سعادت مند لیکن بباطن باغیانہ جذبات موجزن جنھیں معنی خیز خاموشی سے کنٹرول کرتے، زندگی اتنی پُر تکلف کہ بے تکلف مجلسوں میں بھی حجابِ تکلف میں مستور، پردہ ان کی زندگی کا جز و لاینفک تھا، رہائشی کمرے میں بھی ایسا زاویہ تلاش کر لیتے جس کے چہار جانب پردے پڑے ہوتے۔

حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادی مرحوم کا سبق جس کی گرمیٔ میدان تلامذہ کو ہمیشہ یاد رہے گی، مرحوم استاذ سبق میں بیٹھتے ہی ٹوپی اتار کر ڈیسک پر رکھ دیتے اور پھر ان کی

قریر دل پذیر شروع ہوتی، وہ افہام و تفہیم کے بادشاہ تھے، لیکن تلامذہ کو معلوم ہے کہ درس کے لیے مطالعہ کا اہتمام ان کے یہاں نہ تھا، جس دن ضروری تیاری نہ ہوتی تو پھر واقعی یدان گرم ہوتا جس میں عربی آمیز اردو، شوکتِ لب ولہجہ، آواز کا اتار چڑھاؤ، اس پر سب نقہہ زن ہوتے، لیکن مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم، اس سے یادہ کچھ نہیں، جس سنجیدگی کو انھوں نے اپنایا اس کا کچھ حصہ خلقی اور کچھ کسبی تھا۔ مجھے مولانا کی سوانح نہیں لکھنا، کچھ لکھ چکے، کچھ لکھیں گے، میں تو مولانا کے کردار و عمل پر ایسی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جسے اگر غور سے پڑھا جائے گا تو بعد کے حوادث و واقعات کی بہت سی گرہیں کھلیں گی اور مولانا کی ڈگر پر کام کرنے والوں کے لیے اس میں عبرت پنہاں ہوگی۔

قصہ مختصر! دیوبند سے فراغت کے بعد اِدھر اُدھر گھوم کر مولاناؒ پھر دیوبند آپہنچے، چوں کہ وہ عربی تحریر و انشاء پر قادر تھے اور پریشانیٔ روزگار میں اسی کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے، دیوبند اس کے لیے بہترین زمین تھی، یہاں پر ان طلبہ کا ہجوم تھا جو عربی لکھنے، بولنے کی اہمیت جان چکے تھے لیکن کوئی ایسا معلم نایاب تھا جو ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو مہمیز دے، اس کام کی مرحوم میں پوری صلاحیت تھی، چناں چہ ''دارالفکر'' کے افتتاح کے ساتھ ہی طلبۂ دارالعلوم کی اچھی تعداد ان سے جڑ گئی، جن کو ان کے ذوق کی چیز مہیا کرنے اور مزید اپنے لب و لہجے کی لطافت سے خود سے مانوس کرلیا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی حریف پارٹی جو دارالعلوم پر قبضے کے لیے بے باک اور جری قائد کی تلاش میں تھی جس کے لیے پہلی ضرورت اس قائد سے طلبہ کا مانوس ہونا تھا، وہ مولاناؒ کے اٹھان کو گہری دلچسپی سے دیکھ رہی تھی، کچھ اور مرحلے پیش آئے، جن کی تفصیل قصداً قلم زد! تا آں کہ مولانا دارالعلوم کے استاذ مقرر ہوئے اور ''عربی ادب'' مع اپنے برگ و بار کے ان کے خصوصی سبق، یہاں دارالعلوم کے طلبہ مولانا کے حلقہ بگوش ہوگئے جنھیں کھینچنے میں مولانا کا سلیقہ وقرینہ خصوصی مؤثر تھا۔ رفتہ رفتہ بڑے سیاسی انداز میں مولانا قاری طیب صاحب کی حریف پارٹی نے مولانا کو خود سے قریب کیا اور مولاناؒ پر نوازشوں کی بارش شروع

ہوگئی۔ صورتِ حال کی مزید وضاحت کے لیے کچھ ''آپ بیتی'' بھی سن لیجیے۔

میں فراغت کے ساتھ دارالعلوم میں تدریس کے لیے منتخب ہو چکا تھا، کامیاب تدریس، شعلہ بار تقریر، اردو انشاء کی وجہ سے طلبہ میں خاصا مقبول تھا۔ سیاسی نظریات میں پکا کانگریسی، پختہ ''جمعیۃ العلمائی''، میں نے جمعیۃ العلماء کی ممبر سازی کے لیے طلبہ کے حجروں پر دستک دی، دیوبند کے محلوں کی گرد چھانی، جمعیۃ العلماء کے اکھاڑے کے جلسے سر کیے، گیا میں جب جمعیۃ علماء کا سالانہ جلسہ ہوا، وہاں کی فضاء کو جمعیۃ کے لیے سازگار کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے سفر کیے، جن میں ہفتے صرف ہوئے، ضلع سہرسہ میں جمعیۃ کے مخالفین کے ہاتھوں اپنی پگڑی اچھلوائی، سہارنپور کے ایک جلسے میں مخالفین کی سنگ باری، سب وشتم اور دور تک تعاقب کا مزہ چکھا، اس کے باوجود مجھے جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کا کبھی ممبر منتخب نہیں کیا گیا جب کہ مولانا کو یہ عہدہ کسی تاخیر وتعویق کے بغیر مل گیا۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ مرحوم ذہنی طور سے جمعیۃ سے وابستہ نہ ہوں گے، مگر جہاں تک جمعیۃ کے لیے حرکت وعمل کا تعلق ہے وہ کتنی ہی حقیر سہی، مگر میرے ہی حصے میں آئے گی، پھر یہ امتیاز کیوں برتا گیا؟ یہاں میں حریف پارٹی کی بصیرت کی داد دینے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے پہلے لمحے میں میری مزاجی ساخت سے اندازہ لگایا کہ یہ دارالعلوم میں کسی انقلاب لانے میں مفید وکارآمد نہیں ہوگا۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کا حلیف طبقہ لیکن نا آشنائے عقل، جب میں مولانا اسعد صاحب کے دوش بدوش کھڑا تھا اس وقت تو مجھے مولانا کا زرخرید سمجھتا، حیرت تو اس پر ہے کہ اب بھی کچھ ایسے محرومِ عقل ہیں جو دارالعلوم کے انقلاب میں اور انقلاب کے لیے مختلف اوقات برپا کی ہوئی تحریکات میں مجھے حریف پارٹی کے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم سمجھتے رہے، حالاں کہ خدا شاہد اور اب واقعات سب سے بڑی برہان کہ حریف پارٹی نے مجھ سے دارالعلوم میں اپنے مقصد کے مطابق کوئی کام لینا تو درکنار، اس موضوع سے متعلق کبھی کسی خفیہ میٹنگ میں بھی مجھے شریک نہیں کیا۔ ایسے ہی کچھ

بدنیت کہتے اور سمجھتے ہیں کہ میں دارالعلوم کی صدارتِ تدریس کے لیے اہتمام کی ہمنوائی میں تھا، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے مولوی طاہر گیاوی کی اسٹرائیک کی اس وقت مخالفت کی تھی جب کہ میں طبقۂ وسطیٰ (ب) کا مدرّس تھا اوراس وقت صدارتِ تدریس کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ میرے بلند پایہ اساتذہ حیات تھے، انھیں پھلانگ کر صدارت کے تختِ طاؤس تک پہنچنا کارِ دشوار نہیں، بلکہ امرِ محال تھا۔

اب آیئے اس طرف کہ مولانا وحید الزماں کیا دارالعلوم میں اصلاحی انقلاب کی خود ضرورت محسوس کرر ہے تھے؟ اوراپنے عزائم کی تکمیل کے لیے انھوں نے ایک طاقتور گروپ کی پشت پناہی حاصل کی، اگر ایسا تھا تو اس کا پہلا طبعی مرحلہ رئیس الاہتمام سے براہِ راست گفتگو تھی۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب کے مزاج وکردار سے آشنا اس کی شہادت دیں گے کہ مرحوم گوشِ شنوار کھتے اور دلیل کی قوت کے ساتھ آنے والی بات کو فوراً قبول کرتے، ان کا تو یہ عالم تھا کہ اپنی خاص نگارش کو نہ صرف مجمع اساتذہ بلکہ رسمی علوم سے ناواقف، لیکن معلومات رکھنے والے اورانشاء کے پیچ وخم سے واقف، مثلاً سیّد محبوب صاحب رضویؒ، برادرِ اکبراز ہر شاہ صاحب قیصر کو بھی سناتے، پھر قاری صاحب جیسا جلیل الشان آدمی ان کے مشورے پر اپنی مرصع نگارش کے کئی کئی صفحات کاٹ دیتا۔

لکھنے کا جنھیں تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اپنی کسی نگارش کو کہنے سننے پر قلم زد کرنا، اپنی عزیز اولاد کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹنے کے ہم وزن ہے، پھر بسا اوقات یہ بھی دیکھا دراں حالیکہ مولانا وحید الزماں کا رخ متعین ہو چکا تھا، اہتمام کی بیشتر مجالس میں ان کی تنقیدی یلغار کو نہ صرف مہتمم صاحب برداشت کرتے، بلکہ اس سے موتی چن لیتے۔ اجلاسِ صد سالہ سے پہلے دارالعلوم کی تزئین کاری میں مہتمم صاحبؒ نے مولانا کو ایسا خود مختار بنایا کہ وہ ان تازہ وپختہ عمارتوں کو جن پر صرفِ کثیر ہوا تھا دھڑا دھڑ گرار ہے تھے جن سے بہت سوں کے دل کانپ اٹھے اور مہتمم صاحبؒ سے عرض ومعارضہ کیا گیا، مگر انھوں نے موصوف کے کام میں مداخلت نہیں کی، اس مزاج وکردار کے امیر سے دارالعلوم کی

اصلاح کے لیے پُرسکون انداز میں بہت کام لیا جا سکتا تھا، مگر یہ حکمتِ عملی حریف گروپ کے مقصد کی تکمیل نہیں تھی۔ اس کے ساتھ یہ چال بھی تیار کیا گیا کہ مرحوم اگر قاری صاحبؒ سے کوئی بات کرنا چاہتے تو سب سے پہلے وہی کاٹ کرتے جو آج دوسری جانب مقربین میں ہیں، میں ان کے مشین ومزین چہروں سے نقاب اٹھا سکتا ہوں لیکن سردست ''مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز'' اس لیے آہ! آہ! وہ شخص جو خاموش علمی خدمت کے لیے باہنر وباصلاحیت تھا، اس کی صلاحیتوں پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈال دیا گیا۔

بقول احسان دانش: ع ''لٹ گیا پردیس میں مزدور شاعر لٹ گیا'' پھر تو مولانا یہ عاشقانہ نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے خودکشی کا ایک ایک مرحلہ طے کرتے رہے ؎

اٹھاؤ نہ خنجر دکھے گی کلائی
گلا کاٹ لو گلبدن دھیرے دھیرے

بہر حال دار العلوم میں اس کی پرانی لیکن اُجلی روایات واقتدار کو پائمال کر کے انقلاب برپا کر دیا گیا۔ علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ حریف گروپ کی تمام کوششوں کے باوجود اقتدار پر قبضہ کا یہ منصوبہ مولانا وحید الزماں کے بغیر قطعاً پروان نہ چڑھتا، چوں کہ انقلاب کا طاقتور عنصر اندرونِ دار العلوم ''طلبۂ دار العلوم'' تھے اور ان کو دل پسند غذا دینے کا مولانا بہترین سلیقہ رکھتے تھے، غرضیکہ وہ انقلاب کے واحد وحید علمبردار رہیں، باقی انگلی کٹا کر مجاہدین میں شریک ہونے والے، انقلاب کے بعد جب مرحوم کی چوکڑیاں اربابِ اقتدار کے لیے پریشان کن بنیں تو ''جمعیۃ الطلبہ'' جو مولانا کا سب سے بڑا طاقت کا مخزن اور پشتی بان تھا، پوری سیاسی حذاقت سے اس سفینے کے ایک ایک تختے کو مولانا ہی سے اکھڑوایا گیا۔ مرحوم کے بعض ہوا خواہوں نے اس ''چال'' پر متنبہ بھی کیا، مگر وہ جوشِ اخلاص میں خود اپنی کشتی غرقاب کرنے میں مصروف رہے، شاخیں، ٹہنیاں سب کاٹ دینے کے بعد ''ٹھڈ'' رہ گیا جسے ذرا سی حرکت سے برابر زمین کرنا مشکل نہ تھا۔

رکیے! اور ذرا سوچیے! ایک جانب مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وسعتِ ظرفی و حوصلہ کہ مرحوم نے مرحوم کی منحرفانہ تمام زیادتیوں کو برداشت کیا، دوسری طرف جن کے لیے مولانا نے اپنی صلاحیتوں کے جنازے کو خود اپنے کاندھے پر ڈھو کر مرقد تک پہنچایا انقلاب کے بعد وہی مولانا برسر اقتدار طبقے کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے اور انھیں یکسو کرنے میں کوئی رواداری نہیں برتی۔

میرا وہ سوال کہ مولانا دار العلوم میں خود اصلاح چاہتے اور اس کے لیے انھوں نے طاقتور گروپ سے مدد لی، پیش کردہ تفصیلات اس مفروضے کی نفی کرتی ہیں۔

دوسری بات کہ مولانا بعض ہوشیاروں کی ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئے۔ واقعات وشواہد اسی کی تصدیق کرتے ہیں، کمال اتاترک کے شریکِ جدو جہد ایک یارِ غار کی ترک انقلاب کے بعد فعالیت، مصطفیٰ کمال کے اقتدار کے لیے خطرہ بن گئی تو اس پر بغاوت وتاراج کا الزام عائد کیا، عدالتی کارروائی تمام مراحل سے گذر کر اس وفادار کی پھانسی پر منتج ہوئی۔ آخری دستخط کے لیے دستاویز مصطفیٰ کمال کے سامنے آئی تو اتاترک لکھتا ہے کہ ایک سیکنڈ کے لیے میرا قلم جھجکا مگر دوسرے لمحے نے مجھے سمجھایا کہ اس کی بقاء میں تیری فنا ہے، میں نے اپنی بقاء کے لیے بے تکلف دستخط کر دیے۔ مصر میں انقلاب لانے والے جنرل نجیب کو آغوشِ لحد میں انھی جمال عبد الناصر نے سلایا جو نجیب کے دستِ راست تھے، مقصد برآری اور بعد میں تہ تیغ کر دینے کی داستانیں پہلے نادر تھیں، اب تو روز مرّہ کے انقلابات میں عام ہو گئیں۔

مجھے کہنا ہے کہ مرحوم کا اخلاص غیر مشتبہ لیکن عاقبت بینی مشکوک، اس تلخ نوائی پر ناراض نہ ہویئے! بلکہ سوچیے! کہ غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح، آخر میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ؎

سادگی اپنی بھی دیکھ
اوروں کی عیاری بھی دیکھ

افسوس کہ مولانا کسی مرحلے پر یہ نہ سمجھے کہ دار العلوم میں اصلاح کا نعرہ، طلبہ کے

حقوق، جمعیۃ الطلبہ، مؤتمر ابنائے قدیم، مجلۃ القاسم، سب دامِ ہم رنگ زمیں ہیں، ٹھیک اسی طرح آج عوام وخواص یہ نہیں جانتے کہ تحفظ ختم نبوت، تردید شیعیت، نصابِ جدید، وفاق المدارس کچھ عوامی توجہات کو کھینچتے تو کچھ سے مدارسِ عربیہ کی سیادت وقیادت کے عزائم، تو کچھ کا مقصد دارالعلوم کے المیے سے اس کی عالمی شہرت کو دھچکا لگنے پر تدارک کی کوششوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

مجھے اس موضوع پر مختصر لکھنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ حال ہی میں مرحوم کی ایک سوانح آئی جس میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں! یعنی مرحوم کی زندگی کا وہ باب جہاں سے ٹریجڈی شروع ہے۔ صاف ہے مولانا کی جبری معزولی کی تحریر کو نقل تو کیا گیا لیکن مجوّزین سے یہ چبھتا ہوا سوال نہ کر سکے کہ جس کی کمر تھپتھپا کر زبردستی چڑ چڑا بنایا گیا تھا، تاوقتیکہ رخ اُس چڑ چڑے پن کا مرحوم قاری صاحبؒ کی طرف رہا، یہ چیز نہ صرف مباح بلکہ واجب رہی اور جب توجہ آپ کی طرف ہوئی تو یہ نہ صرف مکروہ بلکہ ایسا حرام قطعی ہوا کہ جرم قابلِ معافی بھی نہ تھا۔ اس تفریق وامتیاز کی وجہ کیا؟

سوانح نگار یہ کیسے پوچھتے؟ ملازمت کی بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں یا مطابق مشہور قول ”عربی پڑھے تازی کا نپے“ کا حادثہ رونما ہوا لیکن انصاف پسند مؤرخ اس سوال کو ضرور اٹھائے گا اور کچھ نہ سہی تو بروز حشر، داورِ محشر تو ضرور ہی نمٹے گا۔[1]

اب گورستانِ قاسمی میں آپ کو ایک ایسا تودۂ خاک ملے گا جس سے اگر آپ کان لگائیں تو مدھم اور مغموم لہجے میں یہ سنا جا سکتا ہے ؎

قبر میں حسرت وارمان غنیمت ہیں اے داغ
رفتہ رفتہ اِن ہی یاروں سے بہل جاؤں گا

یہ آواز اس فریب خوردہ کی ہے جو اصلاح کے ارمان اور ان ارمانوں کی عدمِ تکمیل کی حسرت کے ساتھ، دنیائے دوں سے منھ موڑ گیا۔

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ فإنہ کان غرّا کریما

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ

ابن شیخؒ

مجاہد، متوکل، بے باک ونڈر، زاہد و متورّع، شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمہ کو پہلی بار کب سنا اور دیکھا صحیح طور پر یاد نہیں، البتہ صاحبزادے مولانا اسعد صاحب سے دید و شنید چند ادوار پر مشتمل ہے جس کے نقوش حافظے میں موجود ہیں:

گرمی کا زمانہ تھا اور اچھی خاصی گرمی، اچانک خبر ملی کہ دہلی میں مولانا اسعد صاحب مرحوم کی والدہ کی وفات حسرت آیات ہوگئی، مرحوم کی حقیقی خالہ میرے ماموں کی اہلیہ تھیں، قرابت بھی، آنا جانا بھی، مرحومہ دبلی پتلی لیکن نقش و نگار زیبا، لباس پوربی، یعنی ساڑی جو دیوبند کے اُس وقت کے معاشرے میں عجیب و غریب پوشاک تھی، سلہٹ کے طویل قیام کی بناء پر "مٹر ما" نامی نوخیز، ان کی خادمہ، سوال کرو تو جواب میں صرف ہنسی اور وہ بھی اس بلا کی کہ خود کے پیٹ میں بل پڑ جائیں، مرحومہ جب بھی ماموں کے گھر آتیں تو یہ مٹر ما ساتھ ہوتی، ہم بچوں کے لیے نادر تحفہ، بلکہ ہنسی کا گول گپا، میری عمر اس وقت چھ سال کے قریب ہوگی، اور والد مرحوم کے سایۂ شفقت سے محرومی کی بناء پر غیر ٹکسالی سکہ، ادھر حضرت مولانا مدنی کا عروج اور ان کے متعلقین رائج الوقت سکے، سانحۂ وفات پر والدہ مرحومہ تعزیت کے لیے گئیں، میں بھی ساتھ تھا، غالباً دن کے ۴ر بجے ہوں گے کہ تابوت کی آمد آمد کا شور ہوا، جسے مولانا مدنی لے کر دیوبند پہنچے، وسط صحن میں تابوت رکھ دیا گیا اور میت چار پائی پر، خوب یاد ہے کہ حضرت مدنیؒ رہائشی کمرہ کے دروازے کے قریب تشریف لائے، چہرہ مغموم، لیکن پیکر صبر و رضاء، نہ گریہ و بکا، نہ نالہ و شیون، عطر حنا کی شیشی کسی عزیزہ کو دی کہ میت پر ڈال دی جائے، حضرت کو تکفین و

تدفین میں ہمیشہ عجلت رہتی، چنانچہ اذانِ عصر پر جنازہ اٹھانے کا حکم دیا:

اب اٹھا چاہتی ہے نعش فانی دیکھتے جاؤ

یہیں مولانا اسعد کو پہلی بار دیکھا، ہم عمری کے باوجود بعد المشرقین، وہ چالوسکہ اور میں یتیم، نہ بات نہ چیت، نہ ہم کلامی، نہ دوستانہ گفتگو، اس وقت حلیہ یہ تھا، رنگ وروپ نامور باپ کی طرح گہرا گندمی، بے ریش وبروت، شاید یہ بھی احساس نہیں کہ دنیا لٹ گئی بلکہ اچھل کود۔

دوسرا دور

میں دارالعلوم کے شعبہ فارسی کا طالب علم، مولانا غالباً مرحوم استاذ قاری اصغر علی صاحب کے خصوصی شاگرد، باپ نے اپنی افتادِ مزاج کے مطابق گھوڑا لے کر دیا، اس پر کبھی مولانا اسعد اور کبھی مولوی فرید الوحیدی سوار، طلبہ ہر دوسمت سے لگام پکڑتے اور سعادت سمجھتے۔

تیسرا دور

باہر کے ایک کمرہ ''انجمن تہذیب الاطفال'' کا سائن بورڈ، مولانا اسعد اور فرید صاحب رکن رکین، مولانا افتخار صاحب بجنوری برادر زادہ مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم انجمن کے صدر نشیں، بذاتِ خود متین، بلکہ سنجیدگی کا پُرسکون ساحل، نہ لڑکپن کی شوخی نہ بچپن کے کھیل کود، پڑھنے پڑھانے میں ہمیشہ مصروف، ابھی زندہ وسلامت ہیں، اور روڑکی کے کسی گوشۂ عافیت میں، سالہا سال ملاقات پر گذر گئے، اس انجمن کے سالانہ جلسے کبھی بیت الہاجرہ، تو گاہے ہمارے رہائشی محلہ خانقاہ میں، میں حرف ناشناسی کے دور سے گذر رہا تھا، نہ پڑھائی نہ لکھائی، بلکہ وقت گنوائی، اس لیے حسرت ویاس سے ان انجمنوں کو دیکھتا، اور مقررین کی زیارت گویا مجنوں کے عشق کی یاد، یا فرہاد کا سوز وساز۔

چوتھا دور

لیگ اور گانگریس کے معرکے، بڑوں سے لے کر بچوں تک جلوس، کانگریسی بچوں کا

جم گھٹا بقیادت مولانا اسعد صاحب لیگی ذہنیت کے بچوں کا ''القاعدۃ'' کی منڑ گشت،
یہاں انڈین نیشنل کانگریس زندہ باد کے نعرے تو وہاں اللہ اکبر کے مترنم زمزمے، اس
زمانے میں انصاری اخبار کانگریس کی زبان اور مولانا مظہرالدین شیر کوٹی کے ''الامان''
اور وحدت'' لیگ کے ترجمان، ہمارے رفقائے درس میں اختر عباس مرحوم تھے، باپ
عطاری کی دوکان کرتے، اور صاحبزادے سیاست کا عطر کھینچتے، ان کی ٹولی کے دوسرے
فرد مولانا اعجاز احمد قاسمی ابھی حیات ہیں، آثارِ قدیمہ باجماعت سے معذور، مگر بچپن کا
شوق سیاست میں ایسا گھسا کہ اب ناتوانی اور بے چارگی کے عالم میں بھی دوسروں کے
کاندھوں پر سہارا لے کر کانگریس کی میٹنگ میں شرکت کو سعادتِ اخروی سمجھتے ہیں،
برادر اکبر مرحوم از ہر شاہ صاحب قیصر انشاء پردازی کے شوق میں صفحۂ زمین کو قرطاس
بنائے ہوئے، ہر وقت انگلی سے زمین پر لکھتے رہتے، اور خود مٹا دیتے، چنانچہ پوری زندگی
اسی نہج پر گذر گئی، تعمیر و منصوبہ بندی اور منصوبوں کے محلات کو اپنے پاؤں کی ضرب سے
گرا دیتے، ''تیج''، ''تیج ویکلی''، ''انصاری''، ''الامان''، ''وحدت''، ''زمیندار''، ''مدینہ''
کے مسلسل خریدار، مجھے بھی وہیں سے اخبار بینی کا چسکا لگا، اور ایسا دامن گیر ہوا کہ میں اب
خود ناتواں لیکن یہ شوق بھرپور، ایک دن خبر دیکھی کہ اختر عباس مرحوم اور مولانا اعجاز احمد
صاحب بیرسٹر آصف علی صاحب مرحوم سے ملاقات کے لیے پہنچے، کیا بتاؤں کہ اس خبر کو
پڑھ کر دل پر کیا گذری، مچلا، کودا، کاش ان ملاقاتیوں میں میرا بھی نام ہوتا:

کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

پانچواں دور

دارالعلوم کے تحتانی حصے میں مولانا عبدالخالق صاحب ملتانی مرحوم مشکوٰۃ کا درس
دے رہے ہیں۔ لمبے تڑنگے، بلکہ طالوت، موٹے تازے، لحیم و شحیم، ان کے دراز کرتے
کی آستین میں بلا مبالغہ ایک کمسن گھس جاتا، ہر بات ''حصر'' سے کہنے کے عادی، ''نہیں
کہا اس بات کو مگر علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بھی'' یا ''نہیں کہا اس بات کو مگر تفتازانی نے

بھئی'' گویا کہ تفتازانی کو دولخت کر دیتے، مولانا اسعد صاحب مرحوم انہی کے درس میں کبھی کبھی نظر پڑتے، میں طویل فترت کا دور گذارنے کے بعد اب دار العلوم کا ابتدائی طالب علم، صرف اس قدر راہ ورسم کہ اتفاقی ملاقات پر السلام علیکم، وعلیکم السلام، اسعد صاحب بعد فراغت غالباً ایک دو سال کے لیے مدینے چلے گئے، اور دار العلوم کا میدان بلاشرکتِ غیر میری ملکیت، یہاں سیاست میں بھی خوب پہلوانی کی، ڈنڈ پیلے اور اٹھک بیٹھک ایسی کہ فن مین رستم زماں بن کر رہا، معلم مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم، جو نئے نئے کرتب سکھاتے، اس وقت جمعیۃ الطلبہ جو طلبہ کی انجمن تھی اس کے اکھاڑے میں ایسی زور آزمائی کی کہ ''گاما'' کو بھی طاقِ نسیاں میں بٹھادیا، حضرت مدنیؒ اس انجمن کے سرپرست تھے اور صدراتی انتخاب الیکشن سے ہوتا، مقابلہ میں مولانا عبدالحیٔ مرحوم انجان شہید والے، ادھر سے یہ آزمودہ کار پہلوان، حزب مخالف کا بس نہ چلا کہ ایک رات پوسٹر نکالا کہ ''انظر شاہ مودودی'' ہے۔ اگلا دن جمعہ کا تھا، جامع مسجد دیوبند میں نماز پڑھ کر نکلا اور دار العلوم پہنچا تو میرے حامیوں نے پکڑ کر نودرہ میں کھڑا کر دیا، گویا کہ ملزم کٹہرے میں، یا شیر قالین پنجرے میں، مطالبہ یہ کہ اس الزام مودودیت کا جواب دو، ورنہ تو شکست کے لیے تیار رہو، خدا جانے کہ کیا اول فول بکا، لیکن جب اکھاڑے سے شرابور نکلا تو ساتھیوں کے کاندھے پر تھا، اللہ اکبر کے نعرے اور زندہ باد کی صدائیں، الیکشن میں جیت گیا، اور مولانا عبدالحیٔ مرحوم چاروں شانے چت آئے، اب مولانا اسعد صاحب مدینہ سے آ پہنچے، دار العلوم میں میری سرگرمیاں عروج پر تھیں، مرحوم بھی مشہور مقولے کے مطابق ''میں آیا، میں نے دیکھا، اور میں نے فتح کرلیا'' میدان میں کود گئے، حضرت مدنیؒ تک یہ بات پہنچائی گئی کہ جمعیۃ الطلبہ دار العلوم پر مکمل قبضے کا پلان رکھتی ہے، وہ رات کیسی عجیب وغریب تھی، دار الحدیث طلبہ سے لبریز، تخت نشین حضرت مدنیؒ اور ملزمین قطار اندر قطار، فرطِ غضب میں کسی کی نہ سنی، پورے الیکشن کو کالعدم قرار دیا، یہ حقیر چیئر پرسن کا جنازہ یکہ وتنہا، اس لاش کو دفن کروں تو کہاں، نہ قبرستان گورستان،

نہ گورکن نہ کفن، اب مولانا اسعد صاحب دارالعلوم کے معاملات میں براہ راست عزل و نصب تک دخیل ہو گئے، خود مرحوم کا تقرر بھی بحیثیت استاذ ہوا، اپنی فطری ہوشمندی اور اپنے نامور باپ کی شخصیت سے خوب فیض اٹھایا، حضرت علیہ الرحمہ روایاتِ اکابر کے حامل، غریب نواز، متوکل، قانع، سرمایہ پرستی سے بمراحل دور، اس لیے کسی ایسے کی گنجائش ان کے یہاں نہ تھی جسے دنیا کی ہوا چھو کر گذری ہو، تاہم مولانا اسعد مدنی صاحب مرحوم کی بھی کچھ خصوصیات تھی جن میں وہ منفرد تھے، پُرعزم، فعال، دانش مند، انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اپنی جدو جہد، محنت اور فعالیت سے، جوڑ توڑ اور کشاکش مستزاد، بڑوں بڑوں سے لوہا لیا، یوپی جمعیۃ العلماء کی صدارت سے شاہد فاخری صاحب رخصت ہوئے، جن کے سب سے بڑے مؤید خود مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی جیسے نڈر بہادر اور شجاع و مخلص جمعیتی تھے، مولوی وحید الدین شیر کوٹی جو دفتر جمعیۃ میں محرر تھے اور ایک زمانے میں مرحوم کے خاص الخاص دست راست، مرکزی جمعیۃ کی نظامت کے عہدے پر ان کا انتخاب مرحوم ہی کا کارنامہ تھا، حضرت مولانا احمد علی آسامی مرحوم کو جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی میں لائے، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی، مولانا حکیم اسماعیل صاحب نگینوی اور جسے یہ سمجھتے کہ حزبِ مخالف کے محاذ میں باکمال مبارز ثابت ہوں گے، ان کو دارالعلوم کی شوریٰ میں بھی کھینچ لیتے، سب سے بڑا معرکہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کی صدارت کا تھا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن حریف، اور کچھ صوبے ان کے حلیف۔ مفتی صاحب کی شخصیت کسی کے کنٹرول وقابو کی نہ تھی، ان کے حلقے سے حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ شیخ الحدیث شاہی مراد آباد کا نام پیش ہوا، میرٹھ میں جمعیۃ علمائے ہند کا یہ انتخاب ہونے والا تھا، اس زور کا رن پڑا کہ علیؓ و معاویہؓ کے مشاجرات تازہ ہو گئے، مرحوم جب کسی چیز کی ٹھان لیتے تو اُس کے حصول کے لیے انتھک جدو جہد، کوشش اور چھوٹا بڑا ہر مؤثر طریقہ استعمال کرتے، درمیان میں ایک طبقہ چوں چوں کا مربہ، یہ بیچارے نیک، صلاح پسند، مصالحت کوش،

اسے نہ سمجھے کہ یہاں "ان الحکم الا للّٰہ" کا نعرہ بلند ہو چکا تھا، ان کی کوششوں کے نتیجہ میں اتنا ضرور ہوا کہ ایک کام کا "صدر" اور ایک نام کا صدر، صدارت کی وحدت ثنویت سے بدل دی گئی، لیکن مولانا مرحوم نے اپنی مستعدی، بے تکان فعالیت اور مضبوط ارادے وحوصلے سے کام کے صدر کو بھلا دیا، تا آں کہ دفتر جمعیۃ دہلی کا مکمل انظام اپنے کنٹرول میں لے لیا، رہے مفتی صاحب تو وہ یہ کہتے ہوئے گوشہ نشین ہو گئے جو حضرت علیؓ نے اپنے حامیوں سے بطور شکوہ فرمایا کہ:

"تمہاری ناکردگی نے آج مجھے اس درجہ میں پہنچا دیا کہ قریش کی عورتیں گھروں میں کہہ رہی ہیں کہ ابو طالب کے بیٹے کی شجاعت میں تو کوئی گفتگو نہیں، لیکن جنگی حکمتِ عملی نہیں جانتا"۔

مجھ سے قرب واختصاص کی بنیاد یہ ہے کہ جب حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی حضرت علامہ کشمیریؒ کے مختص شاگرد دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث ہوئے تو شبِ منگل میں ان کی رہائش پر کھانا ہوتا، سب اپنے کھانے لے جاتے اور اجتماعی طور پر کھاتے، مولانا اسعد صاحب دیوبند ہوتے تو اس مجلس میں ضرور شریک ہوتے، اور میں چوں کہ نظریاتی طور پر کانگریسی اور جمعیۃ جماعتی طور پر ہمیشہ اس کی حلیف رہی، اس لیے فکر و خیال کا اتحاد مفت ہاتھ آیا، یوپی جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت، مرکزی جمعیۃ کے سالانہ اجلاس میں شرکت، جمعیۃ کی ممبر سازی کی مہم میں شریک ـــــ جمعیۃ کی بعض کانفرنسوں کی صدارت بھی کی، خطبہ صدارت بھی پڑھا، جسے جمعیۃ آفس نے آب وتاب سے شائع کیا۔

مرحوم کی فعالیت اور مستعدی، طویل اسفار کے لیے ہمہ وقت کی پابہ رکابی، جمعیۃ کے لیے حصولِ سرمایہ وتعاون کی حذاقت، سب قیل وقال سے ماورا، جمعیۃ علماء کے تحفظ میں وہ سرگرمی دکھائی کہ ہر خطرے کو بھانپ لیتے، مشاورت کا محاذ ہو یا مسلم مجلس کا یا مسلم پرسنل لاء کا اسٹیج ہو، جمعیت کی حفاظت میں برسرِ پیکار نظر آتے، شخصیت ایسی ہمہ رنگ کہ سیاست

کے خارزار کے ساتھ، خانقاہ کے گل گلزار بھی جماتے، ادھر راجیہ سبھا کی ممبری ادھر صوفی حلقہ نشین۔ دارالعلوم دیوبند کی داستان تھی ختم ہو چکی، ایک آندھی تھی نکل چکی:

ہمراز یہ فسانۂ آہ و فغاں نہ پوچھ

یہ حیرت انگیز ہے کہ والدہ مرحومہ کا تابوت بھی دہلی سے آیا اور لختِ جگر کا بھی وہیں سے، فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً

(تذکرہ فدائے ملت)

OOO

مصنّفِ کتاب

حضرت مولانا سیّد محمد انظر شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کا

مختصر سوانحی خاکہ اور امتیازات

نام: (مولانا) انظر شاہ کشمیری

ولدیت: (مولانا) انورشاہ کشمیریؒ

تاریخِ پیدائش: ۱۹۲۷/۱۲/۶ء

جائے پیدائش: دیوبند (یوپی) بھارت

وفات: ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء بروز ہفتہ صبح ساڑھے دس بجے

تدفین: مزارِ انوری، متصل عیدگاہ، دیوبند

امام العصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ ایک عالمی شہرت یافتہ عالم دین اور ریسرچ اسکالر تھے، جن کے شاگرد ہندوستان اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور انتظامی، تحقیقاتی اہم مناصب پر فائز ہوکر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تحریر کردہ مختلف علمی موضوعات پر کتابیں مصر، سعودی عربیہ، ترکی، پاکستان، بنگلہ دیش، متحدہ عرب امارات سے بڑے پیمانہ پر شائع ہوچکی ہیں، وہ جنگ آزادی کے ایک عظیم سپاہی تھے۔ ہندوستان کی آزادی میں ان کا موثر کردار ہے، ''تحریک ریشمی رومال'' کے سرگرم رکن تھے، گاندھی جی کی نمک تحریک میں انگریزوں کی پالیسی کے خلاف فتویٰ بھی دیا تھا۔

حضرت مولانا سیّد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ گذشتہ ۵۶/سال سے دارالعلوم دیوبند اور وقف دارالعلوم میں اہم مناصب پر کام کرنے کے علاوہ طلبہ کو تفسیر وحدیث، فقہ اسلامی

اور فلسفہ وغیرہ کا درس دیتے رہے۔ اس وقت ہندوستان اور دنیا کے مختلف ممالک میں تقریباً بیس ہزار شاگرد اہم علمی، تحقیقاتی و انتظامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جیسے بنگلہ دیش، سعودی عربیہ متحدہ عرب امارات، ملیشیا، انڈونیشیا، ساؤتھ افریقہ، زامبیا، ری پبلک آف پناما، نیپال، امریکہ، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، انگلینڈ وغیرہ میں۔ ملک و بیرون ملک میں ایک اسلامک اسکالر، مقرر، ادیب و انشاء پرداز اور مستند و معتبر عالم دین کی حیثیت سے بھرپور تعارف تھا۔ تقریباً دنیا کے ۴۰ر ممالک میں کانفرنسز اور سیمینارز میں اپنے ادارے اور ملک کی نمائندگی فرمائی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تصانیف کی تعداد ۱۵ر کے قریب ہے۔ اور وہ عربی کتابیں جن کا عربی سے اردو، فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا ان کی تعداد بھی ۲۰ر کے قریب ہے۔

تعلیمی قابلیت

۱- منشی (فارسی) پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۴ء
۲- منشی فاضل (فارسی) پنجاب یونیورسٹی
۳- ادیب عالم (اردو) پنجاب یونیورسٹی
۴- ہائی اسکول پنجاب یونیورسٹی
۵- ڈپلومہ شعبۂ فارسی دارالعلوم دیوبند
۶- فاضل (عربی) دارالعلوم دیوبند

شائع شدہ تصانیف

۱- تقریر شاہی (اردو) تفسیر قرآن
۲- اسمائے حسنیٰ کی برکات (اردو) قرآن و حدیث
۳- الفیض الجاری (عربی) حدیث
۴- تراجم ابواب (عربی/اردو) حدیث
۵- نوادرات امام کشمیری (اردو) حدیث

۶-لالہ وگل (اردو) شخصیات
۷-نقش دوام (اردو) سوانح
۸-تذکرۃ الاعزاز (اردو) سوانح
۹-خطباتِ کشمیری (اردو) تقاریر
۱۰-فروغ سحر (اردو) تقاریر
۱۱-گل افشانی گفتار (اردو) تقاریر
۱۲-ربنا (عربی/اردو) ادعیہ
۱۳-فردوس درودوسلام (اردو) ادعیہ
۱۴-فردوس صلاۃ وسلام (عربی/اردو) ادعیہ

تراجم

۱-	تعلیم المتعلم	(عربی سے اردو)	طریقۂ درس وتدریس
۲-	تفسیر ابن کثیر	(عربی سے اردو)	تفسیر قرآن
۳-	تفسیر مدارک	(عربی سے اردو)	تفسیر قرآن
۴-	تفسیر طنطاوی	(عربی سے اردو)	تفسیر قرآن
۵-	تفسیر جلالین	(عربی سے اردو)	تفسیر قرآن
۶-	تفسیر مظہری	(عربی سے اردو)	تفسیر قرآن
۷-	تشریح وتوضیح تفسیر حقانی	(اردو)	تفسیر قرآن
۸-	تکمیل الایمان	(فارسی سے اردو)	دینیات وعقائد
۹-	کشف الحاجۃ	(عربی سے اردو)	تشریح حدیث

عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور اردو کی
ترویج واشاعت کے لیے گراں قدر خدمات

جامعہ امام محمد انور شاہ (قدیم نام معہد الانور) نامی ادارے کا قیام ۱۹۹۷ء دیوبند

میں اس مقصد کے لئے کیا گیا کہ عربی زبان سے اردو زبان میں علمی کتابوں کا ترجمہ اور عربی، فارسی، ہندی انگریزی زبان کی تعلیم نئی نسل کو دی جائے۔ اس وقت ادارے میں پانچ کتابوں کا ترجمہ عربی و فارسی سے اردو میں، اور اردو سے عربی فارسی میں کیا جا چکا ہے، اس وقت اس ادارے میں طلبہ کی ایک خاصی تعداد زیر تعلیم ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی نگرانی اور سرپرستی میں ان تمام امور کے علاوہ ایک رسالہ "محدث عصر" کے نام سے جاری کیا گیا، جواب معتمدِ جامعہ مولانا سیّد احمد خضر شاہ مسعودی کی ادارت میں تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

حاصل کردہ منصب و امتیازات

۱- بحیثیت مدرس عربی ۳۰ ؍سال دارالعلوم دیوبند میں اونچے درجات میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔

۲- ۲۶ ؍سال سے بحیثیت استاذ عربی وقف دارالعلوم دیوبند میں تاوفات تدریسی خدمات پر مامور رہے۔

۳- بحیثیت سربراہ شعبہ اسلامیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقرر۔

۴- بحیثیت صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند میں خدمات

۵- بعہدہ قائم مقام مہتمم دارالعلوم دیوبند میں خدمات

۶- بعہدہ ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند میں خدمات

۷- بعہدہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین وقف دارالعلوم دیوبند میں تاوفات خدمت کی انجام دہی

۸- بعہدہ ناظم تعلیمات وقف دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تعلیمات کی سربراہی

۹- سرپرست جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

۱۰- ایڈیٹر ماہ نامہ ہادی دیوبند ۱۹۶۲-۱۹۵۵ء

۱۱- ایڈیٹر ماہنامہ نقش دیوبند ۱۹۶۰ء-۱۹۵۵ء

۱۲-ایڈیٹر پندرہ روزہ یثرب دیوبند ۱۹۸۳ء-۱۹۷۸ء

۱۳-سرپرست ونگراں ماہنامہ "محدث عصر" دیوبند ۲۰۰۱-تاوفات

۱۴-سربراہ خیرسگالی وفد برائے حج (گورنمنٹ آف انڈیا)

۱۵-رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

۱۶-قاری طیب صاحب ایوارڈ من جانب مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ

۱۷-ایوارڈ برائے ماحولیات سہارن پور

۱۸-راشٹرپتی ایوارڈ، حکومتِ ہند (ماہر لغت عربیہ) برائے ۲۰۰۳ء

۱۹-بانی وصدر آل انڈیا تنظیم علماء ہند

اہم مطبوعات

العرف الذكي (۵ر جلدیں)	مختارات الإمام الكشميري
نفحة العنبر	خاتم النبيين ﷺ (عربی)

حیاتِ ابن مریم (ترجمہ عقيدة الإسلام في حياة عيسىٰ عليه السلام)

نوادراتِ امام کشمیریؒ	گنجینۂ اسرار
نقش دوام	ملفوظات محدث کشمیری
تصویر انور	لالہ و گل
خطباتِ کشمیری	اسمائے حسنیٰ کی برکات
دو گوہرِ آبدار	The Pride of Kashmir (فخرِ کشمیر)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اپنی ہشت پہلو شخصیت ----------

سیّد ازہر شاہ قیصر: ایک ادیب، ایک صحافی

JAMIA IMAM MUHAMMAD ANWAR SHAH

Behind Eidgah, Deoband 247554 (U.P.) INDIA

Mobile (Mohtamim) : +91 8006075484
Phone (Office) : +91 1336 220471
E-mail : ahmadanzarshah@gmail.com